سلسلۂ تجدیدِ دین (۱)
جامع المجددین
تجدید دینِ کامل
حضرت مولانا عبد الباری ندویؒ
خلیفۂ اقدس
حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمہما اللہ تعالیٰ
المکتبۃ الاشرفیۃ
جامعہ اشرفیہ
فیروز پور روڈ لاہور

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

سنایا یہ جاتا ہے کہ دین دنیا کی راہ مارتا اور فتنہ و فساد برپا کرتا ہے۔ لیکن دیکھا یہ جارہا ہے کہ دینی بیزاری کا جنون جتنا بڑھتا جاتا ہے فتنہ و فساد اتنا ہی زور پکڑتا جاتا ہے۔ انفرادی و اجتماعی، سیاسی و معاشی اقوامی و بین الاقوامی ہر طرح کی راحت و عافیت سلامتی و آسودگی کھو جاتی ہے، بلکہ کھو چکی ہے۔ ایسے مجنوں کا حال ہو رہا ہے، جو جوش جنوں میں خود اپنے جیب و گریباں کو تار تار اور اپنے ہی بدن کو نوچ نوچ کر لہولہان کر رہا ہو۔ جنگ عظیم کے بعد جنگ جہانگیر کی مصیبتیں دنیا ابھی بھگت ہی رہی ہے۔ کہ جنگ جہاں سوز اور ایٹم بم کے بعد ہائیڈروجن بم کا عذاب ہمارے سر پر منڈلا رہا ہے۔ کل ہی (۲۶ فروری) پانیر میں ایک مضمون جہنم بم کے نام سے دیکھا کہ ہائیڈروجن بم ایٹم بم سے ہزار گنا طاقتور (اور صدق میں ایک ماہر سائنس کا بیان چھپا کہ اس سے لاکھوں گنا بڑھا ہوا) ہو گا۔ ایٹم بم اگر ۱۰ میل مربع پر تباہی نازل کرتا تھا تو ہائیڈروجن بم تین چار سو مربع میل کو جہنم میں جھونک دے گا۔ مشہور ترین ماہر سائنس آئنسٹائن کا تو دعویٰ ہے کہ ساری فضا میں اس کا زہر پھیل کر کسی متنفس کو زندہ نہ چھوڑے گا۔ (صدق ۱۰ مارچ ۵۰ء)

آخرت کی جہنم سے پہلے دنیا کو جہنم بنا دینے والا یہ لادینی جنون یورپ میں کلیسا کے منسوخ (آوٹ آف ڈیٹ) وہ بھی مسخ در مسخ دین کے تجربے سے شروع ہوا۔ پھر یورپ ہی کے سیاسی و سائنسی غلبہ کے ساتھ دنیا بھر میں پھیل کر بالآخر دنیا و آخرت دونوں کے خسران وہلاکت کا سامان ہے۔

جس کے جواب وہ دنیا و آخرت دونوں جگہ مسلمان ہیں۔ ان کے پاس دنیا کی توہیداً ہیئت اور انسانی فطرت کے قالب میں ڈھلا ہوا آخری (لیٹسٹ) کامل و قیم دین موجود تھا، جو زندگی کی ہر راہ میں ہر طرح کے عوج و کجی سے پاک متوازن و مستقیم ضابطہ حیات تھا۔ اور بالکل اپنی مکمل و مستند شکل میں محفوظ۔ مگر ہم بجائے اس کے کہ انفرادی و اجتماعی، ظاہری باطنی اعتبار سے کسی معتد بہ درجہ تک اس دین کو دنیا کے کسی حصہ میں بھی عملاً پیش کرتے رہتے، خود ہی لادینی کے سیلاب میں عملاً بہ چلے۔ اور اپنے ہاتھ کی مشعل پھینک کر اندھوں کے پیچھے ہو لئے

بس کہیں کہیں سے تحریری و تقریری، عقلی و کلامی رنگ میں دین کی حمایت یہ مدافعت و معذرت (اپالوجی) کی سی آوازیں سنائی پڑ جاتی ہیں۔ نقار خانہ میں طوطی کی آواز۔ خائی رجز خوانوں نے دنیا ہی کا کب اور کونسا میدان سر کیا ہے، چہ جائیکہ کہ دین کا تو دعوتی مزاج ہی اصلاً عمل ہی عمل ہے۔ وہ کان کے راستہ سے کم اور آنکھ کے راستے سے زیادہ راہ پاتا ہے۔

یہی راز ہے کہ آج کل کی لادینی و فرنگی جماعات سازی کی وبا و شور و غوغا کے بجائے دینی و انبیائی راہ کا پہلا قدم ہمیشہ خاموش افراد سازی رہی۔ مجموعہ کی کارکردگی و درستی ہمیشہ اجزا کی درستی پر موقوف ہوتی ہے۔ موجودہ معاشی و معاشرتی، سیاسی و قومی مصائب و مشکلات کا بڑا سرچشمہ افراد سازی کے بغیر جماعات سازی اور انسان سازی سے زیادہ قانون سازی ا۔ کی الٹی گنگا ہے۔

اسلامی احکام و تعلیمات کا بہت بڑا حصہ بالکلیہ افراد کی نفس انفرادی و اختیاری ہمت و قوت کا طالب ہے۔ اس حصہ کی انفرادی تکمیل ہی سے جو جماعت از خود وجود میں آ جائے وہی "کان حقا علینا نصر المومنین" کی نصرت حق کی حقدار اور ایمان و عمل صالح پر موعود "استخلاف فی الارض" کی صالح ہوگی۔ ورنہ غیروں کی نقالی میں عرب و عجم ہر جگہ نام کے اسلامی ملکوں میں بھی ہر آئے دن کیسے کیسے عبرت و ذلت کے تازیانے غیروں ہی کے ہاتھ سے لگتے رہتے ہیں۔

غرض آخرت تو آخرت مسلمانوں کے دنیوی احیاء و نشأت کا مدار بھی تمامتر دو اہل

حقیقتوں پر ہے۔ ایک جماعت سازی و قانون سازی سے اہم و اقدم افراد سازی و مسلمان سازی دوسرے مسلمان سازی بھی کامل مسلمان سازی یعنی ایمان و عمل صالح کے تمام ابواب دین میں معتد بہ حد تک پورا پورا مسلمان بنانا بنانا۔ ایمان کے بعد نماز روزہ اور حج کے سوا زکوٰۃ کی خالص عبادت تک حقوق عباد کے مصالح سے خالی نہیں۔ غور کیا جائے تو نماز (خصوصاً جماعت و مسجد کے تاکیدی احکام) اور روزہ و حج کے بہت سے احکام میں بھی کتنے حقوق عباد ملحوظ و مرعی ہیں۔ باقی دیگر دیانات (نکاح و طلاق وغیرہ) اور معاملات و معاشرات کے بے شمار احکام و تعلیمات کا تو سارا دفتر کہنا چاہئے کہ بندگان خدا ہی کے حقوق و فرائض کا دفتر ہے۔ بلکہ ایمان ہی کی عملی شرح۔ جیسا کہ نص حدیث سے ظاہر ہے کہ "ایمان کے کچھ ستر سے اوپر شعبے ہیں جن میں ادنیٰ درجہ راستہ سے کانٹے وغیرہ کسی اذیت کی چیز کا دور کر دینا ہے۔"

لیکن کیسی ستم ظریفی ہے کہ ہم جب مسلمان ہی نہیں ولی و بزرگ بھی بننا یا بنانا چاہتے ہیں تو ساری سعی و فکر گھوم گھما کر بالعموم نوافل و مستحبات اور وظائف کے کچھ معمولات بڑھانے کے اندر ہی رہ جاتی ہے۔ رہے معاملات و معاشرات اخلاق و عادات ان کے فرائض و واجبات تک کی تعلیم و تربیت عمل و اہتمام کی طرف توجہ شاذ ہی ملے گی۔ مدرسہ سے لے کر خانقاہ تک جہاں چلے جائیے یہی دردناک نظارہ سامنے ہوگا۔

حضرت جامع المجدد دین (مولانا تھانویؒ) کی تجدید دین میں اسی جامعیت کو پا کر کہ وہ دین کامل کے تمام ابواب و اجزا کے مدنظر کامل مسلمان سازی و افراد سازی کا کامل نظام ہے، یقین کرنا پڑتا ہے کہ اس سراپا شرو پر فتن دور میں حق تعالیٰ نے دراصل دین

۱۔ اس لادینی عہد میں پاکستان کی ہمت و سعادت ہزار ہا ہزار ستائش و آفرین کی سزاوار ہے کہ اس نے اصولاً "دینی دستور" کو تسلیم کر لیا بشرطیکہ اس کے ماتحت دستور سازی کی بھی ہو۔

لیکن جس چیز سے حکومت و عوام دونوں کے خواص بے فکر معلوم ہوتے ہیں "وہ مسلمان سازی ہے" اگر مسلمان مسلمان ہی نہ بنے تو اسلامی دستور پر چلنے والے کیا آسمان سے اتریں گے! سب سے زیادہ ادھر توجہ کی ذمہ داری حضرات علماء پر ہے۔

حق کی حجت پوری طرح پوری فرمادی۔ امت کے ہاتھ میں ایسا قد آدم آئینہ دے دیا ہے جس میں ایک طرف ہر صنف اور ہر طبقہ کا ہر ہر فرد خود اپنا دینی سراپا اور اس کا ایک ایک داغ دھبہ دیکھ اور دور کر سکتا اور دوسری طرف گم کردہ راہ دنیا کیلئے اسلام کے کمال و جمال کی دید کا آئینہ بن سکتا ہے۔

بس یہی باتیں دل میں سما کر خیال ہوا کہ یہ ناکارہ کسی اور کار کا تو ہے نہیں، اسی قد آدم آئینہ کو تجدید دین کے چوکھٹے میں پہنا کر "امۃ مخریہ" کی خدمت میں پیش کر دے کہ شاید "اخرجت للناس" کے فراموش کردہ فریضہ کی جوابدہی کی از سر نو کوئی چونک پیدا ہو جائے گو بڑے دکھ سے عرض کرنا پڑتا ہے کہ من حیث الامت یا قوم قرآن مجید کی عجیب تعبیر میں ہمارا کچھ ایسا ہی عجیب حال ہو رہا ہے کہ "سیدھی راہ دیکھیں بھی تو ادھر کا رخ نہیں کرتے اور ٹیڑھی راہ دیکھ کر اس پر دوڑنے لگتے ہیں۔" تاہم افراد و احاد کے سینے الحمد اللہ اب بھی حق جوئی و حق پذیری سے خالی نہیں۔ خدا سے قوی امید ہے کہ ان کو اپنی دنیا و دین دونوں کے سنوارنے کا خزانہ اس کتاب میں نقد دم ہاتھ آئے گا۔ اور ان کی دعا مولف ہذا کے حق میں انشاء اللہ آخرت و مغفرت کا بڑا سہارا ہوگی۔ اس نامہ سیاہ کے لئے یہ دولت ہی کیا کم ہے۔

جو کچھ بن پڑا محض حق تعالیٰ کے فضل و توجہ کی قدم قدم پر دستگیری سے۔ اس دستگیری کی توثیق فرمائی میں سب سے اول منت پذیر و منت گذار حضرت محترم مولانا شاہ سید سلیمان صاحب ندوی رحمتہ اللہ (خلیفہ حضرت جامع المجددین) کا ہوں کہ پورا مسودہ ملاحظہ فرما کر نہ صرف اپنی تصویب و تحسین سے اطمینان بخشا۔ بلکہ مستقل و مبسوط مقدمہ سے حضرت علیہ الرحمہ کی تجدیدی و اصلاحی جامعیت کی جو اہمیت اس بے علم مولف نے پائی اور پیش کی تھی اس پر اپنے علم و تحقیق کی مہر ثبت فرمادی۔

محب قدیم و محترم مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، زید مجدہ کی حضرت حکیم الامت کے تحریری کارناموں پر جیسی وسیع عمیق و دقیق نظر ہے، اور جتنا علمی استفادہ انہوں نے ان سے فرمایا ہے کم کسی کے حصہ میں آیا ہوگا۔ انہوں نے بھی خاکسار کی درخواست پر کتاب کے معتدبہ حصہ پر نظر فرما کر "خوب اور بہت خوب" کے صداقت نامہ سے ممنون

و مطمئن فرمایا۔ وہ نرے مصنف ہی نہیں، ماشاء اللہ فن تصنیف کے خصوصاً جدید فنی آداب کے بھی نکتہ شناس ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے مقدمہ (دیدہ کامل) کی بعض جزئیات کے حذف کا مشورہ دیا، جس پر بے چوں و چرا عمل ہوا۔

اول و آخر قلب پر بہت زیادہ اثر حضرت مخدوم و محترم سراپا لطف و کرم مولانا شاہ محمد حسن صاحب امرتسری ثم لاہوری بارک اللہ فی برکاتہم ومتعنا اللہ بطول لقائہم کا ہے۔ نہ صرف ظاہر و باطن علیم و عمل کے جامع اور حضرت جامع المجددین کے اخص خلفاء میں سے ہیں بلکہ حضرت کے اصلاحی و تجدیدی مذاق و مسلک کے خاص پہچاننے والے۔ مخدوم ممدوح کی نظر سے اس سلسلہ تجدید کی کچھ چیزیں جب سے گذاری گئیں اور تجدید دین کامل کا مسودہ خود حاضر ہو کر پیش کرنے کی سعادت ملی، اس وقت سے شاید ہی کوئی مکتوب مبارک ان کے متعلق غایت اشتیاق واستفسار سے خالی ہوتا ہو اور ان کی نافعیت و مقبولیت کی قوی امیدوں اور قلبی لاکھوں لاکھ، دعاؤں سے برابر نہ نواز جاتا رہا ہو۔

بندہ پیر خراباتم کہ لطفش دائم ست زانکہ لطف شیخ زاہد گاہ ہست و گاہ نیست

آگے تجدید تصوف کے دیباچہ کی موعودہ وہ تجاویز درج کی جاتی ہیں جو خود حضرت علیہ الرحمہ کی چیزوں کی ذرا از سر نو خاص ترتیب تہذیب ضروری تسہیل اور مناسب مقدمات کے ساتھ اشاعت کے لئے پیش نظر ہیں:۔

(الف) ملفوظات جو کئی ہزار صفحات میں ہیں، ان کے مکررات حذف کر کے مضامین کی مفصل فہرست کے ساتھ تین تین سو صفحات کے حصوں میں اشاعت آغاز مطبوعہ آخری ملفوظات یعنی الافاضات کی جلد ہفتم سے ہو گا یا اور جو غیر مطبوعہ دستیاب ہوں۔ نام اشرف المجالس ہو گا۔

(ب) مواعظ مضمون وار ترتیب اور حسب ضرورت تسہیل و تلخیص اور فہرست مضامین کے ساتھ بنام اشرف المواعظ۔ مواعظ و ملفوظات کی اشاعت اس لحاظ سے مقدم ہے کہ دین کی طلب و قبول اور خود اپنی اصلاح کے خیال کو پیدا و بیدار کرنے میں یہ اکسیر کا حکم رکھتے ہیں۔ پھر ہر طبقہ و مذاق کیلئے نہایت درجہ دلچسپ ان کی ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں اشاعت پڑھنا پڑھانا سننا سنانا بجائے خود انشاء اللہ مسلمان بننے بنانے کا بڑا محرک ہو گا۔

(ج) کلام مجید کو ترجمہ کے ساتھ اور سمجھ کر پڑھنے کا رجحان الحمدللہ روز افزوں ہے۔ لیکن اس میں گمراہیوں تک کی غلطیوں کا جیسا اندیشہ بلکہ تجربہ ہے اہل بصیرت سے مخفی نہیں۔ اس لئے سفر و حضر میں ساتھ رہنے کے لائق ایسی حمائل کی بڑی ضرورت ہے جس میں ترجمہ وہ ہو جو بیان القرآن میں بین السطور کے علاوہ قوسینی تشریحات کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔ اور حاشیہ پر وہ تفسیری فوائد حرف کے تحت درج ہیں۔ جہاں حاشیہ کی گنجائش سے زیادہ ہوں مختصر کئے جائیں۔ نیز ترجمہ کی قوسینی تشریحات کو جہاں بین السطور کی گنجائش سے زیادہ ہوں حاشیہ پر ضرور لیا جائے۔ اے نام اشرف الحمائل

(د) اشرف التفاسیر کے نام سے ان آیات کی تفسیر جو مواعظ کا عنوان یا مواعظ کے اندر ہیں اور جن میں بیان القرآن سے کوئی خاص بات زائد ہے۔

(ہ) اسی طرح اشرف الاحادیث کے نام سے وہ حدیثیں جو مواعظ اور التکشف اور حیات المسلمین وغیرہ میں بکثرت ایسی ملتی ہیں جن میں حضرت کے فہم و استنباط نے کوئی خاص پہلو پیدا فرمایا ہے یا جن کے نفس ترجمہ میں ایک آدھ قوسینی فقرہ ہی نے معنی و مطلب کو بالکل روشن یا دیگر احادیث و آیات سے ظاہری تعارض کو رفع فرما دیا ہے۔

(و) اشرف الفتاوی کے نام سے حوادث الفتاوی اور ایسے فتاویٰ کا مجموعہ جس میں حضرت کے تفقہ کی کوئی خاص تجدید و اجتہادی رائے ہو۔

(ز) تربیت السالک کے اہم انتخابات بتویب اور فہرست کے ساتھ بنام اشرف السلوک جو ہر شیخ و طالب پیر و مرید کے حرز جاں بنانے کے لائق ہوں گے۔

(ح) اشرف العلوم کے نام سے حضرت کے خاص علوم موہوبہ اور دیگر متفرقات۔

(ط) ایک تمنا یہ ہے کہ ساری امت کے استفادہ کے لئے یہ چیزیں عربی میں بھی شائع ہو سکتیں اور بعض انگریزی میں کہ غیر بھی محروم نہ رہتے۔

تجدید دین کامل اور تجدید تعلیم و تبلیغ کا خلاصہ ہی عربی میں اور تجدید تصوف و تجدید معاشیات کا عربی و انگریزی دونوں میں آ جائے تو انشاء اللہ حضرت کی تجدیدی و تعلیمی خصوصیات کا نچوڑ آ جائے گا اور اپنے پرائے سب اسلام کے کمال و جمال کی ایک جھلک تو دیکھ ہی سکیں گے۔

ظاہر ہے کہ یہ خدمات تنہا اپنے بس کی کسی پہلو سے بھی نہیں خصوصاً سن وصحت کے اس انحطاط و زوال بلکہ اختتام کے وقت کہ ۶۰ سال کا سن ہو چکا اور کم و بیش ۳۵ سال سے دمہ دم کے ساتھ ہے اور اس سال تو ۵؍۶ مہینے کی مسلسل علالت اور اس کے باقیات نے بالکل ہی توڑ دیا تاہم اگر کسی ایک ہی با اخلاص و باہمت رفیق کار کی مستقل رفاقت میسر آ جائے تو انشاء اللہ بشرط حیات بہت کچھ ہو سکتا ہے کم از کم کام کی صورت بندھ کر سلسلہ آگے چلتا رہ سکتا ہے۔ مالی اعتبار سے الحمدللہ کہ اپنی ذات کے لئے کوئی منفعت مدنظر نہیں۔ اصل و نفع سب انشاء اللہ اسی مد میں صرف ہوتا رہے گا گو سمندر کے پیاسے کے لئے یہ قطرہ سے زیادہ نہیں تاہم اپنی حقیر ہمت و وسعت کے دیکھتے یہ بھی بہت اور محض اللہ تعالیٰ کی توفیق ہے۔

متفرق و غیر مستقل افراد سے کام لینے کا تجربہ ناکام رہا۔ حکایت و شکایت دونوں کے طور پر ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ خود حضرت علیہ الرحمہ سے نسبت و عقیدت رکھنے والے حضرات الحمدللہ یوں تو سینکڑوں ہزاروں ہیں اور بہتوں سے براہ راست خود اس نیاز مند کو شرف نیاز حاصل اور ان تجاویز پر تحسین و آفرین بھی بہت فرمائی، بعض کتابیں تک لے گئے لیکن مہینوں رکھ کر جوں کی توں واپس فرمادیں۔

ان سطور کے ملاحظہ کے بعد بھی اگر کوئی صاحب ہمت فرمائیں تو تفصیلات پر مکاتبت یا مخاطبت فرمائیں۔ انشاء اللہ جس وقت کی بھی خدمت ہوگی۔

یہ دیباچہ بھی اور ایک مقدمہ ہی بن گیا، عذر بھی اس درازنفسی کا اس کے سوا کچھ نہیں کہ ؎

مصلحت نیست مراسری ازین آبحیات
ضاعف اللہ بہ کل زمان عطشی

بعد نظر ثانی بوقت طبع ثانی ۱۱؍ ربیع الاول ۷۶ھ مطابق ۱۷؍ اکتوبر ۱۹۵۶ء

۱۔ اس خدمت کو احقر کی درخواست پر محب فاضل و جوان صالح مولانا اسحٰق صاحب سندیلوی سلمہ جو ہر طرح اس کے صالح ہیں الحمد للہ پوری فرما چکے ہیں۔ صرف احقر کی نظر ثانی باقی ہے۔ لیکن اس کے مصارف طباعت کی سکت راقم ہذا کے وقف سلسلہ تجدید دین نہیں۔

مقدمہ

از حضرت محترم مولانا شاہ سید سلیمان صاحب ندوی

خلیفہ حضرت حکیم الامت جامع المسجد دین علیہ الرحمہ

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت جاری ہے کہ جب ضرورت پیدا ہوتی ہے تو اس کا دفعیہ کا بھی سامان پیدا کرتے ہیں، رات کے اندھیرے میں چاند اور تاروں کے چراغ جلا دیتے ہیں گرمی اور امس جب شدت کو پہنچ جاتی ہے تو ابر رحمت نازل فرماتے ہیں جہاں بیماریاں وہیں اس کی دوائیں اگاتے اور تدبیریں بتاتے ہیں، بالکل یہی حال امراض باطنی اور احوال نفسانی کا ہے جب فساد ظاہر ہوتا ہے صلاح کی تدبیر ابھرتی ہے جب ظلمت انتہا کو پہنچتی ہے سپیدہ نور طلوع ہوتا ہے ضلالت کے ساتھ ہدایت، کفر کے ساتھ ایمان، آذر کے ساتھ ابراہیم اور فرعون کے ساتھ موسیٰ کا ظہور ہوتا ہے۔

اسی اصول پر دنیا میں تاریکی کے ہر دور میں نبوت کا نیا نور چمکا اور دنیا کو روشن کر گیا آخر حضور رسالت مآب خاتم النبیین محمد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود پاک پر جب شریعت اتمام کو پہنچی اور دین کامل ہو گیا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی، تو نسل انسانی کو اس شریعت کی راہ دکھانے اور اس دین کے مسائل کو بتانے اور نئے نئے زمانہ کے نئے نئے فتنوں سے محفوظ رکھنے اور دین و شریعت کو تحریف و تبدیل سے بچانے اور شکوک و شبہات کو مٹانے کے لئے ہر دور میں ایسی ہستیاں ظاہر فرمائی جاتی رہی ہیں جو دین کو اپنے اصلی جادہ پر قائم رکھ سکیں اور اس کے چشمہ صافی کو گرد و غبار سے صاف کر کے مصفا رکھیں۔

مقصود یہ ہے کہ زمانہ ہمیشہ حرکت میں ہے اور اس کے ساتھ ہر چیز حرکت میں ہے اس حرکت سے لوگوں کے خیالات و اعمال میں گھٹاؤ بڑھاؤ پیدا ہوتا رہتا ہے۔ نئی نئی تحریکیں

نمایاں ہوتی ہیں، نئی نئی بدعتیں ظاہر ہوتی ہیں، نئے نئے خیالات لوگوں کے دلوں میں جگہ پاتے ہیں، زبان طرز تعبیر، طریق استدلال میں تغیر ہوتا رہتا ہے اور یہ سب کے سب مل کر ایمانیات اور یقینیات میں شک و شبہ کی راہیں کھولتے ہیں اس لئے اس قادر مطلق نے جس نے دین کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے مخصوص انسانوں کے ذریعہ دین کی حفاظت کے وعدہ کو پورا فرماتے رہتے ہیں۔

یہ تحریف و تبدل اور خیالات کا اتار چڑھاؤ اور اعمال کا بگاڑ ہر زمانہ میں الگ الگ راہوں سے اور انوکھے اور نت نئے دروازوں سے داخل ہوتا رہتا ہے اس لئے ہر زمانہ کا فساد عمل اور سوء اعتقاد ایک طرح کا نہیں ہوتا۔ کبھی یہ فساد قیصری و کسروانی حکومتوں کے قاعدوں اور قانون کی راہ سے آیا کبھی یونانی و عجمی علوم و فنون کی صورت میں آیا، کبھی ہند و شام و مصر کے سابقہ مذہبوں کے اختلاط نے دین میں گنجلک پیدا کی، اور کبھی کسی ملک کے رسم و رواج نے شریعت کی جگہ لے لی۔ کبھی غیر شرعی عصری تحریکات نے دلوں اور دماغوں کو متعفن کیا۔ غرض کبھی سیاست کی راہ سے کبھی علم و فن کی راہ سے کبھی تہذیب و تمدن کی راہ سے، کبھی حکومت کی راہ سے کبھی عقل پرستی اور خرد نوازی کے ذریعہ سے، کبھی غیر دینی اقتصادی و تمدنی نظامات کے واسطہ سے، بلکہ کبھی خود غلوئے دین اور تشدد فی الدین کی راہ سے دین میں تحریفات و بدعات پیدا ہوتے رہے ہیں، اس لئے ہر زمانہ کے مفاسد کے لحاظ سے دین کے مجدد دین کا ہر عصر میں ظہور ہوتا رہا ہے اور انہوں نے خداداد قوت عمل اور ربانی محبوبیت اور انسانی مقبولیت پا کر زمانہ کی مشکلوں کا پورا مقابلہ کر کے اصل دین کے چہرہ سے زمانہ کے گرد و غبار کو صاف کیا ہے اور پھر دین کی حقیقت کو بے غبار کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ہر صدی میں ایسے مجدّد کے ظہور کی حدیث حسب ذیل ہے۔

عن ابی هریرہ فی ما اعلم عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ یبعث فی امتی علی راس کل مائۃ من یجدد لھا دینھا (ابو داؤد کتاب الملاحم)

بے شبہ اللہ تعالیٰ میری امت میں ہر صدی کے سرے پر ایسے کو پیدا کرے گا جو اس کے لئے اس کے دین کو نیا کر دے گا۔

یہ روایت ابو داؤد کی ہے، حاکم نے مستدرک، کتاب الفتن میں اور بیہقی نے مدخل میں اس کی دوسری روایتیں کی ہیں۔

بعض محدثین نے گو اس حدیث کی سند میں کلام کیا ہے خود اسی ابو داؤد کی روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک رفع میں راوی کو تردد ہے۔ مگر ایسی بہت سی حدیثیں ہیں جن کی سند میں کلام کیا گیا ہے مگر واقعہ نے ان کی صداقت کی توثیق کر دی ہے۔ یہی حال اس حدیث کا بھی ہے اور تاریخ اسلام اس کی صداقت کی شاہد ہے۔

اس موقع پر ایک شبہ کا دفع کرنا ضروری ہے عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ ہر صدی کے سرے پر ایک ہی مجدد پیدا ہوتا ہے، لیکن لفظ من جیسا کہ محققین نے اصول فقہ میں ثابت کیا ہے کسی خاص کے لئے ہونا اس کا ضروری نہیں[1]۔ بلکہ عموم بھی اس سے سمجھا جاتا ہے یعنی اس سے ایک دو اور چند بھی سمجھے جا سکتے ہیں، جیسے من الناس من یقول امنا باللہ و بالیوم الآخر وماھم بمومنین کی آیت میں آمنا اور ہم کی جمعیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ من کے لئے ایک کا ہونا ضروری نہیں اس لئے بالکل ممکن ہے کہ مختلف ملکوں میں یا مختلف اصلاحوں اور مختلف مفاسد کے مقابلہ میں تجدید دین کے لحاظ سے ایک ہی وقت میں کئی مجدد ظہور کر سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ علما نے بعض دفعہ ایک ہی وقت میں کئی بزرگوں کو مجدد مانا ہے۔

حدیث میں علی راس کل مائۃ آتا ہے یعنی ہر صدی کے سرے پر سرا ابتدا اور انتہا دونوں پر بولا جاتا ہے، چنانچہ بعض شارحین ابو داؤد نے لغت سے دونوں استعمالوں کو ثابت کیا ہے اس لئے راس کل مائۃ کا صحیح ترجمہ صدی کے سرے پر کے بجائے تخصیص کے ساتھ ابتدا اور انتہا پر نہیں آنا چاہئے۔

ایک اور بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ صدی کے سرے پر مجدد کی پیدائش ہونا

---

[1] ضروری نہیں لیکن زبان کا عام استعمال یہی ہے۔ اور اس حدیث تجدید میں تو "ہر صدی کے سرے" کی قید بے تکلف بول رہی ہے کہ اس سے مقصود کسی بہت خاص نمایاں فرد کی بعثت ہے۔ ورنہ کچھ نہ کچھ لوگ تو ہر صدی کے ہر حصہ ہی میں ایسے پائے جاتے ہیں جو تھوڑی بہت دین کی تجدیدی خدمت انجام دیتے ہیں۔ (مولف)

ضروری نہیں بلکہ اس وقت اس کے تجدیدی مشن کا آغاز ہوتا ہے، جس کو حدیث میں بعثت کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پیدائش کے چالیس برس کے بعد مبعوث ہوئے۔

ایک اور نکتہ کو بھی کھول دینا ضروری ہے حدیث کے لفظ یہ ہیں کہ مجدد دین کو نیا کر دے گا یعنی رسوم و بدعات و فسادات کی کھنگی کو دور کر کے اصل دین کو ظاہر کرے گا اس لئے مجدد کی بڑی پہچان جس سے خواص اس کو پہچان اور عوام جان سکتے ہیں کہ اس کی تعلیم و تلقین اور جدوجہد اور دعوت و تبلیغ سے زمانہ کی ظلمتیں اور خیالات کی بدعتیں اور اعمال کے مفاسد دور ہو کر وہ اصل دین نمودار ہو جائے جس کی صحیح تصویر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے نگار خانہ کتاب و سنت میں محفوظ ہے۔

چونکہ اس حدیث کا سہارا لے کر بعض دفعہ مدعیان باطل نے نئے نئے دعوے کئے ہیں، یہاں تک کہ نبوت کے حدود حرم تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور اسلام میں نئے نئے فرقوں بلکہ امتوں کی بنیاد ڈالنی چاہی ہے اس لئے یہ لغزش گاہ بھی ہے اور اس مقام پر قلم اور قدم کو بہت پھونک پھونک کر چلنا چاہئے۔ اسی لئے ضرورت ہے کہ بتا دیا جائے کہ نبی کی ضرورت اصل احکام کے من جانب اللہ انسانوں تک پہنچانے کے لئے ہے۔ یعنی نبی اللہ تعالیٰ سے پا کر بندوں تک پہنچانے میں واسطہ ہے وہ عقل و قیاس اور علم و فہم سے نہیں کہتا، بلکہ وہ جو کچھ کہتا ہے وحی سے کہتا ہے اور خدا سے پا کر کہتا ہے اس کی وحی و تعلیم ہر خطا سے پاک اور وہ خود ہر غلطی سے معصوم ہے۔ مگر مجدد کا یہ حال نہیں ہے بلکہ وہ کتاب و سنت اور وحی و رسالت کے احکام و پیغام کو سمجھ کر اور اپنی فراست ایمانی صفائے ذہن، عقل مستقیم اور قیاس صحیح اور رائے صواب سے صحیح غلط میں تمیز کرتا ہے دین کو غیر دین سے ارشادات الٰہی کو ایجادات انسانی سے، سنت کو بدعت سے ممتاز کرتا ہے اور اپنی علمی و عملی زندگی کی طہارت و نزاہت اور ثبات و استقامت اور نبی کی اتباع کامل اور اقتدائے تام سے محبوبیت و مقبولیت کی شان پیدا کرتا ہے۔

اس تقریر سے ظاہر ہے کہ نبی کو ماننے اور اس پر ایمان لائے بغیر انسان اصل شریعت سے محروم رہتا ہے اور کفر سے لپٹا رہتا ہے اس لئے اس پر نعیم آخرت کا ہر دروازہ ہمیشہ کے

لئے بند اور عذاب آخرت کا ہر دروازہ ہمیشہ کے لئے کھل جاتا ہے۔ لیکن مجدد کے نہ ماننے سے وہ صرف کتاب و سنت کی صحیح ترجمانی سے محروم ا ؎ رہتا ہے۔ اور بدعات و فسادات کی آمیزشوں سے بچ نکلنے میں اس کو مشکلیں پیش آتی ہیں، اس لئے ہو سکتا ہے کہ جنت تک پہنچنے میں اس کو عذاب کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑے، وللہ ملک السموات والارض یغفر لمن یشاء و یعذب من یشاء۔

اسی وجہ سے نبی اور مجدد کی دعوتوں کی نوعیت میں بھی فرق ہے۔ نبی ہر شخص کو اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے اور نبی کی نبوت پر ایمان لانا ایمان کا جز ہے جس کے بغیر کوئی مومن نہیں ہو سکتا، کیونکہ نبی کو نبی مانے بغیر اس کے واسطہ سے آئے ہوئے احکام الٰہی اور کلام ربانی تک رسائی نہیں ہو سکتی، لیکن مجدد اپنی شخصیت کی دعوت نہیں دیتا یہاں تک مجدد کو مجدد ماننا ایمان کا ادنیٰ جز بھی نہیں خصوصاً کسی ایک زمانہ کے کسی خاص مجدد کو مجدد تسلیم کرنا بھی ضروری نہیں۔

اسی فرق سے دوسرا فرق بھی پیدا ہوتا ہے نبی کو اپنا نبی ہونا یقینی اور قطعی طور سے معلوم ہوتا ہے اور اس کو اللہ کی تعلیم و خبر سے اس واقعہ کا ہونا یقینی بدیہی معلوم ہوتا ہے، جس کے لئے اس کو دلیل کی بھی ضرورت نہیں لیکن مجدد کو اپنا مجدد ہونا ظن و تخمین سے زیادہ معلوم بھی نہیں ہوتا، بلکہ اگلے زمانہ کے مجدّدین کا مجدد ہونا بالعموم ان کی وفات کے بعد ان کے پاکیزہ کارناموں اور مقدس حالات اور تجدیدانہ مساعی سے خواص امت پر ظاہر ہوا اور اس کے بعد لوگوں نے مان لیا، چنانچہ سب سے پہلے حضرت امام احمد بن حنبل نے پہلی صدی کے خاتمہ کا مجدد حضرت عمر بن عبدالعزیز المتوفی ۱۰۱ھ کو اور دوسری صدی کا مجدد امام شافعی المتوفی ۲۰۴ کو مانا۔ "

تیسری صدی میں امام ابوالحسن اشعری اور پھر امام الحرمین، پھر امام غزالی کو بہتوں نے اس منصب کے قابل قرار دیا، اس کے بعد اہل حدیث نے حافظ ابن تیمیہ کو بھی ساتویں

ا ؎ یہ محرومی بھی کتنی بڑی ہے محرومی ہے کہ دولت ایمان رکھ کر بھی اسے کے دینی و دنیوی ثمرات و برکات سے گویا عملاً محروم ہی رہتا ہے (مولف)

صدی کا مجدد بتایا۔ ہندوستان میں دسویں صدی کے خاتمہ پر حضرت شیخ احمد سرہندی، پھر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے بعد ایک جماعت نے مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کو اس منصب کا اہل تسلیم کیا۔

حافظ سیوطی نے نویں صدی میں ایک نظم میں ان بزرگوں کے نام گنائے ہیں جن کو بعض خواص امت نے مجددوں میں شمار کیا ہے، چنانچہ حافظ سیوطی کے بتائے ہوئے اسمائے مبارکہ یہ ہیں، نویں صدی میں انہوں نے صرف اپنے متعلق امید ظاہر کی ہے مگر ان کے معاصر امام سخاوی بھی اس عہدہ کے امیدوار ہیں اس لئے دونوں کے نام لکھے جاتے ہیں۔

۱۔ پہلی صدی	عمر بن عبدالعزیز المتوفی ۱۰۱
۲۔ دوسری صدی	امام شافعی المتوفی ۲۰۴
۳۔ تیسری صدی	حافظ ابن شریح امام ابوالحسن اشعری
۴۔ چوتھی صدی	امام باقلانی، امام سہل بن با ابو حامد
۵۔ پانچویں صدی	امام غزالی
۶۔ چھٹی صدی	امام رازی رافعی
۷۔ ساتویں صدی	ابن دقیق العید
۸۔ آٹھویں صدی	امام بلقینی یا حافظ زین الدین عراقی
۹۔ نویں صدی	سیوطی یا امام سخاوی

حافظ سیوطی شافعی تھے اس لئے انہوں نے زیادہ تر نام شافعیوں کے لکھے ہیں۔ محدثین نے جو فہرست پیش کی ہے اس میں چوتھی صدی تک کے محدثین کے نام گنائے ہیں ۱۔

۱۔ پہلی صدی	ابن شہاب زہری و قاسم بن محمد و سالم بن و حسن بصری و محمد بن سیرین (امام محمد باقرؒ)

۱۔ اصل بات وہی معلوم ہوتی ہے کہ اس طرح کے ہمارے اکابر نے اپنی اپنی جگہ کوئی نہ کوئی تجدیدی خدمت انجام دی ہے۔ لیکن اگر حدیث تجدید کو قبول کیا جائے تو "صدی کے سرے" کی قید و تخصیص کسی تخصیصی مجدد کو بھی ضرور مقتضی ہے۔ واللہ اعلم (مولف)

۲۔ دوسری صدی　　یحییٰ بن معین امام الجرح والتعدیل
۳۔ تیسری صدی　　نسائی صاحب سنن نسائی
۴۔ چوتھی صدی　　حاکم صاحب مستدرک و حافظ عبدالغنی مصری

اس کے بعد دسویں صدی میں صاحب خلاصہ الاثر نے شمس الدین بن شہاب الدین کا نام لیا ہے جن کو ان کے اہل زمانہ وقت کا مجدد سمجھتے تھے۔ گیارہ سے لے کر چودہ تک کا زمانہ ہندوستان کا ہے اس موقع پر ایک بات اہل نظر کو صاف نظر آئے گی کہ دینی قطبیت کا مرکز دوسرے اسلامی ملکوں سے ہندوستان کو منتقل ہو گیا۔ چنانچہ دینی و مذہبی خدمت، علوم و فنون کی خدمت، حدیث و تفسیر کی خدمت اور ہدایت خلق و احیائے سنن و رد بدعات کے لحاظ سے ہندوستان تمام دوسرے اسلامی ملکوں پر سبقت لے گیا ہے۔ کیونکہ ان صدیوں میں ہندوستان میں جو ہستیاں نمایاں ہوئیں، ان کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں ملتی۔ مثلاً گیارہویں صدی کے آغاز میں حضرت شیخ احمد سرہندی متوفی ۱۰۳۴ھ اور بارہویں صدی کے وسط میں حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی المتوفی ۱۱۷۶ھ اور تیرہویں صدی کے وسط میں مولانا شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی اور مولانا سید احمد بریلوی شہید۔

بیرون ہند حجاز میں کچھ ایسے بزرگ گزرے ہیں جن کے فیض سے علوم حدیث کو دنیائے اسلام میں رواج ہوا اور ان کی برکت سے ہندوستان اور حجاز یکساں مستفید ہوئے۔ چنانچہ گیارہویں صدی میں ابراہیم بن حسن کرونی نزیل مدینہ اور بارہویں صدی میں شیخ صالح بن محمد بن نوح نزال مدینہ کے نام بعض محدثین نے لئے ہیں۔ شیخ ابراہیم بن حسن کروی کے صاحبزادہ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی ہیں جو حضرت شاہ ولی اللہ کے استاد ہیں۔

گیارہویں صدی کے مجدد وقت حضرت شیخ احمد سرہندی کو مجدد کے لقب سے سب سے پہلے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے ملقب کیا جو شاہجہاں کے عہد کے سب سے بڑے عالم تھے اور جن کی تصنیفات دنیائے اسلام میں شائع و رائج ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس لقب کو ایسا مقبول کیا کہ زبان خلق پر ان کا نام ہی مجدد الف ثانی قرار پایا۔

شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ تعالیٰ کے کارنامے سب کے سامنے ہیں، اور انہوں نے خود بھی اپنے متعلق اپنی کتاب تفہیمات الہیہ میں ادھر اشارہ کیا ہے۔ حضرت مولانا اسمٰعیل شہید

کی ذات سے ہندوستان میں دین اسلام نے جو قوت و توانائی پائی اور عقائد اسلام جس طرح رسوم و بدعت سے پاک ہوئے اور بہت سی مردہ سنتیں جس طرح ان کے دم قدم سے زندہ ہوئیں اور اب تک ہیں۔ وہ محتاج دلیل نہیں۔ حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل کے ساتھ حضرت مولانا سید احمد شہید بریلوی کا نام لینا بھی مناسب ہو گا گویہ دونوں ہستیاں یک جان و دو قالب ہو گئی تھیں اور ان میں سے جن کو چاہو مجدد کے وصف سے متصف مان لو۔

ان بزرگوں کی تاریخ پیدائش و وفات کا حال ذیل کے نقشہ سے معلوم ہو گا۔

۱۔ حضرت شیخ احمد سرہندی　　پیدائش ۹۷۱ھ　وفات ۱۰۳۴ھ

۲۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی　　پیدائش ۱۱۱۴ھ　وفات ۱۱۷۶ھ

۳۔ حضرت مولانا اسمٰعیل شہید　　پیدائش ۱۱۹۳ھ　شہادت ۱۲۴۶ھ

۴۔ حضرت مولانا سید احمد شہید　　پیدائش ۱۲۰۱ھ　شہادت ۱۲۴۶ھ

بہر حال اوپر کی تفصیلوں سے ظاہر ہے کہ کسی مجدد کا مجدد ہونا کوئی ادعائی اور یقینی مسئلہ نہیں ہے۔ اور نہ اس کے دعویٰ پر موقوف ہے بلکہ خواص امت کو اس کے دینی کارناموں کی بنا پر یا اسی شخص کو اپنی کوششوں کی مقبولیت کی بنا پر یہ گمان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو صدی کا مجدد بنا کر بھیجا ہے۔

عصر حاضر یعنی چودھویں صدی کے مجدد کی تعیین کے لئے بھی وہی معیار ہو گا جو اگلوں کے لئے تھا یعنی ان کے کارنامے اس منصب جلیل پر سرفراز ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور اس تعین کے مسئلہ میں نیک نیتی سے دو شخصوں کی راہیں حسب عقیدت و محبت مختلف ہو سکتی ہیں اور ان میں سے کسی ایک پر اعتراض اور ایراد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ مسئلہ محض گمان و تخمین اور قیاس کا ہے۔

اس صدی کے بزرگوں میں سے مرشدنا حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص ممتاز حیثیت ہے۔ علوم ظاہر و باطن کی یکجائی، اور تمام کمالات علمی و عملی کا ان میں اجتماع، ایک طرف فقہ و فتاوی کی مسند نشینی، دوسری طرف تصنیف و تالیف و تحریر و وعظ و تقریر سے ہدایت خلق، رد بدعات، دفع شبہات، ابطال رسوم، اور تیسری طرف اپنے انفاس قدسیہ سے باطنی فیوض و برکات کا اجرا اور اسلام کے عقائد و اعمال کو

زمانہ کے تہ بہ تہ ظلمات کے گرد و غبار سے پاک کرنا ایسے اوصاف ہیں جن کا اجتماع ان کے محبین و معتقدین کے خیال میں اس درجہ پر ہے کہ وہ منصب تجدید کی حد تک پہنچتا ہے۔

حضرت والا کی ولادت ۱۲۸۰ھ میں ہوئی، مراتب درس و تعلیم سے فراغت ۱۳۰۰ھ میں ہوئی اور ۱۳۰۱ھ میں قطب وقت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی اور اسی سال ۱۳۰۱ھ سے کانپور میں بیٹھ کر درس و تدریس اور وعظ و تقریر اور تالیف و تحریر کا آغاز فرمایا اور اسی سال قطب آفاق حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی کے فیض دیدار سے مسرور ہوئے اور اسی سال فریضہ حج سے مشرف ہوئے اور شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے بیعت ہو کر اور فیوض گوناگوں سے بہرہ اندوز ہو کر ۱۳۰۲ھ کو واپس ہوئے۔

ان تاریخوں کا ذکر اس لئے کیا گیا تاکہ علی راس کل ماۂ کی ظاہری مطابقت بھی واضح ہو جائے۔ حضرت مولانا کے دینی و علمی و روحانی و اصلاحی کارناموں کو دیکھ کر خواص امت کو حضرت کے مجدد وقت ہونے کا گمان حضرت کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا۔ اور بعض صاحبوں نے ہمت کر کے آپ سے دریافت بھی فرمایا تو اس طرح اس کا جواب دیا جس طرح حدود شرع کے اندر احتیاط کے ساتھ کہا جا سکتا ہے، چنانچہ زبانی اور تحریری دونوں قسم کی روایات اس بندہ ہیچمداں تک پہنچی ہیں۔ الافاضات الیومیہ سے مولف ہذا نے حضرت کے حسب ذیل ملفوظ کو اس کتاب کے مقدمہ (دیدہ کامل) میں نقل کیا ہے، ایک مولوی صاحب نے دریافت کیا۔

> کیا حضرت مجدد وقت ہیں، فرمایا "احتمال تو مجھ کو بھی ہے مگر اس سے زائد نہیں جزم اوروں کو بھی نہیں کرنا چاہئے، ظن کے درجہ میں گنجائش ہے، باقی قطعی یقین تو کسی مجدد کا نہیں ہوا جس پر جتنا اور جس درجہ کا فضل ہو جائے، ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔"

اس سے زیادہ واضح عبارت کمالات اشرفیہ (ص ۳۰۰ ملفوظ ۱۱۸۷) میں ہے۔

ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت مجدد وقت ہیں، فرمایا کہ چونکہ نفی کی بھی کوئی دلیل نہیں، اس لئے اس کا احتمال مجھ کو بھی ہے، مگر اس سے

زائد جزم نہ کرنا چاہیئے، محض ظن ہے اور یقینی تعین تو کسی مجدد کا نہیں۔
(الحمد للہ حمداً کثیراً مبارکاً فیہ علی ہذا الاحتمال)

مسئلہ کی حقیقت اس حد تک ہے، مگر حضرت والا کے ایک معتقد خاص اور صحبت یافتہ و اجازت یافتہ باختصاص نے جن کا تعلق حضرت مولانا سے پندرہ سال رہا اور جو ماشاء اللہ خود بھی عالم و فاضل اور مشرقی و مغربی فلسفہ کے ماہر اور متعدد کتابوں کے مصنف و مترجم ہیں اور ساتھ ہی حضرت کے یمن صحبت اور فیض و برکت سے باطن کی دولت سے بھی مالا مال ہیں، حضرت کی تجدیدات اور اصلاحی کارناموں پر چار ا؎ ضخیم تالیفات ترتیب دیں اور ان میں ایسے تمام شواہد و دلائل جمع کر دیئے جن سے یہ احتمال قوی سے قوی تر ثابت ہو سکے، چنانچہ یہ کتاب اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، اس میں مولف نے حضرت والا کی ان تجدیدی اور اصلاحی کوششوں کو جو امت مرحومہ کی ہر نوع و ہر صنف کے لئے مفید ہیں پورے استقصا کے ساتھ جمع کر دیا ہے ان کو پڑھ کر خاص و عام ہر شخص حضرت کے ان اصلاحی کارناموں کو تجدیدی رنگ میں پاکر ان کے مجدد وقت ہونے کے قوی سے قوی احتمال کے ماننے پر مجبور ہو گا اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک فضل ہے کہ حضرت والا کے ان تجدیدی کارناموں پر ایک فاضل و لائق شخص نے ظن و تخمین کو قوی کرنے کے لئے شواہد و دلائل بھی یکجا کر دیئے اور یہ ایک ایسی چیز ہے جو کسی زمانہ میں کسی اور کو حاصل نہیں ہوئی، وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کسی کو یہ شبہ نہ گزرے کہ اس تحریر یا اس تالیف کا مدعا کسی شخص کی مجددیت کے دعوی کی تشہیر یا منصب تجدید کی دعوت و تلقین ہے بلکہ یہ مؤلف کی عقیدت مندانہ تعبیر ہے کہ وہ حضرت کی اصلاحی مساعی کو تجدیدات کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی اصلاحات کی خاص شان یہ ہے کہ وہ ہمہ گیر ہیں اصلاح امت کی کوشش میں علمی و عملی زندگی کے ہر گوشہ پر ان کی نظر تھی بچوں سے لے کر بوڑھوں تک، عورتوں سے لے کر مردوں تک، جاہلوں سے لے کر عالموں تک، فاسقوں سے لے

ا؎ تجدید دین کامل۔ (۲) تجدید تصوف سلوک (۳) تجدید تعلیم و تبلیغ (۴) تجدید معاشیات

کر صوفیوں درویشوں اور زاہدوں تک، غریبوںؓ سے لے کر امیروں اور دولت مندوں تک، خریداروں سے لے کر تاجروں تک، طالب علموں سے لے کر استادوں اور مدرسوں تک، غرض ہر صنف امت اور ہر جماعت کے کاموں تک ان کی نظر دوڑی، پیدائش، شادی بیاہ غمی اور دوسری تقریبوں اور اجتماعوں تک کے احوال پر ان کی نگاہ پڑی اور شریعت کے معیار پر جانچ کر ہر ایک کا کھرا اور کھوٹا الگ کیا اور رسوم و بدعات اور مفاسد کے ہر روڑے اور پتھر کو صراط مستقیم سے ہٹا دیا۔ تبلیغ، تعلیم، سیاست، معاشرت، معاملات، اخلاق، عبادات اور عقائد میں دین خالص کی نظر میں جہاں کوتاہی نظر آئی اس کی اصلاح کی۔ فقہ کے نئے نئے مسائل اور مسلمان کی زندگی کی نئی نئی ضرورتوں کے متعلق بھی اپنے جانتے پورا سامان مہیا کر دیا۔ اور خصوصیت کے ساتھ اس فن احسان و سلوک کی جس کا مشہور نام تصوف ہے۔ تجدید کی جو دنیا میں کس مپرسی میں اور ہندوستان میں بحالت غربت تھا اور جس کی تابانی پر بدعات کی ظلمت غالب آ گئی تھی، جو دوکاندار صوفیوں کے ہاتھوں کسب معاش کے فنون میں سے ایک فن کی صورت بن گیا تھا، اور جہاں اس کی تعلیم ہوتی تھی وہاں وہ یا محض چند فلسفیانہ خیالات کا مجموعہ ہو کر رہ گیا تھا یا اوراد وظائف کے ایک نصاب کا سلف صالح نے اس فن کے جو ابواب و مسائل منقح کر کے لکھے تھے وہ بالکل فراموش ہو گئے تھے۔ اور خصوصیت کے ساتھ سلوک کی حقیقت اور غایت بالکل ہی چھپ گئی تھی اور جہاں کسی قدر اس کا نام و نشان تھا وہاں علم و نظر میں وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود کی ناقص تعبیر پر اور اعمال میں صرف ذکر و فکر و مراقبہ کی چند تعلیمات پر بالکلیہ قناعت تھی، خانقاہوں میں سماع و اعراس و محافل کے سوا اس کا کوئی حقیقی مظہر باقی نہیں رہا تھا، طریقت و شریعت کو دو متقابل حریف ٹھہرا کر ان میں سے ایک کی توہین اور تحقیر کی جا رہی تھی۔

یہ تو ان کا حال تھا جو دین کے مدعی تھے باقی عوام تو ان کی زندگی دین سے خالی ہو کر رسوم و بدعات کی نذر ہو گئی تھی، مسلمان کی زندگی کے کسی گوشہ میں بھی دین اور خالص دین کا تخیل نہ تھا، اخلاق کی تعلیم اور معاملات معاشرات کی تصحیح دین کامل کے دائرہ سے باہر ہو گئی تھی۔

تعلیم جدید کی نئی آب و ہوا نے تفریح اور فرنگی مآبی کا وہ زہر پھیلا دیا تھا جس سے دینی

عقائد و اعمال کی ہر چیز پر مردنی چھا گئی تھی اور جہاں دین کا کچھ خیال زندہ بھی تھا شکوک و شبہات کی کثرت اور شدت نے اس پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔

ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے ایک گوشہ میں ایک دور بین زندہ دل مرد درویش بیٹھا ہوا مسلمانوں کے سارے احوال اور ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر نظر ڈال کر حق و باطل، نیک و بد، اور صحیح و غلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا اس کے سامنے دین کی صحیح تمثال تھی اور اس کو دیکھ دیکھ کر موجودہ مسلمانوں کی زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں وہ ان کے درست کرنے میں مشغول تھا اس نے پوری زندگی اس میں صرف کی کہ مسلم کی تصویر حیات کو اس شبیہ کے مطابق بنادے جو دین حق کے مرقع میں نظر آتی ہے۔

اس یقین کو جو مسلمانوں کے سینوں میں چودہ سو برس سے نقش تھا کہ دین ہی ان کی دینی و دنیاوی دونوں ترقیوں کا کفیل ہے، لیکن جس کو تعلیم جدید نے یورپ کی نقالی میں شک سے بدل دیا تھا اس حکیم الامتہ نے دوبارہ پیدا کیا اور بتایا کہ حقیقت میں ترقی جس کی اس وقت دم بدم پکار ہے اونچے محلوں، بھرے خزانوں، بیش قیمت لباسوں، گراں بہاں سامانوں، بڑی بڑی تجارتوں، اعلیٰ ملازمتوں، اونچی تنخواہوں، شاہانہ احتراموں، اعزازوں اور خطابوں کا نام نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کے ساتھ بلند اخلاق، شریف عادات اور پاک و صاف قلب کا نام ہے جو آب و گل سے وابستہ اور فانی کا طالب نہ ہو اور حرص و ھوا حُبّ مال اور حب جاہ کا گرویدہ نہ ہو جس میں اخلاص کے ساتھ خالق کی رضا کے لئے خلق کی خدمت کا جذبہ ہو۔

فقر و تصوف علم و فن اور تمدن و سیاست زندگی کے ہر شعبہ میں مسلان اپنی غرض و غایت اور اصول و مبادی کو چھوڑ کر ہندی و عجمی و یونانی و افرنگی تصوریات کی تقلید میں مصروف ہو گئے اور اب تک مصروف ہیں۔ اور اسی کی رونق کو اپنے کاشانہ کی عظمت جانتے ہیں، فقر و تصوف میں ہندی و یونانی تصورات جوگ و اشراق کی تقلید ہے، علم و فن میں عجمی و یونانی مذاق کی پیروی ہے، تمدن و سیاست میں ایرانی و رومی رنگ کی آمیزش ہے۔ کیا عجیب بات ہے کہ وہ دین جو قیصریت و کسروانیت کے رنگ کو مٹانے آیا تھا اسی کے نام لیوا چالیس برس کے بعد خود ہی قیصریت و کسروانیت کے رنگ میں آہستہ آہستہ ایسے رنگ گئے اس کے امراء و

حکام خلفاء راشدین کی نیابت کی جگہ قیصر و کسریٰ کی جانشینی پر فخر کرنے لگے۔ وہی تعیش وہی سونے چاندی اور ریشم و حریر اور طاؤس و رباب کی زندگی مسلمان امراء و حکام کی زندگی کا مقصد بن گیا، بیت المال ان کا ذاتی خزانہ ہو گیا اور سلطنت ان کی موروثی ملکیت جاگیرداری اور زمینداری۔ اسلامی اصول کے بجائے قیصر و کسریٰ کے طرز کی پیروی جاری ہو گئی۔

یہ تو عہد گزشتہ کا حال تھا عہد حال میں یورپ کے تمدن اور سیاست کی نقالی ہماری اسلامی سلطنتوں کا فخر ہے، ہمارے دارالسلطنتوں کے سامنے پیرس کے خاکے ہیں، ہماری خواتین کے سامنے انگلستان و فرانس کی عریانی اور رنگینی اور بے حجابی ہے، ہمارے نوجوانوں کی نگاہوں میں رقص و سرود اور ظاہری پوشاک و وضع کی اور طرز ماند و بود میں فرنگی مآبی زندگی کی کامیابی کا سب سے اعلیٰ تخیل ہے۔ غرض مسلمانوں کے دل و دماغ اور ذہن و تصور سے زندگی کی وہ غایت و حیات کا وہ مقصد جو اسلام نے پیش کیا تھا یکسر مخفی اور پوشیدہ ہے۔

علم و فن پر غور کیجئے تو ہماری قدیم تعلیم اب تک یونان کی تقویم پارینہ کی پرستش میں اور تعلیم جدید یورپین ضلالت و گمراہی خیال کی عکاسی میں مصروف ہے، اور سوائے تقلید و نقالی کے کوئی مجتہدانہ تصور ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ہمارے سامنے جب اعلیٰ تمدن اور اعلیٰ سلطنت داری کا تخیل آتا ہے تو یورپ کی ایک ایک سلطنت اپنی پوری ہوشربائی اور باطل آرائی کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے اور یہ حقیقت ہمارے سامنے سے گم ہو جاتی ہے کہ اسلام کا تصور سیاست اور تصور تمدن اور تصور علم و فن اپنا خاص ہے اور اسی کو دوبارہ پیدا کرنا اور دنیا کے سامنے لانا ہماری قومی و ملی غرض و غایت ہے۔

سلوک اور فقر و تصوف جو در حقیقت اعلیٰ دین اور اعلیٰ اخلاق کا اصطلاحی نام تھا وہ ترک عمل اور چند رسوم و رواج کا مجموعہ ہو کر رہ گیا اور پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام طرق حیات پر بدعات اور رسوم شرک و کفر کے توبر تو پردے پڑے ہیں، جن کی، بزرگوں کی متروکہ وراثت کے نام سے، ہم اب تک بقا کے درپے ہیں۔

ان حالات میں بڑی ضرورت تھی کہ اس اصلاح و تجدید کے خاکہ کو جس کو ایک مصلح وقت اپنی تصنیفات و رسائل میں سپرد کر گیا ہے اور جن پر زبان کی کہنگی اور طریق ادا کی قدامت کا پردہ پڑا ہے ان کو زمانہ موجودہ کے مذاق اور تقریر و تحریر کے نئے انداز کی روشنی

میں اجاگر کیا جائے. سلسلہ تجدیدات و اصلاحات کے نام سے چار جلدوں میں اسی خدمت کو انجام دیا گیا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچائے۔ اس وقت دنیا اور ہندوستان و پاکستان رفتار سفر کے جس موڑ پر ہے ضرورت تھی کہ عین اس وقت یہ فرض انجام پاتا، سو بحمد اللہ تعالیٰ کہ وہ عین وقت پر ایک سعادت مند قلم سے انجام پا رہا ہے۔ یہ کتابیں [۱] مسلمانوں کی حقیقی اصلاح و ترقی کے متعلق حرف اخیر کی حیثیت رکھتی ہیں. دل سربسجود ہے اور ہاتھ دعا کے لئے اٹھے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دیں کہ وہ اس آئینہ میں اپنے خط و خال کو دیکھ کر اپنی شکل کو پہچانیں اور غلط اور گمراہ دنیا کے پیرو اور مقلد بننے کے بجائے دنیا کے امام اور پیشوا بنیں اور ایک نئے تمدن. نئے طرز حیات نئے مقصد زندگی اور نئے آئین سلطنت کی بنیاد ڈالیں۔

بیا تا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم

اور اس وقت کی غمزدہ اور مصیبت سے بھری ہوئی امن کی جویا اور سکینت کی پیاسی دنیا کو امن و سلامتی کا پیغام دیں اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی تکمیل کریں جو دنیا و آخرت کی صلاح و فلاح کی کفیل ہو اور سیاست اور ملک داری کو حرص و ہوا جھوٹ اور دغا اور مکر و فریب سے آزاد کریں۔

اگر غم لشکر انگیزد کہ خوں عاشقاں ریزد من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

اسلام نے ببانگ دہل بتایا ہے اور تاریخ نے اس کی تائید کی ہے کہ حکمرانی کے استحقاق کے لئے اخلاقی جوہر لازم ہے. حب مال اور حب جاہ یہ دو لبالب زہر کے پیالے ہیں جو شربت زلال کی شکل میں حکام اور لیڈران کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں اگر کسی نے اس کی طمع میں آکر ان کو پی لیا تو نہ صرف ان کی بلکہ پوری ملت کی موت کا باعث بن جاتے ہیں. اس لئے وہ حکومت صالحہ جس کی دعوت اسلام کا آئین دیتا ہے وہ ایثار و اخلاص اور خدمت خلق کے للہی جذبات سے تعمیر پاتی ہے لیکن ان جذبات کی آفرینش اور مال و جاہ کی محبت سے قلوب کی حفاظت اس تقوی کے بغیر ممکن ہی نہیں جو قرآن سے ہدایت یابی کی پہلی شرط ہے۔

---

[۱] یعنی تجدید دین کامل۔ تجدید تصوف و سلوک. تجدید تعلیم و تبلیغ اور تجدید معاشیات

ہدی للمتقین ۔ بے انصافی، کینہ پروری، رشوت خوری، پرمٹ فروشی، دوست نوازی، بلیک مارکیٹنگ جن کی بدولت ہندوستان و پاکستان کی بنیادیں ہل رہی ہیں، وہ حاکموں اور عہدہ داروں اور وزیروں اور سوداگروں اور تاجروں اور زمینداروں اور کسانوں کی انہیں اوصاف عالیہ سے خالی اور محروم ہونے کے سبب سے ہیں اور اس کا اصل سرچشمہ اس خشیت الٰہی اور جزائے "یوم الدین" سے بیگانگی ہے جس سے قلوب تزکیہ و تصفیہ کے آب صافی سے پاک و صاف ہوتے ہیں۔

اجتماعی کاموں کو چھوڑ کر انفرادی کام بھی تزکیہ قلب اور تصفیہ اخلاق کے بغیر فوز حقیقی سے محروم رہتے ہیں، افراد کے قلوب جب تک عناد و حسد بغض و کینہ، عجب و غرور، ریا و نمائش سے خالی اور اخلاص و ایثار، توکل و اعتماد علی اللہ اور صبر و ثبات سے معمور نہیں ہوتے دنیا میں کامیابی سے اور آخرت میں اجر و ثواب سے ہمکنار نہیں ہوتے اور یہ ایسے اصول ہیں جو ایک طرف اصول و تعلیمات دین اور دوسری طرف جماعت اجتماعی و انفرادی مبادی نفسیات سے ثابت اور موید ہیں۔

شخصی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی اس کے کاموں کی غایت رضائے الٰہی کی طلب اور احکام الٰہی کی تعمیل اور اعلاء کلمتہ اللہ کے بلند تخیل کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں ہو سکتی۔ غیر فانی ملت کا مقصد حیات ایسے ہی غیر فانی مقاصد ہو سکتے ہیں ورنہ محض دنیاوی فوز و فلاح، یعنی دولت و حشمت، عیش کی زندگی اور اسباب راحت کی فراوانی اور بلند محلات اور خدم و حشم کی کثرت تو وہ پست و متبذل مقاصد ہیں جو زندگی کا فریب اور حیات انسانی کا سراب ہے۔ ذالک بان اللہ ھوالحق وان مایدعون من دونہ الباطل (ـــــ) کل شئی ما خلا اللہ باطل۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیدہ کامل

ز مغربی نظرے دام کن بدست نگر — کہ تا بدیدہ کامل کمال ادبینی

ایک پرانا مریض سر سے پاؤں تک طرح طرح کے امراض کا شکار بستر پر پڑا ہے۔ آس پاس گوناگوں تعلقات کے ہمدردوں تیمار داروں اور طبیبوں کا ہجوم ہے۔ بہت زیادہ وہ ہیں جن کو براہ راست خود مریض کی ذات اور اس کی صحت و شفا سے دلچسپی نہیں۔ البتہ اس کے نام سے ان کے جاہی و مالی ذاتی و جماعتی بہت سے منافع وابستہ ہیں، اس لئے قدرۃً اس کی برائے نام زندگی کے خواہاں ہیں، جس سے ان کا کام چلتا رہے۔ بلکہ مریض کے پوری قوت و صحت کے ساتھ اٹھ کھڑے ہونے اور پورے مالکانہ تصرفات کی صورت میں ان کے جاہی و مالی مقاصد میں رخنہ پڑجانا یقینی ہے۔ لہٰذا یہ اپنی خیریت اسی میں جانتے ہیں کہ مریض کی زندگی کا بس اتنا نام رہے کہ پڑے پڑے سانس لیتا اور ان کے کام چلاتا رہے۔

کچھ ایسے بھی ہیں جو متمنی تو مریض کی کامل صحت و قوت کے ساتھ شفایابی کے ہیں، لیکن غلط فہمی سے توجہ صرف دل و دماغ کے معالجہ پر مرتکز ہے۔ باقی جسم کے تمام ظاہری و باطنی اعضاء جوارح سے (جن سے کام لینے ہی کے لئے دل و دماغ کی صحت و قوت مطلوب ہوسکتی تھی) غفلت ہے اور وہ ناکارہ و شل ہورہے ہیں۔ ایک اور جماعت ہے جس کی توجہ کا مرکز زیادہ تر ظاہری و جسمانی اعضاو جوارح کی صحت قوت ہے کہ سوء فہم سے بظاہر عملی جدوجہد کا مدار ان ظاہری آلات ہی پر ہے۔ یہ قدرۃً دل و دماغ یا روح کی متصرفانہ اہمیت سے غافل ہیں۔ دوسرے اس جماعت کے اطبا نے محض کتابیں پڑھ کر مطب کھول دیا ہے، کسی حاذق طبیب کے پاس کچھ مدت نسخہ نویسی کی مشق سے جو ذوقی و وجدانی بصیرت نصیب ہوتی ہے اس سے بالکل محروم ہیں۔

بڑا غضب یہ ہے کہ معالج قریب قریب سب کی سب "مویشی ڈاکٹر" ہیں۔ جو انسان و حیوان میں ظاہری و جسمانی مماثلث کی بنا پر تشخیص و علاج میں انہیں اصول و تجربات سے کام لے رہے ہیں، جن کو مویشیوں یا جانوروں کے معالجہ میں کامیاب دیکھا ہے۔ مریض کی انسانی خصوصیات یا ذہنی و روحانی ممیزات کی اہمیت ان کی نظر میں کہنا چاہئے کہ اتنی بھی نہیں، جتنی ایلوپیتھ ڈاکٹروں کے مقابلہ ہومیوپیتھ کی جسمانی امراض میں ذہنی و دماغی علامات و کیفیات پر ہوتی ہے۔ بلکہ اسی طرح ان کا الٹے استہزا و استخفاف ہے، جس طرح اکثر ایلوپیتھی والے ہومیوپیتھی کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ غرض آدمی کو ظاہراً و باطناً جانور اے قرار دے کر علاج کا طریقہ و نتیجہ وہی ہے، جو گائے بیل کی دوا کو، اور اسی مقدار میں کسی انسان مریض کے حلق سے اتار دینے کا ہو سکتا ہے!

سارے مجمع میں کامل و حاذق طبیب فقط ایک ہے جس کی نظر بوقت واحد قلب و قالب دونوں کے ایک ایک مرض و معالجہ پر ہے۔ وہ مریض کی پوری قوت و صحت کے ساتھ شفایابی کا مخلصانہ دل و جان سے طالب ہے۔ خود مریض کی انسانی خصوصیات و ممیزات ہی سے آگاہ نہیں، بلکہ اس کا خاندانی معالج ہے، اس لئے خاندانی مزاج اور موروثی اثرات سے بھی خوب واقف ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ ظاہری و باطنی ذہنی و جسمانی کوئی روگ ایسا باقی نہ رہے، جو اس سے انسان کامل کے کمالات و مطالبات کے ظہور میں مخل ہو۔ نسخہ بھی ایسا مرتب کر دیا ہے، جس کے اجزاء میں تمام چھوٹے بڑے امراض کی دقیق رعایتیں ملحوظ و موجود ہیں۔ پیش کش کتاب مسلمانوں کے امراض کا یہی نسخہ ہے۔

مطلب یہ کہ جس طرح خود انسان ایک عضوی کل (Cargrmic whole) یا اعضائی

اے یہ وہ ہیں جو مغربی و فرنگی تہذیب و تمدن، علوم و فنون، انکشافات و ایجادات کی ظاہری چمک دمک اور وقتی و عارضی سیاسی و معاشی غلبہ تسلط سے مغلوب و مرعوب ہو کر یہ سمجھ بیٹھے کہ مسلمانوں کا علاج بھی یہی تعلیم و تہذیب، یہی سیاسیات و معاشیات ہے۔ حالانکہ اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انسان کو سرے سے انسان ہی نہیں بس ایک اعلیٰ درجہ کا حیوان (Taigher animal) یا بڑھیا جانور تصور کیا گیا ہے اور اس لئے قدرۃً اس تعلیم و ترقی کی نظر و توجہ تمامتر انسان کے حیوانی یا مادی رخ پر ہے۔

وحدت ہے۔ یعنی باوجود اندرونی بیرونی بڑے چھوٹے اعضاو جوارح کی کثرت کے پھر بھی سب کا مرجع و محور ایک ہی زندگی یا حیاتی وحدت ہے۔ اور یہ زندگی اپنے تمام کمال مقصد کو اسی وقت پورا کر سکتی ہے، جب کہ سارے اعضاء و جوارح اپنا اپنا کام پورا کر رہے ہوں۔ اسی طرح انسان کا دین کامل (اسلام) بھی ایک عضوی نظام ہے کہ جب تک کوئی فرد د جماعت اس نظام کے سارے اعضاد یانات و معاملات اخلاق و معاشرات تمام شعبوں میں اپنی زندگی کو اس کے قالب میں نہ ڈھال دے، اس وقت تک نہ دینی و دنیوی فلاح و صلاح کے مطلوبہ انفرادی ثمرات حاصل ہو سکتے ہیں نہ اجتماعی۔

اور جس طرح مثلاً داڑھ کے درد یا جسم کے کسی اور چھوٹے بڑے عضو کے ماؤف و متاذی ہونے سے سارا جسم درد مند و بے قرار اور بعض صورتوں میں سرے سے بے کار ہوجاتا ہے، اور زندگی اپنے مظاہر کے ظہور یا مقاصد کے حصول سے قاصر رہتی ہے، اسی طرح ایمان و عمل صالح کے کسی چھوٹے بڑے شعبہ کے ماؤف و مریض ہوجانے سے ساری دینی زندگی متاثر و متاذی ہوجاتی اور اپنے مظاہر و مقاصد کا حق ادا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ غرض جس طرح جسم کے سارے چھوٹے بڑے اعضا و جوارح باہم اس طرح پیوستہ ہیں کہ ہر ایک کی صحت و سقم کا دوسرے پر عمل و ردعمل ہوتا ہے۔ اسی طرح دین کامل کے بھی سارے ایمانی و عملی عناصر ایک ایسی غیر منفک و باہم پیوستہ وحدت ہیں کہ جب تک سب اپنی اپنی جگہ کارفرمانہ ہوں دینی زندگی بھی اپنے دینوی و اخروی مظاہر و مقاصد کی نمود و تکمیل سے عاری رہتی ہے۔

چہ جائیکہ جب دین کے سارے عقائد و اعمال ہی ماؤف و مختل ہوں، تو پھر وہ دین اتنا ہی دین ہو گا جتنا وہ آدمی جو سر سے پاؤں تک امراض کی گٹھری ہو۔ ہاتھ پاؤں جذام سے سڑگل رہے ہوں، سماعت و بصارت ختم ہو رہی ہو، دل و دماغ جواب دے رہے ہو، بس بستر پر ایک لاش پڑی ہو۔ زندہ بلاشبہ اب بھی اس کو کہا جائے گا، اور آدمی بھی کہا جائے گا، بیل بکری نہ کہا جائے گا۔ [1] لیکن کیا اس سے آدمیت یا انسانیت کے وہ اغراض و مصالح بھی پورے

---

[1] جو حضرات ایسے مسلمانوں کو مسلمان ہی نہیں کہتے ان کی غلطی واضح ہے۔ ہیں یہ بہر حال مسلمان ہی اور اس لئے آخرت میں ان کا معاملہ یقیناً و انصافاً غیر مسلموں سے الگ ہو گا۔ مومن خواہ ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کا ہو اس کے ساتھ سرے سے غیر مومن ہونے کا معاملہ کیسے درست ہو سکتا ہے!

ہوں گے جو اس کی تخلیق میں مضمر تھے۔ اسی کو حضرت مجدد وقت و معالج کامل فرماتے ہیں کہ

"جیسے آپ کسی سے کہیں کہ ہم کو ایک آدمی کی ضرورت ہے اور وہ ایسے آدمی کو چارپائی پر ڈال کر لائے جس کے اندر تمام بیماریاں موجود ہیں۔ آنکھیں بھی نہیں کان بھی نہیں ہاتھ پیر بھی بیکار ہیں عقل بھی درست نہیں البتہ جاندار ہے کہ اگر کوئی مار ڈالے تو قانون سے اس کو پھانسی ہو جائے۔ مگر کیا ایسے آدمی سے آپ کی کوئی غرض پوری ہو سکتی ہے اور آپ کہیں گے کہ اس گوشت کے لوتھڑے کو کیوں لائے ہو"؟

بس کچھ ایسا ہی بالعموم آج کل ہمارا انفرادی و اجتماعی دین و ایمان رہ گیا ہے کہ نہ عقائد صحیح نہ عبادات درست، نہ معاملات بجا، نہ اخلاق و معاشرت ٹھیک۔ اکثر افراد و جماعت میں بس ایک مبہم و مجمل ایمان کے سوا کوئی شے ایسی نہ ملے گی جس کی بنا پر مومن کو غیر مومن یا مسلم کو غیر مسلم سے ممتاز کیا جا سکے۔ حضرت کی مثالیں تو عجیب دل نشیں ہوتی ہیں۔ ایسے ایمان و اسلام والوں کو حضرت کے نزدیک مسلمان کہنا ایسا ہی ہے جیسے۔

"ایک پیسہ رکھنے والے کو مالدار کہنا، بلکہ ایسا کہنے والے کو پاگل کہا جائے گا۔ بس جب ہم دین کے بہت سے کام چھوڑے ہوں۔ تو اس حالت میں یہ دعویٰ کرنا کہ ہم مسلمان ہیں ایسا ہی جیسا ایک پیسہ رکھنے والے کا مالدار ہونے کا دعویٰ (گو وہ سرے سے بے پیسہ والا نہ سہی)

"اسی طرح خوبصورت وہ ہے، جس کی آنکھ ناک سب درست ہوں۔ اگر کسی خوبصورت کی ناک کٹی ہو تو اس کو خوبصورت کون کہے گا[1] (تسہیل المواعظ ص ۱۴)

خصوصاً جدید لادینی تاثرات و رجحانات سے مغلوب ہو کر ہمارے ایک طبقہ کا حال یہ ہو

۱۔ تاہم اس کا شمار ہو گا آدمیوں ہی میں گو بدصورت اور نکٹا آدمی سہی۔

گیا ہے کہ غفلت و جہالت کی بناء پر نہیں جان بوجھ کر بلاتحقیق و تفکر عقلیت و اجتہاد کے دعویٰ کے ساتھ دینی مسلمان کی جگہ قومی مسلمان بن گیا ہے جس کا اصل پیش نہاد اپنے فرنگی استادوں کی طرح انفرادی یا اجتماعی مادی ترقی و تعیش یا سیاسی و معاشی غلبہ و تسلط ہے۔ یہ قومی مسلمان نہ پورے اسلامی عقائد و ایمانیات کا قبول کرنا ضروری جانتے ہیں، نہ سارے اسلامی دیانات و عبادات کی پابندی لازم ہے۔ معاشیات کا تو گویا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ بس اتباع ہوا اور اعجاب رائے کے زور میں ایمان و عمل کی جو بات مرضی و مطلب کے موافق نہ ہوئی بے تکلف کہہ دیا کہ کیا مسلمان ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے۔ ان کا اسلام بالکل مولانا روم کی مشہور حکایت والا شیر ہو گیا ہے جس کو اکثر حضرت علیہ الرحمہ نقل فرمایا کرتے تھے کہ

"ایک شخص بدن گودنے والے کے پاس گیا کہ میری کمر پر شیر کی تصویر بنا دو۔ اس نے سوئی لے کر ایک طرف کو چا دیا اس نے کہا ہائے مر گیا کیا بناتا ہے۔ کہا دم۔ کہا کہ کیا بے دم کا شیر نہیں ہوتا۔ اس نے چھوڑ کر دوسری طرف سوئی کا کوچا دیا۔ دریافت کیا کہ اب کیا بناتا ہے۔ کہا کان۔ کہا کیا بوچے شیر نہیں ہوتے۔ اس نے تیسری طرف سوئی کا کوچا دیا۔ پوچھا اب کیا بناتا ہے۔ کہا پیٹ۔ کہا کیا یہ کھاوے گا۔ اس نے چوتھی طرف کوچا دیا دریافت کیا اب کیا بناتا ہے۔ کہا سر۔ کہا بے سر کا بھی تو بن سکتا ہے۔ اس نے سوئی پھینک کر کہا۔

شیر بے گوش و سر و دم شکم کہ دید ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید

تو واقعی اس قسم کا شیر خدا نے بھی نہیں پیدا کیا ہے اور نہ اس قسم کا اسلام عطا کیا ہے کہ جس ایمان و عمل کو چاہو چھانٹ دو اور پھر شیر اسلام بنے رہو! اسلام کی تو لفظی و معنوی حقیقت ہی یہ ہے کہ وحی و نبوت یا خدا کے حکم و حکمت کے مقابلہ میں بندہ اپنی رائے وہوا یا عقل و خواہش سے دست بردار ہو جائے۔ مرد مومن کی زندگی آفاق و انفس دونوں کے خلاف پیہم "اصغر و اکبر" جہاد ہے۔ جس کا کام توپ و تفنگ کے لئے سینہ سپر رہنا ہو وہ

سوئی کے کوچوں کو کیا خاطر میں لاسکتا ہے۔ ورنہ پھر شیر اسلام بننے کا حوصلہ بے معنیٰ ہے۔

چون نداری طاقت سوزن زدن　　بس تواز شیرزیاں ہم دم مزن

دنیا میں تو اگر مارکس اور لنین بھی کسی خاص سیاسی و معاشی اصول پر تصور۔ (ائیڈیالوجی) کا علم بلند کریں اور اس کی حکومت قائم کرنا چاہیں تو اس کے خلاف افراد کو ذاتی و شخصی رائے و خواہش کا علم بغاوت بلند کرتے رہنے کا حق نہیں۔ لیکن مسلمان بنے رہنے کے لئے نہ ایمان و عقیدہ کے کوئی خاص تصورات (یا ائیڈیالوجی) قبول کرنا ضروری ہے، نہ احکام و اعمال کے کسی خاص ضبط و ضابطہ (ڈسپلن) کے ماتحت رہنا لازم۔ نہ اس کے میدان کارزار یا چھوٹے بڑے جنگ و جہاد کے سپاہیوں کی کوئی خاص وضع و قطع یا وردی، جس فرد کا جو وردی جی چاہے پہن لے، جو ترمیم احکام و ضوابط میں چاہے کر ڈالے، اور جو ایمان و عقیدہ چاہے اختیار کرلے۔

غرض پرانے مسلمان اگر اپنی غفلت و جہالت سے نام کے مسلمان رہ گئے ہیں، تو یہ نئے قومی مسلمان تحقیق و اجتہاد کے دعوے کے ساتھ "بے گوش و سر دم اشکم" کے شیر بنے رہنا چاہتے ہیں جس سے شیر نستیاں" کے آثار و اوصاف تو کیا ظاہر ہوتے "شیر قالین" کی تصویر بھی نہیں مکمل ہوتی۔

کوئی مشین اسی وقت تک خوبی کے ساتھ چلتی اور اپنا مقصد پورا کرتی ہے، جب تک اس کے اکثر و اہم پرزے اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہوتے اور اپنا اپنا کام خوبی سے انجام دیتے۔ کسی ایک آدھ پرزے میں کوئی اتفاقی خرابی اگر رونما بھی ہوتی ہو تو صرف اس کے درست کر دینے سے کام چل جاتا ہے۔ لیکن جس مشین کے سارے چھوٹے بڑے پرزے فرسودہ و زنگ خوردہ ہو رہے ہوں، اس کو جب تک از سر نو کھول کر ایک ایک پرزے کی جانچ پڑتال اور پوری صفائی و درستی (اورہالنگ) نہ ہو محض ایک آدھ بڑے چھوٹے پرزے کو ٹھیک کر دینے سے کام نہیں چل سکتا نہ ایسی مشین اپنے اصل مقصد کے اعتبار سے کار آمد و کارگر رہ جاتی ہے۔

ہماری ملی و اسلامی زندگی کی مشین کا یہی حال ہوگیا ہے، کہ ایمان و عمل صالح کے اکثر و

اہم پرزے کار گر یا چالو نہیں رہ گئے ہیں۔ نہ ظاہر درست نہ باطن نہ عقائد صحیح نہ اعمال، نہ خالق ہی سے تعلق بجانہ مخلوق سے۔ غرض نہ انفرادی زندگی میں مسلمان ہونے کا کوئی امتیازی وجود، نہ اجتماعی زندگی میں بس زیادہ سے زیادہ زبان و قلم پر اسلام اسلام کا نام ہے۔ جس انجن کے سارے پرزے فرسودہ و زنگ خوردہ اور صفائی و درستی کے محتاج ہورہے ہوں۔ وہ خالی انجن انجن کی رٹ لگانے یا کسی ایک آدھ پرزے کو کچھ بنادینے سے کیسے چلنے لگ سکتا ہے۔ ہمارے مصلحین جن میں بعض مخلصین بھی شامل ہیں اکثر اسی غلطی میں گرفتار ہیں کہ ان کی اصلاحی و احیائی نظر پورے اسلام یا "الیوم اکملت لکم دینکم" والے کامل دین پر نہیں۔

حاصل یہ کہ دنیا کا کوئی بھی نظام ہو خواہ میکانکی (Mucanceal) خواہ عضویاتی (Organic) یا کوئی اور جب تک اس کے اہم و اکثر اجزا و اعضا درست و تندرست نہوں نہ بحیثیت نظام وہ اپنا مقصد پورا کر سکتا ہے، نہ وظیفہ حیات جاری رکھ سکتا ہے۔

اسلام بھی دنیا و آخرت کی فانی و باقی زندگی کا ایک مستقل و مکمل نظام ہے۔ آخرت کا ذکر ہی کیا کہ وہ اصل دین بلکہ عین دین ہے۔ لیکن یہ آخرت دراصل چونکہ نام ہے دنیا ہی کی زندگی کے نتیجہ و انجام کا، اس لئے آخرت کی کامل خیر و فلاح کے ساتھ اور اس کے ماتحت دنیا کی بھی انفرادی و اجتماعی راحت نہ عزت کی اس نظام زندگی میں قطعی ضمانت ہے۔ اور یہ کوئی حدیث و فقہ کا استنباطی مسئلہ نہیں۔ خود قرآن کی صریح و منصوص آیت اور خدائے قرآن کا حتمی وعدہ ہے۔ جس کے متعلق ضمانت ہے کہ "عورت و مرد جو فرد بھی ایمان و عمل صالح کا حق ادا کرے گا اس کو ہم ضرور بالضرور دنیا میں مزیدار زندگی عطا کریں گے۔ [1]" اسی طرح اجتماعی زندگی میں کسی قوم و جماعت کی سب سے بڑی کامیابی و عزت زمین کی فرمانروائی و حکومت ہے اور ہمارے قومی مسلمان سب سے زیادہ اسی کے لئے جیتے مرتے ہیں۔ ارشاد ہے کہ

---

[1] من عمل صالحامن ذکراوانثی وہو مومن فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ

اس حیات طیبہ کی حقیقت اسی عنوان سے تجدید تصوف میں ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہے۔ جو شائع ہو چکی ہے۔

"جن لوگوں نے ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کی اللہ تعالیٰ کا ان سے اٹل وعدہ ہے کہ ان کو زمین کی خلافت یا فرمانروائی دے کر رہے گا۔ (۱) " اسی کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ضمانت کی اس قوت کے ساتھ وعدہ فرمایا کہ "اگر صرف ایک بات مان لی جائے تو وہ ایسی ہے کہ عرب و عجم سب کو جھکا دے۔ یہ ایک بات کیا تھی وہی لاالہ الا محمد رسول اللہ جو ہمارے اسلام کی جڑ بنیاد ہے اور جس سے ہماری غفلت کا یہ عالم ہے کہ کروڑوں مسلمانوں کی گنتی کے یہ چار حرف یاد تک نہیں، اور جن کو یاد بھی ہیں، وہ اس کو بس ایک منتر کی طرح دھراتے ہیں۔ حالانکہ یہ چار لفظی کلمہ (جیسا کہ آگے اسی کتاب میں معلوم ہو گا) ایمان و عمل صالح کی ساری اسلامی تعلیمات کی جڑ بنیاد اور قوت و طاقت کا ایسا میگزین ہے، جس کے سامنے مادی طاقت کا کوئی بڑا سے بڑا پہاڑ بھی کھڑا نہیں رہ سکتا۔

غنیمت ہے کہ نئے پرانے کوئی مسلمان ابھی اتنے بیباک مسلمان نہیں ہوگئے ہیں کہ اپنے خدا یا اس کی کتاب کو زبان کھول کر (معاذ اللہ) جھوٹا یا غلط کہہ دیں۔ پھر جب قرآن اور اس کا خدا سچا اور یقیناً سچا ہے تو "استخلاف فی الارض" کے وعدے کے بالکل خلاف یہ کیا انقلاب ہے کہ کم و بیش ساری روئے زمین پر کم و بیش ہزار سالہ "استخلاف" کے بعد اب صدیوں سے روز بروز اس کا رخ زوال ہی کی طرف ہے۔ جہاں جو کچھ حکومت رہ بھی گئی ہے ایمان و عمل صالح کے بل بوتے پر نہیں، محض غیروں کی مصلحت و حکمت کے طفیل و ماتحت یہی نہیں ذرا عبرت سے اپنی تاریخ کے اوراق دہرائیں، تو صاف دیکھ سکتے ہیں کہ جس نسبت سے ایمان و عمل صالح میں اختلال و زوال آتا گیا، اسی نسبت سے ہماری خلافت ارضی بھی اختلال و زوال سے دوچار ہوتی گئی۔ اور ایمان و عمل صالح کے ہمہ گیر و ہمہ جہتی اختلال و زوال کے بعد جہاں کہیں بھی قدم کچھ زمین پر ٹکے ہیں وہی دوسروں کی مصلحت و حکمت عملی کے صدقہ میں۔

---

۱ ۔ عربی:۔

پھر آخر اس کا علاج؟

مرض کی ذرا یہ تفصیل. اور تشخیص سب سبب تدبیر و علاج ہی کے لئے تھی۔ اور جس طرح سب مرض اصلاً ایک ہی ہے۔ ایمان و عمل صالح کے ہر شعبہ میں ضعف و زوال. خلل و انتشار. اسی طرح تدبیر علاج بھی ایک ہی ہے۔ ہمہ جہتی و ہمہ گیر اصلاح. جس کو اوپر کسی مشین کی از سر نو درستی (اورہالنگ) سے تعبیر کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے انفرادی و اجتماعی نظام زندگی کی پوری مشین کھول کر اس کے ایک ایک پرزے کی جانچ پڑتال کر کے از سر نو سب کی درستی و صفائی کر کے اس نظام کو پھر سے کارگر و کار آمد بنایا جاسکتا ہے۔

یہ اورہالنگ یا کامل و جامع نظام دین کی کامل و جامع اصلاح یا باصطلاح حدیث تجدید (۱) کی خدمت بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس عہد میں مجدد وقت (مولانا تھانوی) علیہ الرحمہ کے ہاتھوں پر پوری فرمائی گئی ہے۔ اور اس بنا پر حضرت کو بلا کسی شائبہ مبالغہ و آمیزش عقیدت جامع المجددین کہنا ایک نفس الامری واقعہ و حقیقت کا اظہار ہو گا۔ اور اس حیثیت سے حضرت کی سینکڑوں کتابوں اور ہزاروں مضامین کی طرف رجوع کئے بغیر بھی جو کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے اور اس کے بعد (تجدید تصوف و سلوک" پھر "تجدید تعلیم و تبلیغ" اور آخر میں تجدید معاشیات و سیاسیات کے صرف چند سو صفحات ہی کا اگر بلا اعتقاد و بلا انتقاد خالی الذہن ہو کر مطالعہ فرمالیا جائے تو انشاء اللہ از خود پکار اٹھیں گے کہ یہ جامعیت بجز حضرت جامع المجددین کے نظام تجدید کے اور کہیں موجود نہیں۔ حضرت کی اصلاحات و تجدیدات دینی زندگی کے بلا استثنا تمام ابواب (عقائد و عبادات. معاملات و معاشرات. اخلاق و کردار. ظاہر و باطن) سب کو جامع و محیط ہیں۔

۱۔ اورہالنگ کا لفظی مفہوم بھی تجدید ہی ہے یعنی از سر نو نیا کر دینا۔

اس علاج کی طرف مختلف دل نشین عنوانات سے جابجا خود حضرت نے متوجہ فرما ہے۔ مثلاً ایک وعظ میں خصوصاً جدید طبقہ کی شکایت فرماتے ہوئے ارشاد ہے کہ۔

"انہوں نے اسلام کو بالکل ہی نہیں سمجھا کیونکہ اسلام کا مقصود کامل نجات ہے۔ اور وہ حاصل ہوتی ہے۔ کامل اسلام سے۔ جیسے مالداری سے مقصود عیش و آرام ہے اور وہ حاصل ہوتا ہے۔ خوب مالدار ہونے سے۔ نہ کہ پیسہ دو پیسے ہونے سے"۔ ایک اور موقع پر شکایت ہی کے طور پر فرماتے ہیں کہ۔

"ہمارے بھائیوں نے اعمال کا بھی ست نکالا ہے۔ مگر ست کا ست نہیں نکلا کرتا۔ دین تو سارا کا سارا خود ہی ست ہے۔ اس کا ہر جز ضروری ہے۔ اب آپ دوبارہ اس کا ست نہیں نکال سکتے۔ ورنہ وہ ست نہ ہو گا اصل اجزا کا فوت کرنا ہو گا......

ست اس چیز کا نکالا جاتا ہے جس میں کوئی فضول چیز ہو۔ اسلام کے اوامر و نواہی میں معاذ اللہ کیا کوئی فضول چیز ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام کو خیال ہوا کہ اگر اونٹ کا گوشت نہ کھاؤں تو اسلام کے خلاف تو ہو گا نہیں کیونکہ کھانا فرض تو ہے نہیں اور توریت پر عمل بھی ہو جائے گا۔ جس میں اونٹ کا گوشت کھانا منع ہے۔ اس پر یہ آیت اتری "یاایہاالذین امنوا ادخلو فی اسلمہ کافتہ" کہ مسلمانو مسلمان پورے ہو ادھورے نہیں۔ اسلام کی حلال کی ہوئی چیز سے پرہیز کرنا دراصل ایمان کا نقص ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی ہلکی سی بھی چیز چھوڑنے کے قابل نہیں پھر اس کا ست کیسے نکل سکتا ہے"

(تہسل المواعظ ص ۱۸)

غرض مسلمانوں کو اگر اسلام کی دینی و دنیوی برکات سے متمتع ہونا ہے تو ایمان و عمل صالح کے پورے نظام اسلام کو قبول کرنا اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس کے قالب میں از سر نو ڈھالنا ہی اس کا واحد علاج و تدبیر ہے۔

راقم احقر کو یوں تو حضرت علیہ الرحمہ کی جوتیوں سے کم و بیش پندرہ سال تعلق کی سعادت نصیب رہی اور تعطیلوں میں یاد نہیں کہ کسی سال اس کی سعادت سے محروم رہا ہوں۔ مسلسل مہینوں کی بھی حاضری نصیب رہی۔ گوناگون فضائل و کمالات کو آنکھوں سے دیکھا اور معتقد رہا، مجدد ہونے کا بھی سرسری اعتقاد تھا۔ لیکن ذہن میں اس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی اور نہ اس نظر سے کبھی حضرت کی کتابیں پڑھیں، اور پڑھیں بھی بہت کم تھی بلکہ سچ یہ ہے کہ حضرت کی زندگی خود اتنی بڑی زندہ کتاب تھی کہ کسی اور طرف نظر بھر کر دیکھنے کا جی ہی نہ چاہا۔ وفات کے بعد حضرت کی "مجددیت" پر ایک مضمون لکھنے کا خیال ہوا۔ اس خیال کو محب و محسن قدیم مولانا عبدالماجد دریا بادی سلمہ نے بھی پسند فرمایا اور وقتاً فوقتاً یاددہانی فرماتے رہے۔ تاہم دوران ملازمت میں یہ خیال خیال ہی رہا۔ ختم ملازمت پر جب لکھنے بیٹھا تو بھی ایک مضمون سے زیادہ کا ارادہ نہ تھا، لیکن جب اس نظر سے حضرت کی کتابیں پڑھنا شروع کیں، تو بلا مبالغہ یہ معلوم ہوا کہ نادانستہ کسی سمندر میں کود پڑا ہوں، جس کی نہ گہرائی کی کوئی تھاہ ہے اور نہ پہنائی کا کوئی ساحل اور صرف (مجددیت) کا کیا ذکر جامع المجددین ہونے کا واقعہ دن دوپہر کا ایک ایسا مشاہدہ تھا، جس کو نہ دیکھنے کی صورت بجز "شپرہ چشمی" کے اور کوئی تھی نہیں۔ خلاصہ یہ کہ مضمون پھیلتے پھیلتے کتاب بنا اور کتاب چار کتابیں۔ اور پھر بھی "دامان نگہ تنگ گل خس تو بسیار" کا معاملہ رہا کہ کیا لکھوں کیا چھوڑوں۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی راسخن پایاں

اسی سلسلہ میں مشہور حدیث تجدید پر بھی غور کیا، کہ "اللہ تعالیٰ پر ایسے شخص کی بعثت فرماتا رہتا ہے، جو امت کے لئے اس کے دین کی تجدید کر دیتا ہے" یعنی نوپیدا مفاسد کی اصلاح کر کے دین کو ازسرنو نیا اور تازہ کر دیتا ہے۔ اصل الفاظ یہ ہیں ان اللہ یبعث فی امتی علی راس کل مائۃ من یجدد لہا دینہا۔

دین کی تکمیل و تحفظ کے بعد نبوت کا ختم ہو جانا بالکل قدرتی امر تھا جب دین کا ہر جہت سے اور ہمیشہ کے لئے اکمال و اتمام فرما دیا گیا اور قیامت تک حفاظت کی ضمانت بھی فرمائی گئی تو ظاہر ہے کہ اب کسی نئی وحی و نبوت کی کیا ضرورت رہی۔ البتہ ایک ضرورت رہ جاتی ہے۔

امتداد زمانہ سے بشری فطرت. نفس و نفسیات اور اتباع ہوا وغیرہ خارجی عوامل کی بدولت کامل و محفوظ دین کے احکام و تعلیمات کی فہم و تفہیم اور اجرا و عمل میں طرح طرح کے خلل و فساد کا لاحق ہوتے رہنا ناگریز تھا۔ کوئی چہرہ بجائے خود حسن و جمال کے خواہ سارے صفات کمال سے متصف ہو۔ مگر خارجی و عارضی گرد و غبار اس کو بھی مکدر کر ہی دیتا ہے جس سے صاف کرتے رہنا وقتاً فوقتاً ضروری ہوتا ہے۔

دین کامل کے چہرہ کمال و جمال سے اسی گرد و غبار کو جھاڑتے رہنے کے لئے بعثت انبیاء کو ختم کرنے کے بعد بعثت مجددین کا صدی بصدی سلسلہ جاری فرمایا گیا تاکہ طالبان حق کو کج رویوں سے بچ کر صراط مستقیم ہمیشہ ملتی رہے اور ضالین و مغضوبین کی گمراہیوں سے محفوظ رہیں۔ خیر القرون سے جتنا بعد بڑھتا جاتا ہے دینی کجراہیاں اور فتنے بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہر عہد میں وقت کی کجراہیوں اور گمراہیوں سے محفوظ رہنے کی اسلم واہون راہ مجدد وقت کو معلوم کرنا اور اس کی تجدیدات وقت کی پیروی کرنا ہے۔ اسی میں سلامتی ہے۔

البتہ نبی اور مجدد میں ایک فرق ہے۔ کہ نبی وقت پر ایمان نفس نجات و مغفرت کے لئے لازم ہے۔ بخلاف اس کے مجدد وقت کی یافت و پیروی پر نجات موقوف نہیں۔ وہ تو انشاء اللہ خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان کے بعد مرتب کر ہو ہی جائے گی لیکن دین کے اصل و پاک صاف سرچشمہ تک پہنچنا اس کی کامل و بے غبار تعلیمات کو سمجھنا اور ان پر عمل کی دینی و دنیوی برکات و ثمرات کا پوری طرح حاصل ہونا. اس کے لئے البتہ مجدد وقت کا پانا اور اس کا دامن تھامنا لابد ہے۔ بشری لغزشیں اس سے بھی ہوں گی لیکن دیگر علماء و محققین کے مقابلہ میں نسبتاً بہت کم۔ اس لئے مجدد وقت کی تجدید و تحقیق کا قبول و اتباع اسلم و احوطہ ہر حال میں ہوگا۔ کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی عہد میں خاص طور پر اسلامی احکام و تعلیمات کے احیا و تجدید ہی کے لئے مبعوث فرمایا گیا ہو. اس کے علم و فہم کی یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص طور پر تائید بھی ہوگی۔

غرض بعثت مجددین ختم نبوت کی کتاب کا ایسا ناگریز ضمیمہ ہے. جس کے بغیر اس کتاب کا ختم سمجھنا ہی دشوار ہے۔ اور نہ عقیدہ ختم نبوت کی اس دشواری کو آسانی سے حل کیا جاسکتا ہے۔ کہ جب معمولی عقائد و اعمال ہی میں اختلال نہیں بلکہ کفر و شرک تک کے دینی مفاسد

ہر زمانہ میں نئے نئے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور روز افزوں ہیں. تو پھر آخر نبوت کی ضرورت کیسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔ ایسی باتوں کا سہارا پکڑ کر خود امت مسلمہ میں وقتاً فوقتاً بہت سے متنبّی کھڑے ہوتے رہے۔

• بہر حال جن اہل علم و بصیرت حضرات کی نظر حدیث تجدید کے منفرد مدعا پر ہے. وہ جان سکتے ہیں کہ وقت کی سب سے بڑی دینی و اسلامی خدمت تجدید یافتہ پیغام اسلام کی اشاعت ہے۔ یوں تو ختم نبوت کے بعد سے برابر اس تجدید دین اور بعثت مجددین کا سلسلہ اسی طرح جاری ہے. جس طرح ختم نبوت سے پہلے انبیا علیہم السلام کی بعثت کا تھا۔ نیز ختم نبوت کے بعد ہی سے تعلیمات دین میں طرح طرح کے مفاسد کی راہ یابی ہر مابعد کی صدی میں ماقبل سے جس طرح بڑھتی گئی وہ بھی معلوم و مسلم ہے۔ اور اب تو طول و عرض و عمق. دین کے سارے ابعاد میں یہ مفاسد اس طرح سرایت کر گئے ہیں کہ مشکل سے عقائد و اعمال کا کوئی گوشہ و ریشہ ان سے محفوظ رہا ہو گا۔ اس لئے لازماً اب تجدید دین کے لئے ایسے ہی جامع مجدد کی بعثت کا وقت تھا. جس کی تجدیدات ساری کجراہیوں اور گمراہیوں کی تسدیدات پر حاوی ہوں۔

حضرت مجدد وقت کی اس جامعیت کا اندازہ حضرت کی قریباً ساڑھے بارہ سو (۱) کتابوں کی وسعت اور ان کے مطالعہ سے بخوبی فرمایا جا سکتا ہے۔ دین کے سارے ایمانی و عملی ابواب و احکام کا کوئی چھوٹا بڑا جز جو ذرا بھی اصلاح طلب و محتاج تجدید رہا ہو ایسا نظر نہ آئے گا جو جامع المجدد دین کی جامع نظر سے نظر انداز ہوا ہو۔ اہل حضرات کو وقت کی اس اہم واقدم خدمت کی طرف متوجہ نہ پا کر اس نااہل راقم نے اپنی بساط بھر ہزار ہا صفحات کی چند سو صفحوں میں سمیٹنے کی سعی میں یہی پیش نظر رکھا ہے کہ اس جامع و ہمہ گیر تجدید کے کم از کم نمایاں خط و خال ایک ہی مرقع میں نظر آ جائیں۔

یوں تو ہر شعبہ میں مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اپنی اپنی رائے و راہ کے مطابق کام کر

۱۔ جن میں کچھ غیر مطبوعہ بھی ہیں۔ اور ایک طرف اگر ان میں دو ورقے رسائل شامل ہیں تو دوسری طرف بڑی بڑی ضخیم کتابیں اور کلاں تقطیع کی سولہ سو صفحات سے زائد کی تفسیر بیان القرآن بھی شامل ہے۔

رہی ہیں، لیکن چونکہ اکثر صورتوں میں اسلام کے اصل اصول و تعلیمات اپنی بے غبار اور صاف ستھری تجدید یافتہ شکل میں سامنے نہیں، اس لئے قدرۃً فکر و عمل کے تیر زیادہ نشانہ سے باہر ہی گرتے ہیں۔ عہد بعہد تجدید دین کی یہی بڑی حکمت و مصلحت تھی کہ دنیا کا آخری دین ہر عہد کے نوپیدا مفاسد سے پاک ہو کر اپنے اصل جمال و کمال کے ساتھ تر و تازہ صورت میں سامنے موجود رہے تاکہ کم سے کم مخلص اہل طلب دین کی طلب و خدمت میں نادانی سے ترکستان کی راہ پر نہ چل پڑیں۔ اور غیر مخلصین پر اتمام حجت ہو۔

بااین ہمہ اس پر اصرار بالکل نہیں کہ حضرت کی تعلیمات و اصلاحات کو قبول کرنے کے لئے حضرت کے لئے منصب تجدید کا قبول و تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ تو بالکل ایسا ہی کسی فن کی کتاب کے مصنف کو اس فن کا عالم اور فن کی جامع کتاب کے مصنف کو جامع الفن کہہ دیا جائے۔ لیکن نفس کتاب سے نفع حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ مصنف کا نام تک معلوم ہو۔ حضرت کو مجدد یا جامع المجدد دین کہنے کی بھی یہی حیثیت ہے کہ حضرت کی اصلاحات و ہدایات کی نوعیت تجدیدی اور تجدیدی جامعیت کی ہے۔ البتہ اہل ایمان کے لئے حدیث تجدید کی تصدیق و توثیق میں ذوق ایمان ضروری ہے۔ نیز کمال اسلام کی دید کے لئے کسی حقیر سے حقیر مومن کو بھی اگر کوئی دیدۂ کامل میسر آگیا ہو تو ایمان کا تقاضا ہے کہ دوسرے ایمانی بھائیوں کو بھی یہ مستعار عینک پیش کر دے۔ بس اصل مدعا اس پیش کش مرقع کا حضرت کے دیدۂ کامل کے ذریعہ دین کامل کی ایک جھلک سامنے کر دینا ہے

ع کہ تا بدیدۂ کامل کمال او بینی

ورنہ خود حضرت کے نزدیک یہ بھی کسی کا مجدد ہونا کسی قطعی دلیل سے معلوم و ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ظنی دلائل کی بنا پر ظن یا غلبہ ظن حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ "ایک صاحب نے دریافت کیا کہ کیا مجدد کا مجدد ہونا کسی دلیل قطعی سے معلوم ہوتا ہے فرمایا کہ نہیں دلائل ظنیہ ...... یعنی علامات و آثار سے" ایک اور مولوی صاحب نے ہمت کر کے یہ سوال کر دیا کہ

"کیا حضرت مجدد وقت ہیں۔ فرمایا احتمال تو مجھ کو بھی ہے۔
مگر اس سے زائد نہیں۔ جزم اوروں کو بھی نہ کرنا چاہئے۔

ظن کے درجہ میں گنجائش ہے۔ باقی قطعی یقین تو کسی مجدد کا
نہیں ہوا۔ جس پر جتنا اور جس درجہ کا فضل ہو جائے۔
ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم (۱)"

تفصیل الدین نام وعظ میں حضرت نے مجدد دین کی ضرورت و بعثت کی ایک بڑی مفید تمہید کے ساتھ خود کچھ تفصیل فرمائی ہے. جو مع تمہید قابل ملاحظہ ہے فرماتے ہیں کہ

"دین کی تفصیل و توضیح کے لئے حق تعالیٰ نے حضورؐ کے بعد
ہر زمانہ میں حاملان دین کو پیدا فرمایا. جو برابر اس کی توضیح
کرتے رہے۔ حتیٰ کہ خیر القرون کے ختم تک (یعنی قرن
ثالث پر جو تبع تابعین کا زمانہ ہے اور جملہ ائمہ و مجتہدین اس
زمانہ میں ہوئے ہیں) ضروری تفصیل و توضیح اللہ تعالیٰ نے
پوری کر دی۔

"لیکن دو مرتبے باقی رہ گئے۔ کہ ایک تفریع کہ قیامت تک
انہیں اصول پر حوادث جزئیہ کی تفریع کرتے رہنا۔ یہ کام علم
و فہم کا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اجتہاد مطلق کو ختم فرما دیا، نہ
اس وجہ سے کہ خداوند کریم کی رحمت معاذ اللہ ختم ہو گئی. بلکہ
اس لئے کہ خداوند تعالیٰ کا قاعدہ ہے اور اس کی عادت مستمرہ
ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی اس کو ختم فرما دیتے
ہیں۔ اس عادت کے موافق چونکہ حضرات مجتہدین کے بعد
اجتہاد کی ضرورت نہ رہی تھی اس لئے اس کو ختم فرما (۲)
دیا۔ البتہ تفریع کی ضرورت قیامت تک رہے گی۔ اس لئے

۱۔ (الافضات یومیہ ص ۴۶۹ حصہ چہارم۔

۲۔ جس طرح حدیث کی جمع و تنقیح کے لئے اب امام بخاری و امام مسلمہ رحمتہ اللہ علیہ جیسے آئمہ حدیث کی ضرورت نہیں رہی۔ اس لئے اب ایسے مجتہدین و محدثین کا پیدا ہونا بے ضرورت اور فالتو ہوتا۔

اتنا اجتہاد اور اتنا فہم قیامت تک کے لئے باقی ہے. جس سے
مجتہدین کے اصول پر علماء جزئیات کو متفرع کرتے رہیں" ۔

اس کے بعد مجدد دین کی ضرورت ملاحظہ ہو کہ

"دوسرے اس کی بھی ضرورت باقی ہے کہ ہر زمانہ میں حق کو
باطل سے ممتاز کر دیا جائے کیونکہ زمانہ نبوت سے بعد ہو
جانے کی وجہ سے بعض دفعہ حق و باطل مختلط ہو جاتا ہے
خواہ عوام کی بے تمیزی یا اہل غرض علماء کی وجہ سے۔ تو ایسے
وقت میں حق تعالیٰ کسی ایسے مقبول بندہ کو پیدا فرماتے ہیں، جو
حق کو باطل سے ممتاز کر کے صراط مستقیم کو واضح کر دیتا ہے۔
یہ درجہ تجدید ہے. جس کے متعلق حدیث میں پیشین گوئی
ہے۔ ان اللہ یبعث فی امتی علی راس کل مائۃ من یجدد لھا
دینہا کہ حق تعالیٰ میری امت میں ہر سو برس کے بعد ایک
ایسے شخص کو مبعوث فرماتے ہیں جو دین کی تجدید کر دیتا
ہے۔ یعنی حق کو باطل سے ممتاز کر دیتا ہے۔ چنانچہ حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر صدی پر کوئی نہ کوئی مجدد ضرور
ہوا ہے۔

"تو یہ دو درجے اب بھی باقی ہیں اور قیامت تک باقی
رہیں گے۔ ایک تفریع ایک تجدید اور یہ دونوں خدمتیں الگ
الگ ہیں۔ اور اگر کوئی اللہ کا بندہ دونوں کا جامع ہو تو یہ خدا
کی رحمت ہے۔

وعظ کے جامع مخدوم محترم مولانا ظفر احمد صاحب نے حاشیہ پر تحریر فرمایا ہے کہ
"حضرت حکیم الامت و مجدد ملت کو یہ جامعیت بھی حاصل ہے۔ اور حضرت مولانا گنگوھی
رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ اجل مشہور و معروف عارف و بزرگ مولانا محمد یحییٰ رحمتہ اللہ کا یہ
قول نقل فرمایا ہے کہ پہلے میں اپنے شیخ مولانا رشید احمد قدس سرہ کو مجدد خیال کرتا تھا پھر

انہوں نے صدی کے خاتمہ پر انتقال فرمایا اور اب میرے نزدیک موجودہ صدی کے مجدد حضرت مولانا اشرف علی ادام اللہ فیوضہ ہیں"۔ اور حضرت کی بکثرت تصانیف و مواعظ وغیرہ کی بنا پر جس طرح دین کے ہر شعبہ میں حق کا امتیاز و ایضاح ہوا ہے اس کی بناء پر اور بھی بہت سے مقبولین اور اہل اللہ کا یہی خیال ہے کہ حضرت مجدد وقت ہیں"۔ (وعظ تفصیل الدین ص۵)۔

بظاہر ایک عجیب بات یہ ہے کہ اصولاً تو کسی کا مجدد ہونا دلائل قطعیہ سے ثابت نہیں کیا جا سکتا، اسی بنا پر حضرت نے خود اپنے کو مجدد سمجھنے سمجھانے کی "درجہ احتمال و ظن" سے زائد اجازت نہیں دی تاہم اللہ تعالیٰ نے جو کثیر تجدیدی خدمات حضرت سے لی ہیں ان کا ذکر تجدید ہی کے عنوان و نوعیت سے بارہا فرمایا مثلاً ایک موقع پر ارشاد ہوا کہ

> "طریق بالکل مردہ ہو چکا تھا۔ لوگ بے حد غلطیوں میں مبتلا تھے۔ بحمد اللہ اب سو برس تک تو تجدید کی ضرورت نہیں رہی۔ اگر خلط ہو جائے گا تو پھر کوئی اللہ کا بندہ پیدا ہو جائے گا۔ ہر صدی پر تجدید کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس مدت کے بعد نری کتابیں ہی کتابیں رہ جاتی ہیں۔ اب تو خدا کا فضل ہے کہ وضوح ہو گیا۔ اور کتابیں فی نفسہ تو کافی ہیں۔ مگر لوگ ان میں تحریفیں کرتے ہیں۔ کتابیں تو درکنار قرآن پاک جس کو ہدی اور بینات فرمایا گیا ہے اس میں بھی دیکھ لیجئے کہ معانی و مطالب میں کس قدر گڑ بڑ مچا رہے ہیں (۱)"۔

بات وہ ہے کہ حضرت کی نفس تجدیدی خدمات اتنی کثیر و واضح ہیں کہ جب ہر دوست دشمن معتقد غیر معتقد آنکھ کھول کر بطور ایک نفس الامری واقعہ کے دیکھ سکتا ہے تو خود حضرت اس تحدیث نعمت سے کیونکر آنکھ بند فرما لیتے۔ اگر کوئی شخص عربی کی ساری

۱۔ الافاضات الیومیہ ۱۴ ذی الحجہ ۵۱ھ ص ۳۱۶

درسیات ختم کر کے عالم ہو گیا ہے یا انگریزی کا ایم۔ اے پاس کر لیا ہے. تو وہ عربی و انگریزی سے بالکلیہ جاہل یا میزان خواں اور پرائمر خواں کے مقابلہ میں اپنے کو زیادہ کتابوں کا پڑھا ہوا یا زیادہ مسائل و معلومات کا جاننے والا تو بہرحال بطور واقعہ و نفس الامر کے ضرور ہی جانے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی یہ مسائل دانی عند اللہ بھی مقبول و معتبر ہے یا نہیں۔ نہ اس کو دلائل قطعیہ سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اسی کو حضرت فرمایا کرتے تھے کہ "اپنے کو اکمل سمجھنا جائز ہے افضل سمجھنا جائز نہیں" ۔ اسی طرح اصطلاحی مجدد چونکہ خالص طور سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوتا ہے. اور اب وحی آتی نہیں. اس لئے نہ کوئی مجدد اپنے مبعوث من اللہ ہونے کا نبی کی طرح خود قطعی دعویٰ کر سکتا ہے. اور نہ کوئی دوسرا قطعی دلیل سے اس کے مجدد مبعوث ہونے کو ثابت کر سکتا ہے۔ باقی نفس تجدیدی خدمات کا بطور واقعہ کے علم و اظہار سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ولایت اور اس کے مختلف مراتب کا بھی یہی حال ہے کہ عند اللہ مقبول و مقرب ہونے کا قطعی علم و اثبات کیسے ممکن ہے. تاہم جس طرح کسی شخص کے ایمان و عمل صالح تقویٰ و طہارت. زہد و عبادت وغیرہ کے غیر معمولی واقعات و حالات کے مشاہدہ اور اہل بصیرت کی شہادت کے بعد اس کا ولی ہونا مسلم ہوتا ہے۔ اور اسی بنا پر اکابر اولیا کہا اور مانا جاتا ہے. اسی طرح حضرت کی کثیر و جامع تجدیدی خدمات اتنی ظاہر و باہر ہیں کہ حضرت کے من اللہ مجدد مبعوث نہ ہونے کا صرف ایک بعید بلکہ ابعد احتمال ہی رہ جاتا ہے۔

الحمد اللہ کہ اس سلسلہ بحث میں ایک اور بڑی اہم بات یاد آ گئی. جو اصل کتاب ہی میں تفصیل کی تھی. لیکن مقدم وہ ایسی ہے کہ مقدمہ میں اس کا ذکر اور بھی انسب ہو گا۔

اور چیزوں میں حضرت کے مجدد ہونے نہ ہونے کا احتمال و شک خود حضرت کو یا دوسروں کو جو کچھ ہو ہو. لیکن ایک چیز میں حضرت نے خود بھی اپنے مجدد ہونے کا اظہار دعوے کی شان سے فرمایا ہے اور دوسرے بھی حضرت کی ایک ہی دو مجلسوں کی حاضری یا آج ایک ہی دو مجلسوں کے ملفوظات پڑھ کر تصدیق کر لے وہ معاشرت کی تجدید ہے فرمایا "مجدد ملت تو خیر لیکن مجدد معاشرت ضرور ہوں (۱) " مگر معاشرت کو لوگوں نے چونکہ سرے

۱۔ اشرف السوانح ص ۱۷ حصہ سوم

سے دین ہی سے خارج کر رکھا ہے. اس لئے اس کی تجدید کا سوال ہی کیا۔
حالانکہ عام شرائع کے علاوہ فرمایا کہ

"خدمت تجدید میں یہ بھی داخل ہے کہ معاشرت کی بھی اصلاح کی جائے۔ بعض مجددین ایسے گزرے ہیں جنہوں نے صرف شرائع کی اصلاح کی ہے اور بعض نے صرف معاشرت کی اور بعض نے دونوں کی (۲)"

آگے جامع ملفوظات نے حرف حرف بجا فرمایا کہ "حضرت اقدس (علیہ الرحمۃ) نے دونوں کی اصلاح بدرجہ اتم فرمائی۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء "ع یار ما این دارد و آں نیز ہم"۔

حضرت کے نزدیک تو یہی نہیں کہ معاشرت بھی شریعت ہی کا جز ہے۔ بلکہ عبادات روزہ نماز وغیرہ جو دین و شریعت کا اصل جز خیال کئے جاتے ہیں۔

"بعض وجوہ سے (امور معاشرت) ان عبادات سے بھی زیادہ ضروری ہیں اس لئے کہ عبادت میں اگر کوتاہی ہو تو یہ خود اپنا نقصان ہے۔ بخلاف امور معاشرت میں کوتاہی سے دوسروں کو ایذا ہوتی ہے"۔

پھر اس مادی ولا دینی تعلیم و تہذیب پر مبنی خود غرض معاشرت کا تو کہنا ہی کیا. جس میں اپنے مقابلے میں نہ دوسروں کا نقصان نقصان ہے نہ دوسروں کی ایذا ایذا جب انفرادی نقصان و ایذا کا معاملہ ہو تو دوسرے افراد کی ایذا نقصان کا سوال نہیں. اور قومی و جماعتی نقصان و ایذا میں دوسری قوم و جماعت کی پرواہ نہیں یہی ذہنیت ہے. جس کی ترقی نے اس عہد ترقی کے انسان کو انسان ہی نہیں رہنے دیا۔ ساری انسانی بستیاں خونخوار درندوں کے جنگل بن کے رہ گئی ہیں۔ افراد و اقوام سب ہر وقت ایک دوسرے کے مقابل دانت اور پنجے نکالے تیار ہیں۔ ابھی ہندوستان کی اس ترقی و آزادی کا تازہ تازہ کھیل سامنے ہے کہ پہلے تو

۲۔ الافضات حصہ ہفتم ص۱۰۵

ہندو مسلمانوں نے خونخواری و درندگی کے میدان و ہندوستان و پاکستان کے نام سے جیتے اور اب ہندوستان میں جب مشترک محاذ انگریزوں کا سامنے سے ہٹ گیا، تو خود آپس میں کانگرس، مہا سبھا، سوشلسٹ و کمونسٹ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں اور کون کہہ سکتا ہے، جو آج چین میں ہو رہا ہے وہ کل کہاں نہ ہو گا!

حضرت مجدد معاشرت علیہ الرحمہ کے نزدیک انسانیت یا آدمیت نام ہی اس حسن معاشرت کا ہے کہ "اپنے سے دوسرے کو اذیت نہ پہنچے۔ (۱) " آج کل سیاسیات و قومیات میں اتفاق اتفاق کا غل مچایا جاتا ہے فرمایا کرتے تھے کہ یہ اتفاق بھی آپس میں اسی وقت ممکن ہے جب دل ملے ہوں۔ اور دل اس وقت مل سکتے ہیں، جب کہ ایک کو دوسرے سے نقصان و اذیت نہ پہنچے۔ حضرت کی مجالس و ملفوظات میں سب سے زیادہ روک ٹوک سور معاشرت ہی کی باتوں پر ہوتی تھی، جو دنیا داروں کا کیا ذکر دوسری جگہ علماء و مشائخ کی مجلسوں میں بھی مطلقاً مفقود ہے۔ اسی سے لوگوں کو اچنبھا ہوتا تھا کہ

"ہم تو بہت بزرگوں کی مجلس میں گئے۔ لیکن کہیں ایسی باتوں پر روک ٹوک نہیں دیکھی۔ (حضرتؒ کا جواب سنئے)
"بھائی میں تو اپنی مجلس کو بزرگوں کی مجلس نہیں بنانا چاہتا ہوں آدمیوں کی مجلس بنانا چاہتا ہوں (۲) "

واقعہ بالکل یہی ہے کہ بزرگ تو الحمد للہ کہ اب بھی بہت ہیں، اور ان کی مجالس بھی ہیں۔ لیکن ان مجالس کو آدمیوں کی مجالس بنانے کا کسی کو بھی خیال نہیں ہوتا

"میں تو کہا کرتا ہوں کہ شاہ صاحب بننا آسان، ملک التجار بننا آسان، بزرگ بننا آسان، قطب بننا آسان۔ مگر انسان بننا مشکل............ اور یہ بھی کہا کرتا ہوں کہ بزرگ بننا ہو ولی بننا ہو قطب و غوث بننا ہو تو کہیں اور جاؤ۔ اگر انسان بننا ہو میرے پاس آؤ میں انسان بناتا ہوں "۔

۱۔ الافضات حصہ چہارم ص ۱۴

۲۔ الافضات حصہ ہفتم ص ۸۴

مگر انسان بنانا و دنیا دین کی تعلیم سے بھی ایسا بیگانہ و خارج ہو گیا ہے کہ آدمی روزہ نماز ذکر شغل درود ظائف سب کے لئے اس کے مقابلہ میں آسانی سے تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن آدمی بننے سے بھاگتا ہے کیونکہ آدمی

"بننا ایسا ہو گا. جیسا کوئی کہے مربا بنانا جانتا ہوں تو ظاہر ہے کہ مربا جس طرح بنتا ہے، اسی طرح بنے گا۔ اول تو پھل کے داغ دھبوں کو چاقو سے صاف کیا جائے گا، چھلکا چھیلا جائے گا۔ پھر دیگچی میں چولہے پر چڑھا کر نیچے آگ جلائی جائے گی تاکہ اچھی طرح ابل جائے۔ مابعد چاقو سے اس کو کوچا جائے گا تاکہ قوام اچھی طرح اندر تک اثر کر کے .... اتنے قصوں کے بعد مربا بنے گا اور کھانے کے قابل ہو گا اور وہ آثار پیدا ہوں گے جس کو تم چاہتے ہو"۔

بھلا آج کل ایسا "مربا آدمی" بننے بنانے پر کون تیار ہو گا! یہ مربا نسبۃً" ہمیشہ ہی اتنا نایاب رہا کہ حضرت عبداللہ ابن مبارک کا ایک عجیب قول اس سلسلہ میں حضرت نقل فرمایا کرتے تھے کہ کسی موقع پر مسجد سے بہت سے نمازی نکل رہے تھے فرمایا کہ "الحمد للہ کہ جنت کی بھرتی ہے لیکن آدمی اس میں دو ہی ایک ہوں گے (اوکما قال) تازہ والا نامہ میں مولانا گیلانی مدظلہ العالی نے ہمارے اس آخر زمانے کے مشہور بزرگ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمتہ اللہ علیہ کا اسی نوعیت کا ایک بڑا عجیب و لطیف قول تحریر فرمایا۔ کسی نے پوچھا حضرت کا آج کل مشغلہ کیا ہے فرمایا کہ "انسانیت کی کتاب میں غلطیوں کی کاٹ چھانٹ اور تصحیح و ترمیم بس یہی کام میرے سپرد ہوا ہے"۔

چونکہ اسی انسانیت سے متعلق حضرت علیہ الرحمہ کی تجدید کا ذکر اس وقت زیر قلم تھا اس لئے مولانا گیلانی کو احقر نے جواب میں لکھا کہ آپ نے بڑے وقت پر اور بڑے مزے کی بات لکھی یہ تو پہلے بھی خیال آتا تھا کہ "انسان سازی" حضرت مرزا صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا خاص مذاق تھا اور حضرت جامع المجددین علیہ الرحمہ نے اس کو تجدید و تکمیل کے درجہ پر پہنچایا۔ لیکن حضرت مرزا صاحب کی ایسی دلچسپ نص اس بات میں دیکھی سنی نہ تھی۔ باقی

ہمارے حضرت علیہ الرحمہ کا تو کہنا چاہئے ساری عمر ایک بڑا مشغلہ "کتاب انسانیت کی کاٹ چھانٹ" ہی رہی جو ولایت و بزرگی سب پر حضرت کے نزدیک جیسی کچھ مقدم تھی اوپر کے اقتباسات سے واضح ہو چکا۔ اور ایک سلسلہ گفتگو میں تو صراحۃً فرمایا کہ۔

"مطلوبیت میں بزرگی سے مقدم آدمیت ہے۔ یہاں اس آدمیت کی تعلیم پہلے اور بزرگی کی بعد میں ہوتی ہے۔" (۱)

اس کے ساتھ اکثر کسی کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

زاہد شدی و شیخ شدی و دانشمند — این جملہ شدی و لے مسلمان نشدی

اور چونکہ پورا مسلمان ہونا ہی انسان ہونا ہے، اس لئے اس شعر میں یہ تصرف فرماتے کہ

زاہد شدی و شیخ و بدو دانشمند — این جملہ شدی ولیکن انساں نشدی

یہ انسانیت جس کا پتہ "زاہد و شیخ و دانشمند" میں بھی شاذ ہی ملتا ہے قرآن و حدیث وفقہ سب میں اس کا جو درجہ و اہمیت ہے، اور خود حضرت علیہ الرحمہ کو اس کا جو تجدیدی و عملی اہتمام تھا اس کا اندازہ آگے اصل کتاب میں حسن معاشرت و اصلاح معاشرت کی کسی قدر ضروری تفصیل سے ہو گا ؎۲ لیکن کیا یہ اور کس منہ سے عرض کیا جائے کہ اچھے اچھے اہل صلاح و تقویٰ حضرات کو اس انسانیت اور انسان سازی کی طرف سے اس درجہ بےالتفاتی دیکھی کہ گویا قرآن و حدیث اور فقہ میں اس کا کہیں کوئی نام و نشان نہیں صرف معاشرت کے مجددؒ کے ہاں حسن معاشرت کا یہ اہتمام دیکھا کہ مسجد میں اگر کوئی بدھنی بھری رکھی ہو تو اس کے استعمال کی بھی اجازت نہ تھی کہ شاید کوئی اپنے لئے بھر کر رکھ گیا ہو، جس کو تلاش کرنے اور دوبارہ بھرنے کی اذیت و تکلیف ہو، ساتھ ہی اس کی ہدایت کہ جس کو جلد ہی کام لینا نہ ہو وہ دیر تک اس طرح بدھنی کو بھر کر مقید نہ کر دے کہ دوسرے کام نہ لے سکیں۔ تابہ امکان ایسی جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کو ناپسند فرماتے اور ناراض ہوتے

۱؎ الافاضات حصہ چہارم ص ۱۴

۲؎ دیکھو از آخر ص ۱۵۱ تا ۱۵۵ اور از ص ۴۹۵ تا ۵۱۴

کہ اگر آگے کے نمازی پہلے فارغ ہو کر نکلنا چاہیں تو ان کا راستہ بند ہو اور ان کو انتظار کرنا پڑے۔ گھر کے لوگوں کے ساتھ تھانہ بھون کے زمانہ قیام میں کبھی کوئی چیز حضرت کی خدمت میں ہدیۃً بھیجی جاتی تو برتن خالی فرما کر لے جانے والے ہاتھ ہی فوراً واپس فرمایا جا تاکہ دوبارہ خود ہم کو اس کے منگانے یا کسی اور کام کے لئے اس برتن کے نہ ہونے سے تکلیف نہ ہو۔

حدیہ کہ لفافے کے اندر خط رکھنے میں اس کا لحاظ فرماتے کہ مکتوب الیہ کو نکالتے وقت دقت نہ ہو! فرمایا کہ لوگ ان امور کو بہت خفیف سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بہت ضروری ہیں" اور فرمایا کہ "جب غفلت حد سے بڑھ گئی اور اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی ان امور کا خیال نہیں رہا تو اس کے متعلق بھی ایک رسالہ لکھنا پڑا آداب معاشرہ اس کا نام ہے۔ مجھ کو ایسے جزئیات کا بہت اہتمام ہے بزرگوں کے ہاں بڑی بڑی باتوں کی تعلیم ہوتی ہے. اور میں چھوٹا ہوں اس لئے میرے یہاں چھوٹی چھوٹی باتوں کی تعلیم ہوتی ہے۔" (۱)

بظاہر ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا مقابلہ ذرا اس معاملت و معاشرت سے فرمائیں جس کا دن رات اپنے پرائے اعزہ و احباب خورد و بزرگ "زاہد و شیخ دانشمند" سب سے تجربہ ہوتا ہے۔ کوئی چھوٹی بڑی چیز بلا اجازت بلا اطلاع اٹھا لینا اور پھر کام نکال کر فوراً نہ رکھ جانا یا بے جگہ رکھ جانا معمولی بات ہے. خواہ جس کی چیز ہے اس کو وقت اور جگہ پر تلاش کرنے اور نہ پانے سے کتنی ہی اذیت و نقصان ہو۔ "ماعون اور مستعار" چیزوں کو دنیا اسلامی معاشرت کا کیسا مامور و ماجور جز ہے۔ لیکن لینے والے بالعموم نہ حفاظت و احتیاط کے ساتھ ایسی چیزوں کا استعمال ضروری خیال کرتے ہیں. نہ بعد استعمال بلا طلب و تقاضا وقت پر واپس کرنا اپنے ذمہ جانتے ہیں۔

کسی کی حاجت و ضرورت پر قرض دے دینا کیسی خدمت اور کیسا مفت کا اجر و ثواب ہے کہ روپیہ کا روپیہ واپس مل جائے اور ثواب گھاتے میں۔ ایسوں کا ذکر نہیں جو سرے سے ادا ہی نہیں کرنا چاہتے یا اس کو ایسا خفیف و حقیر معاملہ سمجھتے ہیں کہ جب خود اپنے جا و بیجا

۱۔ وعظ عمل الذرہ ص ۲۴

مصارف سے بچے گا تو دیکھا جائے گا۔ ذکر ان کا ہے جو ادائی کی پوری نیت رکھتے ہیں ان میں "شیخ و زاہد و دانشمند" ہر طبقہ کے کیسے کیسے حضرات سے اور کیسے کیسے تجربات ہوتے ہیں۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں وقت وعدہ کو پورا نہ کرنا، پھر خود کسی دوسرے وقت و وعدہ کی اطلاع نہ دینا۔ اور یاد دہانی پر ہفتہ عشرہ مہینہ دو مہینے کا غیر متعین وعدہ کر دینا اب یہ اذیت سہنا قرض دینے والے کی سزا ہے کہ وہ انتظار کرتا رہے کہ دیکھئے سات دن میں ملتا ہے کہ دس دن میں ایک مہینے یا دو مہینے میں!

یہ وہ روز مرہ کے "مشتے از نمونہ از خروارے تجربات ہیں جو کس کو نہ ہوتے ہوں گے اور ان ہی سے مجدد وقت کی اس معاشرتی تجدید کا یقین ہوتا ہے کہ "معاشرت کا (عقائد و عبادات وغیرہ) تمام اجزائے دین سے کسی سے من وجہ اور کسی سے من کل الوجوہ مقدم و مہتم بالشان ہونا ثابت ہے[۱]۔" جب تک حضرت کی خدمت و صحبت اور اصلاح و تعلیم تک رسائی نہ ہوئی تھی دین و دینداری ولایت بزرگی کا اونچا سے اونچا معیار خود حضرت علیہ الرحمہ کے الفاظ میں بس یہی سمجھ میں آتا رہا کہ "ہاتھ میں تسبیح لے لی ٹخنوں سے اونچا پایجامہ اور گھٹنوں سے نیچا کرتا پہن لیا، اشراق چاشت اور تہجد کی نفلیں پڑھ لیں بس ہو گئے کامل!" (۱) باقی معاملات اور معاملات سے بھی بڑھ کر

> "معاشرت کو لوگوں نے دین کی فہرست ہی سے نکال دیا۔ سمجھتے ہیں کہ نماز روزہ حج زکوٰۃ ذکر و شغل تلاوت قرآن نفلیں بس ان چند چیزوں کے متعلق احکام ہیں۔ آگے جو چاہیں کرتے پھریں جس کے معنی آج کل آزادی کے ہیں۔ سو خوب سمجھ لو کہ تم کو ہرگز ہرگز آزاد نہیں چھوڑا گیا ہے، مثل بھینسے اور سانڈ کے کہ جس کے گیہوں چاہیں کھالیں، جس کے چنے چاہیں کھالیں۔ سو ہم کو ایسا نہیں چھوڑا گیا ہے بلکہ شریعت نے ہماری رفتار و گفتار نشست و برخاست لین دین، کھانے پینے ہر چیز سے تعرض کیا ہے۔ شریعت مکمل قانون ہے۔" (۲)

۱۔ دیکھو آگے اصل کتاب ص ۵۔۲۱۴۔ الافاضات حصہ چہارم ص ۲۰۴

۲۔ الافاضات حصہ چہارم ص ۲۲۰۴۔ آگے؟

یہ توالحمد للہ حضرت جامع المجددین کی جامع و کامل تجدید ہی کی بدولت ذہن نشین ہوا کہ واقعی شریعت مکمل قانون ہے۔ " اور نری تسبیح و مصلے والی بزرگی بزرگی تو کیا ہوتی صریح حدیث کی رو سے سزاوار جہنم ہے۔

" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو دو عورتوں کا ذکر کیا گیا کہ ایک نماز روزہ کثرت سے کرتی تھی (یعنی نوافل کیونکہ کثرت اسی میں ہو سکتی ہے) مگر اپنے ہمسایوں کو ایذا پہنچاتی تھی۔ اور دوسری زیادہ نماز روزہ نہ کرتی تھی (یعنی ضروریات پر اکتفا کرتی تھی) مگر ہمسایوں کو ایذا نہ دیتی تھی آپ نے پہلی کو دوزخی دوسری کو جنتی فرمایا۔ (۱)

بخاری شریف کی حدیث ہے کہ "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی اذیت سے سارے مسلمان محفوظ رہیں۔ " (۲) اس سے بڑھ کر یہ کہ "الدین النصیحۃ " کہ دین سراپا خیر خواہی ہے۔

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کے بناؤ بگاڑ پر خود مسلمانوں ہی کی صلاح و فلاح موقوف نہیں بلکہ قرآن و حدیث کی نصوص صریحہ کی رو سے ساری دنیا کے بناؤ بگاڑ کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہے۔

امت محمدیہ مثالی (آئیڈیل) یا نمونہ کی امت ہے۔ یہ امۃ مخرجہ و امت مبعوثہ ہے جو نکالی اور اٹھائی ہی گئی ہے ساری انسانیت کے معروف و منکر کی نگرانی و رہنمای یا ہدایت و امامت کے ۲۔ لئے۔ جس کو ایمانیات و معاملات اخلاق و معاشرات ہر شعبہ زندگی کے لئے نمونہ بننا ہے۔ خصوصاً معاملات اور اخلاق و معاشرت میں کیونکہ دوسروں اور غیروں سب کی نظر براہ راست انہیں باتوں پر پڑتی ہے۔ اسی بنا پر حضرت ان کو عقائد و دیانات کے مقابلہ میں اظہر فرمایا کرتے تھے کہ انہیں سے دن رات اپنے پرائے سب کو سابقہ پڑتا ہے۔ اور انہیں کے تجربہ و کشش سے پھر وہ ایمانیات کو خود بخود قبول کر لیتے ہیں کہ جس درخت کے پھل ایسے ہوں اس سے کون اپنے دل و جان کی زمین کو آباد نہ کرے گا۔

ایک دفعہ ریل کے سفر میں ایک غیر مسلم نے اسلام سے اپنی غیر معمولی واقفیت و کشش

کا اظہار کیا۔ یہ دریافت کرنے پر کہ آخر پھر انتظار کیا ہے؟ جو جواب ملا اس نے شرم سے سر نیچا کر دیا۔ کہنے لگا کہ خود اسلام جیسا اور جتنا اچھا ہے اس کے نمائندے ویسے اور اتنے ہی برے ہیں۔ اس لئے ان میں ملنے کا جی نہیں چاہتا۔ "جب امام ہی کا رخ ترکستان کی طرف ہو تو مقتدیوں کو کعبہ کی راہ کون دکھلائے!"

غرض راقم احقر کے نزدیک تو دنیا بھر میں جہاں کہیں اور جو کچھ بھی انفرادی و اجتماعی سیاسی و سماجی، اخلاقی و معاشرتی شر و فساد برپا ہے۔ اس کی مسئولیت و جوابدہی سے مسلمان اپنے کو بری نہیں رکھ سکتے۔ سب سے زیادہ حکومت و سیاست کی راہ سے زمین شر و فساد سے بھر گئی ہے۔ لیکن اگر مسلمان کوئی چھوٹی سی چھوٹی حکومت بھی اسلام کے نمونہ (آئیڈیل) کی بنا کر آنکھوں کے سامنے کھڑی کر دیتے تو دنیا اس جمہوریت و عوامیت اشتمالیت و اشتراکیت کے نام پر لعنت بھیجتی جس نے زمین پر امن و سلامتی کی کوئی جائے پناہ نہیں چھوڑی۔

بس وقت کے جامع المجدد دین کی جامع و کامل دین کی جامع و کامل تجدید کا مدعا و ماحصل یہی ہے کہ اس دین کے مدعی نام کے مسلمان خود اپنے اور غیروں سب کی دنیا و آخرت کے لئے کام کے مسلمان بالفاظ دیگر کامل مسلمان یا انسان بن جائیں۔ یاایھا الذین آمنوا آمنوا مسلمانو پورے پورے مسلمان بن جاؤ۔

اور یہ پورا پورا مسلمان بن جانا کوئی "جوئے شیر لانا" بالکل نہیں۔ حضرت مجدد کی تجدیدات و اصلاحات کی نمایاں خصوصیت یہ نظر آئے گی کہ وہ واقعی ایک بالکل سہل و صاف (سمحاء بیفاء) ملت اور ایک آسان دین (الدین یُسر) کی تفسیر و ترجمانی ہیں۔ کوئی ایمانی و عملی، اصولی و فروعی، انفرادی و اجتماعی تعلیم شریعت کی ایسی نہ ملے گی جس میں کوتاہی کا سبب سراسر ہماری غفلت و بے پروائی کے سوا کچھ اور ہو یا جس کی اصلاح ہمارے اختیار اور سہولت سے اختیار میں نہ ہو اور جس سے محرومی کا بجز محرومی کے کوئی بھی معقول عذر پیش کیا جا سکتا ہو۔ ننانوے فیصد احکام یا اوامر نواہی ایسے نکلیں گے جو ہر شخص کے شخصی اور انفرادی ارادہ و اختیار سے پورے کئے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ ارادہ ہو اور اختیار سے کام لیا جائے۔

اب آگے ذرا توجہ سے اسی خصوصیت خاصہ کو پیش نظر رکھ کر اصل کتاب پڑھو اور دیکھو

کہ وقت کے دیدہ کامل نے دین کامل کو کس طرح دیکھا اور دکھلایا ہے اور پھر اس آئینہ سے اپنی صورت درست کر کے ساری دنیا کے لئے انسانی کمال و جمال کی دید کا آئینہ بن جاؤ۔

ز "اشرفی" نظرے دام کن بدست نگر
کہ تا بدیدہ کامل کمال اُو بینی

الحمد للہ الذی ہدانا لہذا وما کنا لنہتدی لولا ان ہدانا اللہ

خلق و خلق کی ایک جھلک

ناسوتی و جسمانی تعلقات و واجبات کا پورا حق ادا کرنے کے لئے جسمانی صحت اور صحیح و سلیم علم و فہم کے لئے صحیح و سالم جسم بھی ضروری ہے۔ بعض صلحا اور بزرگوں کو دیکھا کہ کمال علم و اخلاص کے باوجود جسمانی نقص و ضعف کی بدولت علم و عمل میں اعتدال و توازن کے بجائے بس ایک مجذوبانہ و مغلوبانہ رنگ ہوتا ہے۔ حضرت تھانوی علیہ الرحمتہ کا سب سے نمایاں اور بڑا کمال راقم احقر کی نظر میں یہ تھا کہ علم و عمل میں حدود کی رعایت اس درجہ تھی کہ حضرات انبیا کا تو ذکر نہیں ورنہ لوازم بشریت کے ساتھ اس سے زائد کا تصور دشوار ہے۔ اور اس میں یقیناً اس نعمت کو دخل تھا کہ اللہ تعالیٰ نے "بسطۃ فی العلم" کے ساتھ "بسطۃ فی الجسم" کا بھی وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ جسمانی خلقت. ظاہری و باطنی حواس کی صحت اور نتیجتاً اعتدال افعال اور مزاج کی لطافت میں بھی مجدد امت کی ذات نبی امت (صلے اللہ علیہ وسلم) کا پرتو تھی۔

ظاہر و قالب: قد مردانہ. میانہ مائل بدرازی۔ بدن دھرا. ہڈیاں چوڑی۔ چہرہ ہموار اور بھرا ہوا۔ دہن معتدل و متوسط۔ سرگیں شرمیلی آنکھوں میں سرخ ڈورے. بس جی چاہتا تھا کہ دیکھا ہی کرو. مگر کون آنکھ بھر کر دیکھ سکتا تھا۔ ہتھیلیاں ایسی نرم کہ مصافحہ کے وقت دست مبارک چھوڑنے کا جی نہ چاہتا تھا۔ داڑھی بھری گنجان۔ رنگ ضعیفی میں بھی گندمی بلکہ کھلتا ہوا تھا جوانی میں یقیناً سرخ و سفید رہا ہو گا۔ سر کے بال خفیف سی خمیدگی لئے ہوئے ذرا گھنگرالے۔ بجز سردی کے موسم کے لباس اکثر سفید استعمال فرماتے گریبان کھلا رہتا۔ گاؤ تکیہ پر بائیں جانب ٹیک لگا کر تشریف رکھتے وقار و ہیبت کا یہ عالم کہ مجلس میں کسی کو سرہلانے کی ہمت مشکل، لیکن واقفیت و مانوسیت کے بعد سراپا محبت و محبوبیت۔ زیادہ

تعظیم سے نفرت۔ بے تکلفی و سادگی طبیعت میں ایسی کہ بارش کی وجہ سے راستہ میں اگر پانی زیادہ ہوتا، توجوتا ہاتھ میں لے لیتے۔ گھر میں حضرت مخدومہ پیرانی صاحبہ کسی کام میں لگی ہوتیں تو کھانا خود نکال کر تناول فرمالیتے۔ آواز نہ پست نہ بلند بس ایسی کہ سارا مجمع بے تکلف سن لے، اور گفتگو جلد جلد نہ فرماتے ہر ہر لفظ صاف و ممتاز ہوتا۔ نماز میں قرات کی بھی یہی خصوصیت تھی کہ ہر ہر لفظ نہایت صاف ترتیل واطمینان کے ساتھ ادا ہوتا، ایسا معلوم ہوتا کہ بہت مزہ لے لے کر پڑھ رہے ہیں۔ نگاہیں نیچی رہتیں کبھی کبھی کسی خوش نصیب کی طرف اٹھ بھی جاتیں۔ ہنسی عموماً وعادتاً تبسم سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن کبھی کبھی کھل کر بھی ہنس لیتے۔ مزاح بھی فرماتے اور بے تکلفی و شگفتگی کے ساتھ فرماتے۔

قلب و باطن: اس ظاہر و قالب کا باطن کیسے قلب سلیم اور السعید من سعد فی بطن امہ کی کیسی بطنی سعادت اور کیسی معصوم و ملکوتی روح سے منور تھا۔ اس کا اندازہ بچپن کے صرف ایک ہی واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ذہانت کی شوخی و شرارت تو فرماتے لیکن ہم عمر بچوں کے ساتھ ان کی ناشائستہ حرکات کی وجہ سے کھیل کود میں شرکت نہ فرماتے، حالانکہ یہ جذبہ بچوں میں کتنا قوی وطبعی ہوتا ہے۔ صرف اپنی ہمشیرہ کے ساتھ گھر کے اندر کھیل لیتے تھے۔ ۱۲، ۱۳ سال کی عمر ہی سے جاڑوں تک کی راتوں میں منع کرنے کے باوجود اٹھتے اور وضو کر کے تہجد پڑھتے۔

باقی عقل و حکمت، فہم و فراست اور علم و بصیرت کے جن بے شمار کمالات سے سینہ منور تھا، اس کو ہر صاحب نظر ایک ہی مجلس کی حاضری میں کچھ نہ کچھ دیکھ لے سکتا تھا، اور آج بھی ہزاروں صفحات کی تحریری باقیات صالحات کے ہر صفحہ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ جس کی مختصر تفصیل ہی راقم سطور کا مدعا ہے۔

ترک لایعنی: گفتگو میں فضول و لایعنی باتوں کا قطعاً گزر نہ تھا۔ ایک گفتگو پر کیا موقوف ترک لایعنی کے حسن اسلام کا یہ رنگ تھا کہ زندگی کی کوئی جنبش بھی لاطائل یا بے سوچے سمجھے نہ ہوتی۔ ہر ہر حرکت جچی تلی۔ ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں اپنی اور سب کی

سہولت و راحت اور فراغ قلب کا غایت اہتمام فرماتے۔ قواعد و ضوابط بھی اسی لئے تھے۔ فرمایا کرتے "میں نے اپنے معمولات میں راحت کی تدابیر اختیار کر رکھی ہیں. یہی میرا اصل مذاق ہے کہ دنیا کی بھی راحت ہو اور آخرت کی بھی اور صرف اپنی ہی راحت مقصود نہیں دوسروں کی راحت کا بھی خیال رکھتا ہوں" (۱) اپنی ذات تک تو یہ حال تھا کہ محض "داشتہ آید بکاء" کی خاطر زائد از ضرورت معمولی کھانے پینے کی چیزوں کو بھی دیر تک ملک میں رکھنا پسند نہ فرماتے۔ ہدیہ کی صورت میں زائد یا بے ضرورت چیز سے تو اکثر عذر ہی فرما دیتے یا بانٹ دیتے کہ ان کی حفاظت اور دھرنے اٹھانے کی فکر کیوں ہو۔ بس جس طرح زبان غیر اللہ کے ذکر سے پاک تھی، اسی طرح قلب کو غیر کی فکر سے فارغ رکھنا چاہتے۔ فرماتے کہ "چاہے توفیق یاد خدا کی نہ ہو لیکن اپنی طرف سے تو قلب کو فارغ رکھنے کی کوشش ہی کرتا ہوں تا اگر کبھی توفیق ہو تو آسانی سے حق تعالیٰ کی طرف قلب کو رجوع کر سکوں اور اس وقت کوئی مانع توجہ الی اللہ سے نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ الجھی ہوئی باتوں سے طبیعت پریشان ہو کر متغیر ہو جاتی ہے کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ بات جلد ختم ہو کر یکسوئی حاصل ہوا" ( )

بناوٹی تہذیب اور تصنع سے طبیعت اتنی نفور تھی کہ اگر کوئی مزاج پرسی کا خط بھی اس طرح لکھ دیتا کہ "سنا گیا ہے کہ خدام والا کا مزاج کچھ ناساز ہے بدرجہ غایت تردد ہے۔ امید کہ کسی خادم کو فرمائیں کہ تاوقت صحت کلی مزاج وہاج کی کوائف عالیہ سے ہر روز بذریعہ ایک گرامی نامہ کے مفتخر و ممتاز فرماتے رہیں" تو ناراض ہوتے اور فرماتے کہ اپنا وقت لکھنے میں اور میرا پڑھنے میں ضائع کیا۔ صرف ایک لفظ کافی تھا کہ طبیعت کیسی ہے۔ لوگوں کی عادت بے محل اظہار معلومات اور بے سند سنی سنائی خبریں بیان کرنے کی ہوتی ہے۔ اس کو سخت ناپسند فرماتے اور فرماتے کہ جس جملہ خبریہ سے کوئی انشا متصور نہ ہو وہ لغو ہے غرض "ترک مالایعنی اور عن اللغوھم معرضون" کا سراپا نمونہ۔

ا۔ الافاضات الیومیہ ص ۶۴ حصہ اول

ا۔ اشرف السوانح ص ۱۸۳

مہمان و مہمانی. مہمان کچھ نہ کچھ کم و بیش روز ہی ہوتے مگر ان کے ساتھ بھی کسی مصنوعی تکلف و تہذیب کو دخل نہ ہوتا۔ البتہ راحت کا پورا خیال فرماتے۔ یہ ناکارہ جب کبھی ایک آدھ ہفتہ کے لئے حاضر ہوتا اور یہ سعادت حاصل ہوتی تو دریافت فرماتے کہ کھانے پینے کے اوقات کیا ہیں کسی خاص چیز کی تو عادت نہیں۔ کھانا کبھی اپنے ساتھ کھلاتے کبھی علیحدہ قیام گاہ پر آ جاتا۔ نفس میں کچھ وسوسہ ہوا تو شاید دوسرے ہی وقت جب کہ ساتھ کھا رہا تھا فرمایا کہ لاکھ بے تکلفی ہو مگر مہمان میزبان کے ساتھ کامل بے تکلفی و آزادی کے ساتھ نہیں کھا سکتا، اس لئے دو چار وقت سے زیادہ ٹھہرنے والے مہمانوں کو اکثر علیحدہ آزادی سے کھانے کا موقع دے دیا کرتا ہوں، تب جا کر اس بدگمان نفس نے بھی اس حکمت و راحت کو محسوس کیا۔ خادموں کو مہمانوں سے کچھ قبول کرنے کی اجازت نہ تھی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ بھی خدمت کرتے ہیں، اس لئے کچھ ان کی خدمت کا جی چاہتا ہے۔ فرمایا مجھ کو دے دو تمہارا نام لئے بغیر دے دوں گا۔ مصلحت یہ ہے کہ ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو سرے سے کچھ نہیں دیتے بعض کم دیتے ہیں بعض زیادہ، تو پھر یہ خادم پہچان پہچان کر خدمت کریں گے۔

پہلے خانقاہی رنگ کی عام مہمانی ہوتی تھی جو آتا حضرت ہی کا مہمان ہوتا۔ لیکن حضرت کی طبیعت میں دوسروں کی راحت و مصلحت کا جیسا اہتمام تھا اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ بہت سا وقت ان کے کھانے پینے اور راحت رسانی کے اہتمام و فکر میں صرف ہو جاتا، اور جس طلب میں وہ دور دور سے سفر اور مصارف برداشت کر کے آتے اس میں خلل پڑتا۔ جس کا اتنا اہتمام تھا کہ ایک مرتبہ احقر کا قیام خانقاہ سے ذرا فاصلہ پر تھا تو صبح کی مجلس خاص کے لئے پہلے احقر کو اطلاع فرماتے پھر خانقاہ والوں کو کہ کچھ بچھڑ نہ جاؤں۔ ساتھ ہی ہر روز کی اطلاع ان تعلیم فرمودہ الفاظ میں کرائی جاتی کہ "میں فارغ ہوں آپ کا جی چاہے آ جائیں"۔ تاکہ اگر کوئی کسی ضروری کام میں مصروف ہو تو بار نہ ہو کہ اطلاع پا کر خواہ مخواہ حاضر ہی ہونا ہے۔ گو کوئی محروم ہی ہو گا، جو حضرت کی مجلس کے ایک لمحہ اور ایک لفظ کو بھی ضائع کرنا پسند کرتا تاہم خود حضرت والا کی جانب سے دوسروں کی آزادی و سہولت کی اتنی رعایت فرمائی جاتی کہ خود بھی کون اپنی رعایت اتنی کر سکتا ہے۔ اور کرنا بھی چاہئے تو ان دقائق پر نظر کس کی جاتی

ہے۔ اس کے علاوہ حاضر ہونے والوں کی اصل غرض تعلیم و تربیت یا اپنے روحانی و باطنی علاج کی ہوتی تھی، اور طبیب کے سر مریضوں کی مہمانی کا بوجھ ڈالنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ پھر یہ بھی فرماتے کہ جب پیر کے گھر مرید مہمان ہوتا ہے تو غیرت آتی ہے کہ مفت کھا کر چل دیں، خواہ مخواہ نذر دینے کی فکر پڑ جاتی ہے۔ اور آٹھ آنہ کا کھایا ہے تو استطاعت ہو یا نہ ہو دل چاہے یا نہ چاہے ایک روپیہ تو دیتے ہی بن پڑتی ہے۔ ان مفاسد و مصالح پر نظر فرما کر عام مہمانداری مسدود فرمادی تھی۔

بات بات میں حکمت و افادہ: خلاصہ یہ کہ کوئی چھوٹی بڑی بات حکمت و مصلحت سے خالی نہ ہوتی۔ اور تعلیمات نبوت کی تجدید فرمانے والے ایک جامع و مبعوث مجدد کی یہی شان ہونی چاہئے، کہ اس کی زندگی "لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ" کا اس باب میں یہی عکس ہو کہ کوئی حرکت و سکون امت کے لئے افادہ و تعلیم سے خالی نہ ہو۔ خواہ اس کا درجہ استحباب ہی کا ہو۔ لوگوں نے معاشرت کو دین سے بالکل خارج کر دیا ہے اور ہمارے عادات و اخلاق، اسلامی تعلیمات سے اس قدر دور جا پڑے بلکہ متضاد ہو گئے ہیں کہ قریباً روزانہ ہی مجلس میں کسی نہ کسی بات پر تغیر ہوتا اور روک ٹوک فرمانی پڑتی۔ مگر اس تنبیہ و مواخذہ میں حدود سے ذرا تجاوز نہ ہوتا۔ آواز کچھ بلند اور لہجہ ذرا تیز ہو جاتا۔ لیکن کیا مجال کہ کوئی لفظ نامناسب زبان پر آ جائے۔ فرماتے کہ "میں اس کو خیانت جانتا ہوں کہ لوگ اپنی اصلاح کے لئے آئیں اور میں اصلاح طلب باتوں پر روک ٹوک نہ کروں۔ لیکن ساتھ ہی فرماتے کہ عین مواخذہ کے وقت بھی "بحمد اللہ اس کا استحضار رکھتا ہوں، کہ یہ شخص مجھ سے لاکھوں درجہ افضل ہے۔ (۱)" اور اس کی مثال میں فرماتے کہ جیسے بادشاہ کسی جلاد کو حکم دے کہ شاہزادہ کے بید لگائے، تو وہ حکم کی وجہ سے بید ضرور لگائے گا، لیکن عین بید لگانے کی حالت میں اس کو یہ وسوسہ بھی نہ ہو گا کہ میں شہزادہ سے افضل ہوں۔ سبحان اللہ کیسے نازک مسئلہ کی کیسی دلنشیں مثال ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ رحم و حلم کوئی ایسی صفت ہے کہ غصہ و تغیر کبھی ہونا ہی نہ چاہئے۔ حالانکہ اللہ تعالٰی نے کوئی صفت بے مصرف یا بے

۱۔ الافاضات الیومیہ ص ۳۴۵ ۲۔ بزم جمشید ص ۷

حکمت نہیں پیدا فرمائی تمام صفات کے استعمال کی ضرورت ہے۔ اور ان کا حسن و کمال ان کے فنا کر دینے یا ازالہ میں نہیں بلکہ ان کے امالہ یا صحیح استعمال و اعتدال میں ہے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ "کامل وہ ہوتا ہے جو حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا پورا متبع ہو۔ طریق سنت میں اعتدال ہوتا ہے افراط و تفریط نہیں ہوتی۔ (۲)"

تمام صفات کا اپنے صحیح مواقع پر اعتدال کے ساتھ اظہار ہو تاکہ لوگ ان کے صحیح استعمال کو جان اور پہچان سکیں۔ جیسا کہ دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا کہ "اصلی شیخ وہی ہے جس سے غم و غصہ و رنج و راحت وغیرہ کے تمام احوال میں سبق حاصل ہو۔ (۱)" اور حضرت شیخ اکبر رحمتہ اللہ علیہ کا یہ مقولہ تو بارہا نقل فرماتے کہ مربی وہ ہے جس کا دین انبیا کا سا ہو، تدبیر اطبا کی سی اور سیاست بادشاہوں کی سی۔ خوب کہا کہنے والے نے کہ

اے قبائے رہنمائی راست بر بالائے تو علم و حکمت را شرف از گوہر والائے تو

صراط مستقیم: اسلام کی اصل روح صراط مستقیم ہے یعنی زندگی کی ایسی سیدھی راہ جو بے اعتدالی اور افراط و تفریط کے ہر عوج و انحراف سے پاک و نا آشنا ہے۔ لہٰذا اس راہ سے اگر لوگ منحرف ہوں یا اس میں کچھ پیچ و خم پیدا کر دیں تو تصحیح و تجدید کا پورا حق وہی ادا کر سکتا ہے جو علم و عمل ہر اعتبار سے نقطہ اعتدال اور حدود کی فہم اور ان پر قدرت رکھتا ہو، اور یہ فہم و قدرت اس کو حاصل ہوتی ہے جو خود کسی خاص حال و مذاق سے مغلوب نہ ہو۔ اس گئے گزرے زمانہ میں بھی الحمد للہ صلحا و مخلصین اور اہل اللہ و مقبولین سے دنیا خالی نہیں۔ لیکن ہر جگہ کسی نہ کسی خاص رنگ کا غلبہ دیکھا جس میں حدود کی رعایت بہ مشکل ہی ہوتی اور ہو سکتی ہے۔ بلا شبہ مغلوبیت بجائے خود ایک عذر ہے، جو مقبولیت کا مانع نہیں، لیکن مقبول ہونا اور شے ہے اور مجدد ہونا اور شے۔ مجدد کی نظر جب تک کسی امر کے تمام پہلوؤں اور مصالح و مفاسد سب پر نہ ہو بالکل ممکن ہے کہ وہ افراط سے تفریط اور تفریط سے افراط کی طرف نکل جائے، اور ایک اصلاح دوسرے افساد کی شکل اختیار کر لے۔ جیسا کہ آج کل کے اکثر اس قسم کے مصلحین اور ان کی اصلاحات میں دیکھا جا رہا ہے۔

کسی خط میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے راقم احقر سے سوال فرمایا تھا کہ مولانا تھانوی علیہ الرحمتہ کا سب سے ممتاز وصف کیا تھا۔ خاکسار نے جواب میں عرض کیا تھا کہ

"علم و عمل ہر شے میں حدود کی انتہائی رعایت" ایک موقع پر اسی کو ارشاد فرمایا کہ

شانِ تجدید: بعض رسوم اس قدر قلوب میں جاگزیں ہو جاتے ہیں کہ بڑے بڑے علماء و صلحاء بھی باوجود تقوی و طہارت ان رسوم سے آگاہ نہیں ہوتے اور ان میں تساہل برتتے ہیں، اور یہ تساہل بوجہ حسن ظن کے پیش آجاتا ہے (یا بوجہ غلبہ حال کے نظر ہی نہیں پڑتی) اور وہ عام لوگوں کے اغراض و عقائد پر مطلع نہیں ہوتے۔ اور ان رسوم کے مفاسد متعدیہ کی طرف جو مآل کار ظاہر ہوتے ہیں بوجہ رقیق ہونے کے ان کی نظریں نہیں پہنچتیں۔ ان مفاسد کا معلوم کرنا ایسے ہی شخص کا خاص حصہ ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے قلع قمع کے لئے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ حکایت ہے کہ حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ اپنے چچا مولانا شاہ عبدالقادر صاحب محدث کے گھر تشریف لے گئے۔ معلوم ہوا کہ عورتوں نے بی بی کی صحنک کی ہے۔ مولانا شہید نے منع فرمایا۔ اس پر ان کے چچا عبدالقادر صاحب نے فرمایا کہ اسماعیل یہ تو ایصال ثواب ہے تو اس میں کیا ہرج ہے۔ مولانا شہید نے جواب دیا کہ یہ بھی تو اس "حجر" میں داخل ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے "وقالوا ہٰذہ انعام و حرث حجر لا یطعمہا الا من نشاء بزعمہم ۔" چنانچہ اس میں بھی یہ شرطین لگائی جاتی ہیں کہ عورتیں کھائیں، مرد نہ کھائیں اور وہ بھی سوہاگنیں کھائیں شاہ عبدالقادر صاحب نے فرمایا کہ واقعی اب تک یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی تھی، اور حقیقت یہی ہے جو تم کہتے ہو"۔

"ایسا ہی حضرت سید احمد صاحب بریلوی" کا قصہ مفتی الٰہی بخش صاحب کاندہلوی کے ساتھ ہوا کہ حضرت سید صاحب مفتی صاحب کے گھر تشریف لائے۔ گھر کے اندر سے ایک لڑکا ماما کی گود میں باہر لایا گیا جس کے ہاتھوں میں چاندی یا سونے کے کڑے تھے اور وہ لڑکا مفتی صاحب کے خاندان کا تھا۔ حضرت سید صاحب نے فرمایا کہ مفتی صاحب یہ تو حرام ہے مفتی صاحب نے فرمایا کہ والدہ سے کہہ دینا کہ سید صاحب فرماتے ہیں کہ یہ حرام ہیں۔ تھوڑی دیر میں پھر ماما آئی اور مفتی صاحب سے کہا کہ آپ کو والدہ بلاتی ہیں فرمایا چلو آتے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر میں تقاضا ہوا اور یہی جواب ملا۔ کئی بار کے بعد سید صاحب نے فرمایا کہ والدہ بلاتی ہیں ہو آیئے کچھ ضرورت ہوگی مفتی صاحب نے فرمایا کہ حضرت کچھ بھی ضرورت نہیں ایک فضول واہیات کام کے لئے بلاتی ہیں۔ سید صاحب نے پوچھا کیا کام ہے۔ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ شادی ہے اور چاول کوٹنے کے لئے موسل میں ڈورا بند ہوا تی ہیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ مولانا یہ تو شرک ہے۔ اس پر مفتی صاحب نے فرمایا کہ والدہ سے کہہ دو سید صاحب فرماتے ہیں کہ یہ شرک ہے۔ یہ باتیں جس مجلس میں ہو رہی تھیں، اس میں ایک شخص نے دلیری سے مفتی صاحب سے کہا کہ سب کچھ سید صاحب ہی فرماتے ہیں، آپ بھی کچھ فرماتے ہیں۔ آپ نے کس واسطے پڑھا تھا گویا آپ کچھ جانتے ہی نہیں۔ اس پر مفتی صاحب نے فرمایا کہ بھائی سچ یہ ہے کہ ہماری مثال اس صندوق کی سی ہے جو جواہرات سے پر ہو، مگر وہ صندوق ان جواہرات کی قدر و قیمت کو نہیں پہنچانتا، بلکہ

جوہری پرکھ کر ہر ایک کی قیمت کو بتاتا ہے اسی طرح ہم نے
سب کچھ پڑھا مگر جو سید صاحب نے سمجھا وہ ہم نے نہیں
سمجھا۔ تو سید صاحب جوہری ہیں اور ہم صندوق۔ (۱) "

مبعوثیت مجدد. ان دونوں حکایتوں سے ظاہر ہے کہ عام صلحا اور اہل اللہ کیا معنی ان میں جو بڑے بڑے محدث و فقیہ ہوتے ہیں ان کا بھی مجدد ہونا ضروری نہیں۔ وہ تو بقول حضرت مفتی الٰہی بخش رحمتہ اللہ علیہ کے دینی علوم کے جواہر کا صندوق ہوتے ہیں باقی ان جواہر کی قدر و قیمت کی پرکھ کے لئے تو جوہری کی نگاہ لابد ہے، اور اسی لئے یہ ایسے ہی شخص کا خاص حصہ ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے دقیق سے دقیق دینی مفاسد پہچاننے کی نظر عطا فرمائی ہو اور ان کے قلع قمع کرنے کے لئے ہی پیدا فرمایا ہو" وہی بات کہ مجدد بھی نبی کی طرح مبعوث ہوتا یعنی تجدید دین کی خدمت کے لئے پیدا ہی فرمایا جاتا ہے۔ لہٰذا ہر ولی و بزرگ یا محدث و فقیہ تو مجدد نہیں ہوتا، لیکن اکابر مجددین کا کسی نہ کسی درجہ میں مفسر و محدث و فقیہ و صوفی سب کچھ ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ تجدید دین کے لئے علم دین ضروری ہے ورنہ تجدید کرے گا کس چیز کی۔ ہر غیر متعصب صاحب بصیرت مجدد تھانوی علیہ الرحمتہ کی کتابوں پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لے سکتا ہے کہ تفسیر و حدیث فقہ و کلام تصوف و فلسفہ کون سا ایسا علم ہے، جس کا دین سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کچھ بھی تعلق ہے اور جس پر مصنف کی نظر نہیں۔ کسی میں عبور و مہارت تو کسی سے بقدر ضرورت واقفیت۔ مگر غیر معمولی عقل و فہم و بصیرت کی بنا پر سب کے مغزوتہ تک رسائی۔ ولیس علے اللہ بمتنکر ان یجمع العالم فی واحد۔

مخلوق سے استغنا. ایک اور اہم وصف جو دین کی ہر چھوٹی چھوٹی خدمت کو صحیح طور پر بجا لانے کی ضروری شرط ہے (چہ جائیکہ خدمت تجدید) وہ مخلوق سے زیادہ سے زیادہ بے غرضی و استغنا ہے۔ جس کو انبیاء علیہم السلام کی زبان سے یوں کہلایا گیا ہے کہ "لا

۱۔ مقالات حکمت ص ۱۹۴

اسئلکم علیہ اجراان اجری الا علے اللہ (۱) " ظاہر ہے کہ جس قدر غیر اللہ یا خلق کا دل و دماغ پر دباؤ ہو گا، اسی قدر علم حق کی فہم کا دروازہ بند ہو گا اور راہ حق میں زبان کا کھلنا اور قدم کا اٹھنا دشوار ہو گا۔ یہ وصف حضرت کی زندگی کے ہر شعبہ میں اس درجہ ابھرا ہوا تھا کہ ناواقفوں کو بعض دفعہ خشکی اور درشتی کا گمان ہوتا تھا۔ ہمارے ایک فرشتہ صفت و سلیم الفہم دوست نے ایک مرتبہ بڑے پتہ کی بات فرمائی کہ حضرت جن باتوں پر متغیر ہوتے اور ناگواری کا اظہار فرماتے ہیں، ہم کو بھی ان پر تغیر ہوتا ہے، مثلاً ایک موقع پر ایک صاحب جو حضرت کے قریب بیٹھے تھے حضرت کے خط کو گھورنے لگے، اس پر اٹھا دیا اور فرمایا کہ "اول تو بدوں اجازت کسی کے خط کا دیکھنا شرعاً ناجائز ہے، دوسرے اس سے کاتب کا قلب مشوش ہوتا ہے۔ اور کون بے حس ہو گا جس کو کسی ایسی بے ہودہ بات پر ناگواری نہ ہو لیکن ہم بالعموم اپنی کسی غرض اور نفع و ضرر کی کسی امید و خوف کی بنا پر دب اور گھٹ کر رہ جاتے ہیں، لیکن حضرت چونکہ کسی سے کوئی ذاتی غرض نہیں رکھتے، اس لئے ناراضی اور غصہ کے موقع پر آخر نام نہاد حلم و مروت سے کیوں کام لیں۔ گو ظاہر ہے کہ حضرت بشریت سے خالی نہ تھے، تاہم حضرت کا تغیر ایسے موقع پر بھی شاید ہی کبھی خود مخاطب کی تعلیم و تنبیہ کے نفع سے خالی ہوتا ہو گا۔ البتہ یہ نفع لوگوں کو بالعموم جب ہی ہوتا ہے، کہ بے ہودہ و نامناسب بات پر کچھ نہ کچھ ناراضی کے لہجہ میں تنبیہ ہو۔ یوں بھی بقول حضرت ہی کے تادیب کے وقت غلامی کا لہجہ نہیں ہو سکتا. خصوصاً آج کل کے طبائع جیسے بلید و بے حس ہو گئے کہ محض نرمی کو اکثر خوشامد پر محمول کیا جاتا ہے۔

مالی استغنا. سب سے دشوار مالی استغنا ہے۔ رائج الوقت پیری و مریدی ایک مستقل معاشی پیشہ بن گیا ہے، اور بلا کسی شرط و تحقیق کے مرید کر لینا تو عام دستور ہے لیکن حضرت کے ہاں اس چیز میں بھی ہر چیز کی طرح حدود و قیود تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ، مجھ کو فوج تھوڑا ہی جمع کرنا ہے، نہ دوکان چلانا ہے" ۔ ہر مرید سے یا بیعت کے وقت تو قطعاً کچھ نہ قبول فرماتے تھے۔ البتہ ہدیہ کے طور پر ایسے مخلص خادموں سے کچھ قبول فرما لیتے جن کے اخلاص کا یقین

۱۔ تم سے میں قطعاً کوئی اجر نہیں چاہتا. میرا اجر صرف اللہ پر ہے۔

و تجربہ ہوتاہ بھی اس کڑی شرط کے ساتھ کہ "تھادو اتحابوا" کے تحت محض محبت کی راہ سے پیش کیا گیا ہو جس میں ثواب کی بھی نیت یا دعا تک کی درخواست نہ ہو۔ کسی نے لکھا کہ پانچ روپیہ بھیجنا چاہتا ہوں اور آنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ فرمایا کہ "اب ملاحظہ ہو ناگواری ہو کہ نہ ہو۔ دونوں کو جمع کیا ہے۔ اصل میں ہم لوگوں کو طماع حریص سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے ان حرکات کی۔ میں بھی ایسا جواب دوں گا کہ طبیعت خوش ہو جائے گی (۱)" غرض جہاں اس طرح کا کوئی قرینہ یا شبہ ہو جاتا انکار فرما دیتے یا لینے کے بعد واپس فرما دیتے۔ بارہا کثیر رقموں تک کے منی آرڈر واپس ہو جاتے یہ بھی شرط تھی کہ ہدیہ کی مقدار اتنی قلیل ہو کہ پیش کرنے والے پر بار بالکل نہ ہو۔ احقر کا تجربہ ہے کہ قلیل کو زیادہ مسرت کے ساتھ قبول فرماتے۔ لوگ اس طرز سے اتنا مانوس و بے تکلف ہو گئے تھے کہ ایک دفعہ کسی خادم نے غالباً لکنی پیش کی اور عرض کیا کہ تین پیسے ہدیہ ہیں اور ایک پیسہ واپس فرما دیں، نہایت خوش ہو کر قبول فرمائے۔ اپنی ذات خاص ہی کے لئے نہیں بلکہ مدرسہ و خانقاہ کے لئے بھی اسی طرح کی احتیاط و استغنا کا معمول تھا۔ ایک صاحب ـــ مدرسہ کے لئے غالباً دو سو روپے بھیجے۔ قبول فرمالیا۔ پھر دوسرے سال جب بھیجا تو لکھا کہ معمول کے موافق روپیہ بھیجتا ہوں لیکن اگر سال گذشتہ کی طرح اس مرتبہ بھی رسید نہ آئی تو آئندہ بند کر دوں گا۔ منی آرڈر وصول نہیں فرمایا اور تحریر فرمایا کہ تم آئندہ سال بند کروگے ہم امسال ہی بند کرتے ہیں۔ (۲)"

دو چار دن بھی جو حاضر رہتا اس کو کچھ اور حاصل ہو نہ ہو، لیکن مال و مخلوق سے حضرت کے کامل استغنا و بے غرضی کا پورا تجربہ یقین تو کرنا ہی پڑتا تھا۔ اپنے بڑے خاص اور بڑے مخلص مرید و مجاز مصطفیٰ صاحب کو معالجہ کے سلسلہ میں ایک مرتبہ ایک اشرفی عطا فرمائی، کہ جب استطاعت ہے، تو طبیب خواہ مرید ہی کیوں نہ ہو اس کی خدمت کا بھی خیال کیا جائے۔

امرا سے استغنا۔ حیدر آباد جانے والے علماء و مشائخ میں بہت ہی کم کوئی ہو گا، جو اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ کی خدمت میں باریابی کی آرزو او وظیفہ و منصب وغیرہ کی طمع دل میں نہ

۱۔ الافاضات ص ۴۷-۴

۲۔ اشرف السوانح حصہ اول ۱۰۸

رکھتا ہو اور اس کے لئے کھلی چھپی کوشش نہ کرتا ہو۔ لیکن حضرت تشریف لے گئے تو اس کا ماجرا ذرا تفصیل سے خود حضرت ہی کی زبان مبارک سے سننے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"اہل علم کے لئے یہ بات ہی ناپسندیدہ ہے کہ وہ امرا سے خلط کریں۔ اس لئے غربا کو جو مصلح سے نفع ہوتا ہے، امرا سے وہ بھی آیا گیا ہو جاتا ہے۔ قلوب پر مصلح کا وہ اثر نہیں رہتا۔ مجھ کو حیدر آباد دکن میں ایک دوست نے مدعو کیا تھا۔ دیو بند کے بعض احباب خاص اہل علم نے مشورہ دیا کہ وہاں نواب صاحب سے ملاقات ضروری ہے۔ میں نے کسی کو کوئی جواب نہیں دیا۔

وہاں پہنچ کر سات ہی روز گزرے تھے کہ فلاں نواز جنگ کا ایک پرچہ آیا جس میں لکھا تھا کہ ایک عرصہ سے مجھ کو زیارت کا اشتیاق تھا، مگر بدقسمتی سے تھانہ بھون کی حاضری نہ ہوئی۔ برائے زیارت حاضر ہونا چاہتا ہوں اور فلاں فلاں وقت اپنے فرائض منصبی سے فرصت ملتی ہے (مطلب یہ کہ اس کی رعایت سے مجھ کو وقت بتلایا جائے)۔

مجلس میں حضرت کے استفسار پر معلوم ہوا کہ یہ "فلاں جنگ صاحب" نواب صاحب کے ناک کے بال اور ارکان سلطنت میں سے ہیں۔ اب ان کے پرچہ کا جواب حضرت والا کی طرف سے ملاحظہ ہو کہ ہمارے کتنے علماء و مشائخ ایسوں سے ایسا استغنا برت سکتے ہیں تحریر فرمایا کہ

"بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کے دل میں دین اور اہل دین کی عظمت و محبت ہے مگر نیچے کی سطر پڑھ کر افسوس کی بھی کوئی حد نہ رہی کہ اس میں فہم سے کام نہ لیا گیا جس کے ملنے کو زیارت سے تعبیر کیا گیا اس کو تو اپنے اوقات فرصت بتلا کر پابند کیا گیا اور خود آزاد رہے۔ یہ کون سی فہم و تہذیب کی بات ہے"

اس پر نواز جنگ صاحب نے اپنی بدفہمی کی معافی چاہ کر دوبارہ لکھا کہ "حضرت والا ہی اپنی ملاقات کے اوقات تحریر فرمادیں"۔ حضرت کی طرف سے مزید تعلیم و امتحان ملاحظہ ہو جواب میں لکھا کہ

> "اب بھی پورے فہم سے کام نہیں لیا گیا۔ مردہ بدست زندہ کی طرح مہمان میزبان کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اس لئے سفر میں اوقات کا ضبط ہونا غیر اختیاری ہے۔ آپ ساتھ رہیں، جس وقت مجھ کو فارغ دیکھیں ملاقات کر لیں"۔

اس جواب پر جواب آیا کہ بدفہمی پر بدفہمی ہوتی چلی جارہی ہے۔ میں نہ اب اپنے اوقات کو ظاہر کرتا ہوں نہ حضرت سے معلوم کرتا ہوں، جس وقت فرصت ہوگی حاضر خدمت ہو کر زیارت سے مشرف ہو جاؤں گا۔ اگر آپ کو فرصت نہ ہوئی لوٹ آؤں گا"۔ امتحان کی اس کامیابی پر حضرت نے پھر کیسی دلجوئی و مسرت کی سند عطا فرمائی کہ

> "اب پورے فہم سے کام لیا گیا، جس سے اس قدر مسرت ہوئی کہ پہلے آپ کا میری زیارت کو جی چاہ رہا تھا اب میرا آپ کی زیارت کو جی چاہنے لگا۔ اگر فرصت ہو آپ تشریف لے آئیں ورنہ مجھ کو اجازت فرمایئے خود حاضر ہو جاؤں"۔

سبحان اللہ تذلل و تکبر دونوں سے اہل علم و اہل دین کو بچانے کی کیسی تعلیم فرمائی۔ آگے خود اہل مجلس کو خطاب فرما کر فرمایا کہ

> "یہ میرا طرز اس لئے تھا کہ یہ دنیا کے لوگ جس قدر بڑے ہیں اہل دین کو بے وقوف سمجھتے ہیں ان کو یہ دکھلانا تھا کہ اہل علم و دین کی یہ شان ہے تو پہلے تذلل سے بچنا مقصود تھا مگر جب وہ اپنی کوتاہی تسلیم کر چکے تو اب کھنچنا تکبر تھا۔ اللہ کا شکر ہے دونوں سے محفوظ رکھا"۔

غرض اس کے بعد "وہ صاحب خود ہی آ گئے۔ اہل مجلس میں بعضوں نے دور سے دیکھ کر کہا فلاں صاحب آ رہے ہیں۔ حضرت ڈاک لکھ رہے تھے برابر لکھتے رہے جس وقت

انہوں نے پہنچ کر السلام علیکم کہا تب حضرت فرماتے ہیں کہ۔

"میں نے سلام کا جواب دیا اور کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔ بیچارے بہت ہی مہذب تھے دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنی برابر جگہ دے کر کہا بھی کہ اس طرف آ جایئے اس پر کہا کہ مجھ کو یہیں آرام ملے گا۔ کچھ دیر میرے سوال پر نواب صاحب کی بیدار مغزی اور انتظام سلطنت کے واقعات بیان کرتے رہے۔ اس کے بعد کہا اگر نواب صاحب سے ملاقات ہو جائے تو بہت مناسب ہے"۔

اب حضرت حکیم الامت کی حکمت آموزی اور تعلیم کے مزید اسباق کان لگا کر سنیں۔ پہلا سوال یہ ہوا کہ

"یہ آپ کی خواہش ہے یا نواب صاحب کی۔ کچھ سکوت کے بعد کہا کہ میری خواہش ہے میں نے سوال کیا کہ جس وقت آپ نے ملاقات کے مناسب و نامناسب ہونے پر غور فرمایا ہو گا اس پر بھی ضرور غور فرمایا ہو گا کہ ملاقات سے نفع کس کا ہے۔ کہا نواب صاحب کا۔ میں نے کہا نفع تو نواب صاحب کا اور ملاقات کی ترغیب مجھ کو دی جا رہی ہے۔ طالب کو مطلوب اور مطلوب کو طالب بنایا جا رہا ہے۔ اس پر کوئی جواب نہیں دیا۔ "

یہ سوالات ہی بچلا رے کے خواب و خیال میں کب گزرے ہوں گے کہ جواب دیتے۔ ان کو سابقہ اب تک ایسے علما و مشائخ سے پڑا تھا، جو خود ہی طرح طرح کے ظاہر و مخفی وسائل و ذرائع سے باریابی کے طالب و ساعی ہو کر آتے ہیں۔ آگے غور سے اس سوال کی دینی و تجدیدی حکمتوں کو خود حکیم الامت و مجدد ملت کی زبان مبارک سے سنیئے کہ۔

"اب میں خود اس کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ اس صورت میں کہ میں خود ملاقات کو جاؤں حضرت ہی

مضرت ہے نفع کچھ نہیں یہ تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اگر
ملاقات کو گیا تو وہ مطلوب اور میں طالب ہوں گا، تو اس
صورت میں ان کو تو مجھ سے کوئی نفع نہ ہو گا۔ ہاں ان سے
مجھ کو ملے گی یعنی دنیا اور وہ بقدر ضرورت بحمد اللہ میرے پاس
بھی ہے اور جو میرے پاس ہے وہ بقدر ضرورت بھی ان کے
پاس نہیں۔ یعنی دین۔
"اور اگر میں گیا بھی اور جو ان کے پاس ہے (یعنی دنیا
منصب و وظیفہ وغیرہ کی صورت میں) وہ مل بھی گئی تو اس
صورت میں ایک خاص ضرر بھی ہے کہ اگر قبول کرتا ہوں تو
اسے مسلک کے خلاف اور اگر نہیں کرتا تو اداب شاہی کے
خلاف۔ کیونکہ قبول نہ کرنے میں ان کی سبکی اور اہانت ہو
گی۔ اور چونکہ اس وقت میں ان کے حدود میں ہوں اس کی
پاداش میں (اخراج وغیرہ) جو چاہیں میرے لئے تجویز کر
سکتے ہیں، تو نواب صاحب کو کوئی نفع نہ ہو گا اور میرا نقصان ہو
گا"۔

آگے بعض اور مصالح بیان فرما کر ملاقات کی صحیح صورت بیان فرمادی، جو نواب صاحب ہی کی شان و مرتبہ کے مناسب تھی، تاکہ اگر ان کو واقعی کوئی دینی طلب و شوق ہے، تو دینی نفع سے وہ اور دینی خدمت سے حضرت محروم نہ رہیں۔ لہٰذا فرمایا کہ

"یہ امر بھی شان سلاطین کے خلاف ہے کہ وہ اپنی رعایا کے
مدعو کئے ہوئے شخص سے ملاقات کریں اس میں کم فہم لوگ
ان کو تنگ دلی کی طرف منسوب کریں گے۔ جس میں ان کی
اہانت ہے کہ کیا خود نہیں مدعو کر سکتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ خیر
اسی میں ہے کہ نہ میں ان کے پاس جاؤں نہ وہ میرے پاس
آئیں۔ اگر ان کا جی چاہے تو تھانہ بھون سے مجھ کو بلالیں میں

خاص شرائط کر کے آ جاؤں گا کچھ عذر نہ ہو گا۔ یہ سن کر نواز
جنگ صاحب کی آنکھیں کھل گئیں اور کہا کہ ان چیزوں پر تو
ہم لوگوں کی نظر بھی نہیں پہنچ سکی"۔

وہ بیچارے جس دنیا کے آدمی تھے ان کی نظر کیا پہنچتی! ضرورت ہے کہ دین کے علماء و مشائخ کی آنکھیں کھلیں اور ان کی نظر ان باتوں تک پہنچے۔ ورنہ امرا کے درباروں میں حاضری اور دربار داری سے دنیا تو شاید کچھ مل جاتی ہو. لیکن دین اپنا ان کا اور دوسروں سب کا کھوتے ہیں۔ راقم احقر کو حیدر آباد ہی میں بارہا اس کے تجربات ہوئے کہ جو اہل علم و دین خود طالب اور امرا کو کسی اعتبار سے بھی مطلوب بنا کر جاتے ہیں. خواہ کسی کی سفارش ہی کے لئے، وہ کچھ نہ کچھ مروت و مداہنت اور تملق پر لازماً مضطر ہوتے ہیں۔ اور حس ہو تو علم و دین ہی کی نہیں، خود اپنی اچھی خاصی ذلت تو آدمی ضرور محسوس کرتا ہے۔ مگر اکثر بے حسی کا یہ عالم دیکھا کہ اس ذلت کو الٹے فخر و عزت جان کر گاتے پھرتے ہیں!

"غرض کہ امرا سے علما کا خلط کرنا (ملنا و جلنا) اس میں امرا کا
تو کوئی (معتدبہ) نفع نہیں ور اہل علم کے اور غربا کے دین کے
نقصان ہوتا ہے اس لئے میں اس کو ناپسند کرتا ہوں۔ (۱)"

تاہم حضرت امرا کے ساتھ کوئی اہانت کا برتاؤ نہ فرماتے بلکہ ان کے مرتبہ کا ظاہری اکرام فرماتے، البتہ قلب میں محض ان کی امارت و دولت کی بنا پر کوئی عظمت نہ تھی۔ فرماتے ہیں کہ "ان کی خاطر و مدارات تو کر دیتا ہوں لیکن عظمت بالکل قلب میں نہیں"۔ چنانچہ اگر کوئی بے تمیزی یا بے ڈھنگے پن کی بات کرتا. تو حضرت محض اس کی امیرانہ عظمت کی وجہ سے طرح نہ دیتے۔ اس لئے امرا میں حضرت سے تعلق کی سعادت وہی حاصل کر سکتا تھا. جو اپنی امیری کو طاق پر رکھ کر آتا۔

"مظفر نگر کے سفر میں ایک معزز رئیس جو بہت بیباک اور تیز

۱۔ یہ ملفوظ خود حضرت کے مال و جاہ دونوں سے استغنا کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد کا جامع تھا اس لئے قریب قریب پورا نقل کر دیا گیا (افاضاعت حصہ چہارم صفحہ ۵۶ تا ۶۳) ۲۔ اشرف السوانح حصہ اول ص ۱۰۸

زبان تھے اور بڑے بڑے حکام کے سامنے نہ جھکتے تھے حضرت والا سے کوئی بےڈھنگی بات پوچھی۔ حضرت نے حسب معمول انھیں ڈانٹا اور یہاں تک ناگواری بڑھی کہ مجلس سے اٹھ جانے کو فرمایا، وہ پھر بھی بیٹھے رہے تو حضرت والا خود اٹھ کھڑے ہوئے .... اور فرمایا کہ "میں ایسے شخص کی ہم نشینی بھی نہیں گوارا کر سکتا۔ اس پر انہوں نے دست بستہ عرض کیا کہ حضرت نہ اٹھیں میں خود ہی جاتا ہوں" اور بعد کو کہا کہ میرا تو عمر بھر کے لئے علاج ہو گیا، (الکبر مع المتکبرین عبادۃ)

اگر تمول سے کچھ بھی رغبت ہوتی، تو ایک متمول باپ کے وارث ہو کر جائداد و زمینداری سے کیوں دست بردار ہو جاتے۔ جو مال و جاہ دونوں کا ذریعہ تھی، اس سے بڑھ کر خود اپنی تصنیفات و تالیفات ہی سے لاکھوں کے مالک بن جا سکتے تھے، جن سے خدا جانے کتنوں نے کیا کچھ نہیں کمالیا۔ مگر حضرت کے دل میں کبھی اس کا وہم نہیں آیا، بلکہ اتنا بعد تھا کہ کوئی کسی کتاب کی فرمائش خود حضرت کی خدمت میں بھیج دیتا تو ناگوار ہوتا اور فرماتے کہ کیا میں نے دوکان کھول رکھی ہے، بلکہ اس کا اعلان فرما دیا تھا کہ کتابوں کی طباعت و اشاعت سے قطعاً کوئی سروکار نہیں رکھتے، اصل یہ ہے کہ مجدد مبعوث کے قلب کو طبعاً اللہ تعالیٰ نے اول دن ہی سے مال کی طمع و محبت سے بالکل بےلوث کر رکھا تھا۔ عین شباب میں جو ہر قسم کی امنگوں اور حوصلوں کا عہد ہوتا ہے، فرماتے ہیں کہ "میں جب کبھی طالب علمی میں سوچا کرتا تھا تو زیادہ سے زیادہ دس روپیہ ماہوار کی مدرسی اپنی ضروریات معاش کے لئے کافی سمجھتا تھا۔ پانچ روپیہ اپنے خرچ کے لئے اور پانچ روپیہ گھر کے خرچ کے لئے، بس اس سے زیادہ کی تنخواہ پر نظر ہی نہ جاتی تھی"۔ بڑی تنخواہ سے طرح طرح کے مادی حوصلے ہی نہیں پورے ہوتے بلکہ عزت د جاہ کا بھی بڑا ذریعہ ہے، دس روپیہ کے چاکر کی کیا وقعت۔ حضرت کے والد بڑے دانشمند اور صاحب فراست تھے ان کو حضرت کی اس نظر کا ہی سے اتنا وثوق تھا کہ ایک موقع پر فرمایا کہ یاد رکھو وہ میرے بعد میرے مال و متاع سے بالکل الگ

رہے گا۔ اور ظاہر ہے کہ کامل للہیت کے ساتھ جب تک جاہ و مال سے بھی کامل استغنا نہ ہو دین کی تبلیغ و تجدید کا حق کیا ادا ہو سکتا ہے یہ وصف اتنا غیر معمولی طور پر نمایاں تھا کہ رات دن کا تجربہ رکھنے والے خوب جانتے تھے کہ کوئی شخص بھی جاہ و مال کی خاطر ایک کلمہ بھی حضرت کی زبان سے نہیں نکلوا سکتا تھا۔ اپنی ذات کا ذکر ہی کیا مدرسہ وغیرہ کسی دینی کام میں چندہ تک کے لئے شخصی تخاطب کے روادار نہ تھے۔ بس زیادہ سے عمومی اعلان و اطلاع کو جائز رکھتے تھے۔ وعظوں میں بھی چندہ کی تحریک سے ابتداہی سے احتراز تھا، مدرسہ فیض عام کانپور کی مدرسی سے علیحدگی کا سب سے بڑا سبب یہی ہوا کہ علما و مدرسین کے لئے چندہ مانگنے کے کام کو بہت ناپسند فرماتے کہ اس غرض اور دباؤ کی بدولت وہ آزادی و استغنا کے ساتھ احکام کی تبلیغ نہ کر سکیں گے۔ اس زمانہ میں اس کی طرف کسی کا ذہن بھی نہیں جاتا اور اچھے اچھے لوگوں کو دیکھا کہ اساتذہ کو بے تکلف تحصیل وصول کی خدمت سپرد کر دی جاتی ہے۔ اور یہ موٹی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ خود دین کے کام کو بے دینی کی راہوں سے کرنا کیسی بے اصولی ہے۔ لیکن اس فہم کا کیا علاج کہ مدرسہ کا نفس بقا ایسا مقصود بالذات بنا لیا جاتا ہے کہ بس وہ کسی طرح نہ ٹوٹے خواہ خود دین اور اس کے اصول پاش پاش ہو جائیں۔ حضرت ایسے مواقع پر بے دھڑک فرما دیتے کہ مدرسہ رہے نہ رہے، لیکن کام تو اصول ہی سے ہو گا۔

> "ایک مہتمم مدرسہ کا خط آیا کہ خرچ بڑھا ہوا ہے اور آمدنی نہیں، سخت پریشانی ہے۔ فرمایا کہ میں تو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ اس کی وحی تو ہوئی نہیں کہ فلاں خاص پیمانہ پر ہو تو مدرسہ کہلائے گا ورنہ نہیں۔ ارے بھائی کام کم کر دو خرچ خود کم ہو جائے گا۔ اور اگر بالکل ہی آمدنی نہ ہو مدرسہ بند کر دو۔ کوئی فرض نہیں۔ واجب نہیں۔ ظاہر ہے کہ آمدنی کا ہونا اختیاری نہیں، مگر خرچ کم کر دینا اختیاری ہے۔
>
> "میرٹھ کے ایک رئیس نے بڑے کام کی بات کہی تھی کہ لوگ عموماً آمدنی بڑھانے کی فکر کرتے ہیں، جو غیر اختیاری

ہے۔ خرچ کے گھٹانے کی فکر نہیں کرتے جو اختیاری ہے۔
اکثر دنیا داروں کو ایسی حکمت کی باتیں سوجھتی بھی کم
ہیں۔ (۱) "

تقویٰ: جس نے مال و جاہ سے اپنی نظر کو ہٹا لیا، اس کے سارے چھوٹے بڑے معاملات میں تقویٰ آسان ہے۔ جس کے واقعات حضرت کی زندگی میں قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ اس کا اندازہ ذیل کے ایسے دو چار واقعات سے کیا جا سکتا ہے جن تک اوروں کی نظر نہیں جاتی، بلکہ بعض تو غایت دلیری سے ان کو محقرات امور قرار دے کر استہزا کرتے ہیں۔

"ایک مقام پر رخصت کے وقت گاؤں کے چودہری نے دو سو روپیہ جمع کر کے حضرت کو نذرانہ دیا............ حضرت کو شبہ ہوا کے اکیلے چودہری صاحب، تو اتنی بڑی رقم دینے کی حیثیت نہیں رکھتے ضرر چندہ کیا ہو گا۔ لہٰذا حضرت والا نے سوال کیا کہ اکیلے آپ ہی کی طرف سے ہے یا اور بھی اس میں شریک ہیں۔ جواب ملا کہ اوروں سے بھی لیا گیا ہے۔ حضرت والا نے فرمایا کہ ہدیہ تو محبت کے لئے ہوتا ہے، جب دینے والے کو میں نہیں جانتا تو مجھ کو ان کی محبت کیسے ہو گی، اس لئے ہر ایک کی رقم واپس کر دو پھر جس کو دینا ہو خود آ کر الگ الگ دے تاکہ معلوم ہو کہ یہ میرا محسن ہے، اور مجھے اس سے محبت ہو۔ چودہری جی نے عذر کیا کہ آپ تو اب جا رہے ہیں۔ فرمایا کہ میں بہت قریب مقام پر جا رہا ہوں جہاں پہنچنا سب کو آسان ہے۔ مگر کسی نے آ کر ایک روپیہ بھی نہ دیا۔ محض رسم تھی۔ پھر معلوم ہوا کہ بعضے علماء جو یہاں آتے ہیں اگر ان کی خدمت نہیں کی جاتی یا نذرانہ کم ہے تو برا مانتے ہیں"۔ (اشرف السوانح ص ۹۸)

۱۔ الافاضات ص ۳۳۱

"ریاست بہاولپور کی طرف سے کسی موقع پر حضرات علما کو جو وہاں مدعو تھے جن میں حضرت والا بھی تھے ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیہ بعنوان خلعت اور پچیس پچیس روپیہ بنام دعوت عطا کئے گئے۔ اس وقت تو اس رقم کو حضرت والا نے دیگر علما کے ساتھ بخیال احترام رئیس قبول فرمالیا۔ لیکن بعد کو خلوت میں وزیر صاحب سے عذر کیا کہ اس کو مجھ سے واپس لے لیا جائے کیونکہ بیت المال میں سے دیا گیا ہے، جس کا مصرف میں نہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ اب تو کاغذات میں بھی اندراج ہو گیا واپسی کی کوئی صورت نہیں۔ حضرت والا نے فرمایا کہ خیر اگر خزانہ میں واپسی نہیں ہو سکتی، تو اس رقم کو مقامی علما و طلبا میں صرف کر دیا جائے کیونکہ شرعاً بیت المال کے وہی مصرف قریب ہیں" (اشرف السوانح ص ۱۰۴)

"کسی رئیس نے دو سو روپیہ خانقاہ کے مدرسہ امداد العلوم کے لئے بھیجا، ساتھ ہی تشریف آوری کی بھی درخواست کی۔ حضرت نے روپیہ واپس فرما دیا اور لکھا کہ اگر اس کے ساتھ بلانے کا مضمون نہ ہوتا تو مدرسہ کے لئے روپیہ لے لیا جاتا۔ اور دونوں باتوں کے اقتران سے احتمال ہوتا ہے کہ شاید مجھ کو متاثر کرنے کے لئے یہ رقم بھیجی گئی ہے (اشرف السوانح ص ۹۹)

"حیدر آباد میں کسی معمر صاحب علم نے اپنی مستورات کو حضرت والا سے مرید کرانا چاہا۔ انہوں نے اس کی کوشش کی کہ بے پردہ سامنے آنے کی اجازت دے دی جائے، لیکن حضرت والا نے منظور نہ فرمایا۔ بالآخر انہوں نے یہ ترکیب نکالی کہ ان کو برقع میں بٹھلا دیا، اور جب حضرت والا مرید

کرنے کے لئے اس مجلس میں بیٹھے تو بڑے میاں بولے کہ منہ کھول دو ان سے پردہ کیا۔ اب حضرت والا بہت تنگ ہوئے۔ لیکن بجائے اسؒ کے کہ حضرت والا بڑے میاں سے قیل وقال کرتے جس میں کامیابی نہ ہو سکتی اور اتنے میں وہ اپنا منہ کھول دیتیں۔ حضرت والا نے فوراً خود برقع والیوں ہی سے للکار کر کہا کہ خبردار جو منہ کھولا .... چونکہ مرید ہونے بیٹھی تھیں ان کو حضرت والا ہی کا حکم ماننا پڑا"۔
(اشرف السوانح ص ۱۰۵)

"ایک مرتبہ سہارنپور سے کانپور تشریف لے جا رہے تھے کچھ گنے ساتھ تھے بغرض ادائی محصول اسٹیشن پر تلوانا چاہا۔ کسی نے تولا نہیں بلکہ ازراہ عقیدت غیر مسلم ملازمین ریلوے نے بھی کہہ دیا کہ آپ یوں ہی لے جایئے ہم گارڈ سے کہہ دیں گے۔ حضرت نے فرمایا گارڈ کہاں تک جائے گا کہا غازی آباد تک۔ فرمایا غازی آباد سے آگے کیا ہو گا! کہا گیا یہ گارڈ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا۔ حضرت نے فرمایا کہ پھر آگے کیا ہو گا۔ کہا بس وہ کانپور تک جائے گا اور سفر ختم ہو جائے گا۔ فرمایا نہیں وہاں سفر ختم نہ ہو گا آگے ایک اور سفر آخرت بھی ہے۔ وہاں کیا انتظام ہو گا؟ یہ سن کر سب دنگ رہ گئے اور بے حد متاثر ہوئے۔ بہت سے اور بھی تعلیم یافتہ ہندو بابو وغیرہ کھڑے تھے سب آپس میں کہنے لگے کہ ایسے بھی خدا کے ایماندار بندے موجود ہیں جو اس قدر احتیاط کرتے اور خدا سے ڈرتے ہیں۔ "

متحرک تبلیغ: اللہ تعالیٰ سے حقیقی خوف و تقویٰ یہی ہے کہ ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں اس کی رضا و ناراضی کا خیال تمام دنیاوی مصالح و اغراض پر غالب رہے، یہی اسلام کی حقیقی و زندہ تبلیغ ہے، کہ مسلمان کی متحرک زندگی میں کھلی آنکھوں اپنے پرائے سب کو اسلام کی تعلیمات زندہ و متحرک چلتی پھرتی نظر آئیں۔ حضرت مجدد تھانوی کا یہی رنگ تھا، کہ جہاں تک معاصی کا تعلق تھا صغائرا و کبائر سے یکساں احتراز تھا۔ صغائر سے بے پروائی برتنے والوں کی نسبت مثالاً فرماتے کہ اپنے کپڑوں کے صندوق میں آگ کی ایک چھوٹی سی چنگاری کیوں نہیں ڈال دیتے کہ اس سے کیا ہو گا۔ بعضوں کو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ علمی یا فکری طور پر حضور دوام کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ تاہم صغائر سے صرف پرواہ ہی نہیں بلکہ استخفاف عجیب بات ہے کہ دنیا کے ایک ادنیٰ حاکم کے سامنے حضوری میں تو آدمی اپنی ادنیٰ ادنیٰ حرکت کی نگرانی رکھتا ہے، پھر احکم الحاکمین کے ساتھ حضور دوام یا شب و روز کی حضوری کے ساتھ یہ دلیری کیسے اور کہاں سے آ جاتی ہے۔

رائے زنی میں تقویٰ: غرض حضرت کا تقویٰ چھوٹے بڑے تمام امور میں بدرجہ اتم تھا، اور صرف اپنی ذات کے مالی یا مادی معاملات ہی تک نہیں محدود تھا بلکہ دوسروں کے عقائد و اعمال کی نسبت کوئی رائے قائم کرنے میں بھی نہایت درجہ احتیاط و حدود کا لحاظ فرماتے۔ بزرگوں کے افعال و اقوال میں اگر کوئی بات خلاف نظر آتی تو تا بہ امکان تاویل ہی فرماتے کہ بدگمانی سے حفاظت ہو، اگر کوئی اور تاویل سمجھ میں نہ آتی تو غلبہ حال پر محمول فرماتے اور فرماتے کہ مغلوب معذور ہوتا ہے۔ بزرگوں ہی کا کیا ذکر سر سید مرحوم جن کی تکفیر تک بڑے بڑے علماء کی طرف سے باقاعدہ ہو چکی تھی فرماتے تھے کہ

> "عیب مے جملہ بہ گفتی ہنرش نیز بگو" سرسید کو مسلمانوں کی دنیاوی فلاح کی بہت ہی دھن تھی، اور اس معاملہ میں بڑی دلسوزی تھی کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی صفت پر فضل فرما دیں .... نیز بعض اکابر کے ساتھ ان کے حسن عقیدت کے واقعات نقل فرمایا کرتے اور فرماتے کہ سرسید کا عقیدہ

توحید و رسالت کے متعلق جس درجہ کا بھی تھا وہ نہایت پختہ و
بلا وسوسہ تھا، جیسا کہ ان کی تصانیف سے مجھ کو اندازہ ہوا اور
قرآن و حدیث میں انہوں نے جو تاویلات و توجیہات کی ہیں
ان کی منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین کا اسلام پر کوئی
اعتراض نہ وارد ہو سکے گو اس کا طرز جو انہوں نے اختیار کیا
تھا غلط تھا، اسی لئے میں ان کو نادان دوست کہا کرتا
ہوں"۔ (اشرف السوانح ص۹ ۱)

مولوی احمد رضا صاحب مرحوم جنہوں نے خود حضرت کی تکفیر و مخالفت کا کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا، ان کی شد و مد سے حمایت فرماتے اور فرماتے کہ ممکن ہے کہ ان کی اس مخالفت کا سبب واقعی حب رسول ہو اور ہم لوگوں کو غلط فہمی سے حضور کی شان میں گستاخ جانتے ہوں، بعض بڑے بڑے فاسقوں فاجروں کے ایسے واقعات بیان فرماتے، جن سے ان کا عاشق دین ہونا نکلتا تھا، اور فرماتے تھے کہ بھلا ایسی حالت میں کس کو برا سمجھا جائے نیز فرماتے کہ بعضے فاسقوں میں کوئی ایسی بات ہوتی ہے کہ بڑے بڑے مشائخ میں نہیں ہوئی۔ لہٰذا کسی کو حقیر نہ جاننا چاہئے۔ یہ ہے سچی رواداری و بے تعصبی جو سچی دینداری اور تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے۔

اوپر حضرت والا کی ذات و صفات اور شخصیت کا جو بہت ہی اجمالی و سرسری خاکہ پیش ہوا اس سے ایک سلیم الفہم ایمانی فراست کا آدمی یہ محسوس کر لے سکتا ہے کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے جس کو تجدید دین کے لئے معبوث فرمایا ہو اس کی یہی شان ہونی چاہئے۔ اب آگے خاص تجدیدی جامعیت اور امتیازی شان کی کچھ تفصیل ہوگی۔ ذہنی و علمی، عملی و اصلاحی ہر اعتبار سے اعتدال و توازن اور جامعیت و احاطت کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔ ذہنی قوتوں میں ادراک و مشاہدہ، فہم و فکر، تحلیل، استنباط، تعمق و تخیل و فراست و بصیرت، سب ہی کمالات کامل توازن کے ساتھ جمع ہیں، اور زندگی کے ظاہری و باطنی تمام اعمال و احوال میں دن دوپہر کی طرح روشن و نمایاں نظر آتے ہیں۔

"علمی جامعیت"

خود حضرت اپنی خاص مناسبت کا ذکر تصوف اور پھر تفسیر سے فرمایا کرتے تھے۔ اور اپنے مرشد کامل حضرت حاجی امداد اللہ رحمتہ اللہ علیہ کی اس باب میں بشارت بھی بیان فرمایا کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر دوسری چیزوں کے لحاظ سے حضرت جامع المجدد دین ہیں، تو تصوف کے مجدد اعظم اور تفسیر کے اکابر آئمہ میں ورنہ یوں حدیث و فقہ، کلام و معقولات تمام علوم اسلامیہ و درسیہ میں بصیرت خاصہ حاصل تھی۔

حدیث: میں علاوہ درس و تدریس کی سعادت کے جو سالہا سال جاری رہی مواعظ و تصانیف کے ہزاروں صفحات حسب موقع احادیث کے اقتباسات و شواہد اور انکی تفہیم و تشریح سے معمور ہیں۔ اور فنی نقطۂ نظر سے تو التشرف فی معرفتہ احادیث التصوف کے چار حصے خالص محدثانہ کارنامہ ہے۔ جن میں ان احادیث اور ان کے درجات کی تحقیق و تنقید ہے، جو صوفیہ کے کلام اور کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ نیز جو روایات دراصل حدیث نہیں، اور حدیث کے نام سے مشہور ہو گئی ہیں ان پر بحث ہے اور اگر وہ لفظاً کسی بزرگ کا قول ہیں، تو اس کی تشریح فرمائی گئی ہے۔ ایک حصہ میں خاص طور پر مثنوی شریف کی حدیثوں کی تخریج ہے۔ باقی حضرت کا اصل کمال تمام چیزوں کی طرح حدیث میں بھی فہم حدیث ہے جو صحیح معنی میں علم حدیث یا حدیث دانی ہے۔ اور جس کا اندازہ ابھی ایک حدیث کی تفہیم اشرف السوانح میں ضمناً نظر آئی اس سے فرمایا جا سکتا ہے۔

حضرت علیؓ سے ایک روایت ہے کہ "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمہ اللہ عمر یقول الحق وان کان مرا ترکہ الحق ومالہ من صدیق"۔ لفظی ترجمہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عمرؓ پر رحم فرمائے کہ وہ حق بات کہہ ڈالتے ہیں خواہ تلخ ہی ہو، اس حق گوئی کی بدولت ان کا کوئی دوست نہیں رہا

اس سے تین شبہے پیدا ہوتے ہیں ایک یہ کہ کیا دوسرے صحابہؓ حق گو نہ تھے۔ دوسرا یہ کہ کیا حضرت عمر کا کوئی دوست نہیں تھا۔ تیسرا یہ کہ کیا حضرات صحابہ بھی حق گوئی کو برا سمجھتے تھے اب دیکھئے کہ ان تینوں کا ازالہ محض قوسین میں ترجمہ کی معمولی تشریح کے طرح فرمادیا۔

"اللہ تعالیٰ رحمت نازل فرمائے عمرؓ پر، وہ حق بات کہہ دیتے ہیں اگرچہ کسی کو (عقلاً یا طبعاً) تلخ (ناگوار) معلوم ہو (یعنی ان میں یہ صفت ایک خاص درجہ میں غالب ہے، اس درجہ کی) حق گوئی نے ان کی یہ حالت کردی کہ ان کا کوئی (اس درجہ کا) دوست نہیں رہا (جیسا کہ تسامح و رعایت کی حالت میں ہوتا) "

فضائل صحابہ کی اور بھی بکثرت ایسی احادیث موجود ہیں، جن میں کسی خاص فضیلت کو کسی خاص صحابی کے ساتھ خاص فرمایا گیا ہے، جس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ "ان میں یہ صفت ایک خاص درجہ میں غالب ہے"۔ غرض یہ کہ

"حق کے درجات متفاوت ہوتے ہیں ایک درجہ یہ ہے کہ اس کا اظہار واجب ہوتا ہے، دوسرا یہ کہ اولیٰ یا مباح ہوتا ہے سو پہلا درجہ تو سب صحابہ بلکہ اہل حق میں مشترک ہے اور دوسرے درجہ کے اعتبار سے بزرگوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں"۔

"بعض مروت یا تسامح کو مصلحت پر ترجیح دے کر سکوت فرماتے ہیں۔ بعض مصلحت کو مروت پر ترجیح دے کر کہہ ڈالتے ہیں پہلا درجہ غلبہ کا ہے دوسرا نفس انصاف کا (علیٰ ہذا) دوستی کے ایک خاص درجہ کی نفی مقصود ہے۔ یعنی اگر حضرت عمرؓ مروت کو مصلحت پر غالب رکھ کر طرح دے جاتے تو اس حالت میں ان کے جیسے دوست ہوتے اب نہیں

رہے۔ رہی طبعی تلخی و ناگواری تو اس کے مقتضیٰ پر اگر عمل
نہ ہو تو خیر کے منافی نہیں، باقی ایسے لوگ بھی ہر زمانہ میں
ہوتے ہیں جن کو عقلی تلخی و ناگواری بھی ہوتی ہے اگرچہ اس
وقت ایسے اقل قلیل تھے۔ (۱)"

حضرت کی مشہور کتاب حیوۃ المسلمین کے مختلف ابواب میں احادیث کی اس طرح تفہیم اور ازالہ شبہات و اشکالات کی بکثرت مثالیں موجود ہیں

تفقہ: فقہ دانی یا تفقہ کی بڑی کسوٹی فتویٰ ہے۔ امداد الفتاویٰ کے مجلدات اس کے گواہ ہیں کہ حضرت کا تفقہ بھی کس درجہ کا تھا۔ نوپیدا مسائل و معاملات سے متعلق حوادث الفتاویٰ کے عنوان سے حضرت کے فتوے اور تحقیقات قابل دید ہیں۔ اصوات آلات جدیدہ، فلم و سینما گراموفون، مسمریزم، فریبیس ، ثبوت ہلال بجر تار، طویل النہار مقامات میں حکم صوم و صلوۃ، ہوائی جہاز میں نماز غرض کوئی نئی چیز یا نئی بات مشکل ہی سے رہی ہوں گی جس کی نسبت عام فتاویٰ کے علاوہ حضرت کی خاص عمیق و دقیق تحقیق موجود نہ ہو۔ بلکہ وسیع معنیٰ میں تفقہ فی الدین ہی تو حضرت حکیم الامت کا سب سے نمایاں وصف ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ فقہا حکمائے امت ہیں۔ یہ حکیمانہ نظر و فکر حضرت کا ایسا ہمہ گیر کمال ہے، جو صرف اصطلاحی فقہ و فتوے تک نہیں محدود بلکہ سارے مواعظ و ملفوظات اور ساری تعلیمات و تجدیدات کی جان ہے۔

تفسیر۔ کا تو کہنا ہی کیا! یوں تو کلام اللہ نامحدود کا کلام ہے، اس کے عجائب بھی نامحدود و غیر منقضی ہیں، اور انسان کی محدود عقل و فہم کے لئے اس کے حقائق و غوامض کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا اور ہر صاحب فکر و تدبر اس اتھاہ سمندر سے اپنی استعداد غواصی کے بقدر موتیوں سے دامن کو ہمیشہ بھرتا رہے گا۔ لیکن کوئی فرد فرید بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا، کہ اس نے اس کی تھاہ کو آخری طور پر پالیا۔ تاہم اللہ کی اس آخری کتاب کا خطاب چونکہ خاص و عام سب کو عام ہے۔ اس لئے اس کے معانی و مطالب کا ایک درجہ ایسا بھی ہونا چاہئے جس کی تفسیر کو ہر درجہ کا مخاطب بے تکلف سمجھتا چلا جائے۔

۱۔ اشرف السوانح حصہ دوم ص ۶۱ و ص ۶

حضرت تھانوی کے ترجمہ قرآن اور تفسیر بیان القرآن کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے، کہ عالم و غیر عالم (اور اس زمانہ میں غیر عالموں کی قرآن کی طرف بالخصوص کسی نہ کسی حیثیت سے زیادہ توجہ ہو گئی ہے) جو بھی اس کو اٹھا کر پڑھنا شروع کر دے، اس طرح بے تکلف سمجھتا چلا جائے گا، کہ جن مقامات پر بڑوں بڑوں کو ٹھوکریں لگی ہیں، وہاں یہ بھی محسوس نہ ہو گا کہ راستہ میں کوئی تنکا بھی پڑا تھا۔ باقی پوری داد تو وہی اہل بصیرت دے سکتے ہیں، جن کی خود کچھ مشکلات قرآن پر نظر ہے۔ راقم الحروف کو بھی ۲۰ - ۲۵ سال سے کچھ غور و فکر و درس تدریس کے ساتھ اس کتاب کے مطالعہ کی توفیق میسر ہے۔ سب سے زیادہ اشکال قدم قدم پر اس کے نظم و ربط میں نظر آیا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اگر کسی مقام کے ربط و نظم کی گہرائی اللہ تعالیٰ نے کھول دیئے تو بیساختہ نظر آ گیا کہ واقعی یہ اللہ ہی کی کتاب ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسے مقامات تمام عمر میں بس گنتی ہی کے ہیں۔ اس کم علم و کم فہم کا تو ذکر ہی کیا، ہمارے عہد بلکہ سارے اسلامی و تفسیری عہد میں مولانا حمید الدین فراہی رحمتہ اللہ علیہ کے علم و فہم پر نظم قرآن جس طرح کھولا گیا کم کسی پر کھلا ہو گا، پھر بھی پوری زندگی اس میں لگا دینے کے باوجود قرآن کی تفسیر پوری نہ ہو سکی۔ لیکن بیان القرآن نے یہ خدمت بقدر ضرورت پوری فرما دی کہ ہر چھوٹا بڑا حصہ اور ہر چھوٹی بڑی آیت دوسری سے اس طرح مربوط ہو گئی ہے، کہ متن قرآن اور اس کے تحتانی ترجمہ کے بعد ہر آیت کا قوسین کے ساتھ جو تفسیری ترجمہ فرما دیا گیا ہے، اگر اس کو آدمی پڑھتا چلا جائے تو معلوم ہو گا کہ ایک بے تکلف مسلسل و مربوط کتاب پڑھ رہا ہے۔ آج کل اپنی بچی کو خود کلام مجید پڑھا رہا ہوں وہ اتنی عربی پڑھ چکی ہے کہ نفس ترجمہ تو عربی دانی کے ساتھ سمجھ لیتی ہے، لیکن مربوط مطلب اس کو میں کسی ایک آدھ رکوع کا بھی ویسا نہیں سمجھا سکتا، جیسا کہ بیان القرآن کے تفسیری ترجمہ سے اس کی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اس وقت سورۂ انعام ہو رہا ہے، اس کی کچھ آیات اندازہ کے لئے درج کی جاتی ہیں۔

"لقد ارسلنا الی امم من قبلک .... والحمد للہ رب العالمین۔ اور ہم نے اور امتوں کی طرف بھی جو آپ سے پہلے (زمانہ) میں ہو چکی ہیں بہت پیغمبر بھیجے تھے) مگر انہوں نے

ان پیغمبروں کو نہ مانا) سو ہم نے ان کو (اس تکذیب پر)
تنگ دستی اور بیماری سے پکڑا تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں (اور
اپنے کفر و تکذیب سے توبہ کر لیں) سو جب ان کو ہماری
(طرف سے) سزا پہنچی تھی وہ ڈھیلے کیوں نہ پڑے (کہ ان
کا جرم معاف ہو جاتا لیکن ان کے قلوب تو (ویسے ہی) سخت
(کے سخت) رہے اور شیطان ان اعمال (کفریہ سابقہ) کو
ان کے خیال میں (بدستور) آراستہ (مستحسن) کر کے
دکھلاتا رہا پھر جب وہ لوگ (بدستور) ان چیزوں کو بھولے
(اور چھوڑتے) رہے جن کی ان کو (پیغمبروں کی جانب
سے) نصیحت کی جاتی تھی (یعنی ایمان و اطاعت) تو ہم نے
ان پر (از قسم اسباب عیش و عشرت) ہر چیز کے دروازے
کشادہ کر دیئے (یعنی خوب نعمت و ثروت دی) یہاں تک
جب ان چیزوں پر جو ان کو (اسباب نعمت میں سے) ملی تھیں
وہ خوب اترا گئے (اور غفلت و مستی میں ان کا کفر خوب بڑھ
گیا اس وقت) ہم نے ان کو دفعتہً (کہ ان کو گمان بھی نہ
تھا) پکڑ لیا (اور عذاب شدید نازل کیا جیسا کہ قرآن کے اور
مواقع میں ان قصوں کی تفصیل ہے۔) پھر تو وہ بالکل حیرت زدہ
رہ گئے (کہ کیا ہو گا) پھر اس عذاب سے) ظالم (کافر)
لوگوں کی جڑ (تک) کٹ گئی (یعنی بالکل ہلاک ہو گئے) اور
اللہ کا شکر ہے۔ جو تمام عالم کا پروردگار ہے (کہ ایسے ظالموں
کا پاپ کٹا جن کے ہونے سے نحوست ہی پھیلتی) (جلد ۳
ص ۶۴)

قوسین کے اس تفسیری ترجمہ کے ربط کے علاوہ کئی کئی آیتوں کے ایک ٹکڑے کا
دوسرے سے ربط مستقلاً ظاہر کیا گیا ہے مثلاً مذکورہ بالا ٹکڑے کا ربط اوپر کے ٹکڑے

"قل ارئیتکم ان اتٰکم عذاب اللہ او اتتکم الساعۃ اغیر اللہ تدعون ان کنتم صادقین بل ایاہ تدعون فتکشف ماتدعون الیہ ان شاء وتنسون ماتشرکون سے یہ ربط ہے کہ

"اوپر مشرکین پر وقوع عذاب فرض کر کے اس بنا پر ان کے دعویٰ شرک کو باطل کیا گیا تھا۔ آگے اس فرض کا غیر مستبعد ہونا ثابت کرنے کے لئے بعض امم سابقہ کا معذب و ہالک ہونا بیان فرماتے ہیں کہ مخالفین کو اس فرض کے غلط کہنے کی گنجائش نہ ہو۔ اور اس ہلاکت کا ذکر بھی ایک خاص طور سے فرمایا جس سے موجودہ کفار کے منشاء انکار کا جواب بھی ساتھ ساتھ ہو جائے۔ کیونکہ بڑا منشا انکار کا یہ ہوتا ہے کہ بعض مصائب آکر ٹل جاتے ہیں، تو نادانوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ یہ سزائے اعمال نہ تھی ورنہ ٹلتی کیوں، اس لئے سنا دیا کہ ان ہلاک ہونے والوں کی دارو گیر کی ترتیب بھی یہی ہوتی تھی کہ اول نزول بلیات ہوا کہ تضرع کریں پھر استدراجاً نعمتوں کا نزول فرمایا گیا جب خوب کفر بڑھ گیا پھر ہلاک کر دیئے گئے تو تم بعض بلیات کے ٹلنے سے دھوکا مت کھانا" (انعام ص ۹۳)

قرآن میں ربط: سبیل النجاح نامی وعظ میں قرآنی نظم و ربط کے مسئلہ پر ذرا تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ۔

"حکام دو قسم کے ہوتے ہیں ایک جو محض ضابطہ کے پابند ہیں کہ ضابطہ کی رو سے جو واجب ہے کر دیا۔ ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ دشوار احکام کو قانون سے خارج کریں یا ان کے آسان کرنے کی تدبیر بتائیں۔ دوسرے وہ حکام ہیں جن کو رعایا سے محبت ہوتی ہے اور راحت پہنچانا چاہتے ہیں وہ

حتی الامکان قانون میں کوئی دشوار حکم نہیں داخل کرتے یا کسی مصلحت سے کرتے ہیں تو اس کے سہل کرنے کی تدبیر بھی بتلا دیتے ہیں۔ اتنی رعایتیں وہی حاکم کر سکتا ہے. جس کو رعایا پر شفقت ہو۔

"ایک اور مثال لے لیجئے کہ نصیحت کرنے والا ایک تو استاد ہوتا ہے, ایک باپ استاد تو بالعموم ضابطہ پر ہی کر دیتا ہے, مگر باپ ایسے عنوان سے نصیحت کرنا چاہتا ہے کہ بیٹے کے دل میں گھر کرے, اگر وہ کوئی کام مشکل بتلاتا ہے تو اس کا طریقہ ایسا اختیار کرتا ہے کہ عمل کرنا آسان ہو جائے۔ اور ان سب رعایتوں کا منشا شفقت ہے۔ شفقت ہی کی بنا پر تمام پہلوؤں کی رعایت کی جا سکتی ہے۔

"اسی لئے باپ کا کلام نصیحت کے وقت کبھی بے ربط و بے ترتیب بھی ہوتا ہے۔ مثلاً باپ بیٹے کو کھانا کھاتے وقت نصیحت کر رہا ہو کہ بری صحبت میں نہ بیٹھا کرے۔ اس درمیان میں اس نے دیکھا کہ بیٹے نے ایک بڑا سا لقمہ کھانے کو لیا, تو وہ فوراً پہلی نصیحت کو قطع کر کے کہے گا کہ یہ کیا حرکت ہے بڑا لقمہ نہیں لیا کرتے۔ اس کے بعد پھر پہلی بات پر گفتگو شروع کر دے گا اب جس کو شفقت کی اطلاع نہ ہو وہ کہے گا کہ یہ کیسا بے ترتیب کلام ہے کہ بری صحبت سے منع کرنے میں لقمہ کا کیا ذکر. مگر جو کبھی باپ بنا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ بے ترتیب کلام مرتب و مرتبط کلام سے افضل ہے۔

"یہی راز ہے کہ خدا تعالیٰ کا کلام ظاہر میں کہیں بے ربط بھی معلوم ہوتا ہے جس کا منشا شفقت ہی ہے کہ حق تعالیٰ مصنفین کی طرح گفتگو نہیں کرتے کہ ایک مضمون پر کلام

شروع کیاتو دوسرا مضمون اس میں نہ آئے۔ چنانچہ ایک آیت یاد
آئی جس پر لوگوں نے غیر مرتبط ہونے کا اعتراض کیا ہے۔

اوپر کی پدرانہ شفقت کی مثال کو سامنے رکھ کر ذرا دیکھئے کہ حضرت علیہ الرحمہ کی فہم القرآن نے حق تعالیٰ کی شفقت کو اس آیت میں واضح فرما کر غیر مرتبط ہونے کے اعتراض کو کیسا بے معنی فرما دیا ہے!

مثال: "سورۂ قیامت میں حق تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان فرمایا ہے کہ انسان اس وقت بڑا پریشان ہو گا بھاگنے کا موقع ڈھونڈے گا۔ اپنے اعمال پر اطلاع ہو گی سب اگلے پچھلے کام جتلائے جائیں گے۔ پھر فرماتے ہیں بل الانسان علی نفسہ بصیرہ ولوالقی معاذیرہ (یعنی انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس طرح جتلانے پر موقوف نہ ہو گا بلکہ) انسان اپنے نفس کے احوال سے خوب واقف ہو گا اگرچہ (باقتضائے طبیعت) کتنے ہی بہانے بنائے، جیسے کفار کہیں گے واللہ ہم تو مشرک نہ تھے مگر دل میں خود بھی جانیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں۔ غرض یہ جتلانا محض قطع جواب و اتمام حجت اور دھمکی کے لئے ہو گا نہ کہ یاد دہانی کے لئے۔

"یہاں تک تو قیامت ہی کے متعلق مضمون ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ ان علینا جمعہ و قرانہ فاذا قرانہ فاتبع قرانہ ثم ان علینا بیانہ یعنی حضور کو ارشاد ہے کہ قرآن نازل ہوتے وقت اس کو یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے۔ قرآن کا آپ کے دل میں جما دینا اور زبان سے پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے، تو جب ہم قرآن نازل کریں اس وقت فرشتہ کی قراءت کا اتباع کیجئے۔ پھر یہ بھی ہمارے ہی ذمہ ہے کہ آپ قرآن کا مطلب بھی بیاں کر دیں گے۔ اس کے بعد پھر قیامت ہی کا ذکر ہے وجوہ یومئذ ناضرہ الی ربھا ناظرہ الخ

"تو اوپر بھی قیامت کا ذکر اور بعد کو بھی اس کا ذکر اور درمیان میں یہ مضمون کہ قرآن پڑھتے ہو جلدی یاد کرنے کے لئے زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے۔ لوگ اس مقام کے ربط میں تھک گئے اور بہت سی توجیہات کی ہیں مگر سب میں تکلف ہے۔ لیکن جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے، جو حق تعالیٰ کو حضور کے ساتھ ہے اس کو آفتاب کی طرح نظر آتا ہے کہ اس کلام کا درمیان میں کیا موقع ہے۔

"اس کا وہی موقع ہے، جیسے وہ باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا کہ درمیان میں بیٹے کو بڑا لقمہ اٹھاتے دیکھ کر کہا یہ کیا حرکت ہے بڑا لقمہ نہیں لیا کرتے۔ اسی طرح یہاں بھی حق تعالیٰ قیامت کا ذکر فرما رہے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس خیال سے کہ کہیں بھول نہ جائیں جلدی جلدی ساتھ ساتھ پڑھ رہے تھے، تو درمیان میں خدا تعالیٰ نے فرط شفقت سے فرمایا کہ آپ یاد کرنے کی فکر نہ کریں یہ کام ہم نے اپنے ذمہ لے لیا ہے آپ بے فکر ہو کر سنتے رہا کریں۔

"لہٰذا اگر یہاں بالکل بھی ربط نہ ہوتا تو یہ بے ربطی ہزار ربط سے افضل تھی، مگر باوجود اس کے یہاں ایک مستقل ربط بھی ہے۔ اور یہ خدا ہی کے کلام کا اعجاز ہے کہ جہاں ربط کی ضرورت نہ ہو وہاں بھی ربط موجود ہے چنانچہ جو رسالے ربط کے باب میں لکھے گئے ہیں ان سے اس کا ربط معلوم ہو سکتا ہے۔

حضرت علیہ الرحمہ نے ایک مستقل رسالہ بھی "سبق الغایات فی نسق الایات" کے نام سے عربی میں تحریر فرمایا ہے، جس میں کل ڈیڑھ سو صفحات میں سورۂ فاتحہ سے لے کر والناس تک اہل علم و فہم کے لئے ربط آیات کے بعض عجیب عجیب ارشادات فرمائے گئے ہیں۔ لیکن خود بیان القرآن میں اس کا جو ربط تحریر فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ

"ینبا الانسان یومئذ بما قدم واخر اور بل الانسان علی نفسہ بصیرہ سے دو مضمون مستفاد ہوتے ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کے عالم و محیط ہیں، دوسرا یہ کہ حق تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ جب حکمت مقتضی ہوتی ہے تو مخلوق کے ذہن میں علوم غائبہ کثیرہ کو حاضر کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ قیامت میں ہو گا۔

اب ربط ملاحظہ ہو کہ

"جب یہ بات ہے تو آپ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) وحی کے نزول کے وقت اس قدر مشقت کہ سنتے بھی ہیں پڑھتے بھی ہیں دھیان میں بھی رکھتے ہیں محض اس احتمال سے کیوں

برداشت کرتے ہیں کہ شاید کچھ مضمون ذہن سے نکل جائے۔ کیونکہ جب ہم نے آپ کو نبی بنایا ہے اور آپ سے تبلیغ کا کام لینا ہے تو یہاں مقتضائے حکمت یہی ہوگا کہ وہ مضامین آپ کے ذہن میں حاضر رکھے جائیں اور ہمارا محصی (یا اس پر قادر) ہونا تو ظاہر ہی ہے، اس لئے آپ یہ مشقت برداشت نہ کیجئے۔ (بیان القرآن جلد ۱۲ ص ۶۱)

اب ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ اوپر کی تقریر و مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ہر جگہ ربط ہونا جب سرے سے ضروری ہی نہیں تو لوگوں نے جو ربط و نظم پر رسائل لکھے یا تفسیروں میں اس کے بیان کرنے کی کوشش کی وہ زبردستی کے اور اختراعی ہو سکتے ہیں۔

"اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں باوجود طرز تصنیف اختیار نہ کرنے کے پھر بھی ربط کا لحاظ کیا گیا ہے اس لئے مفسرین کے بیان کردہ روابط مخترع نہیں ہیں اور ربط کی دلیل یہ ہے کہ احادیث سے ثابت ہے کہ نزول آیات کی ترتیب اور ہے اور تلاوت و مصحف کی اور ہے۔ یعنی قرآن کا نزول تو واقعات کے مطابق ہوا ہے کہ ایک واقعہ پیش آیا اور اس کے متعلق آیت نازل ہو گئی، پھر دوسرا واقعہ پیش آیا تو دوسری آیت نازل ہو گئی تو ترتیب نزول تو حسب واقعات ہے اگر تلاوت خود باری عزاسمہ نے بدل دی یعنی حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی آیت کسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی تو جبرائیل علیہ السلام بحکم خداوندی حضور سے کہتے کہ اس آیت کو مثلاً سورۂ بقر کی فلاں آیت کے بعد رکھا جائے اور اس کو فلاں آیت کے بعد اور اس کو فلاں سورہ کے ساتھ و علی ہذا۔

"تو مصحف میں ترتیب آیات ترتیب نزول پر نہیں، بلکہ اس کی ترتیب حق تعالیٰ نے دوسری رکھی، اس سے معلوم ہوا

کہ جس آیت کو بھی کسی آیت کے ساتھ ملایا ہے، دونوں میں
کوئی مستقل ربط و مناسبت اور تعلق ضرور ہے .... غرض
عجب بے نظیر کلام ہے کہ باوجود ضرورت ربط نہ ہونے کے
پھر بھی ربط ہے اور پورا ربط پس خدا تعالیٰ کے کلام میں اس
مستقل دلیل سے ہم ربط کے قائل ہیں۔
"لیکن اگر ربط نہ بھی ہوتا تو قرآن پر اعتراض کی گنجائش نہ
تھی۔ ہم کہہ سکتے تھے کہ قرآن میں طرز تصنیف اختیار نہیں کیا
گیا بلکہ طرز نصیحت مع لحاظ شفقت اختیار کیا گیا ہے اور اس
میں ضرورت تخاطب کے لحاظ سے گفتگو کی جاتی ہے جس کی
بے ربطی ہزار ربط سے افضل ہوتی ہے"۔

بڑے پتہ کی بات. اسی سلسلہ میں کہ قرآن مجید میں نصیحت و شفقت کے طرز کو خصوصیت کے ساتھ پیش نظر رکھا گیا ہے، ایک اور بڑے پتہ کی بات حضرت نے یہ تحریر فرمائی ہے کہ۔

"اسی وجہ سے حق تعالیٰ ہر سورت میں بہت سے احکام بیان
فرما کر اخیر میں ایسی بات بیان فرماتے ہیں، جو سب کی جامع
ہوتی ہے اور جس پر عمل کرنے سے تمام احکام مذکورہ میں
سہولت ہو جاتی ہے .... جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم
سے کسی نے عرض کیا ان شرائع الاسلام قد کثرت علی فقل لی
قولا احفظہ واخذبہ (اوکما قال) کہ یا رسول اللہ احکام اسلام
میرے لئے بہت زیادہ ہو گئے ہیں کوئی ایسی بات بتلا دیجئے
جس کو یاد کر لوں اور اسی کے موافق عمل کرتا رہوں۔ آپ
نے فرمایا قل آمنت باللہ ثم استقم کہ بس کہو کہ اللہ پر ایمان
لایا پھر استقامت کے ساتھ رہو۔ حضورؐ نے ساری شریعت
ابتدا سے انتہا تک اس ایک جملہ میں بھر دی۔ امنت باللہ میں

اجمالاً تمام اعتقادیات کو بیان فرما دیا اور ثم استقم میں اعمال کے اندر استقامت کی تعلیم دی جس میں نماز، روزہ حج زکواۃ معاملات و معاشرات سب آ گئے۔

"باقی یہ مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ سائل کی یہ درخواست تھی کہ مجھے ایسی بات بتلا دیجئے کہ تمام احکام کو بھلا کر صرف ایک بات کو یاد کر لوں۔ مطلب یہ تھا کہ مجھے ایسی بات بتلا دیجئے جس کی تمام شریعت میں رعایت کروں، اور جس سے ہر امر کا شرعی غیر شرعی ہونا معلوم کر لیا کروں۔ حضورؐ نے اس کے موافق ایسی بات بتلا دی جو شریعت کا موضوع ہے یعنی عظمت الٰہی کا اعتقاد اور افعال و اقوال میں استقامت۔ اور ظاہر ہے کہ کسی علم کا موضوع معلوم ہو جانے سے اس کے تمام مسائل دوسرے علوم کے مسائل سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔ مثلاً طب کا موضوع بدن انسان کی تندرستی و بیماری ہے تو اب اگر سنا کہ بنفشہ زکام کو نافع ہے فوراً سمجھ گیا کہ یہ طب کا مسئلہ ہے اور اگر یہ سنا کہ اتنی گہری بنیاد ہو تو اتنا اونچا مکان بنایا جاسکتا ہے تو سنتے ہی سمجھ میں آ جائے گا کہ یہ مسئلہ طب کا نہیں"۔

غرض یہ معلوم ہو جانے کے بعد اسلامی اعمال و احکام کی خاص خصوصیت استقامت و اعتدال ہے، آدمی بےاعتدالی یا افراط و تفریط کی باتوں کے متعلق یہ فیصلہ کر لے سکتا ہے کہ یہ اسلام کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ اس طرح کلام مجید کی بڑی بڑی سورتوں میں مختلف احکام وغیرہ بیان فرما کر "اخیر میں کوئی ایسی بات بیان فرما دیتے ہیں جو سب کی جامع ہوتی ہے"۔ مثلاً

"سورۂ آل عمران میں مختلف ابواب احکام بیان فرما کر کلام کو ختم نہیں کیا اخیر کی آیت میں بطور میزان کل کے ایک

ایسی بات بتلا دی جو سب کو جامع ہے۔ جیسے تفصیل حساب
کے بعد میزان بیان کر دینے سے ایک قسم کا ضبط و تکرار ہو
جاتا ہے۔ مفصل حساب کا یاد رکھنا دشوار ہے اور میزان کا
یاد رکھنا آسان ہے۔

"ایسے ہی حق تعالیٰ بھی تمام احکام کو ذکر کر کے اخیر میں
ایک ایسا گر بتلا دیتے ہیں جو گویا تمام سورت کا موضوع ہے۔
چنانچہ (آل عمران کے آخر میں) ارشاد فرماتے ہیں یا ایہا
الذین امنوا اصبرو و صابر و ورابطو واتقو اللہ لعلکم تفلحون کہ
اے ایمان والو (تکلیف پر) خود صبر کرو اور (جب کفار
سے مقابلہ ہو تو) مقابلہ میں صبر کرو اور (احتمال مقابلہ کے
وقت) مقابلہ کے لئے مستعد رہو۔ اور (ہر حال میں) اللہ
تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ (حدود شرعیہ سے باہر نہ نکلو) تاکہ تم
پورے کامیاب ہو (آخرت میں تو ضرور ہی اور اکثر ان احکام
و اعمال پر محافظت کی بدولت دنیا میں بھی پوری کامیابی
ہوتی ہے۔

"جن باتوں کا اس آیت میں ذکر ہے ان کو اس سورت (آل عمران) کے احکام سے
خاص تعلق تو ہے ہی۔ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جس قدر بھی شرعی احکام ہیں سب سے
ان کا تعلق ہے اور ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جیسے ان کو احکام شرعیہ سے تعلق ہے اسی طرح
تمام دنیوی مصالح معاشیہ سے بھی تعلق ہے۔ مگر نہ اس وجہ سے شریعت کا موضوع و مقصود
ہے، بلکہ اس لئے کہ شریعت آخرت کی تکمیل کے ساتھ ساتھ ہماری دنیا کی بھی تکمیل کرتی
ہے۔ اس لئے احکام شرعیہ ایسے مقرر کئے گئے ہیں جو تبعاً یا ضمناً مصالح دنیویہ کو بھی
متضمن ہیں [1]"۔

---

[1] ملخصاً از ص ۱۱ تا ص ۱۴

پھر آیات کی نفس شرح و تفسیر و ربط و ترتیب کے ساتھ ساتھ حروف ف کے تحت جو جا بجا کثرت سے فوائد درج فرمائے ہیں، ان میں ایسے مستقل اصول و مسائل آ گئے ہیں جو سارے قرآن کی مفتاح ہیں۔ مثلاً مذکورہ صدر آیات کے بعد وما نرسل المرسلین .... لعلکم یتقون کے تحت جو یہ فائدہ درج ہے کہ

"حشر کے متعلق کل تین طرح کے آدمی ہیں۔ ایک وہ جو جزماً اس کے ثبوت کے معتقد ہیں دوسرے جو متردد ہیں۔ آیت میں ان ہی دو جماعتوں کا ذکر ہے، جن کی طرف ترجمہ میں احقر نے اس عبارت سے اشارہ کیا ہے اعتقاداً یا احتمالاً الخ۔ تیسرے وہ جو جزماً اس کے منکر ہیں۔ اور انزار گو ان کو بھی عام ہے، جیسا اور آیات میں مصرح ہے، لیکن یہاں مطلق انذار مراد نہیں۔ بلکہ وہ انذار جس میں خاص اہتمام ہو، سو یہ وہیں ہو گا جہاں نفع متیقن یا متوقع ہو، جیسا قسم اول و دوم کا حال ہے۔ بخلاف اس قسم سوم کے کہ بوجہ نفع کی عدم توقع کے ان کو انذار محض اتمام حجت کے لئے ہو گا۔ توجہ کی ان میں بوجہ عناد قابلیت ہی نہیں، اس لئے یہاں پہلی دو قسموں کی تخصیص کی گئی، جیسا بعض آیات میں بنا بر تعین نفع صرف قسم اول ہی کی تخصیص بھی ہے کقولہ تعالیٰ "انما تنذر الذین یخشون ربہم بالغیب واقاموا الصلوٰۃ الخ اور احقر نے اثنائے ترجمہ میں جو لفظ "خاص طور" کہا ہے وہ اشارہ اسی تقریر کی طرف ہے۔ اور غیر اللہ کی ولایت و شفاعت کی نفی کا تحقیق دو طور پر ہو سکتا ہے ایک یہ کہ ان کا کوئی ولی و شفیع نہ ہو یہ تو کفار کے لئے ہو گا۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کا ولی اور رسول و دیگر مقبولین ان کے شفیع ہوں مگر غیر اللہ نہ ہو یہ مسلمانوں کے لئے ہو گا اور ولی میں

غیر نہ ہونا تو ظاہر ہے اور شفیع میں مراد یہ ہے کہ بغیر اذن اللہ نہ ہو چنانچہ شفاعت مومنین کی باذن اللہ ہو گی پس من دونہ دونوں کو شامل ہے. من دون ذاتہ کو بھی اور من دون اذنہ کو بھی۔ غرض غیر اللہ کی ولایت اور غیر مومنین کے لئے شفاعت مطلقاً منفی ہے اور اللہ کی ولایت اور مقبولین کی شفاعت مومنین کے لئے ثابت ہے۔ اور آیت میں تین باتوں کی نفی کی گئی ہے قدرۃ علی الخزائن۔ علم غیب۔ ملکیت۔ اس کی ایک توجیہ کی کہ آیات مقترحہ کا جواب ہے، تقریر ترجمہ میں مذکور ہے اور ایک سہل توجیہ یہ خیال میں آتی ہے کہ مقصود اس سے استبعاد کفار کا رفع ہو یعنی تم جو اقتراح آیات سے میری رسالت کی تکذیب کرتے ہو محض بے معنی ہے. رسالت جس کا میں بہ دلیل مدعی ہوں کوئی مستبعد امر نہیں ہے۔ کسی امر عجیب و غریب مثل قدرت و علم و ملکیت مذکورہ کا تو میں مدعی نہیں ہوں جو اس کو مستبعد سمجھ کر انکار کرتے ہو. جیسا سورۂ ہود میں نوح علیہ السلام کا قول ہے (لا اقول لکم عندی خزائن اللہ الخ (انعام ص۹۶)

بعض اور مثالیں: سورۂ انعام ہی سے دو ایک اور مختصر مثالیں لو۔ قل ہو القادر ان یبعث علیکم عذا بامن فوقکم اور من تحت ارجلکم و یلبسکم شیعا ویذیق بعضکم باس بعض انظر کیف نصرف الایات "لعلکم یتفقون و کذب بہ قومک وہو الحق قل لست علیکم بوکیل لکل نبا مستقر و سوف تعلمون میں قل لست علیکم بوکیل کا ترجمہ "کہہ دو کہ میں تمہارے اوپر نگہبان یا داروغہ نہیں ہوں" کر دینے سے جیسا کہ اکثروں نے کیا ہے نہ مطلب کھلتا ہے. نہ ربط معلوم ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے

حضرت علیہ الرحمتہ نے ترجمہ فرمایا کہ " آپ کہہ دیجئے کہ میں تم پر تعینات نہیں کیا گیا ہوں" اور تفسیری ترجمہ میں یوں فرمایا کہ "کہ دیجئے کہ میں تم پر عذاب واقع کرنے کے لئے تعینات نہیں کیا گیا ہوں کہ مجھ کو مفصل اطلاع ہو یا میرے اختیار میں ہو البتہ ہر چیز کے وقوع کا وقت اللہ کے علم میں ہے. اور جلد ہی تم کو معلوم ہو جائے گا کہ عذاب آیا۔

اسی طرح آگے "واذاریت الذین یخوضون فی ایاتنا .... وما علی الذین یتقون من حسابہم من شی" میں ما علی الذین یتقون من حسابہم من شی" کا ترجمہ بالعموم یہ کر دیا جاتا ہے. کہ جو لوگ پرہیزگاری کرتے ہیں ان پر ان کا کچھ حساب نہیں" ۔ جس سے مطلب صاف نہیں ہوتا۔ حضرت نے ترجمہ فرمایا کہ "جو لوگ احتیاط رکھتے ہیں ان پر ان کی باز پرس کا کوئی اثر نہ ہو گا. اور تفسیری ترجمہ میں یوں فرمایا کہ جو لوگ منہیات شرعیہ سے جن میں بلا ضرورت ایسی مجالس (خائفین فی ایات اللہ) میں جانا بھی ہے. احتیاط رکھتے ہیں ان پر ان طاغین و مکذبین کی باز پرس اور گناہ طعن کا کوئی اثر نہ پہنچے گا یعنی بضرورت وہاں جانے والے گنہگار نہ ہوں گے۔

تفسیری مواعظ. غرض جو شخص بھی قرآن میں کچھ فکر و تدبر کی عادت اور اس کی مشکلات کا اندازہ رکھتا ہے. وہ قدم قدم پر دیکھے گا کہ یہ مشکلات ترجمہ اور تفسیری ترجمہ کے چند فقروں ہی سے کس طرح حل ہو جاتی ہیں۔ اس سے بڑھ کر اگر حضرت کے ذرا عام فہم تفسیری استنباطات اور قرآنی نکات کو دیکھنا ہے. تو مواعظ کا مطالعہ کرنا چاہئے. جو دراصل قرآنی آیات ہی کی تفسیر و استنباطات پر مبنی اور عجیب عجیب نکات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مثال کے

لئے المراد نام وعظ میں اس آیت کی تفسیر ملاحظہ ہو کہ

"من کان یرید العاجلتہ عجلنالہ فیھا مانشاء لمن نرید ثم جعلنالہ جھنم یصلھا مذموما مدحور اومن ارادالاخرۃ وسعی لھا سعیھا وھو مومن فاولئک کان سعیھم مشکورا۔ یعنی جو کوئی دنیائے عاجلہ کا ارادہ (طلب) کرے ہم اس کو دنیا ہی میں دے دیتے ہیں۔ پھر اس کے لئے جہنم مقرر کر دیتے ہیں جس میں وہ برائی اور ذلت کے ساتھ داخل ہو گا اور جو کوئی آخرت کا ارادہ کرے اور اس کے لئے وہ سعی کرے جو ہوا کرتی ہے در آنحالیکہ مومن بھی ہوں تو ان لوگوں کی کوشش کی قدر کی جائے گی۔

"اب ذرا دونوں مضمونوں میں غور کر لیا جائے طالب دنیا کی بابت تو ارشاد ہے کہ ہم طالبان دنیا میں جس کو چاہتے ہیں اور جس قدر چاہتے ہیں دے دیتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ نہ سب کا کامیاب ہونا ضروری ہے۔ اور نہ یہ ضروری ہے کہ جو وہ چاہا کریں وہی مل جائے"

دنیا طلبوں کی ناکامی: جو لوگ دنیا کے پیچھے جان دیتے ہیں ان کی طلب و سعی کے یہ دونوں نتائج دن رات تجربہ میں آتے رہتے ہیں کہ نہ ہر شخص اپنی دنیاوی سعی و طلب میں کامیاب ہوتا ہے اور نہ جس درجہ کی کامیابی چاہتا ہے وہ حاصل ہونا ضروری ہے بخلاف اس کے۔

"طالبان آخرت کے متعلق ارشاد ہے کہ جو آخرت کی طلب عملی کوشش و ایمان کے ساتھ کرتے ہیں ان کی کوشش کی قدر کی جائے گی۔ ایمان و سعی کی قید واقعی ہے احترازی نہیں اور یہ دراصل بیان ہے من ارادالاخرۃ کا کہ ارادہ آخرت کہتے ہی ہیں ایمان اور عمل صالح کی سعی کو۔ کیونکہ

اس کے بدون طلب آخرت کا تحقق نہیں ہو سکتا۔ اور یہاں سے ان لوگوں کا رد ہو گیا جو اپنے کو طالب آخرت سمجھتے ہیں. مگر عمل صالح نہیں کرتے۔ دراصل یہ لوگ آخرت کے طالب ہی نہیں کیونکہ طلب کے لئے علامت بھی چاہئے اور طلب آخرت کی علامت یہی ہے کہ ایمان و عمل صالح اختیار کیا جائے۔ غرض سعی آخرت اور ایمان یہ قید واقعی اور ارادہ آخرت کا بیان و شرح ہے۔

"رہا یہ سوال کہ پھر اس کا مقابلہ میں ارادہ عاجلہ (دنیا) کی شرح کیوں نہ بیان کی گئی۔ جواب یہ ہے کہ ارادہ آخرت کی شرح سے مقصود یہ ہے کہ اس کا سہل ہونا معلوم ہو جائے کہ اس میں معمولی سعی و ایمان کی ضرورت ہے تاکہ آخرت کی طلب کے لئے دل میں رغبت ہو بخلاف ارادہ دنیا کے کہ اس کی ترغیب مقصود نہیں. اس لئے اس کی تفسیر و شرح بیان نہیں فرمائی۔ علاوہ ازیں ارادہ آخرت کی تفسیر و تفصیل کے متعلق لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کوئی کسی طریقہ کو طلب آخرت سمجھتا ہے کوئی کسی طریقہ کو اس لئے اس کی تفسیر کی ضرورت تھی اور ارادہ دنیا کو تو ہر شخص سمجھتا ہے اس کے بیان کی حاجت نہ تھی

فرق طلب دنیا و آخرت میں: بس ارادہ دنیا و آخرت میں ایک فرق تو یہ بتلایا گیا کہ طلب دنیا سے یہ ضرور نہیں کہ مطلوب حاصل ہی ہو جائے اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر ایک کو حاصل ہو جائے اور طلب آخرت کی ہمیشہ قدر ہوتی ہے. وہ [illegible] سکتے

دوسرا ایک لطیف اشارہ ایک خاص فرق کی طرف اور بھی
ہے. جو اس وقت سمجھ میں آیا اور تفسیروں میں نظر سے نہیں
گزرا ممکن ہے کسی نے لکھا ہو۔ وہ یہ کہ اس جگہ دو جملے
شرطیہ ہیں اور ہر ایک میں شرط کا تعلق جزا کے ساتھ مختلف
عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ ارادہ دنیا کی بابت تو ارشاد ہے
من کان یرید العاجلتہ جو استمرار کا صیغہ ہے اور ترجمہ یہ ہوا
کہ جو کوئی دنیا کی طلب کرتا رہے اور ہمیشہ طلب میں منہمک
رہے تب کچھ ملتا ہے اور ارادہ آخرت کے متعلق من اراد
بدون لفظ کان کے ارشاد فرمایا. جس سے معلوم ہوا کہ ثمرہ
اخروی حاصل کرنے کے لئے طلب و سعی میں مرنا کھپنا نہیں
پڑتا. بلکہ کچھ ارادہ کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے"۔

واقعی یہ لطیف فرق و اشارہ لطیف ہی نہیں بلکہ واقعی و حقیقی بھی ہے کہ دنیاوی معاملات میں کامیابی کے لئے جتنا مرنا کھپنا پڑتا ہے. اس کے مقابلہ میں آخرت کے لئے بس "کچھ ارادہ ہی کافی ہو جاتا ہے۔ جیسے صاف سیدھا راستہ چلنا آسان ہوتا ہے بخلاف دنیا طلبی کے کہ اس کا راستہ مکر و فریب. ریا و نفاق. ظلم و تعدی. دروغ و دغابازی کی کجراہیوں اور الجھنوں سے بھرا ہوتا ہے۔ یہ تو دنیا پرستوں کی زندگی میں دن رات کا مشاہدہ ہے۔

اس کے علاوہ دین کی حقیقت خدا سے خاص تعلق و محبت ہے لہٰذا یہ مطلب نہیں کہ طالب آخرت کا ارادہ و طلب مستمر نہیں ہوتا یا کچھ دنوں کے بعد زائل ہو جاتا ہے۔ نہیں حقیقت میں تو وہ بھی مستمر رہتا ہے مگر تھوڑی سی سعی و طلب کے بعد حکم میں غیر مستمر کے ہو جاتا ہے۔

"کیونکہ محبت الٰہی پیدا ہو جانے کے بعد وہ ارادہ اتنا سہل ہو
جاتا ہے کہ اس کے پیدا کرنے کے لئے اہتمام کرنا نہیں پڑتا.
خود بخود پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اگرچہ پیدا اختیار سے ہوتا ہے. مگر
بوجہ اعانت غیبی کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود بدون

اختیار کے پیدا ہورہا ہے۔

اب اس غیبی اعانت کی اصل وجہ ذرا حدیث سے سنئے کہ

" آخرت کی طلب خود سرکار (اللہ تعالیٰ) کو محبوب ہے اس لئے اس میں سعی کرنے والے کی اس طرف سے امداد ہوتی ہے۔ جس سے وہ بالکل سہل ہو جاتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ من تقرب الی شبرا تقربت الیہ ذراعا ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیہ باعا ومن اتی یمشی اتیتہ ہرولتہ۔ اور دنیا بارگاہ الٰہی کی مردود ہے اس میں ہمیشہ وقت و تعب ہی رہتا ہے۔ اس کے لئے ہمیشہ اہتمام و انہماک از خود کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ طلب ہمیشہ بہ تکلف از سرنو پیدا کرنا پڑتی ہے۔

آگے اس آیت کے متعلق چند نکات اور سنئے جو عین وعظ ہی کے وقت حضرت کے ذہن میں آئے۔

لطیف نکات: " ایک نکتہ یہ ہے کہ طالبین دنیا کے بارے میں پہلے یہ فرمایا گیا ہے کہ عجلنالہ فیہا مانشاء لمن نرید کہ دنیا طلبوں میں سے ہم جس کو چاہے جس قدر چاہئیں عطا کر دیتے ہیں اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس کے مقابلہ میں طالبین آخرت کے لئے یہ فرمایا جاتا کہ ہم طالب آخرت کو جو کچھ وہ چاہے گا وہی دیں گے۔ جب دنیا والوں کے لئے یہ فرمایا کہ ان کو جو ہم چاہئیں گے دیں گے۔ تو بظاہر اس کے مقابل آخرت والوں کی فضیلت پوری اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ ان کو ان کی طلب کے موافق سب کچھ دیا جائے گر آیت میں مایشاؤن کے بجائے اولئک کان سعیہم مشکورا فرمایا۔

" بات یہ ہے کہ اگر اس جگہ یہ فرماتے کہ ان کو جو کچھ وہ

چاہئیں گے وہی دیا جائے گا تو درحقیقت کچھ اضافہ نہ ہوتا بلکہ وعدہ گھٹ جاتا کیونکہ آخرت کی نعمتوں کی شان یہ ہے کہ مالا عین راءت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ یعنی ان نعمتوں کو نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا نہ کسی بشر کے قلب میں ان کا خیال تک گزرا۔ تو بتلایئے کہ جب وہاں ان کی نعمتوں کا یہ حال ہے. تو اگر یہ فرمایا جاتا کہ جو کچھ وہ چاہیں گے دیا جائے گا تو یہ اضافہ اور زیادتی ہوتی یا کمی۔ دراصل بہت ہی کمی ہو جاتی کیونکہ جب وہاں کی نعمتوں کا ہم کو وہم بھی نہیں ہو سکتا تو ہماری خواہش کے موافق جو ملتا وہ بہت کم ہوتا۔

"حق تعالیٰ شانہ کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ ہمارے واسطے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کا ہم کو وہم و خطرہ بھی نہیں ہو سکتا. اور وہاں ثواب ہماری خواہش پر موقوف نہیں فرمایا. بلکہ اپنی رحمت سے ہماری خواہش سے بہت زیادہ عطا فرمائیں گے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں کہ

خود کہ یابد این چنین بازار را　　کہ بیک گل می خرد گلزار را

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد　　انچہ در ہمت نیاید آں دہد

"اس وجہ سے حق تعالیٰ نے اجمالاً فرما دیا کہ اولئک کان سعیہم مشکورا۔ یعنی ان لوگوں کی کوشش کی اس دربار میں قدر ہو گئی۔ اس سے سمجھ جاؤ کہ جن کی کوشش کی قدر دانی ایسے عظیم الشان قدر دان بادشاہ کے دربار میں ہو ان کو کیا کچھ نہ ملے گا۔ جس کا اندازہ اس سے کرو کہ دنیا کے بادشاہ جب کسی کی قدر دانی کرتے ہیں تو اس کے ساتھ کیسا معاملہ کرتے ہیں۔ یہ نہیں کرتے کہ انعام خدمت کی حیثیت سے دیں. بلکہ وہ اپنی حیثیت کے موافق انعام و اکرام کیا کرتے ہیں, جس کا اس کو وہم بھی نہیں ہوتا پھر جس کی قدر دانی حق تعالیٰ اپنی عظمت کے موافق فرمائیں گے اندازہ کرو کہ اسے کیا کچھ ملے گا۔ جس کی یہاں تفصیل سمجھ میں بھی نہیں آ سکتی۔

"دوسرا اشارہ وسعی لھا سعیہا سے اس سعی کے سہل ہونے پر ہے۔ جیسا اردو محاورہ میں بھی بولا جاتا ہے کہ اس کام کے لئے بس جو تدبیر ہے وہ کرنی چاہئے۔ تدبیر کا بیان نہ کرنا اور اجمالاً صرف یہ کہہ دینا کہ جو تدبیر ہے وہ کرنی چاہئے. اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تدبیر معلوم بھی ہے اور سہل بھی ہے۔

تیسرا اشارہ مشکورا میں اس بات کی طرف ہے کہ جو کچھ آخرت میں ملے گا. محض قدر دانی ہے. عمل کو اس میں دخل نہیں جس میں تنبیہ ہے کہ اپنے عمل پر نازاں نہ ہونا چاہئے۔ وجہ یہ ہے کہ طاعت ادائے حق خداوندی ہے. اور اس کے حقوق غیر متناہی ہیں۔ اور غیر متناہی حقوق کا ادا کرنا موقوف ہے غیر متناہی عمل پر۔ اور ہم بوجہ حادث و متناہی ہونے کے غیر متناہی عمل سے عاجز ہیں۔ لہٰذا جو کچھ بھی ملے وہ محض قدر دانی نہیں تو اور کیا ہے۔ پس مشکورا فرما کر بتلا دیا کہ عقل تو چاہتی ہے کہ تمہارا اجر کم ہوتا مگر یہ ہماری قدر دانی ہے۔

"ایک حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں اپنے عمل سے کوئی نہ جائے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا. اور اس سوال کی ہمت بھی انہیں کو تھی. کہ ولا انت کیا آپ بھی اپنے عمل سے جنت میں نہ تشریف لے جائیں گے۔ اس سوال پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خوف غالب ہو گیا اور اپنے سر مبارک پر ہاتھ رکھ کر فرمایا ولا انا الا ان یتغمدنی اللہ برحمتہ کہ میں بھی عمل سے جنت میں نہ جاؤں گا مگر یہ کہ خدا کی رحمت دستگیری فرمائے۔ صاحبو! اب کس کی ہمت ہے کہ اپنے عمل کو کچھ سمجھے۔

"قیامت میں جب ہم اپنے اعمال کی جزا دیکھیں گے. کہ اس قدر بے شمار نعمتیں ہیں. تو معلوم ہو گا یہ سب محض قدر دانی ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز حق تعالیٰ شانہ اپنے مومن بندہ کا حساب چھپا کر لیں گے اور فرمائیں گے کہ ہم نے تم پر یہ یہ انعامات فرمائے تھے پھر بھی تم نے نافرمانی کی

فلاں گناہ کو یاد کرو. فلاں دن یہ کیا تھا فلاں دن یہ کیا تھا یہاں تک مومن یہ سمجھے گا کہ بس میں ہلاک ہوا اور ہر طرف سے اپنے کو جہنم کے قریب دیکھے گا. اس وقت حق تعالیٰ شانہ فرمائیں گے کہ جاؤ ہم نے دنیا میں بھی پردہ پوشی کی تھی یہاں بھی کرتے ہیں۔ کچھ ٹھکانا ہے اس رحمت کا کہ مسلمان کو دوسروں کے سامنے ذلیل بھی نہ فرمائیں گے۔

"صاحبو ایسے خدا کو چھوڑ کر کہاں جاتے ہو کیا اس کا حق تمہارے اوپر کچھ بھی نہیں جو یوں نافرمانی پر کمربستہ ہو"!

ایک بڑے شبہ کا ازالہ. اس سلسلہ میں ایک بڑے شبہ کا ازالہ فرمایا ہے۔

"بعض رحمدل لوگوں کے دل میں آیا کرتا ہے کہ کافروں کے لئے ہمیشہ جہنم یا خلود فی النار کیوں ہے کفر تو اس نے کیا تھوڑی مدت تک یعنی دنیا کی چند روزہ زندگی میں اور سزا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم جو بظاہر عدل کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ تو بات یہ ہے کہ کافر نے حق تعالیٰ کے ساتھ جب شرک و کفر کیا تو اس نے حق تعالیٰ شانہ کے دراصل غیر متناہی حقوق کو ضائع کیا اور غیر متناہی حقوق کے ضائع کرنے پر غیر متناہی سزا بالکل عقلی قاعدہ کے موافق ہے۔

غرض عمل صالح سے تو حقوق غیر متناہی ادا نہیں ہوتے اور کفر سے حقوق غیر متناہی ضائع ہو جاتے ہیں" (۱)

یہ صرف ایک مثال تھی ورنہ سارے مواعظ جو سینکڑوں کی تعداد میں ہیں اسی طرح کے قرآن فہمی کے تفسیری حقائق و نکات سے بھرے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ کاش یہ سب یکجا (۲) ہو کر مختصراً کسی ترجمہ قرآن کے حاشیہ پر چڑھ جائے۔ تو بہترے بندگان خدا کے لئے تلاوت قرآن میں جان پڑ جاتی۔ احقر کی تجاویز میں یہ بھی شامل ہے۔ والا تمام من اللہ

۱۔ ملخصاً از ص ۲۲ تا ص ۴۹

۲۔ الحمد للہ کہ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی استاد تفسیر دارالعلوم دیوبند نے یکجا فرمانا شروع فرما دیا ہے۔

تصوف۔ لیکن حضرت مجدد وقت کا سب سے وسیع و محیط تجدیدی کارنامہ تصوف کی کامل و جامع تجدید و اصلاح ہے۔ اور حق یہ ہے کہ یہ خدمت حق تعالیٰ نے حضرت والا سے ایسی لی ہے جس کی نظیر اولین و آخرین میں مشکل سے نظر آتی ہے۔ تصوف یا طریقت کی ساری تعلیمات کلیات و جزئیات حضرت کی تجدید کے بعد عین شریعت بن گئی ہیں. بلکہ تصوف کے بغیر جیسا کہ خود فرمایا کرتے تھے دین و ایمان کامل ہی نہیں ہوتا۔ شریعت و طریقت کی دوئی کی بحث ہی انشاء اللہ قیامت تک کے لئے ختم ہو گئی۔ اور ایسے تصوف و طریقت کا کوئی خشک سے خشک ملا بھی کیسے انکار کر سکتا ہے جو سراسر شریعت ہو۔ اگر آج علامہ ابن تیمیہ علیہ الرحمہ موجود ہوتے تو ان کی تحقیق و حق پسندی بھی ان کو خانقاہ امدادیہ کے تصوف سے باہر نہ رہنے دیتی. اور عبدالوہاب نجدی" میں بھی حضرت علیہ الرحمہ کے بقول "وجدی" ہونے کی جو کسر تھی وہ نہ رہ جاتی۔ چونکہ تصوف کی تجدید پر "تجدید تصوف و سلوک" ہی کے نام سے الحمد اللہ ایک مفصل و مستقل کتاب ہو گئی ہے. اس لئے یہاں حضرت کی علمی جامعیت کے سلسلہ میں صرف اتنے ذکر ہی پر بس کیا جاتا ہے۔

معقولات۔ تفسیر و حدیث فقہ و تصوف یہ تو سب کم و بیش دینی و نقلی علوم ہیں. باقی عقلی علوم سے جس طرح طائفہ دیو بندیہ منصورین علی الحق کو بعض حلقوں میں کم سواد یا بے سواد خیال کیا جاتا ہے. اس کی بنا پر شاید حضرت والا کی نسبت بھی گمان ہو کہ منطق و فلسفہ اور علم کلام وغیرہ معقولات سے کوئی خاص مناسبت نہ ہو گی۔ گو یہ عجیب بات ہے کہ جس دارالعوم دیو بند کا خود بانی. مولانا محمد قاسم رحمتہ اللہ علیہ نانوتوی جیسا متکلم و فلسفی ہو. جس کی کتابیں آج بھی زندہ گواہ ہیں. اس طبقہ کی نسبت معقولات سے نا آشنائی کا گمان نہ جانے کیسے ہوا! شاید اس لئے کہ معقولات نام صرف صدرا و شمس بازغہ قاضی و حمد اللہ یا سلم کے شروح اور حواشی در حواشی کا رکھ لیا گیا ہے۔ تو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حضرت تھانوی نہ فقط ان نام نہاد کتب معقولات کا برسوں اور اس عبور و مہارت کے ساتھ درس دیتے رہے کہ "مثناہ بالتکریر"

جیسے مشکل مقامات کو طلبہ کے لئے پانی بنا دیا کرتے تھے ا۔ بلکہ حکیم الامتہ فلسفہ کے اصلی و صحیح معنی میں محب الحکمہ ا۔ تھے۔ یعنی صدرا و شمس بازغہ کی کتاب خوانی پر ناز کرنے والوں کا حال تو اکثر یہ دیکھا. کہ دو باتیں بھی عقل و حکمت کی مشکل سے کر سکتے ہیں منطق پر فنی اعتبار سے اتنا قابو و عبور تھا کہ ایک موقعہ پر خواجہ عزیز الحسن صاحب سے فرمایا کہ "اب فرصت و قوت نہیں رہی ورنہ منطق کی ایک کتاب بھی اگر مجھ سے پڑھ لی جاتی تو پھر دوسری کتاب کی چنداں ضرورت ہی باقی نہ رہتی اور منطق سے پوری مناسبت پیدا ہو جاتی ۲۔" لیکن منطق کا اصل وظیفہ خطائے فی الفکر سے بچانا ہے. جس سے ہمارے مدعیان منطق کو حلقہ درس سے باہر اتنی بےفکری ہوتی ہے. کہ ان کی باتوں سے کتابی منطق سے نابلد سلیم الفکر عامی بھی شرما جائے۔ یہی نہیں بلکہ اس مروجہ منطق و معقولات کے اکثر مشاہیر کو دیکھا کہ سرے سے ان کا دماغی توازن ہی سلامت نہیں رہتا۔ بخلاف اس کے حضرت کی سینکڑوں کتابوں کے ہزاروں صفحات آج بھی ہمارے سامنے ہیں. جن کی سطر سطر اس بات کی شہادت ہے کہ سب سے زیادہ حضرت پر شریعت کے بعد جس چیز کا غلبہ تھا. وہ عقل و حکمت ہی کا تھا۔

حضرت کی چیزوں کو پڑھ کر بڑا اثر یہی ہوتا ہے کہ دین و شریعت سراپا عقل و حکمت ہے۔ البتہ ایسی بے عقلی نہیں کہ عقل کے مقام و رسائی کو نہ پہچان کر وحی و نبوت یا کتاب و سنت کو نفسانی عقل و حکمت کے تابع بنا دیا ہو نہ وہ فرنگی عقل جو صرف حیوانی و مادی تزئین حیات میں غرق ہو بلکہ اسی حیوانیت کو تمامتر انسانی ترقی کا مدار و معیار جانتی ہو۔ ورنہ جو صحیح عقل ہے اس کی نسبت ہمیشہ فرماتے کہ "طبیعت کو عقل کے تابع رہنا چاہئے اور عقل کو شریعت کے"۔ اس قید کے ساتھ پھر تو یہی فرماتے کہ ہمیشہ رہنے کی چیز اور اصل دولت ایمان و عقل ہی ہے۔ درسیاتی منطق اور معقولات کے دعویدار تو شاید ہی دس بیس منٹ منطقی و معقولی گفتگو فرما سکتے ہوں لیکن حضرت نامعقول اور غیر منطقی گفتگو کرنا کیا معنی سننا بھی

ا۔ اشرف السوانح حصہ اول باب درس و تدریس۔

ا۔ فلسفہ یونانی الاصل لفظ ہے جس کے معنی عقل و حکمت کی محبت یا حکمت پسندی کے ہیں

۲۔ اشرف السوانح باب درس و تدریس۔

گوارا نہیں فرما سکتے تھے اور نامعقول بات سے زیادہ کسی چیز پر طبع سلیم کو تغیر نہ ہوتا تھا۔ جس کا تجربہ حضرت کی مجالس کے سعادت اندوزوں کو بات بات میں ہوتا تھا. اور ملفوظات سے آج بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے مثلاً تحریک خلافت کے زمانہ میں

گفتگو میں منطق و حکمت. "ایک مولوی صاحب ایک مجمع کی طرف سے آئے آنے کے قبل بواسطہ ان سے گفتگو ہو چکی تھی کہ آنے کی تین غرضیں ہو سکتی ہیں ایک افادہ ایک استفادہ ایک مناظرہ اگر افادہ مقصود ہے تو میرے ذمہ اس کا جواب نہ ہو گا، وہ تبلیغ ہو گی اپنا فرض ادا کر کے تشریف لے جایئے گا عمل کرنا نہ کرنا میری توفیق پر ہے۔ اور اگر استفادہ مقصود ہے تو اس کے لئے پہلے سے تردد لازم ہے اور آپ کو تردد ہے نہیں، اس لئے کہ شرکت کر چکے، شرکت کا اعلان کر چکے اس لئے یہ شق قابل تسلیم نہیں۔ رہا مناظرہ اس میں بے تکلفی شرط ہے سو مجھ میں اور آپ میں پہلے سے بے تکلفی نہیں۔ جواب آیا کہ جو چاہو سمجھو آنے کی اجازت دے دو۔ میں نے اجازت دے دی۔

اب ذرا آنے کے بعد سنئے۔

"آئے اور درخواست کی کہ تنہائی میں کچھ کہنا ہے میں نے کہا کہ جلوت میں گفتگو کرنے میں تو آپ کے لئے خطرہ ہے کہ آپ کے اسرار ظاہر ہوں گے، مگر آپ اس خطرہ کے لئے تیار ہیں، اور خلوت میں میرے لئے خطرہ ہے کہ مجھ پر اشتباہ ہو، جس کے لئے میں تیار نہیں۔ بس آپ کے لئے خلوت و جلوت دونوں برابر ہیں کیونکہ آپ اعلان کر چکے ہیں توپوں فوجوں بندوقوں مشین گنوں اور جیل خانوں کے لئے تیار ہو چکے ہیں، مگر میرے لئے خطرہ ہے کہ یہ سمجھا جائے گا کہ گورنمنٹ کے خلاف کوئی سازش کرنے کا ارادہ ہے اس لئے جو کہنا ہو مجمع میں کہئے"۔ (۱)

۱۔ الافضات حصہ چہارم صفحہ ۱۷۴

اس کھری اور سچی منطق کا جواب ہی کیا تھا "بس بیچارے رہ گئے" ۔ ایک اور مثال اسی مجلس ملفوظات سے لیجئے۔ کانپور میں گیارہویں کے متعلق حضرت کا بیان تھا۔

"اس میں ایک انسپکٹر پولیس بھی شریک تھے وعظ کے بعد کہا کہ ہمارے لئے بڑی مشکل ہے، فلاں فلاں عالم تو اس کو جائز کہتے ہیں اور تم اس کو بدعت کہتے ہو ہم کیا کریں۔ میں نے کہا کہ اس کا جواب تو بعد کو دوں گا پہلے یہ بتلایئے کہ آپ کو تردد رفع کرنا مقصود ہے یا اعتراض کرنا کہا تردد رفع کرنا۔ میں نے کہا کہ تردد تو دونوں ہی جانب ہونا چاہئے، سو جیسے مجھ سے اس وقت کہا کیا کبھی ان جائز کہنے والوں سے بھی اس طرح کہا گیا کہ فلاں فلاں منع کرتے ہیں اور آپ جائز کہتے ہیں ہم کیا کریں۔ بس داروغہ جی ختم ہو گئے" ۔ (۱)

مگر یہ منطق سلم اور اس کی شروح و حواشی رٹنے رٹانے سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کا سرچشمہ محض حق تعالیٰ کا فضل ہے جو تعلق حق ہی سے نصیب ہوتا ہے جیسا اوپر والے ملفوظ اول ہی کے سلسلہ میں فرمایا کہ

"اللہ کا شکر ہے اپنے فضل سے عین وقت پر دل میں ضرورت کی چیز ڈال دیتے ہیں، اس میں میرا کوئی کمال نہیں، جس سے چاہیں اپنا کام لے لیں" ۔

حق تعالیٰ کے اس فضل خاص کی مثالیں حضرت کے حق میں کہاں تک گنائی جائیں۔ تاہم ایک مذکورہ بالا مجموعہ ملفوظات ہی سے نقل کی جاتی ہے۔

"قصبہ رامپور میں ایک تقریب تھی ختنوں کی۔ وہاں پر مجھ کو بھی بلایا گیا اور اپنے اور حضرات (مولانا خلیل احمد و مولانا دیو بندی وغیرہ) بھی تھے۔ پہنچ کر معلوم ہوا کہ بڑا تفاخر کا سامان کیا گیا ہے، اس لئے میں شریک نہیں ہوا اور خفیہ گھر چلا آیا۔ اس پر ایک صاحب دوسرے بزرگوں کی نصرت کے لئے مناظرہ کی نیت سے تشریف لائے اور کہا مجھے ان رسوم کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ میں نے کہا ضرور شوق سے، مگر کچھ شرائط ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ

ا۔ الافاضات حصہ چہارم ص ۱۷۷

دیکھ لیا جائے کہ آپ کو واقعی شبہ ہے، دوسرے یہ کہ اس شبہ کا آپ کے ذہن میں کوئی جواب نہیں، تیسرے یہ کہ اپنے کسی معتقدفیہ (بزرگ) کی نصرت (حمایت) مقصود نہیں۔ یہ حلف سے بیان فرما کر جو شبہ ہو فرمائیے۔ بس سب اعتراضات ختم ہو گئے"۔

اب حضرت ہی کے سلسلہ کے جو دوسرے بزرگ اس تقریب میں شریک ہوئے تھے ان کا معاملہ و واقعہ بھی قابل شنید ہے۔

"حضرت مولانا خلیل احمد صاحب" سے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ اگر یہ بات جائز تھی تو وہ (مولانا تھانوی) کیوں نہیں شریک ہوا اور اگر ناجائز تھی تو آپ کیوں شریک ہوئے۔ اس پر مولانا مجمع میں تو یہ جواب دیا کہ وہ تقوے پر عمل کرتا ہے اور ہم فتوے پر۔ اس لئے بعض دفعہ ہمارا اور اس کا اختلاف ہو جاتا ہے۔ اور خفیہ خط میں مجھ کو یہ لکھا کہ اصلاح الرسوم پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ (۱)

"میں نے مولانا خلیل احمد صاحب" کو جواب لکھا کہ میں نظر اول نظر ثانی ثالث رابع سب کچھ کر چکا، ہر نظر کا وہی نتیجہ ہے جو نظر اول کا تھا ہاں اس کی اور صورت ہے وہ یہ کہ آپ نظر فرما کر اس میں غلطیاں نکال دیں، میں اس کا رد نہ کروں گا بلکہ شائع کر دوں گا۔ ناظرین دونوں کو دیکھ لیں گے۔ اب چاہے کوئی ادھر جائے چاہے ادھر جائے۔ مگر جو رسمیں مٹ چکی ہیں اگر آپ کی تحریر پر انہوں نے پھر عود کیا تو اس کو آپ خود دیکھ لیں۔ اس کے بعد حضرت مولانا (خلیل احمد صاحب) نے کبھی کچھ اس کے متعلق نہیں فرمایا"۔ (صفحہ ۲۱۹، ۲۲۰)

۱۔ جس میں تمام ناجائز رسوم کی اصلاح فرمائی گئی ہے۔

عام اہل علم و فضل اور مجدد وقت میں فرق: حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ جیسے حضرات کے علم و فضل اور بزرگی میں کلام نہیں. لیکن بات وہی ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے دین کی تجدید اور امت کی اصلاح کے لئے مبعوث و مقرر فرمایا ہو. اس کی بصر و بصیرت فہم و فراست امت کے خواص و عوام کے مصالح و مفاسد تک جس درجہ پہنچ سکتی ہے بڑے بڑے علماء صلحا و مقبولین کی بھی پہنچنا ضروری نہیں۔ کیونکہ ان کو اس خاص خدمت کے لئے متعین ہی نہیں فرمایا گیا ہے۔

چنانچہ مذکورہ بالا تقریب کے معاملہ میں جب وہی سوال حضرت مولانا دیوبندی (شیخ الہندؒ) کی خدمت میں پیش کیا گیا تو۔

"مولانا نے حقیقت بیان فرمادی اور یہ جواب دیا کہ جس قدر عوام کی حالت اسے (یعنی مولانا تھانوی کو) معلوم ہے ہمیں معلوم نہیں. اس لئے وہ ایسی چیزوں کو روکتا ہے"۔

اب آگے ہمارے حضرت کا کمال دیکھئے کہ اپنے اس کمال واقعی کو محض تواضعاً رد نہ فرمانے کے باوجود اپنے اساتذہ اور بزرگوں کے کمال علم و فضل کے اعتراف کے ساتھ ادب کو بھی کس درجہ ملحوظ و محفوظ رکھا فرماتے ہیں کہ

"کوئی شبہ نہ کرے کہ نعوذ باللہ کیا مجھ کو اپنے اکابر سے زیادہ علم ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عوام کی حالت کا علم یہ محسوسات کا علم ہے اور محسوسات کا علم کوئی کمال نہیں بلکہ احکام کا علم کمال ہے۔

"اس معاملہ میں ایک بزرگ نے مجھ سے کہا کہ تم نے اپنی جان تو بچالی لیکن اگر کوئی اعتراض کرے کہ تمہارے اکابر کی شرکت کیوں ہوئی؟ میں نے کہا مجھ کو کسی نئے جواب کی ضرورت نہیں۔ میں وہ جواب دوں گا جو ہمارے اکابر (غالباً مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ) نے حضرت حاجی صاحب (امداد اللہ صاحبؒ) کے مولود میں شریک ہونے کے متعلق سکھا دیا ہے کہ حضرت حاجی صاحب کو عوام کی حالت کی خبر نہیں۔ ہم کو خوب خبر ہے"۔

غرض یہ کہ تجدید و اصلاح کی خدمت کے لئے صرف علم و تقویٰ کا کمال کافی نہیں، بلکہ جس گروہ یا جماعت کی اصلاح مقصود ہے اس کے مصالح و مفاسد کا خداداد و دقیق و عمیق، مشاہدہ اور ان کے ازالہ کی تدابیر کے لئے موہوب فہم و بصیرت لازم و مقدم ہے۔ اور حضرت علیہ الرحمہ کی تجدیدی اصلاحات میں یہ دونوں باتیں آفتاب نیم روز کی طرح روشن ہیں۔

خیر یہ بات تو حسب موقع درمیان میں استنطرواً آگئی۔ اصل میں گفتگو یہ تھی کہ حضرت کی منطق و حکمت صرف کتابی و درسی نہ تھی، بلکہ زندگی کے ہر اعلیٰ و ادنیٰ عمل و حرکت کیا معنی بات بات میں نمایاں تھی۔ اور "یونانیوں" کی منطق حکمت کے مقابلہ میں "ایمانیوں" کی منطق و حکمت کی یہ شان ہے۔

چند خوانی حکمت یونانیاں حکمت ایمانیاں راہم نجواں

عمل میں حکمت کی مثال: گفتگو میں تو اس ایمانی منطق و حکمت کی بعض مثالیں سن لیں ایک آدھ مثال عمل میں بھی حکمت و ایمان کی دیکھ لیں۔ سفارش جو بظاہر ایک معمولی بات ہے اور اچھے اچھوں کو دیکھا کہ اس کو بس اچھا کام سمجھ کر بغیر اس کے دوسرے نتائج پر غور فرمائے بلا قید و شرط سفارش فرما دیا کرتے ہیں۔ لیکن حکیم الامت کی سفارش میں ایمانی حکمت کا رنگ یہ ہوتا تھا کہ فرماتے ہیں کہ

"ایک صاحب ہمارے بزرگ کی اولاد میں ہیں۔ دو یا ڈھائی ہزار کے قرضہ دار تھے مجھ سے سفارش چاہی میں نے صاف کہہ دیا کہ خطاب خاص سے تو سفارش نہ کروں گا۔ ہاں خطاب عام سے سفارش میں عذر نہیں صورت خاص میں سفارش کرنا دو حال سے خالی نہیں۔ ایک تو خواہ اس کا جی چاہے یا نہ چاہے، مگر پورا ہی کرے، اس میں تو دوسرے پر بار ہوتا ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ فلاں شخص نے لکھا ہے اگر کام نہ کیا تو اس پر ناگواری کا اثر ہو گا۔

"تو اس صورت میں دینے والے کا ایک تو دنیا کا نقصان ہوا اس لئے کہ اس میں خلوص نہ رہا صرف فلوس رہا، تو ثواب سے بھی محرومی رہی اس لئے دین

کا نفع نہ ہوا اور مال الگ تلف ہوا. اس لئے دنیا کا نقصان ہوا۔ اور چونکہ طیب خاطر سے نہیں دیا گیا اس لئے لینے والے کے دین کا نقصان ہوا. کیونکہ بدون طیب خاطر کسی کے مال کا لینا شرعاً جائز نہیں۔

"اور ایک ضرر مخاطب کا اور ہے وہ یہ کہ اگر اس نے دیا تو سفارش کرنے والے سے حجاب ہو گا خصوصاً جب کہ اس سے اصلاح کا تعلق ہو. تو یہ اس کے لئے دین کی مضرت ہو گی کیونکہ اس کو اپنے اس مصلح سے دین کی خدمت لیتے ہوئے حجاب ہو گا کہ اس نے ایک بات کو لکھا تھا یا کہا تھا مگر ہم نے نہیں کیا۔ اب ہمارا کیا منہ ہے کہ اس سے کسی قسم کی خدمت لیں"۔

"غرض خطاب خاص میں یہ خرابیاں ہیں. اس لئے میں نے صورت عام میں سفارش لکھ دی اور کامیابی کی دعا کر دی"۔

فرمایئے کتنے لوگ سفارش میں ان ایمانی حکمتوں کا خیال فرماتے ہیں۔ رہا یہ وسوسہ کہ سفارش کی بدولت بیچارے حاجتمندوں کے جو کام نکل جاتے ہیں. وہ سفارش میں ان قیود و شرائط اور تنگی کے ساتھ کتنوں کے نکلیں گے تو یہ وسوسہ سرے سے غیر ایمانی ہے. اس لئے کہ سفارش سے کوئی دیتا یا پاتا تھوڑا ہی ہے۔ (لا معطی لما منعت ولا مانع لما اعطیت) جو کچھ ملنے والا ہے. وہ تو مل ہی کر رہے گا۔ آخر ان قیود و شرائط کے باوجود ان کو ڈھائی ہزار روپیہ ایک ہی شخص سے مل گیا اور اس طرح چھت پھاڑ کر ملا کہ وہ ایک سوداگر کو حضرت کی وہی عام سفارشی تحریر دکھلا رہے تھے۔

"جن کی دوکان پر اس وقت بمبئی کے ایک سیٹھ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے کانوں میں اس واقعہ کی کچھ بھنک پڑی، تو ان سوداگر سے سوال کیا کہ کیا بات ہے۔ انہوں نے مفصل قصہ بیان کیا کہ یہ صاحب اتنی رقم کے قرضہ دار ہیں. ایک بزرگ کی اولاد ہیں مگر ان کی شرط یہ ہے کہ ایک ہی شخص یہ رقم دے گا تو لوں گا ورنہ نہیں. اور میرا نام بھی لیا کہ اس کی سفارش و تصدیق بھی ان کے پاس ہے۔ بس ان سیٹھ نے بغیر کسی کنج و کاؤ کے ڈہائی ہزار کے نوٹ جیب سے نکال کر ان کے حوالہ کر دیئے۔ اور یہ الفاظ کہے کہ جب ایسے

شخص کی سفارش ہے تو آگے کسی بات کے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں"۔

لطف یہ کہ معلوم ہوا۔

"یہ سیٹھ عقائد و مسلک میں ہمارے بزرگوں کے خلاف بھی تھے۔ بدعتی خیالات کے شخص تھے۔ اور یہ بھی کہا کہ میں جب بمبئی سے چلا تھا، یہ ڈہائی ہزار کے نوٹ اس نیت سے لے کر چلا تھا کہ کسی کار خیر میں صرف کروں گا سو اللہ نے وہ موقع عطا فرما دیا"۔

یہ سب اس سلسلہ میں فرمایا کہ

"جس کام کو حق تعالیٰ کرانا چاہتے ہیں، اس کے اسباب ویسے ہی مہیا فرما دیتے ہیں اور اس میں کسی کی ذات کو خاص دخل نہیں ہوتا کہ فلاں ہی شخص کرے گا تو وہ کام ہو گا، وہ جس سے چاہیں لے سکتے ہیں۔ بڑے بڑے مظنہ خیر بیٹھے منہ دیکھا کرتے ہیں اور کام لے لیتے ہیں"۔

"اس حالت میں کسی کو ناز نہیں کرنا چاہئے کہ ہم ہی کریں گے تو فلاں کام ہو سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ وہ جس سے چاہیں اپنا کام لے لیں، ان کا ملک ہے، ان کی مخلوق ہے مگر بھروسہ شرط ہے" (ص۱۴۸)

جب یہ معاملہ ہے تو پھر اہل ایمان کو سفارش وغیرہ کسی بھی چھوٹے بڑے کام میں آخر دینی قیود و شرائط یا ایمانی حکمت چھوڑنے کا کیا عذر ہو سکتا ہے!

غرض منطق و معقولات فلسفہ و حکمت وہی ہے، جو کام آئے خصوصاً خدمت دین میں، ورنہ نام ہی نام یا پھر نری لفاظی اور ذہنی عیاشی ہے۔

علم کلام: معقولات کا جو فن خاص دین ہی کی ایک خدمت کے لئے وضع ہوا وہ علم کلام ہے۔ اس فن میں جو کتابیں اس زمانہ کے لحاظ سے لکھی گئی ہیں، ان میں حسین آفندی کی کتاب رسالہ حمیدیہ قدیم و جدید کی جامعیت عقائد و اعمال کی احاطت، اور مباحث کی معقولیت و مناسبت کے اعتبار سے بحیثیت مجموعی خوب کتاب ہے۔ حضرت علیہ الرحمہ نے اس کے ترجمہ سائنس اور اسلام کی حذف و اضافہ کے ساتھ بہت اچھی تلخیص اپنی کتاب تعلیم

الدین میں تکمیل الیقین کے نام سے شامل فرمادی ہے۔

اس کے علاوہ المصالح العقلیہ للاحکام النقلیہ کے نام سے ایک پوری مستقل کتاب تین حصوں میں تحریر فرمائی. جس میں صرف عبادات و معاملات ہی کے اصولی و فروعی احکام نقلیہ کے عقلی مصالح و حکم نہیں بیان فرمائے گئے ہیں۔ بلکہ آخری حصہ میں قبر و قیامت کے بہت سے معاملات کے بھی اسرار تحریر فرمائے گئے ہیں. مثلاً قبر کا عذاب و ثواب. اس عذاب و ثواب کا عام اہل دنیا کو نظر نہ آنا. جو لوگ ڈوب یا جل کر مرجاتے ہیں ان کے لئے عذاب و ثواب قبر کی کیا صورت ہے۔ عالم برزخ کے بعد عالم حشر برپا ہونے کی وجہ۔ مرنے والوں کی ارواح کا اپنی قبروں سے تعلق. پل صراط کی حقیقت. قیامت کی حقیقت بہشت و دوزخ کی حقیقت وغیرہ۔

نیز اصلاح الخیال روح الارواح. مواعظ ہفت اختر وغیرہ میں بھی بہت سے نقلی مسائل و احکام کی بڑی دل نشین عقلی تقریریں ملتی ہیں۔

علم کلام کا تجدیدی کارنامہ۔ لیکن علم کلام میں مجدد وقت کا اصل تجدیدی کارنامہ ایک اسی صفحہ کا چھوٹا سا رسالہ الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ ہے. جس کی تقریب تالیف کا ماحصل یہ ہے کہ

> "اس زمانہ میں مسلمانوں میں عقائد کی اور پھر اس سے اعمال کی جو دینی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں ان کو دیکھ کر اکثر زبانوں سے جدید علم کلام کی ضرورت تدوین کا ذکر سنا جاتا ہے۔ گو جو قدیم علم کلام پہلے سے مدون موجود ہے اس کے اصول بالکل کافی دوافی ہیں۔ البتہ ان اصول کے استعمال اور تفریعات کے اعتبار سے یہ جدید ضرورت مسلم ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا یہ جدید ہونا شبہات کے جدید ہونے کی بناپر ہے۔ تاہم یہ شبہات کیسے ہی اور کسی زمانہ میں ہوں ان کے جواب کے لئے وہی قدیم علم کلام کافی ہوتا ہے"

لہٰذا ایک ضروری اصلاح و تجدید تو یہ فرمائی کہ قدیم علم کلام ہی کے اصول سے تفریع کر کے جدید شبہات کے جوابات دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن بہت زیادہ اہم و ضروری اصلاح خود

کلام جدید کا نام لینے والوں کے اس خطرناک رجحان کی ہے کہ وہ تحقیقات جدیدہ کو غیر مشکوک و مسلم قرار دے کر شریعت کے قطعیات و منصوصات تک کو کھینچ تان کر ان کے موافق یا تابع کر دینا چاہتے ہیں۔

"گو ان تحقیقات کی صحت نہ مشاہدہ سے ثابت ہو نہ کوئی اور قطعی عقلی دلیل قائم ہو۔ سو ظاہر ہے کہ یہ مقصود سراسر باطل ہے۔ کیونکہ جن دعوؤں کا نام تحقیقات جدیدہ رکھا گیا ہے. نہ وہ سب تحقیقات کے درجہ کو پہنچے ہوئے ہیں. بلکہ زیادہ تر تخمینات و وہمیات ہیں اور ان میں اکثر جدید ہیں. بلکہ فلاسفہ قدیم کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اور ہمارے متکلمین نے ان پر بحث بھی کی ہے۔

"البتہ اس میں شبہ نہیں کہ بعض شبہات کا ذکر زبانوں پر نہیں رہا تھا، وہ اب از سرنو تازہ ہو گئے ہیں، اور بعض کا عنوان کچھ جدید ہو گیا ہے، اور بعضوں کا خود معنوی مبنی بھی جدید ہو گیا ہے۔ جن کو واقعی تحقیقات جدیدہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے۔ اس لئے ان شبہات اور ان کے ازالہ کو نیز اس وجہ سے کہ مذاق زمانہ کے لحاظ کچھ طرز بیان میں بھی جدت مفید ثابت ہوتی ہے، اس کو کلام جدید کہنا درست و بجا ہے۔ اور اس بنا پر کلام جدید کی ضرورت سے بھی انکار نہیں"

یہ تو کلام جدید کا مفہوم اور اس کی ضرورت تھی، جس کی تکمیل کی صورت ابتداً حضرت کی پیش نظر یہ تھی کہ

"جتنے شبہات زبان زد یا حوالہ قلم ہو رہے ہیں سب کو جمع کر کے ایک ایک کا جزئی طور پر جواب دیا جائے اور ان کی تقریر کے ضمن میں جو ضروری کلیات پیدا ہوں گے وہ اس قسم کے دیگر شبہات کے بھی انشاء اللہ دافع ہوں گے۔ مگر چونکہ اس کے لئے پہلے شبہات کے جمع ہونے کی ضرورت تھی، اور یہ کام صرف مجیب کا نہیں۔ اس لئے میں نے اس بارے میں اکثر صاحبوں سے مدد چاہی اور انتظار رہا کہ شبہات کا کافی ذخیرہ جمع ہو جائے تو اس کام کو بنام خدا شروع کیا جائے۔

اس اثناء میں حضرت کا ایک سلسلہ سفر میں علی گڑھ تشریف لے جانا ہوا اور وہاں اہل کالج کی درخواست پر کالج میں ایک بیان ہوا جس میں یہ اندازہ ہو کر کہ "طلبا کو ایک درجہ میں حق کی طلب و انتظار ہے اور فہم و انصاف کے آثار بھی معلوم ہوئے" یہ تجویز فرمایا کہ

"شبہات جزئیہ کے جمع ہونے کا جو اوروں کے کرنے کا کام ہے سردست انتظار چھوڑ دیا جائے، اور جو شبہات اب تک کانوں سے خطاباً یا آنکھوں سے کتاباً گزرے ہیں صرف انہیں کے بقدر ضرورت جوابات کو پیش اور شائع کر دیا جائے"۔

رسالہ انتباہات اسی تجویز کی قلم بند صورت ہے۔ جس میں اصل رسالہ سے پہلے اس بیان یا وعظ کا خلاصہ درج فرمایا گیا ہے جو کم و بیش تیس سال قبل کالج میں فرمایا تھا، اور جو آج بھی نئی تعلیم کے مسلمان طلبہ ہی نہیں بلکہ ایسے سارے نو تعلیم یافتہ مسلمانوں کے کان لگا کر سننے کا ہے، جو مسلمان ہو کر بھی اسلامی عقائد و اعمال کے متعلق کچھ نہ کچھ شکوک و شبہات میں گرفتار ہیں، اور بالعموم ان کے رفع کرنے کی بھی کوئی خاص فکر نہیں کرتے بلکہ بہتیرے ان کو "روشن خیالی" کی سند جانتے اور فخریہ و مدعیانہ ان کو گاتے پھرتے ہیں۔ حالانکہ مسلمان ہونے یا وحی و نبوت پر ایمان لانے کے بعد ان شبہات کے جراثیم کا بقایا ان کی پرورش قلب و روح کے لئے اس سے زیادہ مہلک ہے جتنا دق کے جراثیم سے بےفکری بالاخر جسم کی ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔ بہرحال سب سے بڑی اور پہلی کوتاہی تو یہی ہے کہ

دینی شبہات روحانی امراض ہیں: "یہ شبہات باوجود یہ کہ روحانی امراض ہیں مگر ان کو مرض نہیں سمجھا گیا۔ دیکھئے اگر خدانخواستہ کبھی کوئی مرض لاحق ہوا ہو گا تو یہ انتظار نہ ہوا ہو گا کہ کالج کا طبیب یا ڈاکٹر خود ہمارے کمرہ میں آ کر ہماری نبض وغیرہ دیکھے بلکہ خود اس کے پاس گئے ہوں گے۔ اور اس سے نفع نہ ہو گا تو شہر کے سول سرجن کے پاس شفاخانہ پہنچے ہوں گے، اس سے بھی فائدہ نہ ہوا ہو گا تو دوسرے شہروں کا سفر کیا ہو گا، مصارف سفر، فیس اور دواؤں مین بہت کچھ خرچ کیا ہو گیا غرض حصول شفا تک صبر و قناعت نہ ہوا ہو گا۔

پھر اس شدید و مہلک دینی مرض میں حصول شفا کے لئے کیا وجہ ہے کہ ایسی ہی دوڑ دھوپ نہیں کی جاتی۔ یہی کہ اس کو سرے سے مرض ہی نہیں سمجھا جاتا، جو بہت بڑی۔

"دوسری کوتاہی ہے کہ اپنی فہم ورائے پر پورا اعتماد کر لیا جاتا ہے کہ ہمارے خیال (یا شبہات میں) کوئی غلطی نہیں ہے۔ سو یہ وسوسہ بڑی غلطی ہے"۔

کامل کی تقلید لازم ہے: "تیسری کوتاہی یہ ہے کہ اتباع کی عادت کم ہے اور اس سبب سے کسی امر میں ماہرین کی اتباع نہیں کرتے۔ ہر امر میں دلائل و اسرار ڈھونڈھے جاتے ہیں۔ حالانکہ غیر کامل کو بدون کسی کامل کی تقلید کے چارہ نہیں۔

"اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ علمائے شرائع کے پاس دلائل و علل نہیں ہیں۔ سب کچھ ہیں، مگر بہت سے امور آپ کی فہم سے بعید ہیں، جیسے اقلیدس کی کسی شکل کا ایسے شخص کو سمجھانا جو حدود و اصول موضوعہ وعلوم متعارفہ سے ناواقف ہو سخت دشوار ہے"

اس رسالہ انتباہات میں حضرت نے بڑی حد تک اسی دشواری کو دور فرمایا ہے اور سب سے پہلے اصول موضوعہ ہی کا بیان و شرح فرمائی گئی ہے کہ اگر ان کو سمجھ کر پیش نظر رکھا جائے تو سابقہ شبہات ہی کا نہیں بلکہ آئندہ بھی قیامت تک جدید سے جدید تحقیقات سے پیدا ہونے والے شبہات کا بھی انشاء اللہ قلع قمع ہوتا رہے گا۔ ان اصول موضوعہ کے بعد مختلف انتباہات ہیں جن میں مختلف شبہات کو ان اصول موضوعہ کے حوالوں سے اسی طرح حل کیا گیا ہے، جس طرح اقلیدس یا ہندسہ میں مختلف اشکال یا دعوؤں کو اصول موضوعہ اور علوم متعارف کے حوالوں سے ثابت کیا جاتا ہے۔ یہ طرز تصنیف بھی بتلاتا ہے کہ حضرت کے ذہن کی طبعی ساخت وافتاد کیسی منطقی تھی۔ راقم ہذا کے علم میں یورپ کے ایک مشہور فلسفی اسپنوزا کے علاوہ اور کسی نے اپنی کسی تصنیف میں یہ اقلیدسی یا ہندسی طرز اختیار نہیں کیا۔ اس رسالہ انتباہات کے علاوہ حضرت نے یہی طرز انگریزی تعلیم کی تحقیق پر جو چھوٹا سا رسالہ

تحریر فرمایا ہے اس میں بھی اختیار فرمایا ہے۔ (۱)

اصول موضوعہ: بہرحال اب ان اصول موضوعہ کی کچھ تفصیل ملاحظہ ہو۔ عوام و خواص ماہرین سائنس و فلسفہ سب زبان و قلم سے اس کا ببانگ دہل اعلان و اقرار کرتے رہتے ہیں کہ انسان کی فکر و فہم و تحقیق و علم سب محدود و ناقص اور خطا پذیر ہے اور ہر علم و فن میں دن رات اس کا تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ بڑے بڑے یگانہ روزگار ماہرین کی مسلم سے مسلم تحقیقات رد ہوتی رہتی اور ان میں غلطیاں نکلتی رہتی ہیں۔ اور کسی علم و فن کا بھی کوئی مسئلہ و نظریہ ایسا نہیں ہو سکتا جس کی ابدی صداقت کا کوئی ہوش مند دعویٰ کر سکے۔

اس کے باوجود آدمی کا یہ جہل مرکب کیسی ستم ظریفی ہے کہ جو بات اپنی سمجھ میں نہ آئے یا کسی رائج و مقبول عام خیال کے خلاف معلوم ہوتی ہو، اس کو غلط اور باطل سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ جب طبعی و تجربی علوم تک میں ہماری فہم و تحقیق ابدی صداقت کا معیار نہیں تو مابعد الطبعی یا دینی و غیبی علوم میں ہماری سمجھ ابدی حق و باطل کی کسوٹی کیسے بن سکتی ہے۔ اس لئے سب سے پہلا اصول موضوعہ یہی قرار دیا گیا کہ

پہلا اصول موضوعہ: "کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا اس کے باطل ہونے کی دلیل نہیں" جس کی شرح یہ ہے کہ

> "باطل ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ دلیل سے اس کا نہ ہونا سمجھ میں آ جائے .... مثلاً کسی دیہاتی نے جس کو ریل دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا یہ سنا کہ ریل بدون کسی جانور کے گھسیٹے خود بخود چلتی ہے، تو وہ تعجب سے کہے گا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس پر قادر نہیں کہ اس کی نفی پر دلیل قائم کر سکے۔ کیونکہ اس کے پاس خود اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ بجز

۱۔ جس کا ... تجدید تعلیم کے حصہ میں ملے گا۔

جانور کے گھسیٹنے کے گاڑی کی حرکت کا کوئی اور سبب نہیں ہو سکتا۔ اس کو سمجھ میں نہ آنا کہتے ہیں۔ اور اگر وہ محض اتنی بنا پر اس کی نفی (یا باطل ہونے) کا حکم کرنے لگے اور راوی کی تکذیب کرنے لگے تو عقلاً اس کو بیوقوف سمجھیں گے کہ تیری سمجھ میں نہ آنے سے نفی کیسے لازم آئی۔ یہ مثال ہے سمجھ میں نہ آنے کی۔

"اور اگر کوئی شخص کلکتہ سے ریل میں ہو کر دہلی اترا اور ایک شخص نے اس کے روبرو بیان کیا کہ یہ گاڑی کلکتہ سے دہلی تک آج ایک گھنٹہ میں آئی تو وہ مسافر اس کی تکذیب کرے گا اور اس کے پاس اس نفی (یا تکذیب) کی دلیل موجود ہے جو خود اپنا مشاہدہ اور سو دو سو جو اس گاڑی سے اترے ہیں ان کی شہادت ہے۔ یہ مثال اس کی ہے کہ اس کا نہ ہونا سمجھ میں آجائے۔

"اسی طرح اگر کسی نے سنا کہ قیامت کے روز پل صراط پر چلنا ہو گا، جو بال سے باریک ہو گا۔ چونکہ کبھی ایسا واقعہ دیکھا نہیں اس لئے یہ تعجب ہوتا کہ ایسا کیونکر ہو گا تعجب نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اسکی نفی پر عقل کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ سرسری نظر میں دلیل اگر ہو سکتی ہے تو یہ کہ قدم تو اتنا چوڑا اور قدم رکھنے کی چیز اتنی کم چوڑی تو اس پر پاؤں ٹکنا اور چلنا ممکن نہیں لیکن خود اسی کا کوئی ثبوت نہیں کہ مسافت کی وسعت قدم سے زیادہ ہونا ضروری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عادت یوں ہی دیکھی گئی، اس کے خلاف نہ دیکھا ہو یا دیکھا ہو مگر اتنا تفاوت نہ دیکھا ہو، جیسے بعض کو رسی پر چلتے دیکھا ہے۔ مگر اس میں کیا محال ہے کہ وہاں عادت بدل جائے۔

"یہ فرق ہے سمجھ میں نہ آنے اور باطل ہونے میں"

دوسرا اہم اصول موضوعہ یہ ہے کہ

دوسرا اہم اصول موضوعہ: "جو امر عقلاً ممکن ہو اور صحیح دلیل نقلی اس کے وقوع کو بتلاتی ہو اس کا قائل ہونا ضروری ہے اسی طرح اگر دلیل نقلی

اس کے عدم وقوع کو بتلا دے تو عدم وقوع کا قائل ہونا ضروری ہے۔

اس کی شرح میں ہے کہ

"واقعات تین قسم کے ہوتے ہیں ایک جن کے ہونے کو عقل ضروری و لازم بتلا دے مثلاً ایک آدھا ہے دو کا یہ امر ایسا لازم الوقوع ہے کہ ایک اور دو کی حقیقت جاننے کے بعد عقل اس کے خلاف کو یقیناً غلط سمجھتی ہے اس کو واجب کہتے ہیں۔ دوسری قسم وہ جن کے نہ ہونے کو عقل ضروری اور لازم بتلا دے۔ مثلاً ایک مساوی دو کا یہ امر ایسا لازم النفی ہے کہ عقل اس کو یقیناً غلط سمجھتی ہے، اس کو ممتنع اور محال کہتے ہیں۔ تیسری قسم وہ جن کے نہ وجود کو عقل لازم بتلا دے اور نہ نفی کو ضروری سمجھے بلکہ دونوں شقوں کو محتمل قرار دے، اور ہونے نہ ہونے کا حکم کرنے کے لئے کسی دلیل نقلی پر نظر کرے۔

"مثلاً یہ کہنا کہ فلاں شہر کا رقبہ فلاں شہر سے زائد ہے۔ یہ زائد ہونا ایسا امر ہے کہ قبل جانچ کرنے یا جانچ کرنے والوں کی تقلید کرنے کے عقل نہ اس کی صحت کو ضروری قرار دیتی ہے اور نہ بطلان کو............ اس کو ممکن کہتے ہیں۔ ایسے ممکن امر کا ہونا اگر دلیل نقلی سے صحیح ثابت ہو تو اس کے ثبوت اور وقوع کا اعتقاد واجب اور اس کا نہ ہونا ثابت ہو جائے تو اس کے عدم وقوع کا اعتقاد ضروری ہے۔

جدید فلسفہ میں امور ممکنہ کی اسی اصولی بحث کو امور واقعیۃ یا واقعاتی امور (matter of facts) کے عنوان سے ڈیوڈ ہیوم نے بڑی نتیجہ خیز تفصیل کے ساتھ کیا ہے، جو کلام جدید کے لئے بڑی بنیادی اہمیت کی بحث ہے۔ (۱)

ایک بڑی غلطی عوام ہی کی نہیں خواص تک کی یہ ہے کہ محال و مستبعد میں فرق نہیں کرتے جس کے لئے تیسرا اصول موضوعہ یہ ثبت فرمایا ہے کہ

۱۔ اس کی اصل کتاب (ہیومن انڈر اسٹینڈنگ) کا فہم انسانی کے نام سے راقم ہذا کا کیا ہوا ترجمہ بھی مقدمہ کے ساتھ دار المصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہو گیا ہے جو قابل ملاحظہ ہے۔

تیرا اصول موضوعہ۔ "محال عقلی ہونا اور چیز ہے اور مستبعد ہونا اور چیز محال خلاف عقل ہوتا ہے اور مستبعد خلاف عادت۔ عقل اور عادت کے احکام جدا جدا ہیں۔ دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔ محال کبھی واقع نہیں ہو سکتا مستبعد واقع ہو سکتا ہے۔ محال کو خلاف عقل کہیں گے اور مستبعد کو غیر مدرک بالعقل۔

اس کی شرح یہ ہے کہ

"محال کی تکذیب وانکار محض بنا بر محال ہونے کے واجب ہے۔ اور مستبعد کی تکذیب وانکار محض بنا بر استبعاد جائز بھی نہیں۔ البتہ اگر علاوہ استبعاد کے دوسرے دلائل تکذیب کے ہوں تو تکذیب جائز بلکہ واجب ہے۔ جیسا اوپر اصول موضوعہ نمبرا و نمبر۲ میں مثالوں سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی کہے کہ ایک مساوی ہے دو کا تو اس کی تکذیب ضروری ہے اور اگر کوئی کہے کہ ریل بدون کسی جانور کے لگائے چلتی ہے تو تکذیب جائز نہیں، باوجودیکہ ایسے شخص کے نزدیک جس نے اب تک وہی عادت دیکھی کہ جانور کو گاڑی میں لگا کر چلاتے ہیں، مستبعد اور عجیب ہے۔

"بلکہ جتنے واقعات کو غیر عجیب سمجھا جاتا ہے وہ واقع میں سب عجیب ہیں، مگر بوجہ تکرار مشاہدہ و عادت ان کے عجیب ہونے کی طرف التفات نہیں رہا۔ مثلاً ریل کا اس طرح چلنا اور نطفہ کا رحم میں جا کر انسان ہو جانا (یا بیج کا زمین میں درخت بن جانا) فی نفسہ دونوں میں کیا فرق ہے۔ بلکہ دوسرا امر واقع میں زیادہ عجیب ہے مگر جس دیہاتی نے امر اول کو کبھی نہ دیکھا ہو اور امر ثانی کو ہوش سنبھالتے ہی کے وقت سے دیکھتا آیا ہو تو ضرور وہ اول کو عجیب سمجھے گا۔

"اسی طرح جس شخص نے گراموفون سے ہمیشہ باتیں نکلتے دیکھا وہ گراموفون کے اس فعل کو عجیب نہیں سمجھتا اور ہاتھ پاؤں کے اس فعل کو عجیب سمجھتا ہے۔ اور عجیب سمجھنے کا تو مضائقہ نہیں لیکن یہ سخت غلطی ہے کہ عجیب کو

محال سمجھے اور محال سمجھ کر نص کی تکذیب کرے یا بلاضرورت اس کی تاویلیں کرے"۔

اصول موضوعہ نمبر ۴. ان کے بعد اصول موضوعہ نمبر ۴ یہ ہے کہ

"کہ موجود ہونے کے لئے محسوس و مشاہد ہونا لازم نہیں"

اس کی شرح میں ارشاد ہے کہ

"واقعات پر وقوع کا حکم تین طرح کیا جاتا ہے ایک مشاہدہ جیسے ہم نے زید کو آتے ہوئے دیکھا۔ دوسرے مخبر صادق کی خبر جیسے کسی معتبر آدمی نے خبر دی کہ زید آیا۔ اس میں یہ شرط ہو گی کہ کوئی دلیل اس سے زیادہ صحیح اس کی تکذیب کی نہ ہو۔ مثلاً کسی نے یہ خبر دی کہ زید رات کو آیا تھا اور آتے ہی تم کو تلوار سے زخمی کیا، حالانکہ مخاطب کو معلوم ہے کہ مجھ کو کسی نے زخمی نہیں کیا، اور نہ اب وہ زخمی ہے، پس یہاں مشاہدہ مکذب ہے، اس لئے اس خبر کو غیر واقع کہیں گے۔ تیسرے استدلال عقلی جیسے دھوپ کو دیکھ کر گو آفتاب کو دیکھا نہ ہو اور نہ کسی نے اس کے طلوع کی خبر دی ہو (مگر چونکہ معلوم ہے کہ دھوپ کا وجود موقوف ہے طلوع آفتاب پر اس لئے) عقل سے پہچان لیا کہ آفتاب بھی طلوع ہو گیا ہے۔ ان تینوں واقعات میں وجود کا حکم تو مشترک ہے، لیکن محسوس صرف ایک واقعہ ہے اور باقی دو غیر محسوس ہیں، تو ثابت ہوا کہ یہ ضرور نہیں کہ جس امر کو واقع کہا جائے تو وہ محسوس بھی ہو اور جو محسوس نہ ہو اس کو غیر واقع کہا جائے۔

"مثلاً نصوص نے خبر دی کہ ہم سے جہت فوق میں سات اجسام عظام ہیں کہ ان کو آسمان کہتے ہیں۔ اب اگر اس نظر آنے والے نیلگوں خیمہ کے سبب وہ ہم کو نظر نہ آتے ہوں تو یہ لازم نہیں آتا کہ صرف محسوس نہ ہونے سے ان کے وقوع کی نفی کر دی جائے بلکہ ممکن ہے کہ وہ موجود ہوں اور چونکہ مخبر صادق نے اس کی خبر دی ہے، اس لئے اس کے وجود کے قائل ہونا ضروری ہو گا.

نمبر ۵: "منقولات محضہ پر محض (خالص) عقلی دلیل کا قائم کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے ایسی دلیل کا مطالبہ بھی جائز نہیں" ۔ یہ نمبر اس لحاظ سے بہت زیادہ اہم اور قابل توجہ ہے کہ دینی عقائد خواہ ماضی کے متعلق اور خدا کی ذات و صفات سے متعلق ہوں اور خواہ مستقبل اور آخرت کے معاملات کے متعلق سب در حقیقت "منقولات محضہ" ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ

"ایسے واقعات پر محض عقلی دلیل سے استدلال ممکن نہیں، مثلاً کسی نے کہا کہ سکندر اور دارا دو بادشاہ تھے اور ان میں جنگ ہوئی تھی اب کوئی شخص کہنے لگے کہ اس پر دلیل عقلی قائم کرو تو کوئی کتنا ہی بڑا فلسفی ہو بجز اس کے کیا دلیل قائم کر سکتا ہے کہ ایسے دو بادشاہوں کا وجود اور مقابلہ کوئی امر محال تو ہے نہیں بلکہ ممکن ہے۔ اور ممکن کے وقوع کی خبر معتبر مؤرخین نے دی ہے اور جس ممکن کے وقوع کی خبر مخبر صادق دیتا ہے اس کا قائل ہونا لازم ہے جیسا کہ نمبر ۲ میں مذکور ہوا۔

"اسی طرح قیامت کا آنا مردوں کا زندوں ہو جانا اور نئی زندگی کا دور شروع ہونا ایک محض منقول واقعہ ہے، لہٰذا اس کے دعویٰ کرنے والے سے کوئی شخص محض عقلی دلیل کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ ان واقعات کا محال عقلی ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں۔ گو سمجھ میں نہ آوے کیونکہ سمجھ میں نہ آنا اور محال ہونا ایک نہیں، جیسا کہ نمبر ا میں بیان ہوا۔ پس یہ ممکن ٹھہرا اور اس امر ممکن کے وقوع کی خبر ایسے شخص نے دی جس کا صدق دلائل سے ثابت ہے، اس لئے حسب نمبر ۲ اس کے وقوع کا قائل ہونا واجب ہو گا۔

البتہ دینی عقائد اور دنیوی واقعات میں (جیسے کہ سکندر و دارا کی جنگ) فرق یہ ہے کہ ثانی الذکر کے مماثل واقعات کا تجربہ و مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے وہ مستبعد نہیں معلوم ہوتے اور اول الذکر مستبعد معلوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے اگر کوئی نہ عقلی دلیل ہو سکتی ہے تو صرف رفع استبعاد کی، لیکن مخبر کا صادق ہونا ثابت کر دینے کے بعد رفع استبعاد

مدعی کے ذمہ واجب نہیں۔ اگر کر دے تو تبرع و احسان ہے۔ اس کو فرمایا کہ

"اگر ایسے واقعات کی کوئی دلیل عقلی محض بیان کی جاوے گی حقیقت اس کی رفع استبعاد ہو گا، جو مستدل کا تبرع محض ہے؛ اس کے ذمہ نہیں"۔

دینی عقائد و مسائل کے باب میں اہل عقل و نقل سب کے لئے یہ اصول گرہ میں باندھنے کا ہے۔ اسی لئے راقم احقر ہمیشہ کہا کرتا ہے کہ دین کا مدار سب سے زیادہ تصدیق رسالت پر ہے۔ اگر رسول "مخبر صادق" نہیں تو دینی مسائل کا کوئی ثبوت نہیں اور اگر اس کا صدق مسلم ہے تو پھر کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں، اور اسی بنا پر حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ احکام دین کے اسرار و علل کا مطالبہ دراصل انکار رسالت کے مترادف ہے۔

نمبر ۶۔ نظیر اور دلیل جس کو آج کل ثبوت کہتے ہیں ایک نہیں۔ اور مدعی سے دلیل کا مطالبہ جائز ہے مگر نظیر کا مطالبہ جائز نہیں۔

"مثلاً کوئی شخص دعویٰ کرے کہ شاہ جارج پنجم نے تخت نشینی کا دربار دہلی میں منعقد کیا، اور کوئی کہے کہ ہم تو جب مانیں گے کہ اس کی نظیر بھی ثابت کرو کہ اس کے قبل کسی اور بادشاہ انگلستان نے ایسا کیا ہو ورنہ ہم اس واقعہ کو غلط سمجھیں گے۔

اسی طرح اگر کوئی دعوے کرے کہ قیامت کے دن ہاتھ پاؤں کلام کریں گے، تو اس سے کسی کو نظیر مانگنے کا حق نہیں۔ البتہ دلیل قائم کرنا اس کے ذمہ ہے اور چونکہ وہ منقول محض ہے، اس لئے حسب نمبر ۵ اس قدر استدلال کافی ہے کہ اس کا محال ہونا ثابت نہیں اور مخبر صادق نے اس کے وقوع کی خبر دی ہے۔ لہٰذا اس کے وقوع کا اعتقاد واجب ہے۔

"البتہ اگر استدلال کرنے والا نظیر پیش کر دے تو یہ اس کا تبرع و احسان ہے۔ مثلاً گراموفون کو اس کی نظیر میں پیش کر دے کہ باوجود جماد محض ہونے کے اس سے کس طرح الفاظ ادا ہوتے ہیں۔ آج کل یہ ظلم ہے کہ نو تعلیم یافتہ ہر منقول کی نظیر مانگتے ہیں سو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ غیر لازم امر کا

مطالبہ ہے۔

نمبر ۷. آخری ساتواں نمبر اصول موضوعہ کا یہ ہے کہ عقل و نقل یا روایت و درایت میں اختلاف و تعارض کی ممکن صورتیں چار ہو سکتی ہیں۔

"ایک یہ کہ دونوں قطعی ہوں اس کا وجود نہیں ہو سکتا اس لئے کہ دو صادق (یا قطعی) باتوں میں تعارض محال ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں ظنی ہوں۔ تو گو دونوں کو جمع کرنے (یا رفع تعارض) کے لئے دونوں کے ظاہر معنی ترک کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ مگر چونکہ زبان کا اصل قاعدہ (یا مقتضی) یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے الفاظ کو اپنے اصلی معنی ہی پر رکھا جائے. اس لئے نقل کو ظاہر معنی پر رکھیں گے اور دلیل عقلی کو حجت نہ سمجھیں گے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ دلیل نقلی قطعی ہو اور عقلی ظنی ہو. یہاں ظاہر ہے کہ نقلی کو یقیناً مقدم رکھیں گے اور چوتھی صورت یہ ہے دلیل عقلی قطعی ہو اور نقلی ظنی خواہ ثبوت میں یا دلالت میں. تو یہاں عقلی کو مقدم رکھیں گے اور نقل میں تاویل کریں گے۔

"پس صرف یہی ایک صورت یا موقع ہے روایت یا نقل کے مقابلہ میں درایت یا عقل کو مقدم رکھنے کا۔ نہ یہ کہ ہر جگہ عقل ہی کو مقدم رکھا جائے۔" (۱)

"دو حکموں کا ایک دوسرے کے اس طرح خلاف ہونا کہ ایک کو صحیح ماننے سے دوسرے کا غلط ماننا ضروری ہو۔ جیسے ایک شخص نے بیان کیا کہ آج زید دس بجے دن کو دہلی کی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ دوسرے نے بیان کیا کہ آج گیارہ بجے (یا دس ہی بجے) زید میرے پاس میرے مکان میں آکر بیٹھا

۱۔ اس اصول موضوعہ کی عبارت عالمانہ زیادہ تھی. اس لئے ذرا سہل کر دیا گیا ہے نفس مضمون میں کوئی تغیر نہیں کیا گیا ہے. تاہم ذرا غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

رہا۔ اس کو تعارض کہتے ہیں چونکہ تعارض میں ایک کے صحیح ہونے کے لئے دوسرے کا غلط ہونا لازم ہے۔ اس لئے دو صحیح دلیلوں میں کبھی تعارض نہ ہو گا۔ "

"اور جب دو دلیلوں میں تعارض ہو گا تو اگر وہ دونوں قابل تسلیم ہیں تب تو ایک میں کچھ تاویل کریں گے یعنی اس کو ظاہری معنی سے ہٹا دیں گے۔ اور اس طرح اس کو مان بھی لیں گے اور دوسری کو اس کے ظاہری معنی پر رکھ کر مانیں گے۔ اور اگر ایک قابل تسلیم دوسری ناقابل تسلیم ہے تو ظاہر ہے کہ پہلی کو تسلیم کر کے دوسری کو رد کریں گے۔

"مثلاً مذکورہ بالا مثال میں اگر ایک راوی معتبر دوسرا غیر معتبر ہے تو معتبر کے قول کے تسلیم اور غیر معتبر کو رد کریں گے۔ اور اگر دونوں معتبر ہیں تو دوسرے قرائن سے جانچ کر ایک کے قول کو مانیں گے اور دوسرے میں کچھ تاویل کریں گے۔ مثلاً اگر اور شہادتوں سے ثابت ہوا کہ زید دہلی سے نہیں گیا کہ راوی کو شبہ ہوا ہو گا یا سوار ہو کر پھر واپس آ گیا ہو گا وغیرہ۔

اوپر جو ظنی دلیل عقلی کے متعلق یہ کہا گیا کہ خواہ ثبوت کے اعتبار سے ظنی ہو خواہ دلالت کے اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ

"نقلی کے ظنی ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ثبوتاً ظنی ہو مثلاً کوئی حدیث ہے جس کا ثبوت متواتر یا مشہور سے نہیں۔ دوسرے یہ کہ دلالتہً ظنی ہو گو ثبوتاً قطعی ہو مثلاً کوئی آیت ہے کہ ثبوت تو اس کا قطعی ہے مگر معنی اس کے کئی ہو سکتے ہیں اور دونوں معنی میں سے کسی پر بھی آیت کی دلالت قطعی نہیں۔ یہ معنی ہیں دلالتہً ظنی ہونے کے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ اصول موضوعہ ایسے ہیں کہ اگر عقل و نقل یا دین و دانش کے مسائل و مباحث میں ان کو احتیاط و انصاف کے ساتھ دلیل راہ بنایا جائے۔ تو قدیم و جدید سارے کلامی اختلافات میں عقل و نقل دونوں کو اپنی اپنی حدود میں رکھ کر حل کیا جا سکتا ہے۔

قدم مادہ. جیسا کہ خود حضرت نے آگے بعض شبہات جدیدہ سے متعلق انتباہات کے عنوان سے جو تنبیہات فرمائی ہیں، ان میں انہیں اصول کا استعمال فرمایا ہے۔ مثلاً انتباہ اول میں حدوث مادہ کے متعلق متقدمین فلاسفہ کے دلائل پر کلام کے ساتھ موجودہ اہل سائنس کی نسبت ارشاد ہے کہ

> "ان کے پاس اس درجہ کی بھی کوئی دلیل نہیں مثل دیگر وعادی کے محض تخمین سے کام لیا ہے۔ یعنی یہ خیال کر لیا ہے کہ یہ سارے موجودات عالم اگر پہلے محض معدوم تھے تو عدم محض سے وجود میں آجانا سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن خوب غور کرنا چاہئے کہ کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا کیا اس کے باطل ہونے کی دلیل بن سکتی ہے۔"

اگر یہ دلیل بن سکتی ہے تو پھر ایک موجود سے بھی اس کے سوا کسی دوسری شے کا موجود ہونا کب سمجھ میں آتا یا آسکتا ہے، سوا اس کے عادۃً ایسا بظاہر دیکھتے ہیں اس لئے مانتے ہیں۔ مثلاً بے عقل وارادہ نطفہ سے ارسطو جیسے عاقل و منطقی انسان کا وجود میں آجانا بھلا عقل محض سے کب سمجھ میں آسکتا ہے۔ بلکہ دراصل یہ بھی معدوم ہی سے موجود ہونا ہے۔ اس لئے کہ نطفہ یا مادہ ارسطو یا انسان تو بہرحال نہ تھا اور ارسطو من حیث ارسطو یا انسان من حیث انسان تو عدم ہی سے وجود میں آیا اس لئے یہ بھی دراصل معدوم ہی سے موجود ہونے کو ماننا ہے۔

پھر اسی طرح جب ہر موجود شے یا مادہ کا ہر تغیر پہلے معدوم یا مسبوق بالعدم تھا تو سمجھ میں تو یہ نہیں آتا کہ نفس مادہ بھی کیوں مسبوق بالعدم یعنی پہلے معدوم نہ رہا ہو اس کو فرمایا کہ

> "سمجھ میں تو یہ بھی نہیں آتا کہ ایک ایسی موجود چیز یعنی مادہ جس کے تمام انحاء (اصناف) وجود یعنی تغیرات مادی میں سے ہر تغیر مسبوق بالعدم (یعنی پہلے معدوم) تھا اس کا نفس وجود مسبوق بالعدم نہ ہو۔ آخر ان وجودات اور اس وجود (مادہ) میں فرق کیا ہے۔
>
> "پس سمجھ میں نہ آنا تو قدم اور عدم قدم دونوں میں مشترک ہے"۔

یہ ذرا دقیق اور فکر طلب بات ہے لیکن ہے بڑی تہ کی بات۔ جس کو راقم احقر بزعم خود

اپنی فکر خاص کا نتیجہ سمجھا کرتا اور فلسفہ اسلام پر لکچروں کے سلسلہ میں اس سے کام لیتا تھا۔ الحمد اللہ کہ حضرت نے مہر توثیق ثبت فرما دی۔

ذات و صفات خدا کا سب سے بڑا حاجب. اصل یہ ہے کہ عقل اور اہل عقل کے لئے جو چیز سب سے زیادہ خدا کی ذات و صفات سے حجاب و محرومی کا باعث بن گئی ہے وہ مادہ ہی کا فلسفیانہ یا سائنسی تصور ہے۔ سو جدید فلسفہ میں تو برکلے نے اس تصور پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ پھر سچ یہ ہے کہ مادیت سر ہی نہیں اٹھا سکی۔ اور گذشتہ نصف صدی کے اندر اندر سائنس میں مادہ اتنا غیر مادی ہو چکا ہے کہ راقم ہذا تو کہا کرتا ہے کہ انسان اور اس کے خدا کے مابین عقل نے جو سب سے بڑا پردہ حائل کر دیا تھا وہ عقل ہی نے تار تار کر کے پھینک دیا (جس کی پوری بحث انشاء اللہ پیش نظر کلام جدید میں آئے گی) اور اب اپنی "خودی کے" سوا کوئی چیز خدا کی خدائی کی حاجب نہیں رہ گئی ہے۔ البتہ یہ نفسی حجاب مادی سے بھی اشد ہے۔

تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

رسالت. ورنہ اصل تو یہ ہے کہ مادہ کا حجاب اٹھ جانے کے بعد ذات باری کا نفس وجود بالکل بے حجاب سامنے آ جاتا ہے۔ جس کے بعد صفات باری و احکام خداوندی کے تفصیلی علم کے لئے رسالت کی ضرورت از خود ناگزیر ہو جاتی ہے کہ جب خالق کائنات بے علم و بے ارادہ مادہ نہیں بلکہ کوئی نہ کوئی صاحب علم و ارادہ ذات ہے۔ تو پھر اس ذات کے تفصیلی صفات اور اس کے ارادہ کی پیدا کی ہوئی کائنات کی صحیح مراد و مقصد کو جاننے کی اس کے سوا صورت ہی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ خود کسی ذریعہ سے اس کا علم عطا کرے۔

کمال قدرت کا مسئلہ. علم و ارادہ کے بعد صفات میں سب سے مقدم کمال قدرت کا مسئلہ ہے اور جس طرح بے علم و ارادہ مادہ کا وجود لازماً ذی علم و ارادہ ذات باری کے وجود کا حجاب ہے، اسی طرح مادہ کے افعال و خواص جن کا نام قوانین فطرت یا اسباب طبعیہ ہے یہ خدا کی صفت قدرت کے لئے حاجب ہیں، بلکہ دراصل خدا کی خدائی کے مانع ہیں۔ انتباہ دوم

میں اسی اعتبار سے حق تعالیٰ کی تعمیم قدرت پر بحث ہے کہ۔

"اس زمانہ کے نو تعلیم یافتوں کی زبان و قلم پر یہ جملہ جاری دیکھا جاتا ہے کہ خلاف فطرت کوئی امر واقع نہیں ہو سکتا اور اس کی دو تقریریں کی جاتی ہیں ایک عقلی رنگ میں اور ایک نقلی پیرایہ میں۔ عقلی رنگ یہ ہے کہ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ آگ ہمیشہ جلاتی ہے کبھی اس کے خلاف نہیں دیکھا، ہم دیکھتے ہیں کہ بچہ ماں باپ سے پیدا ہوتا ہے کبھی اس کے خلاف نہیں دیکھا، پس اس قاعدہ کے خلاف جو ہو گا محال ہو گا اور اس بنا پر معجزات کا کہ خوارق عادات ہیں انکار کر دیا۔

"ظاہر ہے کہ یہ استحالہ (محال ہونا) ایک دعویٰ ہے جس کے لئے دلیل کی حاجت ہے۔ اور محض یہ امر دلیل ہونے کے لائق نہیں کہ ہم نے کبھی ایسا دیکھا نہیں، اس لئے کہ اس کا حاصل استقرا ہے، اور استقرا میں چند جزئیات کا مشاہدہ ہوتا ہے، جن سے دوسری جزئیات پر استدلال کرنا قطعی نہیں ہو سکتا۔ البتہ مرتبہ ظن میں دوسری جزئیات کے لئے بھی اس حکم کو ثابت کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ ظن وہاں حجت ہو گا جہاں اس سے قوی تر دلیل اس کی معارض نہ ہو اور وہاں بھی دوام کا حکم درجہ ظن ہی میں ہو گا جانب مخالف کا عدم امکان ثابت نہ ہو گا اور جہاں قوی تر دلیل معارض ہو وہاں اس ظن کا اتنا بھی اثر نہ ہو گا۔

قوانین فطرت یا اسباب طبعیہ کی نسبت یہ خلاصۃ بعینہٖ وہی بحث ہے، جو قانون تعلیل (علت و معلول) کے سلسلہ میں بسط و تفصیل کے ساتھ جدید فلسفہ میں ہیوم نے کی ہے اور پھر اس کے اتباع میں منطق استقرار کے مشہور معلم جدید اسٹورٹ مل وغیرہ اکابر عہد نے اور جو فلسفہ ہی میں نہیں سائنس میں بھی مسلم ہے۔ اور قوانین فطرت کی اسی استقرائی حقیقت کی بنا پر خود ہیوم ہی کو اقرار کرنا پڑا ہے کہ کسی معجزہ کا انکار محض اس کے خلاف فطرت ہونے کی بنا پر نہیں کیا جا سکتا۔ یہی نہیں بلکہ کوئی "قوی تر نقلی دلیل" یعنی وقوع معجزہ کی نفس

شہادت قابل اطمینان اور قوی تر موجود ہو تو اس خرق عادت کو قبول ہی کرنا پڑے گا۔ (۱)
اور حضرت علیہ الرحمہ نے اس ساری بحث کا فیصلہ اہل فہم و فکر کے ایک ہی سطر میں فرما دیا ہے کہ

"قادر مطلق نے جس طرح خود اسباب طبیعہ کو بلا اسباب طبیعہ کے پیدا کیا، ورنہ تسلسل لازم آئے گا۔ اسی طرح ان کے مسببات کو بھی اگر چاہئیں بلاواسطہ اسباب طبیعہ پیدا کر سکتے ہیں۔ غایت ما فی الباب اس کو مستبعد کہیں گے، مگر استحالہ و استبعاد ایک نہیں" (اصول موضوعہ نمبر ۴)

یہ تو "عقلی رنگ کی تقریر" کا قصہ تھا۔

"دوسرا پیرایہ اس دعوے کی دلیل کا نقلی ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا (کہ اللہ کی سنت یا طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے) .... اس استدلال کا صحیح ہونا موقوف ہے دو امر پر ایک یہ کہ سنت سے مراد ہر سنت ہے۔ دوسرے یہ کہ تبدیل کا فاعل عام ہے یعنی خدا اور غیر خدا دونوں کو شامل ہے۔ حالانکہ ان دونوں دعووں پر کوئی دلیل نہیں۔

"ممکن بلکہ واقع بھی ہے کہ بقرینہ سیاق و سباق سنت سے مراد وہ خاص خاص امور ہوں، جو ان آیات میں مذکور ہیں اور جن کا حاصل باطل پر حق کا غلبہ ہے خواہ دلیل و برہان سے یا سیف و سنان سے۔

"اور اگر مراد سنت میں عموم لیا جائے (جس میں اسباب طبیعہ بھی داخل ہوں) تو تبدیل کا فاعل غیر اللہ ہے (اور مطلب یہ ہے) کہ خدا تعالیٰ کے معمول (طرز عمل) کو کوئی دوسرا (غیر اللہ) نہیں بدل سکتا۔ جیسے دنیا میں بعض احکام شاہی میں کسی جماعت کی شورش وغیرہ بعض اوقات سنگ راہ

۱۔ اس کی پوری تفصیل کے لئے سیرۃ النبی جلد سوم (مطبوعہ دار المصنفین) کا باب معجزات و فلسفہ جدیدہ ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے۔

ہو جاتی ہے (اس طرح خدا کے طرز عمل کو اس کے سوا کوئی دوسری طاقت بدل یا بدلوا نہیں سکتی)۔

انتباہ سوم متعلق نبوت:۔ انکار نبوت بھی دراصل وہی مادہ پرستانہ دانستہ یا نادانستہ انکار خدا پر مبنی ہے کہ جب **کائنات اور انسان کی خالق کوئی صاحب علم** وارادہ ذات نہیں جس کی اس خلق سے کوئی خاص مراد مطلب ہو، تو پھر وحی یا فرشتہ وغیرہ سے اس مطلب و مراد پر انسان کو مطلع کرنے کے کیا معنی۔ لیکن چونکہ انبیاء کو ان کی زندگی اور حالات کی بنا پر جھوٹا بھی کہنا آسان نہیں اس لئے اس طرح کی باتیں بتائی جاتی ہیں کہ۔

"بعض میں فطرۃً اپنی قوم کی بہبودی و ہمدردی کا جوش ہوتا ہے اور جوش کے سبب اس پر اسی کے تخیلات غالب رہتے ہیں، اس غلبہ تخیلات سے بعضے مضامین کو اس کا متخیلہ مہیا کرلیتا ہے، اور بعض اوقات اس غلبہ سے کوئی آواز بھی سنائی دیتی ہے اور بعض اوقات کوئی صورت بھی نظر آجاتی ہے اور وہ صورت بات کرتی ہوئی بھی معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ واقع و خارج میں اس آواز یا صورت یا اس کلام کا کوئی وجود نہیں ہوتا سب خیالی موجودات ہیں۔

"لیکن نبوت کی یہ حقیقت صریح و صحیح نصوص کے بالکل خلاف ہے نصوص میں تصریح ہے کہ وحی ایک غیبی فیض ہے، جو فرشتہ کے واسطہ سے ہوتا ہے اور وہ فرشتہ کبھی القا کرتا ہے، جس کو حدیث میں نفث فی روعی فرمایا اور کبھی اس کی آواز سنائی دیتی ہے کبھی وہ خود سامنے آکر بات کرتا ہے، جس کو فرمایا کہ یاتینی الملک احیانا فیتمثل لی۔

"اس کا علوم جدیدہ میں اس لئے انکار کیا گیا ہے کہ خود فرشتہ کا وجود بلا دلیل باطل سمجھا گیا ہے، سو اس کی تحقیق کسی آئندہ انتباہ میں وجود ملائکہ کی بحث میں انشاء اللہ تعالیٰ آوے گی، جس سے معلوم ہوجائے گا کہ ملائکہ کا وجود عقلاً محال نہیں اور جب ممکن عقلی کے وجود پر نقلی صحیح دلیل ہو تو عقلی طور پر اس کا قائل ہونا واجب ہے (اصول موضوعہ نمبر۲)

چنانچہ آگے انتباہ ہشتم میں ملائکہ وغیرہ کے وجود پر مستقلاً بحث فرمائی گئی ہے اور معلومات جدیدہ ہی سے ان کے استبعاد کو رفع فرمایا گیا ہے۔ لیکن احقر کے نزدیک جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ نبوت و ملائکہ وغیرہ سب کا انکار دراصل اعتقاد مادہ اور اس پر مبنی شعوری یا غیر شعوری طور پر انکار خدا کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس لئے اصل ضرب مادہ ہی پر خود جدیدہ علوم فلسفہ و سائنس کے فراہم کردہ تیر سے لگائی ہے، جو انشاء اللہ کلام جدید یا فلسفہ اسلام میں ہوگی۔ جدید تعلیم اور خیالات ہی کے اثر سے نبوت سے متعلق اور یہی بہت سی غلطیاں یا غلط فہمیاں خود مسلمانوں میں پھیل گئی ہیں، جو اگر براہ راست انکار نبوت کا نہیں تو حقیقت نبوت کے انکار یا نہ سمجھنے کا نتیجہ ضرور ہیں۔ اس "انتباہ متعلق نبوت" ہی میں ان چیزوں پر متنبہ فرمایا گیا ہے مثلاً۔

"احکام نبوت کو صرف امور معاد (آخرت) کے متعلق سمجھا جاتا ہے اور امور معاش میں اپنے کو آزاد و مطلق العنان قرار دیا ہے جس کی نصوص صاف تکذیب کررہی ہیں کما قال اللہ تعالیٰ وما کان لمومن ولامومنۃ الخ کہ مسلمان مرد و عورت کسی کو حق نہیں کہ جب اللہ و رسول کسی کام کا حکم دیدیں تو پھر ان کو اس کام میں کوئی اختیار باقی ہے۔

"جس کا شان نزول امر دینوی ہی ہے۔ اور جس حدیث تابیر سے شبہ پڑ گیا ہے (جس میں ہے کہ انتم اعلم بامور دنیاکم یعنی اپنی دنیا کی باتوں کو تم زیادہ جانتے ہو) اس میں یہ قید ہے کہ جو بطور رائے یا مشورہ کے فرمایا جائے نہ کہ بطور حکم کے فرمایا جائے۔

سیاسیات میں تو یہ فتنہ آج کل اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ غیروں کی نقالی میں بہت سے نو تعلیم یافتہ ہی نہیں بعض اچھے اچھے علما تک لادینی (Seculer) حکومت کا راگ الاپنے لگے ہیں۔ حدیہ کہ جمعیۃ العلمائے ہند جو سارے علمائے ہند کی نمائندگی کی دعویدار ہے، اور جو پیدا ہی سیاست و حکومت کے میدان میں ہوئی تھی، وہ اب اعلان پر اعلان اس سے اپنی تبری و توبہ کا کررہی ہے!

ایک اور فتنہ

نو تعلیم یافتہ جماعت میں خصوصیت سے عام یہ ہے کہ

"وہ احکام شریعت کی علت و غایت اپنی رائے سے تراش کر کے ان کے وجود و عدم پر احکام کے وجود و عدم کو منحصر سمجھتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منصوص احکام میں تصرف کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ بعض کی نسبت مسموع ہوا کہ انہوں نے وضو کی علت غائی نظافت کو سمجھ کر جب اپنے کو نظیف دیکھا تو وضو کی حاجت نہ سمجھی اور بے وضو نماز شروع کر دی۔"!

یہ نماز بلاوضو کا اجتہاد تھا۔ راقم کے ایک بڑے تعلیم یافتہ کرم فرما وضو بلا نماز کے قائل تھے اور فرماتے کہ نماز تو سمجھ میں نہیں آتی، لیکن وضو صحت و صفائی کے لئے بہت اچھی تعلیم ہے! سو قطع نظر اس کے کہ بعض احکام محض تعبدی یا ابتلائی ہوسکتے ہیں، اس کی کیا ذمہ داری و دلیل ہے کہ جو علت و غایت تم نے کسی حکم کی تجویز کی ہے وہی شارع کا مقصود ہو۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ ایسی غایات مقصود ہوں، جو مقرر فرمودہ احکام کی۔

"خاص صورت نوعیہ ہی پر مرتب ہوتی ہوں جس طرح بعض ادویہ (بلکہ عندالتامل تمام ادویہ) بالخاصہ موثر ہوتی ہیں۔"

پھر اپنے اپنے ذہن و دماغ سے احکام کی علت و غایت تلاش کرنے میں مختلف لوگ اپنے اپنے فہم و مذاق کے مطابق ایک ہی حکم کی مختلف غایات تراش سکتے ہیں۔

"کسی کی سمجھ میں کچھ آوے کسی کے خیال میں کچھ آوے تو ایک رائے کی دوسری پر ترجیح کی کیا دلیل ہے تو اس طرح تعارض و تساقط کے قاعدہ سے نفس احکام ہی منعدم و منہدم ہو جائیں گے۔"

اسی غلطی کا نتیجہ ایک دوسری خطرناک غلطی ہے کہ لوگ مخالفین مذہب کے مقابلہ میں فرعی و جزئی احکام تک کو ثابت کرنے کے لئے ان کے طرح طرح کے علل و اسرار یا اپنے نزدیک ان کا فلسفہ بیان کرنے کو بڑی کلامی و دینی خدمت خیال کرتے ہیں۔

"جس میں بڑی خرابی ہے، کیونکہ یہ علل محض تخمینی ہوتے ہیں اگر ان میں کوئی خدشہ نکل آوے، تو اصل حکم ہی مختل ٹھہرتا ہے، تو اس طرح مخالفین کو

ہمیشہ کے لئے ابطال کا موقع دیدینا ہے۔

"اور موٹی بات تو یہ ہے کہ یہ قوانین ہیں اور قوانین میں ہر کس ناکس کی مزعومہ (یا خود تراشیدہ) اسرار و علل کی بنا پر تغیر و تبدل یا ترک کا اختیار نہیں ہوتا۔ البتہ خود بانی قانون کو یہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

"باقی مجتہدین نے جو بعض احکام میں علل نکالے ہیں اس سے دھوکا نہ کھایا جائے۔ اول تو وہاں مسکوت عنہا امور میں تعدیہ حکم کی ضرورت تھی دوسرے ان کو اس کا سلیقہ تھا۔ اور یہاں دونوں باتیں مفقود ہیں۔ اور کم علمی کے علاوہ بڑا حاجب یافت حق میں اتباع ہوا ہے" جس کا زور آج کل جیسا کچھ ہے معلوم ہے)

چونکہ علل و اسرار کو مدار احکام (جس میں ارکان اسلام و عبادات تک شامل ہیں) سمجھنے سمجھانے کا مرض عقلیت (ریشنا لزم) بہت عام و متعدی ہے، اس لئے انتباہ دواز وہم میں ارکان و عبادات کی نسبت خصوصیت سے پھر اس کے مفاسد پر تنبیہ فرمائی گئی ہے۔ ان خود تراشیدہ مصالح و اسرار کی نوعیت تو یہ ہے کہ مثلاً

"زکوٰۃ میں ایسے لوگوں کی دستگیری مقصود ہے، جو ترقی کے ذرائع پر قادر نہیں۔ حج میں تمدنی اجتماع اور ترقی تجارت کی مصلحت ہے۔ دعا میں صرف نفس کی تسلی اور اعلائے کلمۃ اللہ میں امن و آزادی کو مصلحت قرار دے کر جب ان مصالح کی ضرورت نہ رہی یا وہ مصالح دوسرے اسباب سے حاصل ہو سکیں، تو ان احکام کو لایعنی قرار دیا۔"

ان حکمت تراشیوں کے متعلق ایک سوال یہ ہے کہ آخر ہر ہر شرعی حکم اور مسئلہ کی۔

"کہاں تک حکمتیں نکالی جائیں گی کیا کوئی شخص نماز میں رکعتوں کے خاص خاص اعداد کی حکمت بتلا سکتا ہے۔ اور اگر عقل ان امور کے لئے کافی ہوتی تو انبیاء کے آنے ہی کی ضرورت نہ تھی جب کہ دنیا میں بہت سے عقلا ہر زمانہ میں پائے گئے"۔

اس سے بھی بڑا فتنہ

ان مصالح پسندی و اسرار تراشی میں یہ ہے کہ۔

"اگر غور کیا جائے تو درحقیقت ان سارے اختراعی مصالح کا مرجع دنیاوی فوائد ہیں، جو درپردہ مقصودیت آخرت سے انکار ہے۔ ورنہ اگر آخرت ہے تو ظاہر ہے کہ وہ دوسرا عالم ہے جس کے خواص ممکن ہے (بلکہ ہونا چاہئے) کہ یہاں کے خواص سے کچھ نسبت نہ رکھتے ہوں جیسا کہ ایک اقلیم کو دوسری اقلیم سے اور مریخ کو زمین سے۔"

اور پھر کیا یہ ممکن بلکہ اغلب نہیں کہ اس عالم کے

"خواص ہم کو معلوم نہیں اور ان کا حاصل ہونا خاص خاص اعمال پر موقوف ہو، جن کی مناسبت و ارتباط کی وجہ ہم کو نہ معلوم ہو سکتی ہو۔"

لیکن ان باتوں سے

"کوئی یہ گمان نہ کرے کہ ہم شرائع و احکام کو حکم و اسرار سے خالی سمجھتے ہیں یا یہ کہ ان کے اسرار پر حکمائے امت کو بالکل اطلاع نہیں ہوتی ضرور ان میں اسرار بھی ہیں اور اطلاع بھی اور اطلاع بھی کس قدر ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی امتثال و اطاعت کا مداز اس اطلاع پر نہیں۔ اطلاع نہ بھی ہو تو بھی امتثال واجب ہے:......

"دیکھئے گھر کے نوکر کو بعض انتظامات خانگی کی لم یا علت معلوم نہیں ہو سکتی حالانکہ خود آقا یا منتظم بھی مثل نوکر کے مخلوق ہی ہے۔ جب مخلوق کو مخلوق کے بعض اسرار معلوم نہیں حالانکہ دونوں کے علم میں نسبت محدود ہے، تو خالق کے اسرار پر اگر مخلوق کو بالکل ہی اطلاع نہو یا صحیح اطلاع نہ ہو کہ دونوں کے علم میں غیر محدود و غیر متناہی تفاوت ہے تو کیا تعجب۔ بلکہ بقول ایک فلسفی کے اگر تمام احکام کی عقلی وجہیں پوری طرح معلوم ہو جائیں تو شبہہ یہ پڑے گا کہ شائد کسی فرد یا جماعت عقلا کا یہ مذہب تراشا ہوا ہے کہ دوسرے عقلا بھی اس کی لم تک پہنچ گئے۔ ورنہ خدائی مذہب کی شان تو یہ ہونا چاہئے کہ اس

کے اسرار تک کسی کی بھی پوری رسائی نہ ہو۔

"اور نہ یہ گمان کیا جائے کہ جن احکام کی عقلی وجہ سمجھ میں نہیں آئی، وہ عقل کے خلاف ہیں۔ ہرگز نہیں عقل کے خلاف ہونا اور بات ہے اور عقل میں آنا اور بات ہے (اصول موضوعہ نمبرا)

ایک اور سب سے قبیح و شدید زہریلی غلطی نبوت کے بارے میں ہمارے "روشن خیال" و "رواداز" مسلمانوں بلکہ نام نہاد عالموں میں یہ پیدا ہوگئی ہے کہ

"بعضے منکر نبوت کی نجات کے قائل ہیں۔ کہتے ہیں کہ خود انبیاء علیہم السلام بھی توحید ہی کے لئے آئے ہیں۔ لہٰذا جس کو اصل مقصود حاصل ہو، غیر مقصود کا انکار مضر نہیں۔"

"اس کا مختصر و نقلی رد تو وہ نصوص ہیں، جو نبوت کی تکذیب کرنے والوں کے خلود نار پر دال ہیں۔ اور عقلی رویہ ہے کہ رسول کی تکذیب کرنے والا درحقیقت خود خدا کی تکذیب کرتا ہے کیونکہ وہ محمدؐ رسول اللہ وغیرہ کی تکذیب کرتا ہے۔ (جو خود قرآن میں منصوص ہے)۔

"اور عرفی نظیر یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جارج پنجم کو تو مانے، مگر گورنر جنرل سے مخالفت و مقابلہ کرے کیا وہ بادشاہ کے نزدیک کسی قرب یا مرتبہ یا معافی کے لائق ہو سکتا ہے۔"

اور ایک بدمذاقی یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر سائنس اور طبیعات کے مسائل نکالے جاتے ہیں اور اس کو بڑا کمال گمان کیا جاتا ہے حالانکہ (جیسا انتباہ دہم میں ارشاد ہے کہ)

"شریعت مطہرہ کو کائنات طبعیہ سے بحث کرنا مقصود ہی نہیں البتہ تکمیل مقصود کے لئے ضمناً و تبعاً کچھ مباحث مختصر طور پر وارد ہیں، جن کی پوری حقیقت کی تفتیش اس لئے ضروری نہیں کہ ان کا شریعت کے اصل مقصود سے تعلق نہیں۔"

لیکن چونکہ خدا کے کلام میں وارد ہیں۔ جس کے علم کی صحت و صدق میں کلام نہیں

ہو سکتا۔

"اس لئے جس قدر اور جس طور پر وہ وارد و منصوص ہیں چونکہ وہ کلام صادق میں واقع ہیں۔ لہٰذا اس کے خلاف یا ضد کا اعتقاد یا دعویٰ کرنا کلام صادق کی تکذیب ہے، اس لئے ایسے اعتقاد یا دعاوی کی تکذیب کو ہم واجب سمجھیں گے۔ مثلاً

"بشر اول کا مٹی سے پیدا ہونا جو نصوص میں مصرح ہے اس کی بنا پر مذہب ارتقا کا یہ کہنا کہ حیوان ترقی کر کے آدمی بن گیا جیسا کہ ڈارون کا وہم ہے یقیناً باطل ہوگا، اس لئے کہ نص میں تو اس کے خلاف وارد ہے۔ اور کوئی دلیل عقلی معارض ہے نہیں، نہ ڈارون کے پاس، جیسا کہ اس کی تقریر سے ظاہر ہے محض اپنی تخمینی (وہی ظنی استقرا) سے حکم کر دیا، نہ مقلدین ڈارون کے پاس جو زیادہ تر) محض ڈارون کی تقلید سے ایسا کہتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ارتقا کا دعویٰ دراصل دانستہ یا نادانستہ انکار خدا کے دعوے یا رحجان کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ ان منکرین کے لئے۔

"ہر شے کے تکون کی طبعی علت اور کیفیت نکالنا ضروری ہے۔ بس انسان کی پیدائش میں بھی یہ احتمال نکالا۔ ورنہ جو شخص وجود خالق کا قائل ہے، جیسے اہل ملت خصوصاً اہل اسلام ان کا خود مذہب ارتقا کے قائل ہونے کی ضرورت نہیں۔ مذہب خلق کے قائل ہو سکتے ہیں۔" ایک اور مثال رعد و برق و بارش کے تکون کی ہے کہ

"روایات میں ان کے تکون کی جو کیفیت وارد ہے اس کی تکذیب محض اس بنا پر کہ بعض آلات و تجربات کے ذریعہ ان چیزوں کا تکون دوسرے طور پر مشاہدہ کر لیا گیا ہے، اس لئے جائز نہیں کہ دونوں میں اگر تعارض ہوتا تو بیشک ایک کی تصدیق کہ مشاہدہ اس پر مضطر کرتا ہے دوسرے کی تکذیب کو متلزم ہوتی۔

"لیکن تعارض کی کوئی دلیل نہین۔ ممکن ہے کہ کبھی ایک طرح کے اسباب

سے ان کا تکون ہوتا ہو کبھی دوسری طرح کے اسباب سے۔ اور نہ روایات میں ایجاب کلی کا دعویٰ ہے۔ اور مشاہدہ سے تو موجبہ کلیہ حاصل ہو ہی نہیں سکتا...... پس جب تعارض نہیں تو دونوں کی تصدیق ممکن ہے پھر روایات کی تکذیب کی کیا ضرورت۔"

اسی طرح مثلاً امراض کے متعدی نہ ہونے کی روایات کا تجربہ کی بنا پر انکار کیا جاتا ہے۔

"سو تامل سے اس میں بھی تعارض نہیں۔ کیونکہ تعدیہ کی نفی سے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ ضروری نہیں، کہ کبھی اس کے خلاف ہو ہی نہیں، اور وہ بلا اذن خالق خود مؤثر ہو۔ نہ مشاہدہ سے اس طرح کا ضروری تعدیہ ثابت ہوا بلکہ مشاہدہ تو اس کے خلاف ہے کیونکہ کبھی (بلکہ بارہا) تعدیہ نہیں بھی مؤثر ہوتا۔ اور نصوص سے ہر امر کا موقوف ہونا ارادہ الٰہیہ پر ثابت ہے۔

مسئلہ تقدیر: اس مسئلہ کا دارومدار چونکہ اس پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیگر صفات کی طرح اس کا علم و تصرف بھی کامل ہے۔ اس لئے

"جو خدا اور اس کی صفات کے کمال کا قائل ہو گا، اس کو تقدیر کا بھی قائل ہونا پڑے گا۔ مگر اس وقت اس مسئلہ میں بھی چند غلطیاں کی جاتی ہیں۔ بعض تو سرے سے اس کا انکار ہی کرتے ہیں کہ اس کے اعتقاد سے تدبیر کا ابطال ہوتا ہے، جو بنیاد ہے ساری کم ہستی و پستی کی .... اور اکثر یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ جو اس مسئلہ کے قائل ہیں وہ بے دست و پا ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔

"اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ان کا کاہلی کا اثر ہے، نہ کہ اس مسئلہ کا اگر مسئلہ کا یہ اثر ہوتا تو صحابہ سب سے زیادہ کم ہمت ہوتے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو اس مسئلہ کا اثر تو یہ ہے کہ اگر تدبیر ضعیف ہو جب بھی کام شروع کر دے جیسا کہ صحابہ کی جب نظر حق تعالیٰ پر تھی تو باوجود بے سروسامانی محض توکل پر کیسے جان توڑ کر خطرات میں گھسے اور یہی مضمون ہے اس آیت کا کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ اور حدیث میں مصرحا ہے کہ کوئی شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اجلاس میں مقدمہ ہار گیا اور کہا کہ حسبی اللہ و نعم

الوکیل تو آپ نے فرمایا کہ ان اللہ یلوم علی العجز فاذا غلبک امر فقل حسبی اللہ ونعم الوکیل۔

"البتہ یہ اثر لازم ہے کہ وہ تدبیر کو موثر حقیقی نہ سمجھے گا تو یہ خود عقلی و نقلی صحیح دلیل کا مقتضا ہے۔ اس پر ملامت کیا ہو سکتی ہے بلکہ اس کے خلاف کا اعتقاد ہو تو وہ قابل ملامت ہے، ایسا شخص تدبیر کا اتنا درجہ سمجھے گا، جیسا کہ جھنڈی کا درجہ ہوتا ہے۔ ریل کے رک جانے میں، جو نہ معطل ہے نہ موثر حقیقی۔ پس چوکیدار جب کسی خطرہ کے وقت ریل کو روکنا چاہے گا تو تدبیر تو یہی کرے گا مگر نظر ڈرائیور یا گارڈ پر ہو گی اور بزبان حال مترنم ہو گا کہ

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقان   مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند ص ۷۰

غرض واقع میں ابطال تدبیر نہ اس مسئلہ کا نتیجہ ہے، نہ نصوص سے ایسا ثابت ہے۔ بلکہ نصوص میں تو

"سعی و اجتہاد کسب معیشت اور تردد للسفر و تدابیر رفع مفاسد و مکائد وغیرہ پر بے شمار نصوص صراحتہً وارد ہیں۔   احادیث میں اس اشکال کا کہ دوا و دعا وغیرہ کیا دافع قدر ہے کیا مختصر و کافی جواب ارشاد ہے کہ ذلک من القدر کلہ"۔ (یہ سب بھی قدر ہی سے ہے)۔

"اور بعض نے نصوص صریحہ کو دیکھ کر اس مسئلہ سے انکار کی گنجائش نہ دیکھ کر مگر یہ سمجھ کر کہ اس میں انسان کا مجبور و غیر مختار ہونا لازم آتا ہے، اس کی تفسیر بدل ڈالی۔

"اور یہ تفسیر قرار دی کہ تقدیر علم الٰہی کا نام ہے اور علم چونکہ معلوم میں متصرف نہیں ہوتا، اس لئے وہ اشکال لازم نہیں آتا۔ اور مثال اس کی نجومی کے علم اور اس کے پیشین گوئی سے دی کہ اگر وہ کہہ دے، فلاں تاریخ فلاں شخص کنویں میں گر کر مر جائے گا اور ایسا ہی واقع ہو گیا تو نہ کہیں گے کہ اس نجومی نے قتل کر دیا۔

"لیکن نصوص میں نظر کرنے والا معلوم کر سکتا ہے اور عقلی مسئلہ بھی ہے کہ جس طرح کوئی واقعہ علم الٰہی سے باہر نہیں، اسی طرح ارادۂ الٰہی سے بھی باہر

نہیں اور تقدیر کی یہی حقیقت ہے باقی اگر کوئی شخص اپنی اصطلاح میں اس کا نام
تقدیر نہ رکھے، تاہم خواہ ارادۂ الٰہی کے اس تعلق سے تو انکار نہیں کر سکتا۔
پس تقدیر کی تفسیر بدلنے سے اشکال سے کیسے نجات ہوئی"۔

جبر و اختیار۔ اصل میں بڑا جھگڑا انسان کے مختار ہونے کا ہے کہ آیا اس کو اختیار حاصل ہے یا نہیں۔ کیونکہ اگر کوئی امر ارادۂ الٰہی کے بغیر نہیں ہو سکتا تو انسان کا کوئی فعل بھی ارادۂ الٰہی کے بغیر نہ ہو سکے گا، اور وہ بجائے مختار کے مجبور ٹھہرے گا یہی سوال ذرا ٹیڑھا اور تحقیق طلب ہے۔ جس کی

"تحقیق یہ ہے کہ خود یہ مقدمہ ہی غلط ہے کہ ارادۂ الٰہی کے خلاف محال ہونے سے اختیار کی نفی لازم آتی ہے۔ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک الزامی ایک تحقیقی۔ الزامی تو یہ ہے کہ اگر اس سے اختیار کی نفی لازم آتی ہے، تو ارادۂ الٰہیہ سے بھی متعلق ہوتا ہے، تو لازم آئے گا کہ خود خدا کا اختیار بھی ان افعال پر باقی نہ رہے۔ حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہو سکتا۔
اور تحقیقی جواب کہ وہی حقیقت میں اس (مسئلہ) کا راز ہے یہ ہے کہ ارادہ کا تعلق بندوں کے افعال کے ساتھ محض وقوع ہی کا نہیں، بلکہ اُس ایک قید کے ساتھ ہے کہ وقوع باختیار عبد۔

یعنی بندہ کے افعال کے متعلق خدا کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ یہ افعال خود بندہ کے اختیار سے واقع ہوں۔ اور خدا کا ارادہ جس امر سے متعلق ہو جب اس کا ہونا لازم ہے۔
"تو اس سے اختیار عباد کا وجود اور موکد (قطعی) ہو گیا نہ کہ منفی (یا مسلوب) اور یہ بہت ہی ظاہر بات ہے"۔
خلاصہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہی یہ ہوتا ہے کہ بندہ کا فعل خود بندہ کے اختیار سے واقع ہو تو اب نہ کوئی فعل بندہ کا بلا خدا کے ارادہ کے صادر ہونا لازم آئے گا اور نہ بلا

بندہ کے اختیار کے یہی ذرا دقیق نکتہ فکر و غور کے ساتھ سمجھنے کا ہے. جس کی فہم میں راقم ہذا کا تجربہ ہے کہ اکثر اصحاب علم و فکر کو بھی دشواری ہوتی ہے۔ (۱)

البتہ یہ خیال رکھنے کی بات ہے کہ خدا نے بندہ کو مستقل اختیار نہیں عطا فرما دیا ہے کہ بالکل آزاد ہو کر جب اور جو چاہے کرتا رہے. بلکہ فعل کے وقت بندہ کے اختیار اور اس اختیار کے مطابق فعل دونوں کو پیدا خدا ہی کرتا ہے۔ یہی مطلب اس کا ہے کہ خالق افعال خدا اور کاسب بندہ ہے۔ رہا یہ سوال کہ۔

> "جب یہ مسئلہ اس طرح عقل و نقل سے ثابت ہے تو (حدیث میں) اس کی کاوش سے ممانعت کیوں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بعض شبہے عقلی نہیں ہوتے طبعی ہوتے ہیں. جن کی شفا کے لئے دلیل کافی نہیں ہوتی۔ بلکہ وجدان کے صحیح ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ اہل وجدان صحیح کم ہیں. اس لئے کاوش سے ایسے شبہات پڑنے کا اندیشہ ہے جو تمدن اور آخرت دونوں کے لئے مضر ہے۔ اس لئے شفقت و حکمت نبویہ کا مقتضیٰ یہی ہوا کہ اس سے روک دیا جائے جیسے شفیق طبیب ضعیف مریض کو قوی غذا سے روکتا ہے"۔

آج کل کا زمانہ بڑا عقلیت (ریشنالزم) کا زمانہ خیال کیا جاتا ہے اور بات بات میں عقلی استدلال کا دعویٰ و مطالبہ ہوتا ہے۔ اس لئے آخر میں مذکورۂ بالا اصول موضوعہ ہی کے تحت بالکل منطقی اور چند سطری انتباہ خود استدلال عقلی کے متعلق یوں فرمایا گیا ہے کہ گو

> "آج کل اس کا استعمال بہت ہے. مگر باوجود کثرت استعمال کے اب تک بھی اس استعمال میں متعدد غلطیاں کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ دلیل عقلی کو مطلق دلیل نقلی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اس کا قاعدہ اصول موضوعہ نمبر ۷ میں بیان

۱۔ حتیٰ کہ ایک اچھے صاحب فکر و فلسفی دوست جواب ماشاء اللہ صاحب دین بھی قابل رشک ہیں. یہ عاجزان کے ذہن نشین جب یہ نکتہ نہ کر سکا تو بالآخر انہوں نے مسئلہ اقتضاء سے اس میں شفا پائی جو دراصل جبر ہی کی خفی صورت ہے بلکہ ایک اعتبار سے بندہ و خدا دونوں کی مجبوری! (العیاذ باللہ)

ہو چکا۔ ایک یہ ہے کہ تخمین واستقرا کو دلیل عقلی سمجھتے ہیں۔ ایک یہ کہ فروع شرعیہ کو عقل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ نظیر کو ثبوت سمجھ کر کبھی خود بھی اس پر اکتفا کرتے ہیں اور کبھی دوسرے سے باوجود اس کے دلیل قائم کر دینے کے نظیر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ امور ممکنہ پر دلیل عقلی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان دونوں امر کا غلط ہونا اصول موضوعہ نمبر ۵ و نمبر ۶ میں ثابت ہو چکا۔ ایک یہ کہ استبعاد سے استحالہ پر استدلال کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ عادت اور عقل کو متحد سمجھتے ہیں"۔

اصل میں حضرت کا یہ رسالہ انتباہات ایسا متن متین ہے جس کی شرح ایک مستقل و مطول کتاب چاہتی ہے۔ اس لئے گو عام ناظرین اس سے پورا استفادہ نہ فرما سکیں گے تاہم اہل فکر و تحقیق کے لئے اس میں ایسے اصول و مبادی بیان فرما دیئے گئے ہیں کہ وہ ان سے اپنے اور دوسروں سب کے جدید سے جدید اصولی و فروعی شبہات کا بہت کچھ ازالہ فرما سکتے ہیں، اور جدید سے جدید علم کلام کی عمارت سے جدید سے جدید معلومات و تحقیقات کی روشنی میں انہیں بنیادوں پر کھڑی کی جا سکتی ہے۔ باقی خود حضرت مجدد کی صحیح عقلیت و تجدید عقلیت دونوں کا اندازہ تو عام ناظرین بھی اس متن سے کچھ نہ کچھ فرما ہی لے سکتے ہیں۔

عملی جامعیت

ذہنی و علمی کمالات کی اتنی جامعیت نادر سہی تاہم بالکلیہ معدوم نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ عملی کمالات کا اجتماع یہ قریب قریب اب مفقود ہے۔ حالانکہ خالص ایمانیات و اعتقادیات سے قطع نظر کر کے (گو وہ بھی دراصل اعمال قلب ہی ہیں) سارا اسلام نام ہے سراپا عملی تعلیمات و ہدایات کا۔ اور اس کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ نہیں، جس کے متعلق اصول و فروع جزئیات و کلیات واجبات و مستحبات کی ہدایات سے اسلامی تعلیمات کا دفتر معمور نہ ہو۔ جس مذہب میں اکل و شرب نشست و برخاست دوستی و ملاقات وغیرہ تک بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں کے آداب کی تعلیم فرمائی گئی ہو اور ان کے لئے بڑے بڑے اجر رکھے گئے ہوں، اور جس مذہب کے معلم ان ساری چھوٹی بڑی تعلیمات کا سراپا نمونہ اور انسانیت کے لئے اسوۂ حسنہ بنایا گیا ہو، اور اللہ تعالیٰ کی محبت و محبوبیت کا مدار تمامتر اس اسوۂ کاملہ کے اتباع پر رکھا گیا ہو، ظاہر ہے کہ وہ عمل کے بغیر ایک ایسا مدقوق جسم ہو گا، جو بستر پر پڑا صرف زندگی کی سانسوں کو پورا کر رہا ہو۔

بلاشبہ ایمانیات و اعتقادیات کا درجہ روح کا ہے، مگر اس روح کا مرئی مظہر یا جسم اعمال ہی ہیں، جن کی صورت میں غیر مرئی و مخفی ایمان کھلی آنکھوں دن کی روشنی میں اپنے پرائے دوست دشمن سب کو چلتا پھرتا نظر آ سکتا ہے۔ جس کے بعد ابو جہل کبر و عناد کے علاوہ کسی کے لئے آنکھیں بند کر لینا دشوار ہو گا۔ اگر جسمانی علائق و اعمال مقصود اعظم نہ ہوتے، تو روح کی جسم میں پھونک کو ارضی خلافت عطا فرمانا، بلکہ ارض و سموات کی ساری جسمانی کائنات کی آفرینش ہی سرے سے باطل و عبث ٹھہرتی۔ خالص گیان دھیان یا فکری استغراق و علمی معرفت کے لئے تو روح کا تجرد ہی اولیٰ تھا۔ البتہ نفس مغفرت کے لئے

رحمت الٰہی کا دامن بہت وسیع ہے۔ لیکن موت و حیات کا یہ سارا ناسوتی ہنگامہ تو حسن عمل ہی کی آزمائش کے لئے برپا فرمایا گیا ہے۔ خلق الموت والحیوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا۔
جس طرح انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں کے لئے اس "احسن عمل" کا اکمل اسوہ ہوئے ہیں اسی طرح نبی الانبیا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین کے تھانوی مجدد کی زندگی تجدیدی درجہ میں امت محمدیہ کے لئے اسلام کی عملی تعلیمات کا ہر شعبہ میں کامل و جامع نمونہ تھی۔
ارشاد ہے کہ

"دین کے پانچ شعبے ہیں عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق باطنہ اور معاشرات۔ ایسے عوام جن کو دین کا کچھ خیال ہے انہوں نے ان میں سے صرف عقائد و عبادات کو دین سمجھ رکھا ہے۔ علمائے ظاہر نے معاملات کو بھی کچھ شریک کر لیا، اور مشائخ کو اگر کچھ اپنے خاص فریضہ کی طرف توجہ ہوئی تو اخلاق باطنہ کی اصلاح کو بھی دین میں شامل کر لیا۔ لیکن معاشرت کو قریب قریب امت کے سارے طبقات نے الا ماشاء اللہ اعتقاداً و عملاً دین کی فہرست سے خارج کر رکھا ہے۔ نہ علما اپنے وعظوں میں اس کا نام لیتے ہیں نہ مشائخ اپنی مجلسوں میں۔ حالانکہ خود حضورؐ سے ان چیزوں کا اتنا اہتمام ثابت ہے کہ مثلاً ایک دفعہ کوئی صحابی ہدیہ لے کر خدمت اقدس میں بلا سلام و اذن حاضر ہو گئے تو فرمایا واپس جاؤ اور السلام علیکم کیا میں حاضر ہوں کہہ کر آؤ۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک صحابی سے ملنے تین میل قبا میں تشریف لے گئے اور تین بار پکار کر سلام فرمایا اور آنے کی اجازت چاہی۔ لیکن اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو واپس ہو گئے۔ تب وہ صحابی دوڑتے ہوئے حاضر ہوئے۔ ان کو اس وقت تک قانون استیذان کا علم نہ تھا، اس لئے قصداً جواب سلام عرض نہیں کیا، کہ حضورؐ کا جتنی مرتبہ بھی سلام پہنچ جائے موجب برکت ہو گا۔ غرض آنحضرتؐ نے تین میل تشریف لے جانا اور پھر واپس ہو جانا پسند فرما لیا، لیکن قانون استیذان (اجازت طلبی) کے خلاف عمل نہیں فرمایا۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے، کہ شب برات میں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بستر سے آہستہ سے اٹھے آہستہ سے نعل مبارک پہنے، آہستہ سے کنواڑ کھولے، آہستہ سے باہر تشریف لے گئے اور آہستہ سے کنواڑ بند فرمائے۔ یہ سب اس لئے کہ حضرت عائشہؓ جاگ نہ پڑیں اور ان کو تکلیف نہ ہو۔ حد یہ کہ اگر کچھ لوگ ساتھ کھا رہے ہوں تو اس کی ممانعت فرمائی کہ کسی کو ایک دم سے مثلاً دو چھارے نہ لینا چاہئے تاوقتیکہ ساتھیوں سے اجازت نہ لے لے جس سے معلوم ہوا کہ بے تمیزی اور دوسروں کی ناگواری کا لحاظ اتنا ضروری ہے کہ ایسی بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں تک میں اس کا خیال و اہتمام رکھنا چاہئے"۔

حضرت والا ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ حسن معاشرت اور ادب و تہذیب کی اصل حقیقت یہی ہے، کہ دوسروں کو کوئی اذیت و کدروت نہ ہو پائے اور ان کی راحت کی تابہ امکان ہر چھوٹی بڑی بات میں رعایت ہو۔ اس میں اگر کوتاہی ہو تو نفلی عبادات روزہ نماز تک بیکار ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو عورتوں کا ذکر کیا گیا کہ ایک نماز روزہ بہت کرتی ہے۔ مگر اپنے ہمسایوں کو ایذا پہنچاتی ہے۔ دوسری زیادہ نماز روزہ تو نہیں کرتی مگر ہمسایوں کو ایذا نہیں پہنچاتی۔ آپ نے فرمایا پہلی دوزخی ہے دوسری جنتی۔

حسن معاشرت کی اہمیت اور اہتمام: غرض حسن معاشرت کی اس اہمیت اور لوگوں میں اس سے غفلت کی بنا پر حضرت والا کو عبادات و معاملات کے فرائض و واجبات کے بعد اعمال میں خود بھی سب سے زیادہ اس کا اہتمام تھا اور دوسروں کو بھی اس کی روک ٹوک اور تاکید برابر رہتی۔ خود تو یہ حال تھا کہ اپنے گھر میں بھی کنڈی کھٹکھٹائے اور اجازت ملے بغیر داخل نہ ہوتے۔ بلکہ اگر کوئی بچہ بلانے آئے تو اس کو کافی نہ خیال فرماتے جب تک کوئی بڑا نہ بلائے۔ گھر کی اگر کوئی چیز کسی ضرورت سے اٹھاتے تو پھر وہیں لے جا کر رکھتے تاکہ رکھنے والے کو ڈھونڈھنا نہ پڑے۔ اگر کہیں سے برتن یا رومال میں کوئی چیز آتی تو فوراً خالی فرما کر واپس فرما دیتے کہ بھیجنے والے کی کوئی ضرورت انکی نہ رہے یا ہرج نہ ہو۔

سفارش جس کو لوگ ایک معمولی نیکی و ہمدردی ہی کا کام خیال کرتے ہیں. اس میں حضرت کی مصلحانہ و مجددانہ حکمتوں کی تعلیم و عمل کی اوپر سفارش عام کی ایک مثال گزر چکی یہاں ایک اور سفارش خاص کی بھی مثال ملاحظہ ہو۔

"ایک صاحب نے سفارش چاہی اور پریشانی کا اظہار کیا اور ایک معین نام بھی بتلایا کہ فلاں سوداگر کو لکھ دو میں نے ان کو اس طرح لکھا کہ

"ایک حاجت مند کو یہ ضرورت ہے۔ اگر آپ کے پاس پہلے سے ایسی رقم موجود ہو جس کو آپ سوچ رہے ہوں کہ کہاں خرچ کریں اور کسی دوسرے سے وعدہ بھی نہ کیا ہو اور آپ کے علم میں کسی اور کو توقع نہ ہو اس حالت میں یہ حاجت مند ہیں ان کی اعانت کیجئے ورنہ اپنی آزادی میں خلل نہ ڈالئے ان بیچارے نے وہ رقم بھیج دی۔" (۱)

اس کے بعد ارشاد ہے کہ

"مجھ کو کام کرنے سے انکار نہیں مگر جی یہ ضرور چاہتا ہے کہ کسی پر بار نہ ہو اور طریقہ سے کام ہو۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ محض نام ہو جاتا ہے کسی کا ورنہ دینے والے تو وہ خود ہی ہیں"۔

باوجود ان قیود اور احتیاطوں کے چونکہ لوگوں میں بے احتیاطی کا مرض عام ہے جس کے تجربات کی بنا پر ایک صاحب کی سفارش کے سلسلہ میں فرمایا کہ "اب ان قیود سے بھی سفارش نہ کروں گا فہم میں سلامتی نہیں۔ لوگ سفارش کی حقیقت سے بے خبر ہیں" باقی حضورؐ نے جو حضرت بریرہ سے مغیث کے نکاح کی سفارش فرمائی تھی اس کی نسبت فرمایا کہ

"اسی حدیث میں یہ بھی وارد ہے کہ بریرہ نے عرض کیا کہ حضور کا حکم ہے یا سفارش۔ آپ نے فرمایا کہ سفارش۔ عرض کیا کہ میں قبول نہیں کرتی ہوں اگر اس قدر آزادی ہو تو سفارش کرنا سنت ہے۔ ورنہ جبر ہے۔ مجھ کو ایسی باتوں میں بڑی احتیاط ہے"۔ (افاضات حصہ چہارم ص ۲۳۴)

قربان جائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر! حضور یا حضور کے کامل متبعین کے سوا ایسی تعلیم و آزادی کہاں!

معاملات میں غایت تقویٰ. معاشرت کے معمولی مستحبات تک میں جب اہتمام کا یہ حال تھا. تو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مالی و غیر مالی معاملات اور حقوق عباد کے اہتمام کا عالم کیا ہو گا۔ ذیل میں صرف چند واقعات اشرف السوانح سے نقل کئے جاتے ہیں، جن پر عمل کیا اس زمانہ میں اچھے اچھوں کی نظر بھی نہیں پڑتی۔

"حضرت کے والد نے یکے بعد دیگرے چار نکاح کئے اور کسی کا مہر ادا کرنا معلوم نہ تھا. نہ معافی معلوم نہ ترکہ میں سے ادا کرنے کا کسی کو خیال آیا (لیکن حضرت کو کسی مستفتی کے ایک ایسے ہی استفتا پر خیال آیا) اور ادائی حقوق کی کوشش میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ دوسرے علما سے استفتا کیا کیونکہ اپنے معاملہ میں خود اپنے فتویٰ پر عمل کرنا خلاف احتیاط سمجھا۔

"گو بنابر رسم غالب برائے مہر اکثر علمائے فتویٰ یہی دیا کہ ترکہ سے ادائیگی واجب نہیں پھر بھی چونکہ رسم کا واقع ہونا متیقن نہ تھا حضرت والا نے احتیاط اسی میں سمجھی کہ جو والد مرحوم کا ترکہ حصہ میں آیا اس کے تناسب سے ان کی چاروں ازواج کے ورثہ کا حصہ رسدی ادا کر دوں گا۔

"چنانچہ نہایت اہتمام سے ورثا کی تحقیق کی جو دور دراز مقامات بلکہ دیگر ممالک میں پھیلے ہوئے تھے۔ تقریباً دو سال اسی تحقیق میں گزر گئے جوابی خطوط بھیج بھیج کر احباب و اعزہ سے تفتیش حالات کر کے جملہ مستحقین کے نام اور پتے دریافت کئے اور بعض مقامات پر ایک اہل علم کو بھی ورثا کی تحقیق کے لئے بھیجا اور پھر از روئے فرائض ان کی حصہ کشی کرائی۔ چونکہ فرائض کا بہت طویل مسئلہ تھا اور حضرت والا اپنے کسی خادم سے بھی اس قسم کا کوئی کام بلا اجرت نہیں لیتے۔ لہٰذا حصہ کشی میں غالباً چودہ پندرہ روپے اور مدت طویل صرف ہوئی۔

"پھر تقسیم میں بہت طوالت کرنی پڑی کیونکہ بعض کے حصہ میں ایک ایک آنہ بلکہ ایک ایک پیسہ تک آیا اور بعض ان میں بہت متمول تھے. جن کو ایک آنہ کی رقم دیتے ہوئے بھی سخت حجاب ہوتا تھا۔ لیکن چونکہ ادا کرنا واجب

تھا. ان کو یہ لکھ کر بھیجا کہ آپ ادائے حقوق میں اگر میری اعانت کریں گے میں ممنون ہوں گا۔ چنانچہ انہوں نے نہایت خوشی سے قبول کیا............ اور بعد ادائیگی حضرت والا نے فرمایا کہ گو نہایت دشوار امر تھا. لیکن حق تعالیٰ نے ایسی دستگیری فرمائی کہ بلاکسی خاص پریشانی کے سبکدوشی نصیب ہوگئی۔ " (۱)

ایک سفر میں کسی چھوٹے اسٹیشن پر بارش کی وجہ سے اسٹیشن ماسٹر نے حضرت کو گودام میں ٹھہرا دیا. اور جب رات ہوئی تو کسی ریلوے ملازم کو اس میں لالٹین جلانے کا حکم بھی دے دیا۔ اب حضرت کو شبہ ہوا کہ کہیں۔ یہ ریلوے کمپنی کی لالٹین نہ ہو. جس کا بابو کو کوئی حق نہیں۔ لیکن اس خیال سے منع فرمانے میں بھی تامل ہوا کہ یہ ہندو ہے دل میں کہے گا کہ مسلمانوں کے ہاں ایسی سختی و تنگی ہے. کہ ہم ان کی راحت کا انتظام کرتے ہیں. اور وہ اس سے نفع بھی نہیں اٹھا سکتے۔ اس کشمکش میں دل ہی دل میں دعا شروع فرمادی کہ یا اللہ آپ ہی اس سے بچائیے۔ جس کے بعد ہی بابو نے ملازم سے پکار کر کہا کہ دیکھو اسٹیشن کی نہیں. ہماری لالٹین جلانا۔ فرمایا کہ مجھے حیرت ہوگئی کہ یہ تو ہندو ہے اس کو کیسے اس کا خیال ہوا۔ لیکن خدا کی قدرت کا مسخر تھا. اس نے دل میں ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا ورنہ اسٹیشن کی لالٹین تھوڑا ہی جلنے دیتا اندھیرے ہی میں بیٹھا رہتا"۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے کسی خادم کے پاس حضرت حاجی صاحب کی تسبیح تھی. جس کو حاجت کی وجہ سے پہلے وہ فروخت کرنا چاہتے تھے. پھر حضرت والا کو نذر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ حضرت نے دریافت فرمایا کہ یہ جائز طریقہ سے ملی ہے۔ عرض کیا کہ خود حاجی صاحب نے عطا فرمائی تھی۔ مزید اطمینان کے لئے پھر دریافت فرمایا کہ مرض وفات میں یا اس سے پہلے۔ عرض کیا کہ وفات سے پہلے۔ تب جا کر حضرت نے اس کو لیا۔ (۲)

۱۔ اشرف السوانح حصہ سوم صفحہ ۲۴۸ و ۲۴۹

۲۔ اشرف السوانح حصہ چہارم ص ۸۳

"کسی مخلص نے کچھ پکی ہوئی چیزیں ہدیہ بھیجیں۔ خادم سے فرمایا کہ دیکھو ان چیزوں کو بڑے گھر پہنچا دو اور کہنا کہ بٹی ہوئی نہیں ہیں۔ اور جن برتنوں میں یہ چیزیں لانے والے کے سامنے گن کر اور کھلا کر لے جانا اور واپس لا کر پھر گنوا دینا تاکہ گڑ بڑ نہ ہو۔ پھر فرمایا گن لیا عرض کیا جی ہاں گن لیا چار برتن ہیں۔ فرمایا ایسی چیزوں میں ضرور مداخلت کرتا ہوں اس لئے کہ لوگوں میں احتیاط نہیں۔ ہر شخص پر اعتماد نہیں کرتا۔ اسی سلسلہ میں ایک مولوی صاحب نے حضرت سعد بن وقاص فاتح فارس کا یہ واقعہ عرض کیا کہ جب غلام کو چیزیں کھانا پکانے کے لئے دیتے تو وزن فرما کر اور گوشت کی بوٹیاں گن کر کسی مسلمان کی طرف سے بدگمانی کا موقع کیوں رہے"۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ یہ ہے فقر و تصوف۔ یہ ہیں اعمال باطنہ۔ کہاں تک ان حضرات کی نظر جاتی تھی آخر صحبت کس کی تھی (الافاضات اول ص۲۷۶)

مالی اور واجب الادا حقوق کے متعلق وصایا کے ذیل میں تصریح فرمائی ہے کہ ان میں کبھی کوتاہی نہیں ہوئی بجز ایک حق کے کہ بعض خطوط میں جواب کے لئے ٹکٹ آتے ہیں اور کاتب کا پورا پتہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا انتظار کے بعد ان ٹکٹوں کو مصارف نقطۂ میں صرف کر دیتا ہوں۔ مگر نیت یہ ہے کہ اگر ٹکٹ والے اس صرف کو جائز نہ رکھیں تو ٹکٹ مجھ سے لے لیں۔ (۱) امانتوں کو ہمیشہ الگ رکھتے کہ مخلوط ہو جانے سے شرعی احکام بدل جاتے ہیں اور امانت قرض کے حکم میں ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ کسی پارسل کے تولنے کے لئے کچھ روپیوں کی ضرورت پڑی۔ تو دو امانتوں سے کچھ روپے نکال کر دیئے اور پہچان کے لئے ایک میں ملکہ کی تصویر کے دیئے اور دوسری میں سے بادشاہ کی تصویر کے (تاکہ مل نہ جائیں۔) (۲)

۱۔ اشرف السوانح حصہ سوم ص۱۳۹

۲۔ اشرف السوانح حصہ سوم ص۹

غیر مالی معاملات میں احتیاط . یہی حال تقویٰ و احتیاط کا غیر مالی معاملات میں تھا کہ مثلاً کسی کتاب پر تقریظ محض اجمالی مطالعہ سے نہ فرماتے. اس کو ناجائز جانتے اگر تفصیلی مطالعہ کی فرصت نہ ہوتی تو کسی مقام کو تعین کرا لیتے، اور صرف اس پر تقریظ تحریر فرماتے. اور اگر کسی پر اطمینان ہوتا تو زیادہ سے زیادہ اتنا اور اضافہ فرما دیتے کہ امید ہے کہ باقی کتاب بھی ایسی ہی ہوگی (۵ ۔ ٦) آج کل کے ناقدین کتب اپنے طرز عمل سے مقابلہ فرمائیں کہ بڑی بڑی کتابوں کو ادھر ادھر سے کچھ دیکھ کر تنقید و تبصرہ ساری کتاب پر فرما دیتے ہیں۔ خود اپنی خاص تصانیف میں محض مواد و معلومات پر قناعت نہ فرماتے بلکہ شرح صدر کا بھی انتظار فرماتے۔ اور جہاں شرح صدر نہ حاصل ہوتا تصریح فرما دیتے۔ جیسا کہ مثلاً بیان القرآن میں سورۂ برات و سورۂ حشر کے دو مقامات پر (۱) ہے۔ نیز اپنی کتابوں کے تسامحات کا خود یا کسی دوسرے سے اگر علم حاصل ہو جاتا، تو برابر ترجیح الرجح کے مستقل عنوان سے ان کی اصلاح و اشاعت فرماتے رہتے۔ پھر خیال ہوا کہ کیا ضرور ہے کہ ہر لغزش پر کوئی نہ کوئی اطلاع بھی کر دیا کرے، اس لئے یہ اہتمام فرمایا کہ علمی و عملی لحاظ سے ایسے معتمد علماء کا انتخاب فرما کر جو نہ حضرت کی مروت و رعایت کریں نہ کوئی عناد و عداوت ہو یہ خدمت ان کے سپرد فرمائی۔ اپنی سوانح حیات کی نسبت فرمایا کہ چونکہ محبت میں اکثر غیر واقعی مدائح مشہور کر دیئے جاتے ہیں، اس لئے میں اپنی سوانح لکھانا پسند نہیں کرتا۔ اگر کسی کو بہت ہی شوق و بیتابی ہو اور دوسرے اہل تدین و تحقیق بھی اجازت دیں تو روایت میں احتیاط شدید کو واجب سمجھنا چاہیئے ورنہ میں بری ہوتا ہوں۔ (۱)

دوسرا عقد فرمایا تو عدل کا اتنا التزام و لحاظ تھا کہ کسی کے (غالباً بڑی پیرانی صاحبہ ہی کے) اس کہنے پر کہ آپ نے نکاح ثانی کا دروازہ کھول دیا، فرمایا کہ نہیں میں نے تو بند کر دیا، کیونکہ جب لوگ دیکھیں گے کہ اس میں عدل کی اتنی رعایت کرنی پڑے گی تو کیا ہمت ہوگی۔ اس عدل کے اہتمام کی انتہا یہ تھی کہ ایک کی باری میں دوسری کا خیال لانا بھی

۱۔ اشرف السوانح حصہ سوم ص ۴۷

۱۔ اشرف السوانح حصہ سوم ص ۱۱

خلاف عدل خیال فرماتے کہ جس کی باری ہے اس کی طرف توجہ میں کمی ہوگی جو حق تلفی ہے۔ بھلا یہاں تک ذہن بھی کس کا جا سکتا ہے۔ سوا اس کے جو اپنے قلب کی ہر ہر جنبش کی نگرانی کرتا اور ہمہ وقت اپنے کو حق تعالیٰ کے حضور میں پاتا اور اس کو حاضر و ناظر جانتا ہو۔ عقد ثانی کے بعد اپنے کپڑے تک گھر کے بجائے خانقاہ میں اس لئے رکھتے کہ ایک گھر میں رکھیں گے تو دوسرے کو شکایت ہوگی کہ ہمارے ساتھ اتنی خصوصیت نہیں۔ ہر چیز دونوں گھروں میں بالکل برابر تقسیم فرماتے. جس کے لئے خانقاہ میں کانٹا لگا رکھا تھا. جس کو خود میزانِ عدل فرمایا کرتے۔" (۱)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر. جن لوگوں کو دین کا کچھ خیال ہوتا ہے. موٹا موٹا احکام میں تو خیر خود اپنی ذات تک اتباع کر بھی لیتے ہیں۔ لیکن اچھے اچھے اہل علم اور بزرگوں کو دیکھا. کہ جہاں تک امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا تعلق ہے غیروں کا کیا ذکر ہے. بھائی برادری اعزہ و اقربا بلکہ اہل و عیال تک کو روک ٹوک نہیں کرتے۔ نہ تغییر بالید سے کام لیتے ہیں کہ جن پر کچھ دباؤ ہو تو دباؤ ڈالیں. نہ زبان ہی سے کہتے ہیں حتیٰ کہ قلب میں بھی گرانی کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا جو ایمان کا آخری درجہ ہے. اور جس کا لازمی نتیجہ کم از کم یہ ہونا چاہئے کہ شرکت و تعاون سے باز رہیں۔ جس بات سے قلب میں گرانی و کراہیت ہو اس میں اتنا تو ہوتا ہی ہے کہ آدمی ہنسی خوشی شرکت نہیں کرتا۔ پھر علما اور بزرگوں میں بڑا مفسدہ یہ ہے. کہ دوسروں کے لئے وہ عملی فتویٰ بن جاتا ہے۔

سماج یا جماعت کا اثر. اس کے علاوہ عوام الناس پر براہ راست خدا و آخرت کے خوف کا اتنا دباؤ نہیں پڑتا. جتنا بھائی برادری اور جماعت کا۔ اسی لئے جن برادریوں یا جماعتی مقاطعہ کا کسی معاملہ میں دستور ہے. مشکل ہی سے اس کے لئے افراد اس پر جرات

۲۔ اشرف السوانح حصہ سوم ص ۱۰۴

کرتے ہیں۔ مقاطعہ تو الگ رہا جماعت میں جس چیز کو معیوب خیال کیا جاتا ہے اور لوگ اس سے نفرت وحقارت ظاہر کرتے ہیں، اس کی بھی آسانی سے کسی کو جرات نہیں ہوتی۔ تغییر بالید و باللسان کے نہ ہونے کی صورت میں تغییر بالقلب کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ جب قلبی نفرت ہوگی تو عملی شرکت نہ ہوگی اور اس عدم شرکت و بیزاری کا اثر حسب تعلق لوگوں پر پڑے گا، اور ان کو اپنا عمل بدلنا پڑے گا، جو پہلے اگر محض مروت و ناخوشی سے بھی ہو، تو بعد کو عادت ہو کر ہنسی خوشی ہو جائے گا۔ البتہ جن برائیوں پر جماعت میں کوئی نکیر نہیں ہوتی بلکہ الٹے مستحسن خیال کی جاتی ہیں، ان کے لوگ بے دھڑک مرتکب ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال سکھوں کے بال ہیں کہ مشکل ہی سے کوئی ان کو ہاتھ لگانے کی ہمت کر سکتا ہے۔ بخلاف مسلمانوں کے کہ ان کی داڑھی بھی ایک دینی شعار ہے۔ لیکن جماعت میں چونکہ اس پر کوئی نکیر و نفرت نہیں رہی بلکہ الٹے منڈانا ہی فیشن بن گیا ہے، اس لئے علما و مشائخ سب کے گھروں میں بے دھڑک استرا چلتا رہتا ہے اور باپ بیٹے تک کو نہیں ٹوکتا۔ داڑھی کس شمار میں ہے نماز روزہ تک کے لئے نکیر نہیں ہوتی۔ بلکہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ نام نہاد علما و مشائخ کو تو "فیشن ایبل اپ ٹوڈیٹ" داماد ہی کی فکر میں اکثر دیکھا (یغفر اللہ لنا ولہم) حالانکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ساری انسانیت (کافۃ للناس) کے لئے بشیر و نذیر بنائے گئے تھے اپنے اہل و عیال اور بھائی برادری کو امر بالصلوٰۃ اور انذار کا خاص حکم تھا (وامر اہلک بالصلوٰۃ وانذر عشیر تک الاقربین) اسی طرح سارے مسلمانوں کو بھی خاص حکم ہے کہ خود اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ (یا ایہا الذین امنو قوا انفسکم واہلیکم نارا) یہ تو دین و شریعت کیا سراسر حماقت ہوگی کہ خود ہمارے گھر میں آگ لگی ہو اور ہم اپنے اہل و عیال کو چھوڑ کر ایران و توران میں جو آگ لگی ہے اس کو بجھانے کی فکر میں لگے ہوں۔

قابل توجہ احادیث۔ مثلاً "حضور نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے جو نبی بھی آیا اس کے حواری و اصحاب ایسے ہوتے تھے جو اس کے طریقہ پر چلتے اور اس کے امر کی اقتدا کرتے تھے پھر ان کے جانشین ایسے لوگ ہوتے کہ جو کچھ کہتے خود نہ کرتے اور اگر کرتے تو دوسروں کو اس کا حکم نہ کرتے۔ پس جو شخص ایسے لوگوں سے ہاتھ سے لڑا وہ مومن ہے، جو زبان سے لڑا وہ بھی مومن، جو قلب سے لڑا (یعنی دل میں برا جانا) وہ بھی مومن، باقی جو قلب سے

بھی نہ لڑا اس کے اندر رائی برابر بھی ایمان نہیں (مسلم شریف)۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں سب سے پہلی خرابی جو پیدا ہوئی یہ تھی کہ ایک شخص دوسرے سے ملتا تو کہتا کہ خدا سے ڈرو فلاں کام چھوڑو یہ تمہارے لئے جائز نہیں۔ پھر جب دوسرے دن ملاقات ہوتی تو اس کو علیٰ حالہ اسی کام میں مبتلا پاتا۔ پھر بھی نہ اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑتا نہ بیٹھنا اٹھنا۔ جب یہ حال ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے سبھوں کے دل ویسے ہی کر ڈالے۔ اس کے ساتھ حضورؐ نے یہ آیت پڑھی کہ لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علی لسان داود و عیسیٰ ابن مریم .... لکن کثیرا منہم فاسقون" جس کا ترجمہ یہ ہے کہ نبی اسرائیل کے ان لوگوں پر داوٗد و عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی جنہوں نے کفر کیا تھا اور یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور اس میں حد سے گزر گئے کہ آپس میں ایک دوسرے کو بڑی باتوں سے روک ٹوک تک نہ کرتے تھے .... " پھر حضورؐ نے فرمایا کہ دیکھو یاد رکھو اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم ضرور ضرور لوگوں کی بھلائی کا حکم کرتے اور برائی سے روکتے رہو. ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اس کو حق کی طرف پھیر دو اور حق ہی پر اس کو قائم رکھو ورنہ تمہارے دلوں کو بھی اللہ تعالیٰ ویسا ہی کر دے گا. اور تم کو بھی اسی طرح ملعون کر دے گا جیسا کہ ان کو کیا (بحوالہ ابو داود و ترمذی) اور ترمذی شریف کے الفاظ یہ ہیں کہ جب بنی اسرائیل معاصی میں مبتلا ہوئے تو ان کے علما نے روک ٹوک کی لیکن وہ نہیں رکے پھر بھی یہ علما ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور کھاتے پیتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے سب کے دلوں کو ویسا ہی کر دیا اور داوٗد و عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ان کو ملعون بنا دیا یہ اس لئے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور اس میں حد سے گزر گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ لگائے بیٹھے تھے یہ فرما کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ بس تم بھی جب تک لوگوں کو حق پر آمادہ و مجبور کرتے رہو گے (ورنہ ویسے ہی مردود بارگاہ حق ہو جاوٗ گے!)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ لوگ کسی کو ظلم و تعدی کرتے دیکھ کر اگر ہاتھ نہ پکڑ لیں

تو اندیشہ ہے کہ سب اللہ تعالیٰ کے عذاب میں آ جائیں گے (ابو داؤد و ترمذی و نسائی۔) (۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بات کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا ہے. اس کے خلاف کیسے ہو سکتا ہے۔ اور مسلمانوں میں ہر طرح کے مفاسد و معاصی کے پھیل جانے کا بڑا سبب یہی معلوم ہوتا ہے. کہ ان کے عوام و خواص سب میں معاصی سے نفرت و بیزاری کا اظہار اور روک ٹوک کہنا چاہئے کہ بالکل ہی ختم ہو گئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ رحم فرمائے ورنہ بظاہر وہی بنی اسرائیل والی ملعونیت اور قہر و عتاب آنکھوں کے سامنے ہے۔ کیا غضب ہے کہ جو لوگ روز رات کو نماز (وتر) میں پڑھتے بلکہ اللہ تعالیٰ سے عہد کرتے ہیں کہ "ہم الگ کرتے اور چھوڑتے ہیں اس شخص کو جو تیری نافرمانی کرے (نخلع و نترک من یفجرک) وہ صبح ہی اس کو بھول جاتے ہیں بلکہ سمجھ کچھ ایسی الٹ گئی ہے کہ ایران و توران کے مسلمانوں کا تو غم ہوتا ہے. وہ بھی آج کل کی نام نہاد و قومی و سیاسی تباہی کا. اور اس کے لئے بہت سے لوگ جان و مال کی بازی لگاتے اور حکومت کے مقابلہ تک کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن خود اپنے اہل و عیال اعزہ و اقربا کے دین و آخرت کی بربادی کا اتنا درد بھی نہیں ہوتا. کہ اپنے دباؤ سے کام لیں یا زبان ہی سے کچھ روک ٹوک کرتے رہیں یا کم از کم شرکت اور تعاون علی الاثم سے باز رہیں اور ہجر جمیل ہی اختیار کریں۔

حضرت کا مسلک مواخذہ و مقاطعہ. حضرت علیہ الرحمہ نے نہ صرف سینکڑوں ہزاروں وعظوں اور کتابوں کے ذریعہ عقائد و عبادات معاملات اخلاق و معاشرت غرض اسلامی زندگی کے ہر ہر شعبہ کے اصول و فروع کے متعلق عام خطاب سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی خدمات آخر دم تک انجام دیں، بلکہ اپنے تعلق رکھنے والوں کی ہمیشہ روک ٹوک اور باز پرس جاری رہی جس میں ڈانٹ ڈپٹ اخراج و ترک کلام وغیرہ کے علاوہ کبھی کبھی ضربی تادیب تک سے کام لیتے البتہ ہر شے حدود کے اندر اور محل و قوع سے ہوتی۔ اولاد تو

۱۔ یہ سب روایتیں ریاض الصالحین باب امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے نقل کی گئی ہیں۔

تھی نہیں. لیکن دونوں گھروں (ازواج محرمات) کے ساتھ معاشرت میں انتہائی رعایتوں کے باوجود امرونہی کے ادنیٰ موقع پر بھی رعایت نہ فرمائی جاتی۔ وفات سے چند ماہ قبل جب یہ احقر حاضر ہوا تو علالت کا زمانہ تھا. خانقاہ میں پابندی کے ساتھ تشریف آوری نہ ہوتی تھی۔ بعض خادموں کو آستانہ ہی پر یاد فرمالیا جاتا. اور زنانہ و مردانہ کے درمیان ایک پردہ پڑا رہتا اس دوران میں ایسے بعض مواقع کا تجربہ ہوا۔ مثلاً ایک دن کوئی ذرا سی چیز جو چمچے میں تھی چکھ کر واپس فرما دی۔ تھوڑی دیر کے بعد دریافت فرمایا کہ اس کو کیا کیا گیا۔ پردہ سے حضرت مخدومہ محترمہ (چھوٹی پیرانی صاحبہ) مدظلہا نے عرض کیا کہ پھینک دیا۔ اس پر کسی قدر تغیر کے ساتھ مواخذہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت تھی اس کو کیوں ضائع کیا۔ طوطا ہی (جو پلا ہوا تھا) کھالیتا۔ یہ ادنیٰ مثال ہی اس اندازہ کے لئے کافی ہے. کہ اور چھوٹی بڑی کوتاہیوں پر کیسی روک ٹوک فرماتے ہوں گے۔ قریب سے قریب اعزہ کے ہاں بھی اگر شادی بیاہ وغیرہ کسی تقریب میں منکرات و بدعات کا دخل ہوتا تو شریک فرمانا کیسا شرکت کا شبہ تک لوگوں کو نہ ہونے دیتے۔ علاتی ہمشیرہ کی شادی کا واقعہ خود حضرت کی زبان سے ذرا تفصیل سے سنئے۔ فرمایا کہ

> "اس میں سب مروجہ رسوم ہوئی تھیں۔ قصہ یہ ہے کہ اس کی والدہ کو عورتوں نے بہکایا اور یہ سمجھایا کہ تمہاری ایک ہی بچی ہے دل کھول کر شادی کرو باقی اگر یہ اندیشہ ہے کہ وہ (یعنی میں) شرکت نہ کرے گا (۱) تو نکاح میں شرکت ہو ہی جائے گی۔ اور جن رسموں کو برا کہتے ہیں ان میں نہ شریک ہوں گے۔ نکاح تو سنت ہے اس میں ضرور شریک ہوں گے۔ والدہ بیچاری بہکانے میں آ گئیں۔ برات آنے کا دن جمعہ تھا۔ میں نے بھینسائی (ایک گاؤں) والوں سے کہلا بھیجا کہ جب جمعہ پڑھتے آؤ ایک بہلی لیتے آنا. میں

۱۔ بہت سے لوگ اس کو کافی خیال کرتے ہیں کہ بھائی اور بیہودگیوں میں شرکت نہ کرو صرف نکاح میں شریک ہو جاؤ کیا مضائقہ۔

بعد جمعہ تمہارے ہاں آؤں گا۔ میں نے جمعہ کی نماز جامع مسجد میں پڑھی اور باہر باہر بہلی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ یہاں گھر والوں تک کو خبر نہ کی۔ یہی خیال رہا سب کو کہ ہو گا کہ کہیں یہیں مسجد وغیرہ میں۔ مغرب کے بعد نکاح پڑھانے کے لئے تلاش ہوئی میں نہ ملا تو بھائی صاحب نے مختلف اطراف مین آدمی بھیجے۔

"ایک آدمی بھینسائی بھی آیا۔ میں عشاء کی نماز پڑھ کر لیٹ گیا تھا۔ وہ آدمی مجھے ملا میں نے کہا جا کر کہہ دینا میں زندہ ہوں اطمینان رکھو اور اگر اوروں پر اختیار نہ تھا تو اپنے نفس پر تو اختیار تھا خود اپنے کو بچالیا۔ صبح کو انشاء اللہ تعالیٰ آؤں گا۔ صبح کو بھی اس خیال سے دیر کر کے چلا کہ ایک براتی کی بھی صورت نہ دیکھوں۔ پھر تو میری شرکت نہ کرنے کی وجہ سے سارے خاندان نے توبہ کی کہ بڑی واہیات ہوئی اب آئندہ کبھی ایسا نہ کریں گے۔ جب سے اللہ کا فضل ہے خاندان میں کبھی کوئی رسم نہیں ہوتی۔ گانوں والوں کا خیال سنئے۔ یہاں سے بھینسائی دو سو روپیہ کا گھی خریدنے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ ہم لوگوں کو خیال ہوا کہ جب مولویوں کے گھر دو سو روپیہ کا گھی ایک گاؤں سے جا رہا ہے اور دوسری جگہ سے بھی ضرور آیا ہو گا. جس گھی کا اس قدر صرفہ ہے اور اجناس میں نہ معلوم کس قدر صرفہ ہو گا. تو اب ہم بھی دل کھول کر شادیاں کیا کریں گے. چاہے گھر کی جائیدادیں فروخت ہو جائیں۔ سو اگر اس وقت آپ یہاں نہ آتے تو ہمارے یہاں بھی شادیوں میں ایسا ہی ہوتا جس کا انجام گھر کی بربادی ہوتی۔ آپ نے آکر ہمارا گاؤں بچالیا. اور ایسا ہو گیا جیسے اپنے پاس سے گاؤں ہم کو دیا۔ واقعی اگر میں وہاں نہ جاتا اور یہاں پر رہتا گو شریک نہ ہوتا. مگر کسے معلوم ہوتا کہ شرکت کی یا نہیں عوام پر بہت برا اثر ہوتا۔ اب یہاں پر قصبہ میں یہ حالت ہے کہ کسی کو ان رسوم کی پابندی نہیں رہی۔ اب کوئی صرف بھی زائد کرے تو اس کا نام نہیں کرتے کچھ ملامت نہیں۔ رسوم مباحہ کا یہی درجہ ہے"۔

اس ایک واقعہ ہی سے کتنے سبق ملتے ہیں کہ بھائی برادری کے منکرات میں بھی شرکت سے کم از کم آدمی خود اپنے کو تو ہر حال میں بچا ہی لے سکتا ہے۔ اور اگر وہ اعتبار سے بھی صاحب وجاہت ہے اور کچھ اثر رکھتا ہے. جس کی شرکت کی لوگوں کو خواہش ہوے تو اگر کچھ نہیں اس کے خیال ہی سے لوگوں کو باز رہنا پڑتا ہے۔ پھر اگر وہ مقتدا کی حیثیت رکھتا ہے. تو اس کی شرکت کا مفسدہ کتنا متعدی ہو جاتا ہے کیا اس کی جواب دہی نہ ہو گی۔ حضرت کی احتیاط و حکمت دیکھئے کہ شرکت تو کیا فرماتے شبہ شرکت کا بھی موقع نہ دیا۔ اب یہ احقر کیا عرض کرے کہ کیسے کیسے علماء و مشائخ بلکہ واقعی مقدس و متقی اشخاص تک کو ان امور میں کیسا بے احتیاط بلکہ بے حس دیکھا جاتا ہے۔ اور شرعی تقریب کے معنی اب ان حضرات ہی نے یہ بنا دیئے ہیں کہ بس زیادہ سے زیادہ ناچ گانا نہ ہو۔ باقی دعوت اور کھانے وغیرہ میں چاہے جتنا فخر و مباہات اور فضولیات کا مظاہرہ کیا ہو. بلکہ اس میں دوسروں کی روک ٹوک یا ان کے ہاں عدم شرکت کا ذکر کیا. خود اپنی اولاد کی تقریبات تک میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے لیکن حضرت نے خود اپنے چھوٹے بھائی (مخدومی محمد مظہر صاحب مرحوم) کی شادی فرمائی تو فرماتے ہیں کہ

> "بالکل سادی ہوئی تھی۔ صرف ایک بہلی تھی، اس میں ایک میں ایک مظہر ایک مولوی شبیر علی جو اس وقت بچے تھے ان کو اس لئے ساتھ لے لیا تھا کہ شاید گھر میں آنے جانے یا کسی بات کے کہلانے کی ضرورت ہو۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہاں بھی گڑ بڑ نہیں۔ صرف خاص خاص عزیزوں کی دعوت ہے جن کی تعداد چھ سات سے زائد نہیں۔ مگر یہ لوگ بھی خفا تھے محض اس وجہ سے کہ رسوم کیوں نہیں کی گئیں۔ مجھ کو جب معلوم ہوا تو میں نے لڑکی والوں سے کہہ دیا کہ صاف کہہ دو اگر جی چاہے شریک ہو جائیں ورنہ اپنے گھر بیٹھیں ہمیں ضرورت نہیں۔ ان لوگوں نے دعوت ہی نہ قبول کی تھی۔ مگر میرا یہ صفائی کا جواب سن کر سیدھے ہو گئے اور دسترخوان پر ہاتھ دھو کر سب آ بیٹھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لڑکی کی ماں اس اختصار سے بڑی شکر گزار ہوئیں اور کہنے لگیں اگر زیادہ بکھیڑا ہوتا تو ایک سونے کا ہار میرے پاس تھا وہ

بھی جاتا اور قرض لینا پڑتا۔ یہ لڑکی کی ماں میرے بڑے گھر میں کی خالہ ہوتی تھیں، اس لئے میں بھی عرفاان کو خالہ ہی کہتا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ لڑکی کو رخصت کس وقت کرو گی۔ کہنے لگے بھائی صبح کو جلدی تو رخصت نہیں ہو سکتی اس لئے جلدی میں نہ کچھ کھاؤ گے نہ کچھ ٹھہرو گے۔ میں نے کہا کہ کھانا تو پکا کر ساتھ کر دو جہاں بھوک لگے گی کھالیں گے، اور ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ جب انہوں نے پھر اپنی رائے کا اعادہ کیا تب میں نے کہا بہت اچھا۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر دیر سے رخصت کیا تو نماز ظہر کا وقت راستہ میں ہو گا، اور میں اپنے اہتمام میں لڑکی کی نماز قضا ہونے نہ دوں گا اور بلاعذر بہلی میں نماز ہو نہیں سکتی تو لڑکی کو بہلی سے اترنا پڑے گا۔ اور یہ بھی تم سمجھتی ہو لڑکی نئی نویلی ہو گی پہنے اوڑھے اور عطر خوشبو تیل وغیرہ بھی لگائے ہو گی۔ اور یہ مشہور ہے کہ کیکر وغیرہ کے درخت پر بھتنی وغیرہ رہا کرتی ہے سو اگر کوئی بھتنی چمٹ گئی تو میں ذمہ دار نہیں۔ چونکہ عورتوں کے مذاق کی بات تھی کہنے لگیں نہ بھائی مین نہیں روکتی جب تمہارا جی چاہے جاسکتے ہو۔ میں نے کہا بعد نماز فجر صبح ہی روانہ کر دو۔ اب صبح چلنے کا وقت ہوا تو ایک رسم ہے بکھیر (نچھاور) کی دلہن کی رخصت کے وقت بستی کے اندر اندر کچھ روپیہ پیسہ کی بکھیر کی جاتی ہے۔ میں نے یہ کیا کہ کچھ روپیہ مساکین کو تقسیم کر دیا اور کچھ مساجد میں دیا، محض اس لئے کہ لوگ بخل و دناءت کا شبہ نہ کریں۔ اس سادگی کے متعلق یہ روایت سنائی کہ لوگ کہتے تھے کہ شادی اس کو کہتے ہیں، قلب کے اندر تازگی شگفتگی انشراح معلوم ہوتا ہے۔ یہ دنیا داروں نے کہا واقعی شریعت پر عمل کرنے سے ایک نور پیدا ہوتا ہے۔ اب ولیمہ کا قصہ سنئے میں نے کسی کی دعوت نہیں کی کھانا پکوا کر گھروں کو بھیج دیا۔ ایک بی بی نے کھانا واپس کر دیا کہ یہ کیسا ولیمہ میں نے کہا قبول نہیں کرتیں ان کی قسمت جانے دو۔ ان کا خیال تھا منائیں گے خوشامد کریں گے۔ مگر ہمیں ضرورت ہی کیا تھی کہ گھر سے کھلائیں اور الٹے خوشامد کریں۔ صبح کو وہی بی بی آئیں

کہنے لگیں رات کا کھانا لاؤ۔ میں نے کہا وہ رات ہی کو ختم ہو گیا یہ سن کر بڑی ہی دلگیر ہوئیں کہ میری ایسی قسمت کہاں تھی کہ ایسی برکت کا کھانا نصیب ہوتا۔ ان دنیاداروں کا دماغ یوں ہی درست ہوتا ہے اہل دین کو قدرے استغنا برتنا چاہئے۔ ان کو جتنا چمٹو وہ زیادہ اینٹھ مروڑ کرتے ہیں۔ (۱)

عہد جدید کے مصلحین: کی اصلاح بالعموم قوم ملک بلکہ ساری دنیا سے شروع ہوتی ہے۔ اور خود اپنی اپنے اہل و عیال اور بھائی برادری کی باری بارہا سرے سے آتی ہی نہیں۔ لیکن انبیائی اصلاح کا راستہ یہی ہے کہ وہ خود اپنے نفس اور اقربا سے شروع ہو کر دنیا میں اسی عملی نمونہ سے از خود پھیلتی ہے۔

غرض اوپر کے دو واقعے ہی یہ جان لینے کے لئے کافی ہیں کہ خلاف شرع باتوں کی شرکت اور تعاون علی الاثم کے باب میں حضرت والا کو کیسی شدید احتیاط تھی، جس میں عزیز و اقارب بھائی برادری کسی کی اصلا پرواہ نہ تھی۔ حدیث کے مندرجہ بالا روایات نقل کرنے کے بعد حضرت والا کے اس معمول کے ساتھ ہی ایک ملفوظ ایسا ملا۔ جو گویا ان کا بالکل ترجمہ ہے۔ جس سے راقم الحروف کو اپنے خیال میں بڑی تقویت اور کامل انشراح نصیب ہوا۔

ایک برمحل ملفوظ۔ معاصی کے سلسلہ میں فرمایا کہ بعض لوگ تو وہ ہیں جو بظاہر خود تو اعمال صالحہ کرتے اور معاصی سے بچتے ہیں۔

> ”مگر ساتھ ہی ان لوگوں کے افعال غیر مشروع و معاصی میں بھی شریک رہتے ہیں۔ جو خدا کے نافرمان ہیں، محض اس خیال سے کہ یہ دنیا ہے اس میں رہتے برادری کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے اور بعض وہ ہیں کہ شریک تو نہیں ہوتے مگر ہوتے دیکھ کر ان منکرات کرنے والوں کے افعال سے نفرت بھی نہیں ہوتی۔ ان میں شیر و شکر کی طرح ملے جلے رہتے ہیں یعنی روزانہ کھانے

۱۔ یہ دونوں واقعات الافاضات الیومیہ حصہ اول ص ۲۳۶ سے منقول ہیں۔

پینے میں ان سے پرہیز نہیں کرتے۔ حاصل یہ ہے کہ اپنے کسی برتاؤ سے ان پر اظہار نفرت نہیں کرتے. تو ایسے لوگوں کے اعتبار سے اس شبہہ کا جواب کہ غیر عاصیوں پر کیوں مصائب آتے ہیں یہ ہے کہ ان کی شرکت یا سکوت خود معصیت ہے. تو مصائب میں ان کا ابتلا بھی معصیت ہی کے سبب ہوا۔

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث شریف میں امم سابقہ کا قصہ بیان فرمایا ہے کہ جبریل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فلاں بستی کو الٹ دو عرض کیا کہ اے اللہ فلاں شخص اس بستی میں ایسا ہے کہ اس نے کبھی آپ کی کوئی نافرمانی نہیں کی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں مع اس کے الٹ دو وہ بھی ان ہی میں سے ہے. اس لئے کہ ہماری نافرمانی دیکھتا تھا اور کبھی اس کی تیوری پر بل بھی نہ پڑتا تھا۔ اور اس کی مثال تو دنیا میں بھی موجود ہے جو شخص حکومت و سلطنت کے باغیوں سے میل جول رکھتا ہے یا ان کی امداد دیتا ہے وہ شخص بھی باغیوں میں شمار ہوتا ہے۔ ہم جس کے وفادار ہیں وفاداری اسی وقت تک ہے کہ اس کے دشمنوں سے بھی نہ ملیں۔ ورنہ ایسے شخص کو وفادار ہی نہ کہیں گے۔ یہ اجتماع ضدین ہے

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں
ایں خیال است و محال است و جنوں" (۱)

فہم و فراست. عقل و حکمت اور ہر طرح کے علمی و عملی کمالات کی یہ نادر جامعیت بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ آج جس طرح مسلمانوں کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی مشکل ہی سے دینی خلل و فساد سے خالی رہا ہو گا. اسی طرح آج کی امت محمدیہؐ کے دین کی بجمیع اجزاء تجدید و اصلاح کے لئے ایسی ہی جامع الصفات جامع المجددین ذات درکار تھی۔

۱۔ الافاضات حصہ دوم ص ۸

"اصلاحی و تجدیدی جامعیت"

حضرات انبیاء علیہم السلام کو ان کی نبوت کے لئے دلائل و آیات ہمیشہ ان کے زمانہ کے مذاق اور مطالبات کے مناسب عطا ہوتے رہے۔ حضرت خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سب سے بڑا معجزہ ذالک الکتاب اور اس کی آیات و تعلیمات کا عطا فرمایا گیا۔ علیم و حکیم کے علم و حکمت نے نبوت ختم فرمادی. اب تا قیامت سارا زمانہ نبوت محمدیہ ہی کے دور دورہ کا زمانہ ہے۔ اور اس زمانہ کی ایک بہت بڑی نمایاں خصوصیت علوم و فنون کی کتابوں اور کتب خانوں کا زور ہے۔ بات بات پر کتابوں کا انبار لگ جاتا ہے۔ انسان کی ظاہری و باطنی جسمانی و ذہنی مادی و اخلاقی انفرادی و اجتماعی زندگی کے سارے شعبوں پر سینکڑوں ہزاروں کتابیں اور کتب خانے فراہم ہو گئے ہیں۔ جو شخص جس چیز کی نسبت بھی کچھ جاننا چاہتا ہے کتابوں کی طلب پیدا ہوتی ہے۔ پڑھا لکھا ہونا ہر کس و ناکس کے لوازم حیات میں داخل ہوتا جارہا ہے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی دین خاتم الادیان ہونے کا مدعی ہو اور پھر اس کی اصل تعلیمات لفظاً و معنیً "ذالک الکتاب" میں جوں کی توں محفوظ نہ ہوں اور پھر ان تعلیمات کی تفہیم و تعمیم تجدید و اصلاح کتابوں ہی کے ذریعہ نہ ہوتی رہے. تو اس دین کے قائم و باقی اور دور و نزدیک ہر کس و ناکس تک پہنچنے اور پہنچانے کی کیا صورت۔ البتہ یہ کتابیں ہر کس ناکس کے قلم کی نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ جس طرح ہر علم و فن کی معتبر و مستند کتابیں وہی ہوتی ہیں جو اس علم و فن کی خصوصی مہارت رکھنے والوں کے قلم سے نکلی ہوں، اسی طرح دینی تعلیمات و ہدایات میں بھی خصوصی مہارت و بصیرت رکھنے والوں ہی کی کتابوں سے دین کی صحیح فہم و یافت نصیب ہو سکتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مجدد دین اور خصوصاً جامع المجددین وہی ہو سکتا ہے جس کو دین کے تمام شعبوں میں مبعوثی یا موھوبی بصیرت تامہ حاصل ہو. اور

جس کی نظر بہ حیثیت مجموعی وقت کے سارے مصالح و مفاسد پر ہو کہ جو رخنہ بھی دین میں کسی علمی یا عملی راہ سے پیدا ہو گیا ہے، اس پر جامع اطلاع کے ساتھ جامع اصلاح و تجدید کی خدمت انجام دے سکے۔

ذالک الکتاب کے مناسب حضرت کی تجدیدی کرامت:۔ یہی اصلاح و تجدیدی جامعیت ہے جو ذالک الکتاب والے دین کے جامع المجد دین کی سینکڑوں کتابوں کے ہزاروں صفحات پر اصلاحی و تجدیدی صورت میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور جس طرح ذالک الکتاب اس دین کے پیغمبر کا سب سے بڑا معجزہ یا سب سے بڑی برھان و آیت تھی، اسی کی اتباع میں اس کے تھانوی مجدد وقت کی کتابیں اپنی کمیت و کیفیت ہر اعتبار سے اس کی تجدیدی جامعیت کی سب سے بڑی کرامت ہیں۔ آج جو شخص بھی دین اسلام کے چہرہ کو پورے جمال و کمال کے ساتھ بالکل صاف و بے غبار جامع و کامل صورت میں از سر نو تجدید یافتہ اور تر و تازہ دیکھنا اور پانا چاہتا ہے وہ عہد حاضر کے جامع المجددین کی کتابی آیتوں کی طرف علماً و عملاً رجوع کر کے خود مشاہدہ کر سکتا ہے۔ (۱) عجیب بات ہے جس طرح ذالک الکتاب کا معجزہ رکھنے والے نے دوسرے غیر متعلق معجزات کے مطالبہ کی نسبت یہ فرمایا کہ "قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک ان اتبع الا ما یوحی الی۔" اسی طرح نبی کامل کے متبع کامل کے کلام میں بھی کثرت سے جا بجا کشف و تصرفات سے اپنی قطعاً ابتری فرمائی گئی ہے۔ اور سارا زور بس وحی یا شریعت کے احکام و اتباع پر ہے۔

آگے انشاء اللہ اسی نقطہ نظر سے اب تعلیمی و تجدیدی کارناموں پر نظر ہو گی۔ گو حضرت کے سینکڑوں مواعظ کی تعداد ہزاروں صفحات تک جاتی ہے لیکن قدرت کا اہتمام دیکھو کہ ان

۱۔ معاند کا ذکر نہیں ورنہ عناد و اعتقاد دونوں سے خالی الذہن جو صاحب علم و بصیرت ان کتابوں کے دو چار سو صفحات کا بھی توجہ سے مطالعہ کرے گا، وہ انشاء اللہ بیان بالا میں کسی سابقہ خوش اعتقادی کا ہلکا سے ہلکا رنگ بھی نہ پائے گا بلکہ نقل و بیان میں وہ بات کہاں پیدا ہو سکتی ہے، جو اصل کے مشاہدہ سے حاصل ہوتی ہے۔

کو بھی قلم بند کرا کے کتابی صورت دے دی۔ امت مسلمہ کی تیرہ سو سال سے زائد کی تاریخ میں ایک مثال بھی معلوم نہیں کہ کسی کے اتنے مواعظ کتابی صورت میں موجود و محفوظ ہوں۔

انبیائی اصلاح جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا اپنی ذات اور گھر سے شروع ہوتی ہے۔ افراد امت کی ذاتی اور گھریلو اصلاح کا دارمدار بہت زیادہ گھر والیوں کی اصلاح پر ہے۔ غور کیا جائے تو مسلمانوں کی بیشتر دینی خرابیوں اور مفاسد کی جڑیں ان کے گھروں کے اندر ہی پھیلی ملیں گی. اور وہیں سے ان مفاسد کے برگ و بار لے کر اولاد باہر آتی اور امت مسلمہ یا اسلامی سماج و جماعت کہلاتی اور بنتی ہے۔ حضرت جامع المجددین کے قلم سے اللہ تعالیٰ نے بنیادی خدمت بہشتی زیور کی صورت میں یہی لی۔ بہتیرے لوگ آج بھی حضرت کو "بہشتی زیور والے اشرف علی" ہی کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں۔ سب سے زیادہ عموم و قبول بھی اسی کتاب کو بخشا گیا۔ موافق و مخالف ہزاروں گھروں میں اس نے گھر کر لیا ہے۔ جو لوگ حضرت کے مسلک سے اختلاف رکھتے ہیں وہ بھی دیکھا گیا کہ بہشت کے اس زیور کو اپنی لڑکیوں کے جہیز میں شامل کرتے ہیں۔ خود حضرت والا کی اصلاحی ہدایات میں عورتوں ہی کو نہیں مردوں کو بھی اس کے پڑھنے پڑھانے اور ان پڑھوں کو سننے سنانے کی تعلیم و تاکید ہوتی ہے، اور اسی غرض سے بہشتی گوہر کے نام سے ایک حصہ کا اضافہ فرما کر خاص مردوں کے ضروری احکام و مسائل کی تکمیل فرما دی گئی ہے۔

تصنیف میں مصنف کا اثر:۔ تعلیم نسواں کے لئے مختلف نقطہ ہائے نظر سے کتابیں اور بھی بے شمار لکھی لکھائی گئی ہیں۔ اور زبان و انشا کے چٹخارہ کے اعتبار سے زیادہ دلچسپ بھی ہیں لیکن بس وہی کہ کسی علم و فن کی مستند اور بے خوف و خطر پڑھنے پڑھانے کی کتاب وہی ہو سکتی ہے. جو اس کے کسی کامل مہارت و بصیرت رکھنے والے کے قلم سے نکلی ہو۔ ساتھ ہی دینی مہارت و بصیرت بغیر عملی تقویٰ و طہارت کے نصیب نہیں ہوتی۔ ذالک الکتاب سے بھی ہدایت یابی کی اولین شرط تقویٰ ہی ہے (ہدی للمتقین) لہٰذا دینی کتابیں جو دراصل ذالک الکتاب ہی کی شرح و تفہیم ہوتی ہیں وہ بلا تقویٰ و طہارت کے فہم و بصیرت کے ساتھ کیسے لکھی جا سکتی ہے۔ اسی لئے دینی کتابوں میں تصنیف سے پہلے مصنف پر نظر ہونی چاہئے

اور مصنف کے خالی علم پر نہیں عمل پر بھی۔ آج کل یہ وبا بھی پھیل گئی ہے، کہ ہر کس و ناکس دینی کتابوں اور رسالوں کا مصنف بن رہا ہے، بلکہ مفسر و محدث تک، ایسی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے سے کچھ معلومات تو ہو جاتی ہیں لیکن عملی تاثر و تربیت کی خیر و برکت مفقود ہے۔ بخلاف اس کے بہشتی زیور کا جن گھروں میں پڑھنے پڑھانے کا اہتمام ہے، وہ جانتے ہیں کہ اس سے نہ صرف علمی واقفیت بلکہ عملی انقلاب رونما ہونے لگتا ہے۔ ایک بہشتی زیور پر کیا موقوف احقر کا تو اس بابرکت قلم کی ساری کتابوں کے باب میں مشترک تجربہ ہے کہ ان کو پڑھ کر بس ویسا ہی ہو جانے کا جی چاہتا ہے۔ دوسروں کو بھی جس میں نئی پرانی تعلیم کے تعلیم یافتہ وغیرہ ہر طبقہ کے لوگ شامل ہیں، ان سے جب جرح کر کے حضرت کی کتابوں کی خاص خصوصیت کو معلوم کیا تو یہی بتلایا کہ عملی تاثر بہت ہوتا ہے۔

تعلیم نسواں کی سب سے جامع کتاب:۔ اس اہم و اقدم اور خاص امتیاز سے قطع نظر کر کے بھی دینی اعتبار سے نسوانی تعلیم کے لئے اس سے جامع تر کتاب کوئی معلوم نہیں۔ اس میں صرف فقہی ابواب کے ضروری مسائل شامل نہیں، جیسا کہ بالعموم سمجھا جاتا ہے بلکہ اس کی ابتدا اردو ابجد کی تعلیم سے ہوتی ہے۔ اور قرآن مجید کے بعد ہی شروع کر دی جا سکتی ہے۔ ایک پورا حصہ سبق آموزی ہمت افزائی اور دلچسپی کے لئے نیک بیبیوں کے حالات کا شریک ہے۔ عبادات و معاملات وغیرہ کے فقہی احکام کے ساتھ ساتھ نماز روزہ نکاح کسب حلال وغیرہ کے فضائل کا بھی بیان قرآن و حدیث سے ہے، فضائل کے علاوہ بھی درمیان درمیان میں یا ضمیموں میں مناسب باتوں کا اضافہ مثلاً نکاح کے سلسلہ میں شوہر کے ساتھ نباہ کی ہدایات، اولاد کی پرورش ماں باپ ساس سسر اعزہ اقربا، عام مسلمانوں اور عام انسانوں کے حقوق کا ضروری ذکر۔ یہ سب وہ اصلاحی باتیں ہیں جن سے غفلت کی بدولت مسلمانوں کی خانگی زندگی دینی دنیوی برکتوں اور راحتوں سے یکسر محروم ہو گئی ہے۔

گھریلو زندگی کی فلاح و مسرت کے لئے سب سے مقدم بی بی میاں کا باہمی خوشگوار اور محبت کا تعلق ہے، اس کے لئے بی بی کو کن باتوں کا لحاظ رکھنا چاہئے۔

"شوہر کی حیثیت سے زائد خرچ نہ مانگو جو کچھ جڑے ملے اپنا گھر سمجھ کر چٹنی روٹی کھا کر بسر کرو .... اگر میاں امیر ہو تب بھی جہاں تک ہو سکے خود کبھی کسی بات کی فرمائش نہ کرو۔ فرمائش کرنے سے آدمی نظروں سے گر جاتا ہے۔ بات ہیٹی ہو جاتی ہے کسی بات پر ضد اور ہٹ نہ کرو۔ اگر میاں کے ہاں تکلیف سے گزرے کبھی زبان پر نہ لاؤ ہمیشہ خوشی ظاہر کرتی رہو۔ خاوند کی ناشکری نہ کرو۔ یوں نہ کہو کہ اس موے اجڑے گھر میں آکر میں نے دیکھا کیا۔ ایسی باتوں سے دل میں پھر جگہ نہیں رہتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے دوزخ میں عورتیں بہت دیکھیں۔ کہ یہ اوروں پر لعنت بہت کیا کرتی ہیں۔ اور اپنے خاوند کی ناشکری بہت کرتی ہیں، تو خیال کرو کہ یہ ناشکری کتنی بری چیز ہے اور کسی پر لعنت کرنا یوں کہنا کہ فلاں پر خدا کی مار خدا کی پھٹکار منہ پر لعنت برس رہی ہے، یہ باتیں سب بری ہیں۔ اگر میاں کے ماں باپ زندہ ہوں اور روپیہ پیسہ سب ان ہی کے ہاتھ پر رکھے تو کچھ برا نہ مانو۔ جب تک ساس سسر زندہ ہیں ان کی خدمت و تابعداری کو فرض جانو اگر سسرال میں کوئی بات بری لگے تو میکے میں آکر چغلی نہ کھاؤ، نہ سسرال کی ذرا ذرا سی بات آکر ماں سے کہو۔ اور ماؤں کا خود کھود کھود کر پوچھنا بڑی بری بات ہے۔ شوہر کی چیزوں کو خوب سلیقہ اور تمیز سے رکھو۔ جو چیزیں تمہارے پاس رکھی ہوں ان کو حفاظت سے رکھو۔ کسی کام مین حیلہ حوالہ نہ کرو جھوٹی باتیں نہ بناؤ اس سے اعتبار جاتا رہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔"

یہ سب ایسی باتیں ہیں کہ مسلمانوں کے ہزاروں لاکھوں گھروں میں بھی شاید ایک آدھ ہی میں ان پر عمل ہو۔ اور کیا یہ ہزاروں لاکھوں کے زیور سے قیمتی زیور نہیں!

اس طرح اولاد کی پرورش کے بارے میں ہے کہ

"نیک بخت دیندار عورت کا دودھ پلائیں۔ دودھ کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ عورتوں کی عادت ہے، کہ بچوں کو کہیں سپاہی سے ڈراتی ہیں کہیں اور کسی

ڈراؤنی چیز سے سو یہ بری بات ہے. اس سے بچے کا دل کمزور ہو جاتا ہے۔
اس کے دودھ پلانے اور کھانا کھلانے کے لئے وقت مقرر رکھو کہ وہ
تندرست رہے۔ اس کو صاف ستھرا رکھو۔ لیکن بہت بناؤ سنگار مت کرو۔
بچوں کے ہاتھ سے غریبوں کو کھانا کپڑا پیسہ اور ایسی چیزیں دلواؤ. اسی طرح
بھائی بہنوں یا اور بچوں کو اس کے ہاتھ سے تقسیم کرایا کرو تاکہ سخاوت کی
عادت ہو۔ مگر یاد رکھو کہ خود اپنی چیزیں ان کے ہاتھ سے دلوایا کرو جو چیز
شروع سے خود ان کی نہ ہو اس کا دلوانا درست نہیں۔ غصہ جھوٹ۔
لالچ۔ چوری۔ چغلی وغیرہ سے ان کو نفرت دلاتی رہو روکو اور تنبیہ کرو۔
اگر کوئی چیز توڑ پھوڑ دے یا کسی کو مارے پیٹے مناسب سزا دو۔ بہت سویرے
مت سونے دو۔ سویرے جاگنے کی عادت ڈالو۔ جب سات برس کی عمر ہو
جائے نماز کی عادت ڈالو جہاں تک ہو سکے دیندار استاد سے پڑھاؤ۔ اس کی
عادت ڈالو. کہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کریں۔ اپاہج اور سست نہ ہو جائیں۔
رات کو اپنا بچھونا اپنے ہاتھ سے بچھائیں صبح سویرے اٹھ کر تہہ کر دیں۔
کپڑوں کی گٹھری اپنے انتظام میں رکھیں۔ کوئی کام چھپا کر مت کرنے دو۔
کھیل ہو یا کھانا یا اور کوئی چیز۔ جو کام چھپا کر کرے سمجھ جاؤ کہ اس کو وہ برا
سمجھتا ہے سو اگر وہ برا ہے تو چھوڑاؤ اور اچھا ہے تو کہو سامنے کرے۔ کوئی
کام محنت کا اس کے ذمہ کرو جس سے صحت و ہمت رہے۔ مثلاً
لڑکوں کے لئے ورزش یا ایک آدھ میل چلنا اور لڑکیوں کے لئے چکی یا چرخہ
چلانا اس میں یہ فائدہ بھی ہے کہ ان کاموں کو عیب نہ جانیں گی۔ عاجزی کی
عادت ڈالو زبان سے چال سے برتاؤ سے شیخی نہ بگھارنے پاوے یہاں تک
کہ اپنے ہم عمر بچوں میں بیٹھ کر اپنے کپڑوں مکان خاندان یا کتاب قلم
دوات تک کی تعریف نہ کرنے پاوے۔"

دیکھتے ہو ایک ہمہ گیر مجدد و مصلح کی گھر کے اندر تک کی اصلاح طلب چھوٹی بڑی چیزوں
پر کہاں کہاں نظر جاتی ہے۔

اس کے بعد دو حصے یعنی چھٹا اور ساتواں سرتا سر اصلاح و تجدید ہی سے متعلق ہیں۔ چھٹے میں پیدائش سے لے کر موت تک جو طرح طرح کی خرافات رسمیں رائج ہو گئی ہیں اور جو منکرات و بدعات سے لے کر مشرکانہ حدود تک پہنچ جاتی ہیں، ان کی اصلاح ہے۔ اس ذیل میں دینی مفاسد و معاصی کے ساتھ ساتھ ان دنیاوی خرابیوں اور بربادیوں کو بھی واضح کیا گیا ہے، جو ایسی بے ہودہ رسوم کا لازمہ ہیں۔ اس سلسلہ میں بھی بہت سی ایسی چیزیں ملتی ہیں، جن پر عام علماء و مصلحین کی بالعموم نظر نہیں جاتی۔ مثلاً تقریبات کے موقع پر یا یوں بھی مستورات کا عام رشتہ داروں یا بھائی برادری میں ہر جگہ بے تکلف چلے جانا اس کو کون برا یا قابل اصلاح جانتا ہے۔ لیکن ارشاد ہے کہ

عورتوں کی بے قیدی: عورتوں کا اپنے گھر سے نکلنا اور کہیں آنا جانا بہت سی خرابیوں کی وجہ سے کسی طرح درست نہیں۔ پس اتنی اجازت ہے کہ کبھی اپنے ماں باپ کو دیکھنے چلی جایا کریں۔ ماں باپ کے علاوہ اور محرم رشتہ داروں کو دیکھنے جانا درست ہے مگر سال بھر میں فقط ایک آدھ دفعہ۔ پس اس کے سوا اور کہیں بے احتیاطی سے جانا جس طرح عام دستور ہے جائز نہیں۔ نہ رشتہ دار کے ہاں نہ کسی اور کے ہاں۔ نہ بیاہ شادی میں نہ غمی میں۔ نہ بیمار پرسی میں۔ نہ مبارک باد دینے میں، نہ بری برات کے موقع پر۔ بلکہ بیاہ برات میں جب کسی تقریب کی وجہ سے محفل و مجمع ہو تو اپنے محرم رشتہ داروں کے گھر بھی جانا درست نہیں۔ اگر شوہر کی اجازت سے گئی تو وہ بھی گنہگار ہوا اور یہ بھی گنہگار ہوئی۔"

(ص ۲۴)

پھر ارشاد ہے کہ

"افسوس اس حکم پر ہندوستان بھر میں کہیں عمل نہیں بلکہ اس کو ناجائز ہی نہیں سمجھتے بالکل جائز خیال کر رکھا ہے حالانکہ اس کی بدولت یہ ساری خرابیاں ہیں۔ غرض اب معلوم ہو جانے کے بعد بالکل چھوڑ دینا چاہئے یہ تو

شریعت کا حکم تھا اب آگے اس کی برائیاں اور خرابیاں سنو۔ " (۱)

"جب خبر ہوئی کہ فلاں گھر فلاں تقریب ہے. تو ہر بی بی کو نئے اور قیمتی جوڑے کی فکر ہوتی ہے۔ کبھی خاوند سے فرمائش ہوتی ہے خود بزاز کو بلا کر دروازہ پر اس سے ادھار لیا جاتا ہے. یا سودی قرض لے کر خریدا جاتا ہے یہ جوڑا محض فخر اور دکھاوے کے لئے بنتا ہے. جس کے لئے حدیث میں ہے کہ ایسے شخص کو قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنایا جائے گا. ایک گناہ تو یہ ہوا۔ پھر اس غرض سے مال کا خرچ کرنا فضول خرچی ہے. یہ دوسرا گناہ ہوا۔ خاوند سے اس کی وسعت سے زائد فرمائش کرنا اس کو ایذا پہنچانا ہے یہ تیسرا گناہ ہوا۔ بزاز سے بلا ضرورت نامحرم سے باتیں کرنا بلکہ اکثر لینے دینے کے واسطے آدھا آدھا ہاتھ جس میں چوڑی مہندی سب ہی کچھ ہوتا ہے باہر نکال دینا کس قدر غیرت و عفت کے خلاف ہے. یہ چوتھا گناہ ہوا۔ پھر اگر سودی لیا تو یہ پانچواں گناہ ہوا۔ اگر خاوند کی نیت ان بے جا فرمائشوں سے بگڑ گئی اور حرام آمدنی پر اس کی نظر پہنچی کسی کی حق تلفی کی رشوت لی. تو یہ گناہ اس بی بی کی وجہ سے ہوا اور گناہ کا سبب بننا بھی گناہ ہے یہ چھٹا گناہ ہوا.........

"یہ تو پوشاک کی تیاری تھی. اب زیور نہیں تو مانگتا تانگا پہنا جاتا ہے. اور اس کا مانگے کا ہونا ظاہر نہیں کیا جاتا. بلکہ اپنی ہی ملک ظاہر کرتی ہیں یہ ایک قسم کا

۱۔ چھوڑنا تو الگ رہا راقم الحروف کو اندیشہ ہے کہ بہتیرے "روشن خیال" عورتوں کی یہ سزائے قید کی تجویز پڑھ کر اس کتاب ہی کو نہ ہاتھ سے پھینک دیں۔ بھلا جب عورتوں کا بناؤ سنگاؤ کے ساتھ تن تنہا یا نامحرم مردوں تک کے ساتھ بے حجابانہ بازار و سیر گاہوں میں پھرنا۔ تماشوں اور نمایشوں میں اپنی نمایش کرنا. تھیٹر اور سینما میں غیر مردوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھنا. کلبوں ناچ گھروں میں بے محابا جانا. بلکہ غیروں کی بغل میں ناچنا تک سب عین روشن خیالی اور معیاری تہذیب ہے. تو جو شخص ان باتوں کو تحمل کے ساتھ صرف سن ہی لے یا عمل نہ کرے تو کم از کم برا ہی جانے. اس زمانہ کا وہ آدمی نہیں فرشتہ ہے یا پھر نئے "مہذبوں" کے نزدیک پرانا وحشی!

فریب اور جھوٹ ہے۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص ایسی چیز کا اپنا ہونا ظاہر کرے جو سچ مچ اس کی نہیں، اس کی ایسی مثال ہے، جیسے کسی نے دو کپڑے جھوٹ اور فریب کے پہن لئے۔ یعنی سر سے پاؤں تک جھوٹ ہی جھوٹ لپیٹ لیا۔ یہ نواں گناہ ہوا۔ پھر اگر زیور ایسا بھی پہنا جاتا ہے، جس کی جھنکار دور تک آئے تاکہ محفل میں جاتے ہی سب کی نگاہیں ان کے نظارے میں لگ جائیں (تہذیب نو میں زیور تو جھنکار کے نہیں ہوتے۔ مگر مطلب زیور و لباس سب کا یہی ہوتا ہے۔ کہ جہاں جائیں سب کی نظریں ان کے نظارے میں محو ہو جائیں) یہ دسواں گناہ ہوا وغیرہ وغیرہ۔

"اب جہاں گئیں وہاں مجلس جمی تو بڑا شغل یہ ہوا کہ گپیں شروع ہوئیں، اس کی شکایت اس کی غیبت، اس کی چغلی، اس پر بہتان، جو بالکل حرام اور سخت گناہ ہے۔ یہ سولھواں گناہ ہوا۔ باتوں کے درمیان درمیان ہاتھ سے پاؤں سے زبان سے ہر طرح اس کا اظہار ہوتا ہے کہ میری پوشاک و زیور پر سب کی نظر پڑے۔ یہ صاف ریا ہے، جو قرآن و حدیث میں صاف صاف حرام ہے۔ اور جس طرح اپنا سامان فخر سے دکھلاتی ہیں اسی طرح دوسروں کے کل حالات دیکھنے کی بھی کوشش ہوتی ہے پھر اگر کسی کو اپنے سے کم پایا تو اس کو حقیر و ذلیل اور اپنے کو بڑا سمجھا۔ بعض غرور پٹی تو ایسی ہوتی ہیں کہ سیدھی طرح منہ سے بات بھی نہیں کرتیں۔ یہ صریح تکبر ہے جو اٹھارہواں گناہ ہوا۔ اگر دوسروں کو اپنے سے بڑھا دیکھا تو حسد و ناشکری اور حرص اختیار کی، یہ انیسواں گناہ ہوا۔ اکثر تقریبوں کے طوفان اور ان بیہودہ مشغولیوں میں نمازیں اڑ جاتی ہیں، ورنہ وقت ضرور ہی تنگ ہو جاتا ہے۔ یہ بائیسواں گناہ ہوا۔ پھر اکثر ایک دوسرے کو دیکھ کر یا ایک دوسرے سے سن کر یہ خرافات باتیں سیکھتی ہیں۔ گناہ کا سیکھنا سکھانا دونوں گناہ ہیں یہ تیئسواں گناہ ہوا۔"

غرض اس طرح عورتوں کے بلا ضرورت کسی ایک تقریب میں جانے ہی کے سلسلہ میں

حضرت نے موٹے موٹے تئیس گناہ گنائے ہیں۔ جن کو درمیان درمیان بہت کچھ چھوڑ چھوڑ کر اور اختصار کے ساتھ اوپر پیش کیا گیا ہے۔

مگر ظاہر ہے کہ یہ سب ان کے لئے تھا، جن کو خدا اور رسول اور قرآن و حدیث کی باتوں کا کچھ خوف و خیال تھا۔ یا جن کے نزدیک خدا و رسول کی نافرمانی یا گناہ کوئی قصور تھا۔ اب تو یہ سب باتیں جہالت و دقیانوسیت کی ہیں اور کبر نمائش فخر و مباہات وغیرہ تو اب سب ترقی کے لوازم بلکہ عین ترقی و تمدن ہیں!

شادی بیاہ کی رسمیں: اس سلسلہ میں سو سے زائد رسموں کو گنا کر لکھا ہے کہ

"ان میں سے کسی میں ایک گناہ ہے کسی میں دو کسی میں چار پانچ، بعض میں بتیس تک جمع ہیں۔ اگر ہر ایک میں تین تین ہی کا اوسط رکھا جائے تو یہ شادی تین سو سے زائد شرعی حکموں کی مخالفت ہوتی ہو اس میں بھلا خیر و برکت کا کیا ذکر۔ غرض یہ سب باتیں ان مختلف گناہوں سے بھری پڑی ہیں۔ (۱) مال کا بیہودہ اڑانا۔ (۲) بیحد افتخار یعنی نمود و شان۔ (۳) بیحد پابندی۔ (۴) کافروں کی مشابہت۔ (۵) سودی یا بلا ضرورت قرض لینا۔ (۶) انعام و احسان کو زبردستی حاصل کرنا۔ (۷) بے پردگی۔ (۸) شرک اور عقیدہ کی خرابی۔ (۹) نمازوں کا قضا ہونا یا مکروہ وقت میں پڑھنا۔ (۱۰) گناہ میں مدد دینا۔ (۱۱) گناہ پر قائم و برقرار رہنا اور اس کو اچھا جاننا۔" اس کے بعد قرآن و حدیث سے ان باتوں کی مذمت کا بیان

دین میں بے دینی: ۔ بعض باتوں کو جو دین و ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے، ان میں بھی بے دینی کی اتنی رسمیں شریک کر دی گئی ہیں کہ سراسر سامان عذاب بن کر رہ گئی ہیں۔ مثلاً ایک فاتحہ یا ایصال ثواب ہی کو لو کہ اس میں گنوا کر کم از کم پندرہ مفاسد بتلائے گئے ہیں، جن میں سے بعض کفر و شرک تک پہنچے ہیں حالانکہ ایصال ثواب کی۔

"حقیقت شرع میں فقط اتنی ہے کہ کسی نے کوئی نیک کام کیا، اس پر جو کچھ ثواب اس کو ملا اپنی طرف سے وہ ثواب کسی دوسرے کو دے دیا۔ کہ یا اللہ

میرا یہ ثواب فلاں کو دے دیجئے اور پہنچا دیجئے۔ مثلاً کسی نے خدا کی راہ میں کچھ کھانا، مٹھائی یا روپیہ پیسہ کپڑا وغیرہ دیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ جو کچھ اس کا ثواب مجھ کو ملا ہے وہ فلاں کو پہنچا دیجئے۔ ایک آدھ پارہ قرآن مجید یا ایک آدھ سورت پڑھی اور اس کا ثواب بخش دیا چاہے وہ نیک کام آج ہی کیا ہو یا اس سے پہلے عمر بھر میں کبھی کیا تھا دونوں کا ثواب پہنچ جاتا ہے۔ اتنا تو شرع سے ثابت تھا اب دیکھو جاہلوں نے اس میں کیا کیا بکھیڑے شامل کئے ہیں۔

آگے ان بکھیڑوں کی تفصیل ہے، جس کا کچھ نمونہ ملاحظہ ہو کہ

"اول تھوڑی سی جگہ لیپتے ہیں، اس میں کھانا رکھتے ہیں، بعض کھانے کے ساتھ پانی اور پان بھی رکھتے ہیں پھر ایک شخص کھانے کے سامنے کچھ سورتیں پڑھتا ہے اور نام بنام مردوں کو بخشتا ہے۔ اس من گھڑت طریقے میں خرابیاں یہ ہیں (۱) بڑی خرابی یہ ہے کہ جاہلوں کا عقیدہ ہے بغیر اس طریقے کے ثواب ہی نہیں پہنچتا۔ جب تک فاتحہ نہ ہو جائے وہ کھانا کسی کو نہیں دیا جاتا کیونکہ اب تک تو ثواب پہنچا ہی نہیں۔ بعض کم علم کہتے ہیں کہ ثواب تو بغیر اس کے بھی پہنچ جاتا ہے، لیکن سورتیں اس لئے پڑھتے ہیں کہ دہرا ثواب پہنچ جائے ایک کھانے کا ایک قرآن کا۔ اگر یہی مطلب ہے تو خاص اس وقت پڑھنے کی کیا وجہ جو قرآن تم نے صبح تلاوت کیا ہے اس کو اس کے ساتھ بخش دیا ہوتا اگر کوئی اس وقت نہ پڑھے پہلے کا پڑھا ہوا ایک آدھ پارہ بخش دے یا یوں کہے کہ اچھا مٹھائی تقسیم کر دو میں پھر پڑھ کر بخش دوں گا تو کوئی نہ مانے گا۔ یا اس کھانے یا مٹھائی کے پاس نہیں کہیں دور بیٹھا بیٹھا پڑھ دے تب بھی نہیں مانتے۔ پھر اس صورت سے دوسرے سے فاتحہ کرنے کے کوئی معنی نہیں کیونکہ قرآن پڑھنے والے کا ثواب اس پڑھنے والے کو ہو گا، تو تمہاری طرف سے تو بہرحال فقط مٹھائی کا ثواب پہنچا۔ یہ اچھی زبردستی کہ جب ہم ثواب بخشیں تو کچھ نہ کچھ دوسرا بھی بخشے۔

"لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ صرف اس طرح پڑھ کر بخش دینے سے ثواب پہنچ جاتا ہے کھانا خیرات کرنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی اور بزرگ کا فاتحہ دلا کر خود کھا جاتے ہیں، گیارھویں وغیرہ کی مٹھائی اگر تقسیم بھی کرتے ہیں تو زیادہ تر فلاں نواب صاحب تحصیل دار صاحب۔ تھانیدار صاحب۔ یا دوستوں عزیزوں کو بھیجی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ سب شیرینی فقراء و مساکین کو خیرات کر دی جائے۔ (۳) ہم نے مانا کہ فاتحہ کے بعد کھانا محتاج ہی کو دے دیا۔ تو محتاج کو دینے اور کھلانے سے پہلے ثواب بخشنے کا کیا مطلب۔ تم کو تو ثواب اس وقت ملے گا جب فقیر کو دے دو یا کھلا دو۔ ابھی تم ہی کو ثواب نہیں ملا تو بیچارے مردے کو کیا بخشا۔ (۴) بعض کا یہ بھی خیال ہے کہ خود وہ چیز پہنچ جاتی ہے، چنانچہ کھانے کے ساتھ پانی اور پان اور بعض حقہ بھی رکھتے ہیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ شب برات کے فاتحہ میں ایک بڑھیا نے پھلجھڑیاں رکھ دی تھیں کہ ان کو آتش بازی کا بڑا شوق تھا۔ خدا کی پناہ جہالت کی بھی حد ہو گئی (۵) یہ بھی خیال ہے کہ اس وقت اس کی روح آتی ہے، چنانچہ لوبان وغیرہ خوشبو سلگانے کا یہی منشا ہے۔ گو سب کا نہ ہو۔ (۸) پھر اگر ثواب پہنچانے کے لئے سامنے رکھ کر پڑھنا ضروری ہے تو اگر روپیہ پیسہ یا کپڑا وغیرہ ثواب بخشنے کے لئے دیا جائے اس پر فاتحہ کیوں نہیں پڑھتی ہو۔ (۱۳) حضرت بی بی کے فاتحہ و صحنک میں یہ بھی قید ہے کہ مرد نہیں کھا سکتے۔ کوئی پاک صاف نیک عورت کھائے اور وہ بھی ایسی نہ ہو جس نے دوسرا نکاح کر لیا ہو (۱۴) بزرگوں اور اولیاء اللہ کے فاتحہ میں ایک اور خرابی یہ ہے کہ لوگ ان کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر اس نیت سے فاتحہ و نیاز دلاتے ہیں کہ ان سے ہمارے کام نکلیں گے اولاد ہو گی مال و رزق بڑھے گا۔ اس طرح کا عقیدہ شرک ہے خدا بچائے۔ (۱۵) بعضے آدمی مزاروں پر چادریں اور غلاف بھیجتے ہیں اور اس کی منت مانتے ہیں۔ چادر چڑھانا منع ہے اور جس

عقیدہ سے یہ کیا جاتا ہے وہ شرک ہے۔

"بعضے موقعوں پر صدقہ کے لئے بعض چیزوں کو خاص کر رکھا ہے جیسے ماش اور تیل اور وہ بھی بھنگی کو دیا جاتا ہے.......... اس میں یہ اعتقاد بھی ہوتا ہے کہ اس صدقہ میں ہماری الا بلا لپٹی ہوئی ہے اس لئے گندے ناپاک لوگوں کو دینا چاہئے .... ایک رواج یہ نکال رکھا ہے کہ گلگلے وغیرہ پکا کر عورتیں مسجد میں لے جاکر خاص محراب یا منبر پر رکھتی ہیں۔ جب عورتوں کا مسجد میں نماز تک کے لئے جانا منع ہے تو پھر ان واہیات باتوں کا کیا ذکر"

....

"...س لئے خیرات کے ان سب طریقوں کو چھوڑ کر سیدھا طریقہ اختیار ...رنا چاہئے کہ جو کچھ میسر ہو وہ چپکے سے کسی محتاج کو یہ سمجھ کر دے دیا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوں گے اور اس کی برکت سے بلا اور مصیبت کو رفع کر دیں گے۔

موت کی رسموں کے مفاسد: اسی طرح مرنے کی رسموں کے سلسلہ میں جو مفاسد بیان فرمائے گئے ہیں ان میں مثلاً ایک یہ ہے جس کو عین ثواب خیال کیا جاتا ہے کہ

"اکثر عادت ہے کہ مرنے کے بعد مردہ کے کپڑے جوڑے یا قرآن مجید وغیرہ نکال کر اللہ واسطے دے دیتے ہیں۔ خوب سمجھ لو کہ جب کوئی مر جاتا ہے شرع سے جتنے آدمیوں کو اس کی میراث کا حصہ پہنچتا ہے وہ سب اس مردے کی ہر چھوٹی بڑی چیز کے مالک ہو جاتے ہیں. اور وہ سب چیزیں ان سب کے ساجھے کی ہو جاتی ہیں۔ پھر ایک یا دو شخصوں کو کب درست ہو گا کہ ساجھے کی چیز کسی کو دے دیں۔ اور اگر سب ساجھی اجازت بھی دے دیں لیکن کوئی ان میں نابالغ ہے تب بھی ایسی چیز کا دینا درست نہیں۔ اور اس کی اجازت کا اعتبار نہیں۔ اسی طرح اگر سب ساجھی بالغ ہوں لیکن شرما شرمی اجازت دیں تب بھی درست نہیں۔"

یہ بظاہر ایک معمولی مسئلہ اور موٹی بات ہے. لیکن اچھے اچھوں کی نظر نہیں جاتی۔ احقر کا گھر الحمداللہ دیندار ہے. اور حضرت والدہ مدظلہا تو غیر معمولی طور سے عابدہ زاہدہ و متقیہ ہیں۔ مگر وہ تک بے تکلف میت کی چیزیں ثواب کی نیت سے غریبوں محتاجوں کو دے دیا کرتی تھیں۔ جب میں نے ایک دفعہ ہمشیرہ کے انتقال کے وقت عرض کیا، تب سے خیال فرمانے لگی ہیں۔

ساتویں حصہ کی تجدیدی شان: ساتواں حصہ تحسین اعمال اصلاح اخلاق و معاشرت و تزکیہ نفس و تصحیح قلب کا ہے۔ یہ چیزیں حضرت کے ہاں نہ فقط دین و ایمان کی جان ہیں. بلکہ انہیں کا نام تصوف یا درویشی ہے اس لئے اس حصہ میں پیری مریدی کی نسبت بھی کچھ مختصر اصلاحی ہدایات درج ہیں۔ ان باتوں سے عوام کیا خواص اور دینداروں تک میں غفلت عام ہے۔ اس لئے یہ حصہ زیادہ خصوصیت سے اصلاحی و تجدیدی شان کا حامل ہے۔ اگر گنجائش مانع نہ ہوتی تو اس کا بیشتر حصہ نقل کر دینے کا جی چاہتا ہے۔ تاہم کچھ ایسے اقتباسات درج ذیل ہیں، جو کم از کم مہلک کوتاہیوں کی نسبت ہماری آنکھوں کو کچھ کھولنے اور حضرت کی تجدیدی نباضی کو سمجھنے کے لئے کافی ہوں۔

نکاح میں مقدم خیال: پہلے عبادات و معاملات کی تحسین (سنوارنے) کا ذکر ہے اس میں نکاح کے سلسلہ میں ہدایت ہے کہ "اپنی اولاد کے نکاح میں زیادہ اس کا خیال رکھو کہ دیندار آدمی سے ہو۔ دولت و حشمت پر زیادہ خیال نہ کرو۔ خاص کر آج کل زیادہ دولت والے انگریزی پڑھنے سے ایسے بھی ہونے لگے ہیں کہ کفر کی باتیں کرتے ہیں۔ ایسے آدمی سے نکاح درست ہی نہیں۔ تمام عمر بدکاری کا گناہ ہوتا رہتا ہے"۔ ہمارے دیندار مسلمان بلکہ علماء و مشائخ تک اس معاملہ میں ذرا اپنے نفس کا ٹھنڈے دل سے محاسبہ فرمائیں کہ کس قماش کے دامادوں کی تلاش و تمنا ہمارے اندر گھر کر گئی ہے!

عادات و معاشرت کی تحسین: کے سلسلہ میں کھانے پینے. پہننے اوڑھنے اٹھنے بیٹھنے

وغیرہ سب ہی باتوں کے آداب کا تھوڑا تھوڑا بقدر ضرورت بیان ہے خصوصاً زبان کے بارے میں کہ اس میں زیادہ بے احتیاطیاں بھی ہوتی ہیں اور ان کی زیادہ پروا بھی نہیں کی جاتی ارشاد ہے کہ

"کسی کو بے ایمان کہنا یا یوں کہنا کہ خدا کی مار خدا کی پھٹکار خدا کا غضب پڑے دوزخ نصیب ہو۔ خواہ آدمی کو خواہ جانور کو یہ سب گناہ ہے. جس کو کہا گیا اگر وہ ایسا نہ ہو تو سب پھٹکار لوٹ کر کہنے والی پر پڑتی ہے۔ اگر کوئی بے جا بات بدلے میں کہے اتنا ہی کہے. اگر ذرا بھی زیادہ کہا تو گنہگار ہو گی۔ خوشامد سے کسی کی تعریف مت کرو اور پیٹھ پیچھے حد سے زیادہ تعریف مت کرو۔ کسی سے بحث مت کرو. اپنی بات کو اونچی مت کرو۔ زیادہ مت ہنسو اس سے دل کی رونق جاتی رہتی ہے۔ اپنی کسی چیز یا کسی ہنر پر بڑائی مت کرو. نہ کلام میں بہت طول یا مبالغہ کرو ضرورت کے بقدر بات کرو۔ کسی کا عیب دیکھو تو اس کو چھپاؤ گاتی مت پھرو۔ دوسروں کو بھی نیک کام بتلاتی رہو بری باتوں سے منع کرتی رہو۔ البتہ اگر بالکل قبول کرنے کی امید نہ ہو یا اندیشہ ہو کہ ایذا پہنچائے گا تو خاموشی جائز ہے. مگر دل سے بری بات کو برا سمجھتی رہو اور بدوں لاچاری ایسے آدمیوں سے نہ ملو"۔

خیال کیجیے کہ آج کل ان باتوں کا کون خیال کرتا ہے, اور ان کے کتنے مفاسد ہیں۔ پھر زیادہ بولنے کی برائی کے ذیل میں علاج بھی نہایت حکیمانہ تجویز فرمایا ہے کہ

"نفس کو زیادہ بولنے میں مزہ آتا ہے اور اس سے صدہا گناہوں میں پھنس جاتا ہے. جھوٹ غیبت کو سننا طعنہ دینا اپنی بڑائی جتلانا خواہ مخواہ کسی سے بحثا بحثی لگانا وغیرہ ان سب آفتوں سے بچنا جب ہی ممکن ہے کہ زبان کو روکے۔ طریقہ یہی ہے کہ جو بات منہ سے نکالنا ہو جی میں آتے ہی نہ کہہ ڈالے۔ پہلے خوب سوچ لے کہ اس بات میں کسی طرح کا گناہ ہے یا ثواب یا نہ گناہ ہے نہ ثواب۔ اگر تھوڑا یا بہت گناہ ہے تو بالکل اپنی زبان بند کر لو۔ اگر اندر سے نفس تقاضا کرے تو یوں سمجھاؤ کہ اس وقت تھوڑا سا جی کو مار لینا

آسان ہے. لیکن دوزخ کا عذاب بہت سخت ہے۔ اگر وہ بات ثواب کی ہے
تو کہہ ڈالو۔ اور اگر نہ گناہ ہے نہ ثواب تو بھی مت کہو۔ اور اگر بہت ہی دل
چاہے. تو تھوڑی سی کہہ کر چپ ہو جاؤ۔ ہر بات میں اسی طرح سوچا کرو
تھوڑے دنوں میں بری باتوں سے خود نفرت ہو جائے گی۔ اور زبان کی
حفاظت کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ بلا ضرورت کسی سے نہ ملو جب تنہائی ہو گی
خود ہی زبان خاموش رہے گی"۔

زیادہ بولنا اور بکواس عورتوں کا شدید مرض تو ہے ہی لیکن مردوں کو بھی اس میں اتنا عام ابتلا ہے کہ اگر مذکورہ بالا تدبیر و علاج پر پچاس فیصد بھی عمل کر کے بے محل کلام سے زبان کو بند رکھا جائے. تو خدا جانے کتنے انفرادی و اجتماعی دینی و دنیوی مفاسد کا دروازہ از خود بند ہو جائے۔

نام اور تعریف: چاہنے کی برائی اور اس کا علاج یہ ہے کہ ایسا آدمی

" دوسرے کے نام و تعریف سے جلتا اور حسد کرتا ہے. جس کی برائی اوپر
(حسد کے ذکر میں) سن چکی ہو۔ اور دوسرے کی برائی اور ذلت سن کر جی
خوش ہوتا ہے۔ یہ سب بڑے گناہ کی بات ہے کہ دوسرے کا برا چاہے اور
اس میں یہ بھی برائی ہے کہ کبھی ناجائز طریقوں سے نام پیدا کیا جاتا ہے
مثلاً شادی وغیرہ میں خوب مال اڑا یا فضول خرچی کی اور وہ مال کبھی رشوت
سے جمع کیا کبھی سودی قرض لیا وغیرہ .... علاج ایک تو یہ ہے کہ یوں
سوچے کہ جن لوگوں کی نگاہ میں ناموری و تعریف ہو گی نہ وہ رہیں گے نہ میں
رہوں گی تھوڑے دنوں بعد کوئی پوچھے گا بھی نہیں .... دوسرا علاج یہ
ہے کوئی ایسا کام کرے. جو شرع کے خلاف تو نہ ہو مگر لوگوں کی نگاہ میں
ذلیل و بدنام ہو جائے مثلاً بچی ہوئی باسی روٹیاں غریبوں کے ہاتھ
سستی بیچنے لگے. جس سے خوب رسوائی ہو گی"۔

غرور و شیخی: "اس کو کہتے ہیں کہ آدمی اپنے کو علم عبادت دینداری. حسب و نسب. مال و سامان. عزت و آبرو. یا عقل وغیرہ کسی بات میں اوروں سے بڑا سمجھے اور دوسروں کو اپنے سے کم و حقیر جانے. جو بڑا گناہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر ہو گا. وہ جنت میں نہ جائے گا۔ دنیا میں بھی لوگ ایسے آدمی سے نفرت کرتے اور اس کے دشمن ہوتے ہیں.......... علاج یہ ہے کہ اپنی حقیقت میں غور کرو کہ مٹی اور ناپاک پانی کی پیدائش ہوں. ساری خوبیاں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں، اگر وہ چاہیں ابھی سب لے لیں. پھر شیخی کس بات پر کروں۔ اور اللہ تعالیٰ کی بڑائی یاد کرو اس وقت اپنی بڑائی دل میں نہ آئے گی. اور جس کو حقیر سمجھا ہے اس کے سامنے عاجزی کرے اور اس کی تعظیم کرے تو شیخی دل سے نکل جائے گی۔ اگر زیادہ ہمت نہ ہو تو اپنے ذمہ اتنی پابندی کر لے کہ جب کوئی چھوٹے درجہ کا آدمی ملے. تو اس کو پہلے خود سلام کر لیا کرے۔ انشاء اللہ اس سے نفس میں بہت عاجزی آ جائے گی"۔

ریا کاری: دکھلاوے کے متعلق ہے کہ وہ

"کئی طرح کا ہوتا ہے صاف زبان سے کہ ہم نے اتنا قرآن پڑھا ہم رات کو اٹھے۔ کبھی اور باتوں میں ملا ہوتا ہے مثلاً کہیں عرب کے بدوؤں کا ذکر ہو رہا تھا کسی نے کہا نہیں صاحب۔ یہ سب باتیں غلط ہیں ہمارے ساتھ ایسا ایسا برتاؤ ہوا تو اب بات تو ہوئی اور کچھ لیکن اسی میں سب نے جان لیا کہ انہوں نے حج کیا ہے۔ کبھی کام کرنے سے ہوتا ہے جیسے دکھلاوے کے لئے سب کے سامنے تسبیح لے کر بیٹھ گئی.......... قیامت میں ایسے نیک کاموں پر جو دکھلاوے کے لئے کئے گئے ہوں ثواب کے بدلے الٹا عذاب ہو گا۔ علاج وہی ہے. جو اوپر نام و تعریف چاہنے کا ہے"۔

پھر نفس کی برائیوں اور ہاتھ پاؤں وغیرہ کے گناہوں کا ایک آسان علاج یہ تحریر ہے کہ "جب نفس سے کوئی شرارت اور برائی یا گناہ کا کام ہو جائے. اس کو کچھ سزا دیا کرے اور دو سزائیں آسان ہیں کہ ہر شخص کر سکتا ہے ایک تو یہ کہ کبھی کوئی بری بات ہو جایا کرے تو اپنے ذمہ کچھ آنہ دو آنے روپیہ دو روپے جیسی حیثیت ہو جرمانہ کے طور پر ٹھہرا لے. جو

غریبوں کو بانٹ دیا کرے دوسری سزا یہ ہے کہ ایک یا دو قوت کھانا نہ کھایا کرے۔ ان سزاؤں کے اہتمام و پابندی سے انشاء اللہ سب برائیاں چھوٹ جائیں گی"۔

ان بری باتوں پر تنبیہ اور ان کے علاج کے بعد پھر ایسی باتوں کا بیان ہے

توبہ: "جن سے دل سنورتا ہے مثلاًتوبہ اور اس کا طریقہ کہ زبان سے صرف توبہ کہہ لینا کافی نہیں بلکہ "گناہوں کے عذاب کو یاد کرے اور سوچے جس سے دل دکھے گا۔ اس وقت چاہئے کہ زبان سے بھی توبہ کرے۔ اور جو نماز روزہ وغیرہ قضا ہوا ہو اس کو قضا بھی کرے اگر بندوں کے حقوق ضائع ہو گئے ہوں ان کو ادا کرے یا معاف کرائے اور جو ایسے گناہ ہو گئے ہوں ان پر خوب کڑھے اور رونے کی شکل بنا کر خدا تعالیٰ سے خوب معافی مانگے"۔

صبر کے معنی: لوگ بالعموم کسی مصیبت پر جزع فزع نہ کرنے کو جانتے ہیں حالانکہ اصل میں

"صبر نفس کو دین کی باتوں پر پابند رکھنا، اور دین کے خلاف اس سے کام نہ ہونے دینا ہے۔ اور اس کے کئی موقع ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی چین وامن کی حالت میں ہو .... تو ایسے وقت کا صبر یہ ہے کہ دماغ خراب نہ ہو جائے غریبوں کو حقیر نہ سمجھے"۔

اسی طرح کچھ اور دوسرے مواقع کی تفصیل ہے۔

خدا پر بھروسہ: رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ

"بدوں خدائے تعالیٰ کے ارادہ کے نہ کوئی نفع حاصل ہو سکتا ہے، نہ نقصان پہنچ سکتا ہے، اس لئے ضرور ہوا کہ جو کام کرے اپنی تدبیر پر بھروسہ نہ کرے، نظر اللہ تعالیٰ ہی پر رکھے اور کسی مخلوق سے نہ زیادہ امید رکھے نہ کسی سے زیادہ ڈرے۔ یہ سمجھ لے کہ بدوں خدا کے چاہے کوئی کچھ نہیں کر سکتا .... طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کو اور مخلوق کے ناچیز و بے بس ہونے کو خوب سوچا کرے اور یاد کیا کرے"۔

سچی نیت کے یہ معنی ہیں: کہ "دین کا جو کام کرے اس میں اپنا کوئی مطلب نہ ہو. نہ دکھلاوا ہو نہ ایسا کوئی مطلب ہو جیسے پیٹ میں گرانی ہو کہالاؤ. روزہ رکھ لیں۔ نماز کے وقت گرمی میں تازہ وضو کر لیا. کہ وضو بھی تازہ ہو جائے اور ہاتھ پاؤں بھی ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ یا کسی سائل کو اس لئے دیا کہ اس کے تقاضے سے جان بچی۔ یہ سب باتیں سچی نیت کے خلاف ہیں۔ طریقہ یہ ہے کہ کام کرنے سے پہلے خوب سوچ لیا کرے اگر کسی ایسی بات کا میل پائے اس کو دل سے صاف کر لے"۔

مراقبہ: یعنی دل سے خدا کا دھیان رکھنا یہ ہے کہ
"ہر وقت یہ دھیان رکھے کہ اللہ کو میرے سب کاموں کی خبر ہے دل کی بھی ظاہر کی بھی۔ اگر برا کام کیا یا برا خیال دل میں لائے شاید اللہ تعالیٰ دنیا یا آخرت میں سزا دیں۔ دوسری عبادت کے وقت یہ دھیان رکھے کہ وہ میری عبادت کو دیکھ رہے ہیں اچھی طرح بجالانا چاہئے۔ طریقہ یہی ہے کہ کثرت سے ہر وقت یہ سوچا کرے تھوڑے دنوں میں دھیان بندھ جائے گا پھر انشاء اللہ کوئی بات اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہ ہو گی"۔
اسی طرح خدا سے خوف و رجا. محبت و رضا شکر وغیرہ سب کا تھوڑا تھوڑا بقدر ضرورت اور عام غلطیوں سے پاک کرنے کا ذکر ہے۔ پیری و مریدی کا بھی تھوڑا سا بیان ہے۔

پیری و مریدی: "پیر سے لوگ یا تو دنیاوی حاجت بر آنے کی توقع رکھتے ہیں. یا مرید ہونے کا یہ مطلب جانتے ہیں کہ آخرت میں پیر ہم کو بخشوائیں گے" اس لئے پہلے مرید ہونے کے صحیح فائدے بیان کئے گئے ہیں. مثلاً پہلا یہ ہے کہ دل کو سنوارنے کے لئے اوپر جو طریقے بیان کئے گئے ہیں ان کو برتنے میں کبھی کم سمجھی سے غلطی ہو جاتی ہے پیر اس کا ٹھیک راستہ بتلا دیتا ہے. دوسرا فائدہ ہے کہ کتاب پڑھنے سے بعض دفعہ اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا پیر کے بتلانے سے ہوتا ہے. ایک تو اس کی برکت ہوتی ہے۔ پھر بھی یہ خوف ہوتا

ہے کہ اگر کوئی نیک کام میں کمی کی یا بری بات کی پیر سے شرمندگی ہوگی"۔

اسی طرح مریدی کے اور کئی اصلی فوائد بیان کرنے کے بعد یہ بتلایا گیا ہے کہ پیر میں کیا کیا باتیں دیکھنی چاہئیں، جن میں دین کے مسائل سے ضروری واقفیت اور شریعت کی پابندی، عقیدہ کی صحت وغیرہ کا دیکھنا ہے۔ یہ نہ دیکھنا چاہئے کہ

"جو کہہ دیتے ہیں وہی ہو جاتا ہے۔ ایک چھو کر دیتے ہیں تو بیماری جاتی رہتی ہے، جس کام کے لئے تعویذ دیتے ہیں وہ مرضی کے موافق ہو جاتا ہے، ایسی توجہ دیتے ہیں کہ آدمی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ ان تاثیروں سے کبھی دھوکا مت کھانا"۔ نیز "اس پیر میں یہ بات بھی ہو کہ دین کی نصیحت کرنے میں مریدوں کا لحاظ ملاحظہ نہ کرتا ہو اور بیجا بات سے روک دیتا ہو"۔

"اگر پیر کوئی وظیفہ یا ذکر بتلائے اور کچھ مدت تک اس کا اثر یا مزہ دل میں کچھ نہ معلوم ہو، تو اس سے تنگ دل یا پیر سے بداعتقاد نہ ہو، بلکہ یوں سمجھو کہ بڑا اثر یہی کہ اللہ کا نام لینے کا ارادہ پیدا ہوتا ہے، اور اس نیک کام کی توفیق ہوتی ہے۔ اور ایسے اثر کا کبھی دل میں خیال نہ لائے کہ مجھ کو خواب میں بزرگوں کی زیارت ہوا کرے، ہونے والی باتیں معلوم ہو جایا کریں، خوب رونا آئے عبادت میں ایسی بےہوشی ہو جائے کہ دوسری چیزوں کی خبر نہ رہے۔ کبھی کبھی یہ باتیں بھی ہو جاتی ہیں اور کبھی نہیں ہوتیں۔ اگر ہو جائیں خدا تعالیٰ کا شکر بجالائے اور اگر نہ ہوں یا ہو کر کم ہو جائیں یا جاتی رہیں تو غم نہ کرے البتہ اگر خدا نہ کرے شرع کی پابندی میں کمی ہونے لگے یا گناہ ہونے لگیں، تو یہ بات البتہ غم کی ہے۔ جلدی ہمت کر کے حالت درست کرے اور پیر کو اطلاع دے اور وہ جو بتلائیں اس پر عمل کرے"۔

دیکھو اقتباسات بالا کے ہر ہر جز میں جہاں کہیں بھی کوئی دینی فساد یا غلط فہمی راہ پائی گئی ہے کس طرح اس کو تجدیدی نگاہ نے پکڑ لیا اور اس کی اصلاح و احیا کی خدمت انجام دی ہے۔

مسلمان کی زندگی: اس کے بعد چالیس ہدایات بطور خلاصہ ایسی درج فرمائی گئی ہیں. جو نہ صرف مرید بلکہ مسلمان کی زندگی کا دستور العمل ہیں کہ مسلمان کی زندی کیسی ہونی چاہئے اور اس کو دن رات کس طرح رہنا چاہئے۔

"ہر مسلمان کو چاہئے کہ (۱) ضرورت کے موافق دین کا علم حاصل کرے خواہ کتاب پڑھ کر یا عالموں سے پوچھ پاچھ کر (۲) سب گناہوں سے بچے (۳) اگر کوئی گناہ ہو جائے تو فوراً توبہ کرے (۴) کسی کا حق نہ رکھے. کسی کو زبان سے یا ہاتھ سے تکلیف نہ دے نہ کسی کی برائی کرے (۵) مال کی محبت اور نام کی خواہش نہ رکھے نہ بہت اچھے کھانے کپڑے کی فکر میں رہے (۶) اگر اس کی خطا پر کوئی ٹوکے تو بات نہ بنائے فوراً اقرار اور توبہ کرے (۷) بدون سخت ضرورت کے سفر نہ کرے۔ سفر میں بہت باتیں بے احتیاطی کی ہوتی ہیں بہت سے نیک کام چھوٹ جاتے ہیں وظیفوں میں خلل پڑتا ہے وقت پر کوئی کام نہیں ہوتا (۸) بہت نہ ہنسے نہ بولے خاص کر نا محرم سے بے تکلفی کی باتیں نہ کرے (۹) کسی سے جھگڑا تکرار نہ کرے (۱۰) شرع کا ہر وقت خیال رکھے (۱۱) عبادت میں سستی نہ کرے (۱۲) زیادہ وقت تنہائی میں رہے (۱۳) اگر اوروں سے ملنا جلنا پڑے تو سب سے عاجزی کے ساتھ ملے سب کی خدمت کرے بڑائی نہ جتلائے (۱۴) اور امیروں سے تو بہت ہی کم ملے (۱۵) بد دین آدمی سے دور بھاگے (۱۶) دوسروں کا عیب نہ ڈھونڈھے کسی پر بدگمانی نہ کرے اپنے عیبوں کو دیکھا کرے اور ان کی درستی کیا کرے (۱۷) نماز کو اچھی طرح اچھے وقت دل سے پابندی کے ساتھ ادا کرنے کا بہت خیال رکھے (۱۸) دل اور زبان سے ہر وقت اللہ کی یاد میں رہے. کسی وقت غافل نہ ہو (۱۹) اگر اللہ کے نام میں مزہ آئے دل خوش ہو تو اللہ کا شکر بجالائے (۲۰) بات نرمی سے کرے (۲۱) سب کاموں کے لئے وقت مقرر کر لے اور پابندی سے اس کو بناہے (۲۲) جو کچھ رنج و غم نقصان پیش آئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جانے پریشان

نہ ہو. اور یوں سمجھے کہ اس میں مجھ کو ثواب ملے گا (۲۳) ہر وقت دل میں دنیا کے حساب و کتاب اور دنیا کے کاموں کا ذکر مذکور نہ رکھے. بلکہ خیال بھی اللہ ہی کا رکھے (۲۴) جہاں تک ہو سکے دوسروں کو فائدہ پہنچائے خواہ دنیا کا یا دین کا (۲۵) کھانے پینے میں نہ اتنی کمی کرے کہ کمزور یا بیمار ہو جائے نہ اتنی زیادتی کرے کہ عبادت میں سستی ہونے لگے (۲۶) خدائے تعالیٰ کے سوا کسی سے طمع نہ کرے نہ کسی کی طرف خیال دوڑائے کہ فلاں جگہ سے ہم کو یہ فائدہ ہو جائے (۲۷) خدائے تعالیٰ کی تلاش میں بے چین رہے (۲۸) نعمت تھوڑی ہو یا بہت اس پر شکر بجالائے اور فقر و فاقہ سے دل تنگ نہ ہو (۲۹) جو اس کی حکومت میں ہیں ان کی خطا و قصور سے در گزر کرے (۳۰) کسی کا عیب معلوم ہو جائے تو چھپائے۔ البتہ اگر کوئی کسی کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے. اور تم کو معلوم ہو جائے تو اس سے کہہ دو (۳۱) مہمانوں مسافروں. اور غریبوں اور عالموں اور درویشوں کی خدمت کرے (۳۲) نیک صحبت اختیار کرے (۳۳) ہر وقت خدائے تعالیٰ سے ڈرا کرے (۳۴) موت کو یاد رکھے (۳۵) کسی وقت بیٹھ کر روز کے روز اپنے دن بھر کے کاموں کو سوچا کرے جو نیکی یاد آئے اس پر شکر کرے گناہ پر توبہ کرے (۳۶) جھوٹ ہرگز نہ بولے (۳۷) جو محفل خلاف شرع ہو وہاں ہرگز نہ جائے (۳۸) حیا اور بردباری سے رہے (۳۹) ان باتوں پر مغرور نہ ہو کہ میرے اندر ایسی خوبیاں ہیں (۴۰) اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ نیک کام پر قائم رکھیں"۔

مسلمان کی دنیاوی ترقی بھی دین ہی سے ہے: سوچنے کی بات ہے. کہ اگر آج مسلمان ان چیزوں کا اپنی شخصی و خانگی زندگی میں صد فیصد کیا ادھا تہارا بھی لحاظ اہتمام رکھیں تو ان کی دین و دنیا کی فلاح و ترقی کہاں سے کہاں پہنچ جائے اور ان کے کتنے انفرادی و اجتماعی مفاسد کی سرے سے جڑ ہی کٹ جائے۔ پھر کیا ان باتوں کے اختیار کرنے کے لئے. بجز اپنے اختیار و ہمت کے [illegible]م میں لانے کے کسی انجمن و چندہ جلسہ و جلوس کی کوئی ضرورت ہے؟ کیا ان

میں حکومت یا غیر مسلموں سے کوئی مقابلہ و تصادم یا ان سے موالات و ترک موالات کا سوال ہے؟ اگر ہم صرف اپنی اپنی شخصی و منزلی زندگی میں وہ بھی صرف اپنے اختیار کی حد تک محض اللہ تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے موالات کی کمر کس لیں تو پھر ایک نسل ہی میں دیکھ لے سکتے ہیں کہ اللہ کی نصرت کا وعدہ کس طرح پورا ہوتا ہے۔ دنیا کی ترقی جس کے پیچھے ہم نے غیروں کی دیکھا دیکھی دین و آخرت خدا اور رسول سب کو پس پشت ڈال رکھا ہے. اور یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہماری دنیاوی ترقی بھی غیروں کی طرح ان کی نقالی میں جلسہ بازیوں انجمن سازیوں اور طرح طرح کے اسکولوں کالجوں. یونیورسٹیوں اور سیاسی اداروں کے قائم کرنے میں ہے تو یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے ساتھ معاملہ غیروں کا نہیں۔ ہماری دنیاوی ترقی کی راہ میں دین اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن تھامے رہنے ہی میں ہے۔ اور حضرت علیہ الرحمہ کو تو اس پر اتنا کامل و واثق یقین تھا کہ قسم کھا کھا کر متنبہ و متوجہ فرمایا کرتے تھے۔

"ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ مسلمانوں کی شان کے بالکل خلاف ہے کہ وہ دوسری قوموں کی روش اختیار کریں یا ان کی تدابیر ترقی کو اپنا ذریعہ ترقی بنائیں یا ان سے کسی قسم کی امداد کے خواہاں ہوں۔ بڑے غیرت کی بات ہے۔ ان کو تو حق تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا چاہئے مشروع تدابیر اختیار کرنا چاہئے اپنے سلف کے کارناموں کو پیش نظر رکھنا چاہئے اسی میں ان کی خیر و فلاح و بہبود ہے۔ جو سبق مسلمانوں کو تعلیم کیا گیا ہے اس میں قوت بھی ہے شجاعت بھی ہے سب کچھ ہے۔ اس میں ہم کو یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ سامان سے غلبہ نہیں ہوا کرتا بلکہ غلبہ ہوتا ہے قوت قلب سے اور قوت قلب میسر ہوتی ہے خدا کے ساتھ تعلق بڑھانے سے اور خدا کے ساتھ تعلق بڑھانے سے اور خدا کے ساتھ تعلق بڑھتا ہے ان کے احکام کی اتباع کرنے سے. ان کی بتائی ہوئی تدابیر پر عمل کرنے سے۔ مگر مسلمانوں کے قلوب میں اس چیز کو کیسے اتار دوں میں خدا کی ذات پر بھروسہ کر کے قسم کھاتا ہوں کہ اگر سب مسلمان احکام حق پر عمل پیرا ہو جائیں اور ان کو راضی کرنے کی سعی و کوشش میں لگ جائیں تو چند روز میں انشاء اللہ کایا پلٹ ہو جائے"۔

حتیٰ کہ اگر رضائے حق اور خالص اتباع کی نیت نہ بھی ہو تو بھی مشروع طریق اور تدابیر اپنا اثر دکھلائے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ فرماتے ہیں کہ

"اگر بہ نیت اتباع ایسا نہ کریں تو ایک تدبیر ہی کا درجہ سمجھ کر کر کے دیکھ لیں۔ آخر اور بھی تدابیر کر رہے ہو ایک یہ بھی سہی تمہارا مقصود تو یہ ہے کہ مقاصد میں کامیابی نصیب ہو، تو جب کہ تمہاری خود ساختہ پرواختہ تدابیر میں اب تک کامیابی نہیں ہوئی اللہ و رسول کی بتلائی ہوئی تدابیر کو تدابیر ہی کی نیت سے کر کے دیکھ لو کہ کیا نتیجہ بر آمد ہوتا ہے، اگر کامیابی نہ ہو گی چھوڑ دینا پھر بھی تو اختیار میں ہو گا۔ لیکن کر کے دیکھو تو کرنے سے پھانسی کیوں لگتی ہے مرے کیوں جاتے ہو کوئی پکڑ کر تھوڑا ہی تم کو بٹھلائے گا۔ بہت دنوں تک بتوں کی پرستش کر کے تجربہ کر لیا اب ذرا خدا کو بھی پوج کر دیکھ لو۔ اسی کو مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

سالہا تو سنگ بودی دلخراش   آزمودن رایک زمانے خاک باش"

(افاضات حصہ ص۴۷)

پھر آگے فرماتے ہیں کہ

"کوئی انگریزوں کی بغل میں جا کر گھستا ہے کہ ان کے پاس ہماری فلاح و بہبود کے اسباب ہیں ان کی سی بول چال ان کا سا لباس ان کی سی معاشرت اختیار کرتا ہے۔ کوئی ہندوؤں کی بغل میں جا کر گھستا ہے کہ ان کے ساتھ رہنے میں ہماری فلاح و بہبود ہے۔ ان کے ساتھ شریک ہو کر احکام اسلام تک کو پامال کر لینے کو تیار ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایمان تک ان کی نذر کر دیا مگر رہے کورے کے کورے نہ انگریزوں سے کچھ ملا نہ ہندوؤں نے کچھ دیا"۔

(افاضات ص۳۸ حصہ پنجم)۔

غرض مسلمانوں کی دنیا کی فلاح بھی دین کے راستہ ہی سے ممکن ہے۔

مسلمانوں کا سب سے بڑا مرض: اس زمانہ میں خود اپنے اور اپنے اہل و عیال و اتباع کے دین سے غفلت ہے جس کی پروا ان کو اتنی بھی نہیں ہوتی جتنا بظاہر فلسطین اور جاوا دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے شور و غل مچاتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ فلسطین اور جاوا کے مسلمانوں سے تمہارا اگر کوئی خاص تعلق ہے تو دین ہی کا۔ لیکن جب ہم کو خود اپنے ہی دین کی فکر نہیں تو ان کے لئے شور و غل جلسہ و جلوس کو دین پر کیسے مبنی قرار دیا جائے۔ سوا اس کے کہ اس پر چودھویں صدی کا یہ بھی بہت بڑا دجالی فتنہ ہے کہ دین کو بھی قوم اور قومیت و سیاست کا لباس پہنا دیا گیا ہے اور مسلمان کی مسلمانوں کے ساتھ دینی نہیں قومی و سیاسی ہمدردی فرائض قومیت و سیاست میں داخل ہے۔

جس زمانہ میں کانپور کی مسجد کا واقعہ پیش آیا راقم ہذا سری نگر (کشمیر) میں تھا اس زمانہ میں انگریزی کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دین کے منکر نام کے مسلمان بھی وہاں سیاحتہً آئے ہوئے تھے۔ جو اکثر مخدومی شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی مرحوم سے ملنے جلنے آ جایا کرتے اور مسجد کانپور کے معاملہ میں بڑے جوش و خروش کا اظہار کرتے۔ میں نے کہا کہ آپ کو سرے سے دین و اصول دین ہی پر اعتقاد نہیں، پھر مسجد کے معاملہ میں آپ کے مجاہدانہ جوش و خروش کے کیا معنی؟ فرمایا کیا میں قوماً بھی مسلمان نہیں ہوں!

کیا عرض کیا جائے۔ ہمارے جدید تعلیم یافتہ جو صریح انکار و الحاد کی اس حد کو نہیں پہنچے ہیں، ان کا اسلام بھی بالعموم بس قومی و سیاسی اسلام ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لئے خود اپنے اور اپنے اہل و عیال اور اتباع یا محکوموں کے دین و آخرت کا اتنا درد و غم بھی نہیں ہوتا جتنا ہزاروں میل کے دور مسلمانوں کی قومی و سیاسی غلامی کا ہوتا ہے۔ دین نام تھا دنیا کو بالکلیہ اس کے تابع رکھنے کا اب الٹ کر دین ہی کو دنیا کے تابع بنا دیا گیا ہے۔

دین کی جان: اصل یہ ہے کہ دین کی جان یوم دین پر ایمان یا آخرت کا یقین ہے۔ لیکن یہ عقیدت اتنا بے جان ہو کر رہ گیا ہے کہ مشکل ہی سے ہم کو اپنی دن رات کی زندگی میں کبھی اس کا خیال آتا ہے کہ اس فانی زندگی کا دامن موت کے بعد ایک غیر فانی زندگی سے بندھا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ موت کی فکر نہ اس کے بعد حساب و کتاب کا اندیشہ،

نہ جنت و درزخ یا جزا و سزا کی پروا۔ گویا قرآن و حدیث کا سارا دفتر جو دراصل آخرت کی زندگی کے بناؤ بگاڑ سے وابستہ اور اس کی تعلیمات سے بھرا ہوا ہے (معاذ اللہ) ایک بے معنی افسانہ ہے۔ انگریزی خانوں اور دنیاداروں کا ذکر ہی کیا اچھے اچھے علمائے دین کا یہ حال ہو گیا ہے کہ اسلام کے دنیاوی منافع و برکات سے تو رطب اللسان رہتے ہیں، لیکن دوزخ و جنت کا نام مشکل سے زبان پر آتا ہے اور وہاں کی نعمتوں اور مصیبتوں کی تفصیل تو شاید اب کسی کٹھ ملاہی کی زبان پر آتی ہو۔ ہم کو اپنے مرنے والوں تک کا غم زیادہ تر محض ان کی زندگی کے دنیاوی منافع واقعی یا متوقع یا طبعی تعلقات کی بنا پر ہوتا ہے باقی ان کی ذات کا غم شاید ہی کسی کو ہوتا ہو۔ اس کی بدولت سارا دین شجر بے ثمر ہو کر رہ گیا ہے اور توحید و رسالت تک کا اجمالی ایمان بے جان بن گیا ہے۔ اغیار کی نقالی میں دینی اصول و حدود سے قطع نظر کر کے جس طرح کی قومی و سیاسی سرگرمیوں کے سیلاب میں بہے جا رہے ہیں، انہوں نے اور بھی آخرت کی فکر و اعتقاد سے غافل بنا دیا ہے، کل کی بات ہے کہ امین آباد کی طرف جانا ہوا، تو عین مغرب کے وقت الیکشن کے ہنگامہ میں کسی طرف سنی بورڈ کی لاریاں دوڑ رہی تھیں اور ان کے انتخابی نعرے آسمان پھاڑ رہے تھے اور کسی طرف سے پاکستان زندہ باد جناح زندہ باد کا شور تھا لیکن شاید ہی ان نعرہ باز مجمعوں میں کوئی بندہ خدا ایسا ہو جس نے ٹھیک اسی وقت مسجدوں کے اندر سے موذن کی جو پکار بلند تھی، اس کی طرف کان لگائے ہوں کہ یہ کون اور کدھر بلا رہا ہے!

خوب یاد رکھنا چاہئے کہ قیامت و آخرت کے عقیدہ کے احیا و تجدید کے بغیر دین کا نام لے کر اس طرح مسلمانوں کی ساری دوڑ دھوپ یا سعی حیلت دنیا ہی میں گم ہوتی رہے گی، اور سب سے سنگین گمراہی یہ ہے کہ اس کو عین دین خیال کیا جانے لگا (وھم یحسبلون انھم یحسبنون صنعا) دین تو یوم دین کے ایمان کو تازہ و زندہ کرنے ہی سے زندہ ہو سکتا اور رہ سکتا ہے۔

حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمہ کے نہ صرف کثرت سے جا آخرت پر مستقل مواعظ الحیوٰۃ شوق لقاء مظاہر الامال ہم الاخرۃ تذکرہ الاخرۃ الرضا بالدنیا حب العاجلہ ازالۃ الغفلۃ ذکر

الموت وغیرہ کے ناموں سے ہیں۔ بلکہ کوئی وعظ شاید ہی اس پر تنبیہ اور اس کی طرف توجہ دلانے سے خالی ہوتا ہو گا، اور نہ کوئی مجلس آخرت کے عذاب و ثواب کے ذکر سے خالی جاتی تھی۔ اکثر فرماتے کہ بھائی میں تو چھوٹی سی چھوٹی مصیبت میں بھی وہاں کے ثواب ہی کو یاد کر کے تسلی حاصل کرتا ہوں۔

المولد البرزخی۔ ساری دنیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ناسوتی یا دنیوی کے سلسلہ میں جشن مناتی اور مجالس میلاد منعقد کرتی ہے اور بعض اس سلسلہ میں وفات کے ذکر تک معیوب جانتے ہیں۔ لیکن حضرت علیہ الرحمہ کا ایک بڑا لطیف و دلچسپ وعظ المولد البرزخی کے نام سے ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر آخرت یا وفات کو عین ولادت بلکہ اس ولادت ناسوتیہ کے مقابلہ میں اس کو "اہم و اعظم اقویٰ۔ وابقیٰ واصفیٰ و اکمل" قرار دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ کی ولادت ملکوتیہ کے کمالات و فضائل بیان فرمائے گئے اور بتایا گیا ہے کہ ولادت ناسوتیہ کے کمالات و فضائل دراصل اسی اکمل و اعلیٰ ولادت ملکوتیہ کا مقدمہ ہیں۔

ظاہر ہے، کہ حضورؐ سے بڑھ کر اور کس کی حیات دنیا عین دین ہو سکتی ہے، مگر یہ عین دین اس لئے تو تھی کہ ساری تعلیمات اور زندگی کا مطمع نظر دنیا اور حیات دنیا نہیں بلکہ یوم دین یا حیات آخرت تھی۔

قرب قیامت کی نشانیاں۔ بہشتی زیور جو دراصل حضرت کی ساری اصلاحی و تجدیدی عمارت کا سنگ بنیاد ہے، اس میں نہ صرف موت اور قیامت کے حساب و کتاب، بہشت و دوزخ کو یاد رکھنے کی تاکید صحیح حدیثوں سے فرمائی گئی ہے، اور نہ صرف نفس قیامت کے حالات بیان فرمائے گئے ہیں، بلکہ قرب قیامت کی نشانیوں کا خاصا تفصیلی ذکر ہے۔ تاکہ ان نشانیوں کو دیکھ کر قیامت کو دور نہ جانیں اور اس سے غافل نہ ہوں۔ یوں تو اصل میں قیامت و آخرت کی نشانیوں کا ظہور دنیا کے آخری پیغمبر کے بعد ہی سے شروع ہو گیا لیکن جیسا جیسا بعد بڑھتا جاتا ہے، ان نشانیوں میں اشتداد ہوتا جاتا ہے۔ اور بعض تو اب دن دوپہر کی طرح روشن ہیں۔ مثلاً

"لوگ خدائی مال کو اپنی ملک سمجھنے لگیں زکوٰۃ کی ڈانڈ کی طرح بھاری سمجھیں۔ امانت کو اپنا مال سمجھیں۔ مرد بیوی کی تابعداری اور ماں کی نافرمانی کرے۔ باپ کو غیر سمجھیں اور دوست کو اپنا۔ دین کا علم دنیا کمانے کو حاصل کریں۔ سرداری اور حکومت ایسوں کو ملے، جو سب میں نکمے یعنی بدذات لالچی اور بدخلق ہوں۔ جو جس کام کے لائق نہ ہو وہ کام اس کے سپرد ہو۔ ظالموں کی تعظیم اور خاطر اس خوف سے لوگ کریں کہ یہ ہم کو تکلیف نہ پہنچائیں۔ شراب کھلم کھلا پی جانے لگے ناچ گانے والی عورتوں کا رواج ہو (جواب ڈانس و میوزک کے نام سے شرفاء کی بہو بیٹیوں تک میں چل پڑا ہے بلکہ عزت و ہنر سمجھا جانے لگا ہے۔ اعاذنا اللہ)۔ پچھلے لوگ امت کے پہلے بزرگوں کو برا بھلا کہنے لگیں............ دین کا علم کم ہو جائے، جھوٹ بولنا ہنر سمجھا جائے اور امانت کا خیال دلوں سے جاتا رہے۔ حیا و شرم جاتی رہے سب طرف کافروں کا زور ہو جائے اور جھوٹے جھوٹے طریقے نکلنے لگیں۔ سب ملکوں میں نصاریٰ کی عملداری ہو جائے"

(منقول از قیامت نامہ شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ تعالیٰ) (۱)

کیا آج قرب قیامت کی ان نشانیوں کو دیکھنے کے لئے کسی خوردبین یا دوربین کی ضرورت رہ گئی ہے!

اس کے بعد تھوڑا تھوڑا خود خالص قیامت کے دن اور بہشت کی نعمتوں اور دوزخ کی مصیبتوں کا ذکر ہے۔

پورا مسلمان: پھر مشہور حدیث کے تحت میں کہ ایمان کے کئی اوپر ستر (۷۰) شعبے ہیں، اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ

"جب اتنی باتیں ایمان سے علاقہ رکھتی ہیں تو پورا مسلمان وہی ہوگا جس میں سب باتیں ہوں، اور جس میں کوئی بات ہو کوئی نہ ہو ادھورا مسلمان ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ مسلمان پورا ہی ہونا ضروری ہے، اس لئے ہر ایک کو

دل کے متعلق یہ ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا (۲) یہ اعتقاد رکھنا کہ خدا کے سوا سب چیزیں پہلے ناپید تھیں پھر خدا کے پیدا کرنے سے پیدا ہوئیں۔ (۳) یہ یقین کرنا کہ خدا تعالیٰ نے جتنی کتابیں پیغمبروں پر اتاریں سب سچی ہیں۔ البتہ اب قرآن کے سوا اوروں کا حکم نہیں رہا (۵) یہ یقین کرنا کہ سب پیغمبر سچے ہیں۔ البتہ اب فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر چلنے کا حکم ہے (۶) یہ یقین کرنا کہ اللہ تعالیٰ کو سب باتوں کی پہلے ہی سے خبر ہے۔ اور جو ان کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے (۷) یہ یقین کرنا کہ قیامت آنے والی ہے (۸) جنت کا ماننا (۹) دوزخ کا ماننا (۱۰) اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنا (۱۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنا (۱۲) اور کسی سے اگر محبت یا دشمنی کرے تو اللہ کے واسطے کرنا (۱۳) ہر کام میں نیت دین ہی کرنا (۱۴) گناہوں پر پچھتانا (۱۵) خدا تعالیٰ سے ڈرنا (۱۶) خدا تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھنا (۱۷) شرم کرنا (۱۸) نعمت کا شکر کرنا (۱۹) عہد پورا کرنا (۲۰) صبر کرنا (۲۱) اپنے کو اوروں سے کم سمجھنا (۲۲) مخلوق پر رحم کرنا (۲۳) جو کچھ خدا کی طرف سے ہو اس پر راضی رہنا (۲۴) خدا پر بھروسہ کرنا (۲۵) اپنی کسی خوبی پر نہ اترانا (۲۶) کسی سے کینہ کپٹ نہ رکھنا (۲۷) کسی پر حسد نہ کرنا (۲۸) غصہ نہ کرنا (۲۹) کسی کا برا نہ چاہنا (۳۰) دنیا سے محبت نہ رکھنا۔

"لوگ خدائی مال کو اپنی ملک سمجھنے لگیں زکوٰۃ کی ڈانڈ کی طرح بھاری سمجھیں۔ امانت کو اپنا مال سمجھیں۔ مرد بیوی کی تابعداری اور ماں کی نافرمانی کرے۔ باپ کو غیر سمجھیں اور دوست کو اپنا۔ دین کا علم دنیا کمانے کو حاصل کریں۔ سرداری اور حکومت ایسوں کو ملے، جو سب میں نکمّے یعنی بدذات لالچی اور بدخلق ہوں۔ جو جس کام کے لائق نہ ہو وہ کام اس کے سپرد ہو۔ ظالموں کی تعظیم اور خاطر اس خوف سے لوگ کریں کہ یہ ہم کو تکلیف نہ پہنچائیں۔ شراب کھلم کھلا پی جانے لگے ناچ گانے والی عورتوں کا رواج ہو (جو اب ڈانس و میوزک کے نام سے شرفاء کی بہو بیٹیوں تک میں چل پڑا ہے بلکہ عزت و ہنر سمجھا جانے لگا ہے۔ اعاذنا اللہ)۔ پچھلے لوگ امت کے پہلے بزرگوں کو برا بھلا کہنے لگیں............ دین کا علم کم ہو جائے، جھوٹ بولنا ہنر سمجھا جائے اور امانت کا خیال دلوں سے جاتا رہے۔ حیا و شرم جاتی رہے سب طرف کافروں کا زور ہو جائے اور جھوٹے جھوٹے طریقے نکلنے لگیں۔ سب ملکوں میں نصاریٰ کی عملداری ہو جائے"

(منقول از قیامت نامہ شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ تعالیٰ) (۱)

کیا آج قرب قیامت کی ان نشانیوں کو دیکھنے کے لئے کسی خوردبین یا دوربین کی ضرورت رہ گئی ہے!

اس کے بعد تھوڑا تھوڑا خود خالص قیامت کے دن اور بہشت کی نعمتوں اور دوزخ کی مصیبتوں کا ذکر ہے۔

پورا مسلمان: پھر مشہور حدیث کے تحت میں کہ ایمان کے کئی اوپر ستر (۷۰) شعبے ہیں، اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ

"جب اتنی باتیں ایمان سے علاقہ رکھتی ہیں تو پورا مسلمان وہی ہو گا جس میں سب باتیں ہوں، اور جس میں کوئی بات ہو کوئی نہ ہو ادھورا مسلمان ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ مسلمان پورا ہی ہونا ضروری ہے، اس لئے ہر ایک کو

لازم ہے کہ ان سب باتوں کو اپنے اندر پیدا کرے اور کوشش کرے کہ کسی بات کی کسر نہ رہ جائے، اس لئے ہم ان باتوں کو لکھ کر بتلا دیتے ہیں وہ سب سات اوپر ستر ہیں۔ تیس تو دل سے متعلق ہیں اور سات زبان سے اور باقی سارے جسم سے"۔

زبان سے متعلق سات باتیں یہ ہیں:۔

" (۱) زبان سے کلمہ پڑھنا (۲) قرآن کی تلاوت کرنا (۳) علم سیکھنا (۴) علم سکھلانا (۵) دعا کرنا (۶) اللہ کا ذکر کرنا (۷) لغو اور گناہ کی بات سے جیسے جھوٹ غیبت گالی، کوسنا۔ خلاف شرع گانا ان سب سے بچنا۔

باقی سارے بدن کے متعلق چالیس باتیں یہ ہیں:۔

" (۱) وضو کرنا، غسل کرنا، کپڑے کا پاک رکھنا (۲) نماز کا پابند رہنا (۳) زکوٰۃ و صدقہ فطر دینا (۴) روزہ رکھنا (۵) حج کرنا (۶) اعتکاف کرنا (۷) جہاں رہنے میں دین کی خرابی ہو وہاں سے چلے جانا (۸) خدا کی منت پوری کرنا (۹) جو قسم گناہ کی بات پر نہ ہو اس کو پوری کرنا (۱۰) ٹوٹی ہوئی قسم کا کفارہ دینا (۱۱) جتنا بدن ڈہانکنا فرض ہے، اس کو ڈھانکنا (۱۲) قربانی کرنا (۱۳) مردے کا کفن دفن کرنا (۱۴) کسی کا قرض آتا ہو اس کو ادا کرنا (۱۵) لین دین میں خلاف شرع باتوں سے بچنا (۱۶) سچی گواہی کا نہ چھپانا (۱۷) اگر نفس تقاضا کرے نکاح کر لینا (۸) جو اپنی حکومت میں ہیں ان کا حق ادا کرنا (۱۹) ماں باپ کو آرام پہنچانا (۲۰) اولاد کی پرورش کرنا (۲۱) ناتے داروں سے بدسلوکی نہ کرنا (۲۲) آقا کی تابعداری کرنا (۲۳) انصاف کرنا۔ (۲۴) مسلمانوں کی جماعت سے الگ کوئی طریقہ نہ نکالنا (۲۵) حاکم کی تابعداری کرنا مگر خلاف شرع باتوں میں نہ کرے (۲۶) لڑنے والوں میں صلح کرانا (۲۷) نیک کام میں مدد دینا (۲۸) نیک راہ بتلانا بری بات سے روکنا (۲۹) اگر حکومت ہو شرع کے موافق سزا دینا (۳۰) اگر وقت آئے دین کے دشمنوں سے لڑنا (۳۱) امانت کا ادا

کرنا (۳۲) ضرورت والے کو قرض دینا (۳۳) پڑوسی کی خاطر داری رکھنا (۳۴) آمدنی پاک لینا (۳۵) خرچ شرع کے موافق کرنا (۳۶) سلام کا جواب دینا (۳۷) اگر کوئی چھینک لے کر الحمد للہ کہے تو اس کو یرحمک اللہ کہنا (۳۸) کسی کو ناحق تکلیف نہ دینا (۳۹) خلاف شرع کھیل تماشوں سے بچنا (۴۰) راستہ میں سے ڈھیلا پتھر کانٹا لکڑی ہٹا دینا"۔

اگر الگ الگ ان باتوں کا ثواب معلوم کرنا ہو تو فروع الایمان (مصنفہ علیہ الرحمہ) دیکھو۔

پورا اور پکا مسلمان بننا بالکل اپنے اختیار میں ہے: یہاں پھر وہی سوال ہے، کہ ادھورا نہیں پورا اور پکا مسلمان ہونے کے لئے قلب و زبان اور جسم و جوارح کے جن اعمال کو اوپر گنایا گیا ہے ان میں آخر کس بات میں انگریزوں کی حکومت یا ہندوؤں کی عداوت مانع و مزاحم ہے؟ اور جن کو بغیر سیاسی آزادی یا بلا حکومت الٰہیہ کے قیام کے پورا نہیں کیا جا سکتا؟ صرف دو ایک باتیں جہاد و حکومت کے احکام سے البتہ ایسی تعلق رکھتی ہیں، جو شخصی و انفرادی تدبیر و اختیار سے باہر ہیں، اور جو چیزیں اختیار سے باہر ہیں ان کی تکلیف ہی سرے سے کب ہے۔ بلاشبہ ان کے لئے حسب استطاعت تدابیر اختیار کرنے کی تکلیف ہے۔ وہ بھی شریعت کے اصول و حدود کے موافق۔ لیکن اس کے لئے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے، کہ دینی احکام و اعمال بالکل ہمارے شخصی اختیار میں ہیں ایک طرف ان کو ترک کریں دوسری طرف محض جاہ و مال کی طلب میں کونسل و اسمبلی کی ممبریوں وزارتوں اور نوکریوں کے لئے شریعت کے حدود و اصول کو بے دھڑک توڑتے پھریں۔

اسلامی جنگ و جہاد و سیاست و حکومت سب کچھ محض دین کی حفاظت اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے ہے۔ لیکن ہماری سیاست حاضرہ میں ایسے کتنے شریک ہیں، جن کے پیش نظر دنیاوی مقاصد و منافع جاہ و منصب کے علاوہ دین کی حفاظت اور نفس کی سربلندی کی طلب کے علاوہ کلمہ حق کی سربلندی کا قلب میں خطرہ بھی آتا ہو۔ جو لوگ نماز تک کے عمداً تارک ہیں خدا کے آگے کبھی سر نہیں جھکاتے، مسجدوں کے اندر قدم نہیں رکھتے آخر ان کے

متعلق یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ وہ کونسل و اسمبلی کے اندر اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کے لئے داخل ہوتے ہیں۔

پھر غضب یہ کہ اس سراسر دنیا طلبی و نفس پروری کو حق بجانب ٹھہرانے کے لئے نام دین کا لیا جاتا ہے اور قرآن و حدیث کے حوالے دیئے جاتے ہیں۔ کیا یہ دین فروشی (" یشترون بایات اللہ ثمنا قلیلا ") کی بنی اسرائیلی راہ کے سوا کچھ اور ہے۔ اور جو لوگ ٹھیک اس وقت جب کہ مسجدوں میں مغرب کی اذان ہو رہی ہو زندہ باد مردہ باد کے نعرے لگاتے پھرتے ہوں کیا ان کی یہ بیباکی اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے کے سوا اس کی نصرت کی امید کا کوئی حق رکھتی ہے!۔

یہ تو ہماری دینی بیماری کی علامات ہیں لیکن حضرت مجدد وقت علیہ الرحمہ کی نظر علامات سے زیادہ اسباب مرض اور تدابیر علاج پر رہتی ہے اور یہ دونوں ابواب حضرت کی مجددانہ جامعیت کے اس درجہ حکیمانہ وحاذقانہ ہوتے ہیں کہ اگر مریض تدابیر کے اختیار اور بد پرہیزی سے احتراز کی ہمت کر لے تو انشاء اللہ مرض کے مہلک سے مہلک درجہ میں بھی شفا یقینی ہے۔

دین کی ساری بیماریوں کے دو ہی سبب ہیں: ایک تو خود اپنے اندر کا نفس اور شیطان بلکہ دراصل صرف نفس اس لئے کہ شیطان کا بس بندہ نفس ہی پر چلتا ہے، اور دوسرا بیرونی تعدیہ یعنی صحبت یا ملنے جلنے والوں کا اثر ساتویں حصہ کے آخر میں انہیں دونوں اسباب مرض اور ان کی تدبیر علاج کی طرف اس طرح متوجہ فرمایا گیا ہے کہ

> "اوپر جتنی اچھی بری باتوں کا اور ثواب اور عذاب کی چیزوں کا بیان آیا ہے اس میں دو چیزیں کھنڈت ڈالتی ہیں ایک تو خود اپنا نفس کہ ہر وقت گود میں بیٹھا ہوا طرح طرح کی باتیں سوجھاتا رہتا ہے۔ نیک کاموں میں بہانے نکالتا رہتا ہے اور برے کاموں میں ضرورتیں بتلاتا رہتا ہے اور عذاب سے ڈراؤ تو اللہ تعالیٰ کا غفور رحیم ہونا یاد دلاتا ہے (مگر ہم میں اب ایسے نفوس بھی کتنے ملیں گے جو عذاب سے اپنے نفس کو ڈراتے بھی ہوں!) اور اوپر سے

شیطان سہارا دیتا ہے۔ اور دوسرے کھنڈت ڈالنے والے وہ آدمی ہیں جو اس سے طرح طرح کا واسطہ رکھتے ہیں یا تو عزیز و قریب ہیں یا جان پہچان والے ہیں یا برادری کنبے کے ہیں یا اس کی بستی کے ہیں؛" نمبر ۹۷

ایک اعتبار سے یہ دوسرا سبب پہلے سے بھی زیادہ مہلک ہے. کہ اس کی نوعیت وباء تعدیہ کی سی ہوتی ہے. جس کی تفصیل یوں فرمائی گئی ہے کہ

"بعضے گناہ تو اس واسطے ہوتے ہیں کہ ان کے پاس بیٹھ کر ان کی بری باتوں کا اثر اس میں آ جاتا ہے اور بعضے گناہ ان کی خاطر سے ہوتے ہیں اور بعضے . اس واسطے ہوتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں ہلکا پن نہ ہو اور بعض گناہ اس لئے ہو جاتے ہیں کہ وہ لوگ اس کے ساتھ برائی کرتے ہیں کچھ وقت اس برائی کے رنج میں کچھ وقت ان کی غیبت میں اور کچھ وقت ان سے بدلے لینے کی فکر میں خرچ ہوتا ہے اور پھر اس سے طرح طرح کے گناہ پیدا ہو جاتے ہیں" ص ۸۰

جن کو دور کرنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں: "غرض ساری خرابی اس نفس کی تابعداری اور آدمیوں سے بھلائی کی امید رکھنے کی ہے۔ اس لئے ان کی خرابی سے بچنے کے لئے دو باتیں ضروری ٹھہریں ایک تو یہ نفس کو دبانا اور اس کو کبھی بہلا پھسلا کر کبھی ڈانٹ ڈپٹ کر دین کی راہ پر لگانا دوسرے سب آدمیوں سے زیادہ لگاؤ نہ رکھنا اور اس بات کی پرواہ نہ کرنا کہ وہ اچھا کہیں گے اس لئے دونوں ضروری باتوں کو الگ الگ لکھا جاتا ہے۔" ص ۸۰

"نفس کے ساتھ برتاؤ کا بیان" اس کا کلی علاج یہ تجویز فرمایا گیا ہے کہ۔

"پابندی کے ساتھ تھوڑا سا وقت صبح کو اور تھوڑا سا شام کو یا سوتے وقت مقرر کر لو اس وقت میں اکیلے بیٹھ کر اور اپنے دل کو جہاں تک ہو سکے سارے خیالوں سے خالی کر کے اپنے جی سے یوں باتیں کیا کرو اے نفس خوب سمجھ لے کہ تیری مثال دنیا میں ایک سوداگر کی سی ہے پونجی تیری عمر

ہے اور نفع اس کا یہ ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کی بھلائی یعنی آخرت کی نجات حاصل کرے۔ اگر یہ دولت حاصل کر لی تو سوداگری میں نفع ہوا اور اگر اس عمر کو یوں ہی کھو دیا اور بھلائی اور نجات حاصل نہ کی تو اس سوداگری میں بڑا ٹوٹا اٹھایا کہ پونجی بھی گئی اور نفع بھی نصیب نہ ہوا یہ پونجی ایسی قیمتی ہے کہ اس کی ایک گھڑی بلکہ ایک ایک سانس بے انتہاء قیمت رکھتی ہے اور کوئی خزانہ کتنا ہی بڑا ہو اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ کیونکہ خزانہ اگر جاتا رہے، تو کوشش سے اس کی جگہ دوسرا خزانہ مل سکتا ہے اور یہ عمر جتنی گزرتی ہے، اس کا ایک پل بھی لوٹ کر نہیں آسکتا، نہ دوسری اور عمر مل سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس عمر سے کتنی بڑی دولت کما سکتے ہیں، یعنی ہمیشہ کے لئے بہشت اور خدا تعالیٰ کی خوشنودی اور دیدار۔

اتنی بڑی کسی خزانہ سے کوئی نہیں کما سکتا، اس لئے یہ پونجی بہت ہی قدر اور قیمت کی ہوئی۔ اور اے نفس اللہ تعالیٰ کا احسان مان کہ ابھی تیری موت نہیں آئی، جس سے یہ عمر ختم ہو جاتی۔ خدا تعالیٰ نے آج کا دن اور دیدیا ہے، اور اگر تو مرنے لگے تو ہزاروں دل و جان سے آرزو کرے کہ ہم کو ایک دن کی عمر اور مل جائے تو اس ایک دن میں سارے گناہوں سے سچی اور پکی توبہ کرلوں، اور پکا وعدہ اللہ تعالیٰ سے کرلوں کہ پھر ان گناہوں کے پاس نہ پھٹکوں گا اور وہ سارا دن خدا تعالیٰ کی یاد اور تابعداری میں گزار دوں۔ جب مرنے کے وقت تیرا یہ حال اور خیال ہو، تو اپنے دل میں تو یوں ہی سمجھ لے کہ گویا، میری موت کا وقت آگیا ہے، اور میرے مانگنے سے اللہ تعالیٰ نے آج کا یہ دن اور دے دیا ہے، اور اس دن کے بعد معلوم نہیں کہ دوسرا دن نصیب ہو گا یا نہیں، تو اس دن کو اس طرح گزارنا چاہئے جیسے عمر کا آخیر دن معلوم ہو جاتا اور اس کو گزارتا، یعنی سب گناہوں سے پکی توبہ کرلے اور اس دن کوئی چھوٹی یا بڑی نافرمانی نہ کرے اور تمام دن اللہ تعالیٰ کے دھیان اور خوف میں گزار دے۔ اور کوئی حکم خدا کا نہ چھوڑے، جب وہ سارا دن

اس طرح گزر جائے پھر اگلے دن یوں ہی سوچے، کہ شائد عمر کا اب یہی ایک دن باقی رہ گیا ہو۔ اور اے نفس اس دھوکے میں نہ آنا کہ اللہ تعالیٰ معاف کریں گے۔ اول تو تجھ کو کیسے معلوم کہ معاف ہی کر دیں گے اور سزا نہ دیں گے، بھلا اگر سزا ہونے لگے تو اس وقت کیا کرے گا، اور اس وقت کتنا پچھتانا پڑے گا۔ اور ہم نے مانا معاف ہی ہو گیا تب بھی تو نیک کام کرنے والوں کو جو انعام اور مرتبہ ملے گا وہ تجھ کو نصیب نہ ہو گا۔ پھر جب تو اپنی آنکھ سے اوروں کو ملنا اور اپنا محروم ہونا دیکھے گا کس قدر حسرت و افسوس ہو گا۔ اس پر اگر نفس سوال کرے کہ بتلاؤ پھر میں کیا کروں اور کس طرح کوشش کروں تو تم اس کو جواب دو کہ یہ کام کر کہ جو چیز تجھ سے مر کر چھوٹنے والی ہے، یعنی دنیا اور بری عادتیں، تو اس کو ابھی سے چھوڑ دے، اور جس سے تجھ کو سابقہ پڑنے والا ہے۔ یعنی اللہ اور اس کو راضی کرنے کی باتیں ان کو ابھی سے لے بیٹھ اور اس کی یاد اور تابعداری میں لگ جا۔ اور بری عادتوں کا بیان اور ان کے چھوڑنے کا علاج اور خدا تعالیٰ کے راضی کرنے کی باتوں کی تفصیل اور ان کے حاصل کرنے کی تدبیر خوب سمجھا سمجھا کر اوپر لکھدی ہے، اس کے موافق کوشش اور برتاؤ کرنے سے دل سے برائیاں نکل جاتی ہیں اور نیکیاں جم جاتی ہیں"۔

"اور اپنے نفس سے کہو کہ اے نفس تیری مثال بمار کی سی ہے اور بیمار کو پرہیز کرنا پڑتا ہے، اور گناہ کرنا بدپرہیزی ہے۔ اس واسطے اس سے پرہیز کرنا ضروری ہوا اور یہ پرہیز اللہ تعالیٰ نے ساری عمر کے لئے بتلا رکھا ہے۔ بھلا سوچ تو سہی اگر دنیا کا کوئی ادنیٰ سا حکیم کسی سخت بیماری میں تجھ کو بتلادے کہ فلانی مزیدار چیز کبھی کھائے گا اس سے بیماری کو سخت نقصان پہنچے گا اور تو سخت تکلیف میں مبتلا ہو گا، اور فلانی کڑوی دوا روزمرہ کھاتے رہو تو اچھے رہو گے تو یقینی بات ہے کہ اپنی جان اگر پیاری ہے تو اس حکیم کے کہنے سے کیسی ہی مزیدار چیز ہو ساری عمر کے لئے چھوڑ دے گا، اور دوا کیسی ہی

بدمزہ ہو آنکھ بند کرکے اس کو نگل جایا کرے گا۔ تو ہم نے مانا کہ گناہ بڑے مزیدار ہیں اور نیک کام بہت ناگوار ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان مزیدار چیزوں کا نقصان بتلایا ہے اور ناگوار کاموں کو فائدہ مند فرمایا ہے. پھر نقصان اور فائدہ بھی کیا ہمیشہ ہمیشہ کا جس کا نام دوزخ اور جنت ہے. تو اے نفس تعجب اور افسوس ہے کہ جان کی محبت میں ادنیٰ حکیم کے کہنے کا تو یقین کرلے اور اس کا پابند ہو جائے اور اپنے ایمان کی محبت میں اللہ تعالیٰ کے کہنے پر دل نہ جمائے اور گناہوں کو چھوڑنے کی ہمت نہ کرے. اور نیک کاموں سے پھر بھی جی چرائے تو کیسا مسلمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمانے کو ایک چھوٹے سے حکیم کے کہنے کے برابر نہ سمجھے اور کیسا بے عقل ہے کہ جنت کے ہمیشہ ہمیشہ کے آرام کی دنیا کے تھوڑے دنوں کے برابر بھی قدر نہ کرے اور دوزخ کی اتنی سخت اور دراز تکلیف سے دنیا کی تھوڑے دنوں کی تکلیف کے برابر بھی بچنے کی کوشش نہ کرے۔

"اور نفس سے یوں کہو کہ اے نفس دنیا سفر کا مقام ہے. اور سفر میں پورا آرام ہرگز میسر نہیں ہوا کرتا۔ طرح طرح کی تکلیفیں جھیلنی پڑتی ہیں. مگر مسافر اس لئے ان تکلیفوں کو سہ لیتا ہے کہ گھر پہنچ کر پورا آرام مل جائے گا۔ بلکہ اگر ان تکلیفوں سے گھبرا کر کسی سرائے میں ٹھہر کر اس کو اپنا گھر بنائے اور سب سامان آسائش کے وہاں جمع کرلے. تو ساری عمر بھی گھر پہنچنا نصیب نہ ہو نہ گھر کی راحت ملے اسی طرح دنیا میں جب تک رہنا ہے محنت و مشقت کو سہ لینا چاہئے۔ عبادت میں بھی محنت ہے اور گناہوں کے چھوڑنے میں بھی مشقت ہے اور بھی طرح طرح کی مصیبت ہے. لیکن آخرت ہمارا گھر ہے وہاں پہنچ کر سب مصیبت کٹ جائے گی۔ یہاں کی ساری محنت مشقت کو جھیلنا چاہئے اگر یہاں آرام ڈھونڈھا تو گھر جاکر آرام کا سامان ملنا مشکل ہے. اور وہاں جانا لازم ہے یہ کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ وہاں نہ جائیں۔ بس یہ سمجھ کر دنیا کی راحت اور لذت کی ہوس نہ کرنا چاہئے۔ اور آخرت کی درستی

کے لئے ہر طرح کی محنت کو خوشی سے اٹھانا چاہئے۔

"غرض ایسی ایسی باتیں کر کے نفس کو راہ پر لگانا چاہئے اور روز مرہ اسی طرح سمجھانا چاہئے۔ اور یاد رکھو کہ اگر تم خود اس طرح اپنی بھلائی اور درستی کی کوشش نہ کرو تو کون آئے گا جو تمہاری خیر خواہی کرے گا اب تم جانو اور تمہارا کام (از ص ۸۰ تا ص ۸۳ ساتواں حصہ)

عام آدمیوں سے برتاؤ۔ اس کے بعد پھر "عام آدمیوں سے برتاؤ کا بیان" اس طرح ہے کہ

"عام آدمی تین طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جن سے دوستی کا علاقہ ہے. دوسرے جن سے صرف جان پہچان ہے. تیسرے جن سے جان پہچان بھی نہیں۔ اگر ان کے ساتھ ملنا بیٹھنا ہو تو ان باتوں کا خیال رکھو کہ وہ جو ادھر ادھر کی باتیں اور خبریں بیان کریں ان کی طرف کان مت لگاؤ۔ وہ کچھ واہی تباہی بکیں ان سے بالکل بہرے بن جاؤ۔ ان سے بہت مت ملو ان سے کوئی امید و التجا مت کرو اگر کوئی بات ان میں خلاف شرع دیکھو تو اگر تمہاری نصیحت مان لینے کی امید ہو تو بہت نرمی سے سمجھا دو۔"

دوستی کس سے کرے۔ اور جن سے دوستی زیادہ اور راہ و رسم ہے ان میں اس کا خیال رکھو کہ اول تو ہر کسی سے دوستی اور راہ رسم مت پیدا کرو ہر آدمی دوستی کے قابل نہیں ہوتا۔ البتہ جس میں پانچ باتیں ہو اس سے راہ رسم رکھنے میں مضائقہ نہیں (۱) عقلمند ہو کیونکہ بیوقوف سے اول تو دوستی کا نباہ نہیں ہوتا دوسرے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فائدہ پہنچانا چاہتا ہے. مگر بیوقوفی کی وجہ سے الٹا نقصان کر گزرتا ہے (۲) دوسری بات یہ کہ اس کے اخلاق و عادات اور مزاج اچھا ہو. اپنے مطلب کی دوستی نہ ہو اور غصہ کے وقت آپے سے باہر نہ ہو جائے ذرا ذرا سی بات میں طوطے کی سی آنکھیں نہ

بدلے۔ (۳) دیندار ہو کیونکہ جو شخص دیندار نہیں، جب وہ خدا تعالیٰ کا حق ادا نہیں کرتا، تو تم کو اس سے کیا امید۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ جب تم بار بار اس کو گناہ کرتے دیکھو گے اور دوستی کی وجہ سے نرمی کرو گے تو تم کو بھی گناہ سے نفرت نہ رہے گی۔ تیسری خرابی یہ ہے کہ اس کی صحبت کا اثر تم کو بھی پہنچے گا اور ویسے ہی گناہ تم سے بھی ہونے لگیں گے۔

(۴) اس کو دنیا کی حرص نہ ہو کیونکہ حرص والے کے پاس بیٹھنے سے ضرور دنیا کی حرص بڑھتی ہے۔ اور جس کو خود حرص نہ ہو موٹا جھوٹا کھانا کپڑا ہو، دنیا کی ناپائداری کا ذکر ہو اس کے پاس بیٹھ کر جو کچھ تھوڑی بہت حرص ہو وہ بھی نکل جاسکتی ہے (۵) جھوٹ بولنے کی عادت نہ ہو۔ جھوٹ بولنے والے کا کچھ اعتبار نہیں، خدا جانے اس کی کس بات کو سچا سمجھ کر آدمی دھوکے میں آجائے۔

دوستی کے حقوق:۔ "ان پانچ باتوں کا خیال تو دوستی پیدا کرنے سے پہلے کرلینا چاہئے اور جب کسی سے دوستی اور راہ رسم پیدا کرلی اب اس کا حق اچھی طرح ادا کرو جہاں تک ہوسکے اس کی ضرورت میں کام آؤ۔ اگر خدا تعالیٰ گنجائش دیں اس کی مدد کرو، اس کا بھید کسی سے نہ کہو جو کوئی اس کو برا کہے اس کو خبر مت کرو۔ جب وہ بات کرے کان لگا کر سنو۔ اگر اس میں کوئی عیب دیکھو نرمی و خیرخواہی سے تنہائی میں سمجھاؤ۔ اگر اس سے کوئی خطا ہوجائے درگزر کرو، اس کی بھلائی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔

عام جان پہچان والوں سے احتیاط:۔ "اب رہ گئے وہ آدمی جن سے صرف جان پہچان ہے ایسے آدمیوں سے بڑی احتیاط درکار ہے کیونکہ جو دوست ہیں وہ تمہارے بھلے میں ہیں اور جن سے جان پہچان بھی نہیں وہ اگر

بھلے میں نہیں تو برائی میں بھی نہیں۔ اور جو بیچ کے رہ گئے جن سے نہ دوستی ہے نہ بالکل انجان زیادہ تکلیف اور برائی ایسوں ہی سے پہنچتی ہے کہ زبان سے تو دوستی اور خیر خواہی کا دم بھرتے ہیں اور اندر ہی اندر جڑیں کھودتے ہیں اور حسد کرتے ہیں اور ہر وقت عیب ڈھونڈھا کرتے ہیں اور بدنام کرنے کی فکر میں رہتے ہیں .... اور اگر کوئی تمہاری عزت و خاطر داری کرے یا تمہاری تعریف کرے اور محبت ظاہر کرے تو اس کے دھوکے میں مت آجانا اور اس کے بھروسہ میں مت رہنا کیونکہ بہت کم آدمی ہیں جن کا ظاہر و باطن ایک سا ہو. اور بہت کم اطمینان ہے کہ ان کا یہ برتاؤ صاف دل سے ہو اس کی امید ہرگز کسی سے مت رکھو...... خلاصہ یہ کہ کسی سے کسی طرح کی بھلائی کی امید مت رکھو نہ کسی قسم کے فائدے پہنچنے کی اور نہ کسی نظر میں آبرو بڑھنے کی اور نہ کسی کے دل میں محبت پیدا ہونے کی۔ جب کسی سے کوئی امید نہ ہوگی، تو پھر کوئی کیسا ہی برتاؤ تم سے کرے ذرا رنج نہ ہوگا۔ اور خود جہاں تک ہو سکے سب کو فائدہ پہنچاؤ اگر کسی کی کوئی بھلائی کی بات سمجھ میں آئے اور یقین ہو کہ وہ مان لے گا تو اس کو بتلادو نہیں تو خاموش رہو۔ اگر کسی سے کوئی فائدہ پہنچ جائے، تو اللہ کا شکر کرو اور اس شخص کے لئے دعا کرو اور کسی سے کوئی نقصان یا تکلیف پہنچے یوں سمجھو کہ میرے گناہ کی سزا ہے اللہ سے توبہ کرو اور اس شخص سے رنج مت رکھو۔ غرض نہ مخلوق کی بھلائی کو دیکھو نہ برائی کو بلکہ ہر وقت اللہ تعالیٰ پر نگاہ رکھو اور ان ہی سے کام رکھو اور ان ہی کی تابعداری اور یاد میں لگے رہو۔ اللہ تعالیٰ اس کی توفیق بخشیں (از ص ۸۴ تا ص ۸۷)

باطن کی درستی:۔ پھر آخر میں "قلب کی صفائی اور باطن کی درستی کی ضرورت" ایک ضمیمہ میں بتلائی گئی ہے۔ اس میں اصلاح باطن اور ظاہر و باطن کے تعلق کی نسبت بعض اہم کوتاہیوں اور مہلک غلط فہمیوں کو رفع فرمایا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ:۔

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلا شبہ اللہ تعالیٰ (فقط) تمہارے جسموں کی طرف نہیں دیکھتے نہ (خالی) تمہاری صورتوں کی طرف بلکہ تمہارے دلوں کو دیکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے اعمال کو قبول نہیں کرتے جو فقط ظاہر میں اچھے معلوم ہوں اور دل کی توجہ اور خلوص سے خالی ہوں ...... یہ غرض نہیں کہ ظاہری اعمال کا بالکل اعتبار نہیں. اعتبار ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ دل کی توجہ اور اخلاص بھی اس کے ساتھ ہو. جیسا کہ حدیث و قرآن سے ثابت ہے ...... مثلاً کوئی ظاہر میں مسلمان ہو اور دل سے نہ ہو تو اس کے اسلام کا خداوند کریم کے نزدیک کچھ بھی اعتبار نہیں۔ اسی طرح کوئی محض دکھانے وغیرہ کسی بری نیت سے نماز پڑھے. خیر خیرات کرے تو وہ کسی شمار میں نہیں۔ گو فرض اس صورت میں بھی اتر جائے گا اور کچھ ثواب بھی ملے گا مگر ساتھ ہی گناہ بھی ہو گا اور پورے ثواب سے محروم رہے گا۔

ظاہر و باطن کا غیر منفک تعلق:۔ "لہٰذا معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہمارے اعمال کے مقبول ہونے کا مدار دل کی اصلاح و درستی پر ہے۔ لوگوں نے آج کل اس میں بہت زیادہ کوتاہی کر رکھی ہے۔ محض ظاہری اعمال تو کچھ تھوڑے بہت کرتے ہیں. اور ان کا علم بھی حاصل کر لیتے ہیں مگر باطن کی اصلاح اور قلب کی درستی کی کچھ فکر نہیں۔ گویا یہ خیال کرتے ہیں کہ باطن کی اصلاح ریا کینہ حسد وغیرہ کا علاج اور ان سے محفوظ رہنا کچھ ضرور نہیں. فقط ظاہری اعمال کو واجب جانتے اور نجات کے لئے کافی خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ اصل مقصود قلب کی اصلاح ہے. جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے اور ظاہری اعمال ذریعہ ہیں قلب کے درست ہونے کا ظاہر و باطن میں کچھ ایسا قدرتی تعلق ہے کہ بغیر ظاہری حالت درست کئے باطنی حالت درست نہیں ہوتی اور جب تک ظاہری حالت پر دوام نہ ہو باطنی

اصلاح بھی قائم نہیں رہتی اور جب باطنی حالت درست ہو جاتی ہے تو ظاہری اعمال خوب اچھی طرح ادا ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی بے عقل یہ نہ سمجھ لے کر ظاہری اعمال کی اس وقت تک حاجت ہے جب تک قلب کی حالت درست نہ ہو جائے. اور جب قلب درست ہو گیا تو پھر ظاہری اعمال کی کچھ حاجت نہیں خواہ کریں خواہ نہ کریں اس لئے کہ یہ عقیدہ کفر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب قلب درست ہو گا تو وہ تو خود ہی حتی المقدور طاعت الٰہی میں مصروف رہے گا۔ اور یہی علامت ہے اس کے درست ہونے کی۔ کیونکہ مقصود اصلاح قلب سے یہی ہے. کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو. اس کا شکر کیا جائے. اس کی نافرمانی نہ ہو۔ اور نماز روزہ وغیرہ کی طاعت الٰہی ہونا ظاہر ہے. تو جب یہ طاعات چھوڑ دی گئیں تو قلب کہاں درست رہا۔ اگر درست رہتا تو مثل اولیائے کرام اور انبیاء علیہم السلام کے طاعات میں ضرور لگا رہتا۔ کیا نعوذ باللہ کسی احمق کو یہ بھی وسوسہ ہو سکتا ہے کہ کسی کا قلب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک سے بڑھ کر صاف و درست ہے. جو اس کو عبادت ظاہری کی حاجت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو باوجود اکمل الکاملین اور افضل المرسلین ہونے کے ظاہری اعمال میں اس قدر مصروف تھے کہ دیکھنے والوں کو بھی رحم آتا تھا............ لہٰذا مسلمانو خوب سمجھ لو کہ جس طرح ظاہری اعمال مثل صوم و صلوٰۃ وغیرہ کا ادا کرنا اور ان کے ادا کرنے کا طریقہ جاننا واجب ہے. اسی طرح باطنی اعمال جیسے صوم و صلوٰۃ وغیرہ کا ریا و نمود وغیرہ سے محفوظ رکھنا. کینہ حسد و غضب وغیرہ سے قلب کو صاف رکھنا اور ان اعمال کے ادا کرنے کا طریقہ جاننا بھی واجب ہے...... حدیث میں ہے کہ دو رکعت نماز ایسے پرہیز گار کی جو شبہ کی چیزوں سے بچتا ہو اس شخص کی ہزار رکعت سے افضل ہے جو شبہ کی چیزوں سے نہ بچے۔ ظاہر ہے کہ یہ فضیلت بغیر صفائی قلب اور اصلاح باطن کے میسر نہیں ہو سکتی۔ جو امراض باطنی سے تندرست نہیں وہ تو واجبات بھی ٹھیک طور سے ادا نہیں کر سکتا۔

اور حرام چیزوں سے بچنے پر بھی پورا قادر نہیں پھر مشتبہ چیزوں سے کیسے بچ سکتا ہے...... لہٰذا مسلمان کو لازم ہے کہ ظاہر و باطن کی کامل اصلاح کرے کہ یہی ذریعہ نجات ہے۔ "

اصل بات یہ ہے کہ اگر ہماری نظر صرف دنیا کے چند روزہ نفع و ضرر پر نہ ہو اور آخرت کی ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی زندگی کا کچھ بھی خیال و اہتمام ہو تو پھر انشاء اللہ ظاہر و باطن کی اصلاح آسان ہے اسی لئے آگے متنبہ فرمایا کہ۔

" اگر تم بیمار ہو اور تمہارا جسم مریض تو کیا یہ گوارا کرو گے کہ مرض میں مبتلا رہو اور باوجود قدرت کے علاج نہ کرو یہاں تک کہ وہ مرض تم کو ہلاک کر دے۔ ہرگز نہیں گوارا کر سکتے حالانکہ اس مرض سے جو تکلیف ہوگی۔ وہ جسمانی تکلیف پھر وہ بھی چند روزہ دنیا ہی میں ہے۔ پس جب یہ گوارا نہیں تو روحانی امراض میں مبتلا رہنا جس کی وجہ سے ایسی جگہ تکلیف ہو جہاں ہمیشہ رہنا ہے. عقل سلیم کے بالکل خلاف ہے۔ "

" فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبردار رہو اس بات سے کہ بدن میں ایک جز (اور وہ ایک بوٹی) ہے. جب وہ درست ہوتا ہے تو تمام بدن درست ہوتا ہے. اور جب وہ فاسد ہو جاتا ہے تو تمام بدن فاسد اور خراب ہو جاتا ہے اور آگاہ رہو وہ دل ہے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا۔ مطلب یہ کہ اعضا کی درستی اور اطاعت خداوندی بجالانا موقوف ہے قلب کی درستی پر کیونکہ قلب سلطان البدن ہے اور رعیت کی صلاح موقوف ہوتی ہے سلطان کے صالح ہونے پر۔ سو اعضا نیک کام جب ہی کریں گے جب قلب صالح ہو۔ لہٰذا اصلاح قلب میں کوشش کرنا واجب قرار پایا........... دیکھئے شریعت نے ایسی حالت میں جب کہ انسان کو بھوک کی خواہش ہو اور اس حالت میں نماز پڑھنے سے طبیعت پریشان ہو تو حکم دیا ہے کہ ایسی حالت میں پڑھنا مکروہ ہے۔ پہلے کھانا کھالو پھر نماز پڑھو۔ بشرطیکہ

نماز کا وقت فوت نہ ہو جائے۔ تو اس میں حکمت یہی ہے کہ مقصود عبادت سے اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری اور اظہار بندگی ہے اس طرح کہ ظاہر و باطن سب اس کی طرف مشغول و متوجہ ہوں اور غیر اللہ کی طرف حتی الامکان توجہ نہ رہے اور جب بھوک لگی ہو تو ظاہر ہے بدن نماز میں مشغول ہو گا اور قلب پریشان ہو گا۔ "

"ایک اور حدیث میں ہے کہ فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ دو رکعت نماز درمیانی طور پر پڑھنا بہتر ہے رات بھر نماز پڑھنے سے ایسی حالت میں کہ قلب غافل ہو............ مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص صرف دو رکعت نماز پڑھے اور درمیانی طور پر ادا کرے اس طرح کہ اس کے فرائض و سنن کو حضور قلب کے ساتھ ادا کرے قرات وغیرہ طویل نہ ہو ایسی دو رکعتیں نہایت عمدہ و مقبول ہیں رات بھر غفلت قلب کے ساتھ نماز پڑھنے سے۔ اس حدیث سے اہتمام قلب کی کس قدر تاکید معلوم ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ فی الحقیقت فعل کی کیفیت دیکھی جاتی ہے کہ کام کیسا کیا اور نری کمیت مطلوب نہیں کہ کتنا کام کیا۔ اگرچہ تھوڑا ہی کام ہو مگر باقاعدہ اور عمدہ ہو تو وہ حق تعالیٰ کے ہاں محبوب و مقبول ہے اور اگر بہت سا کام ہو لیکن بے ضابطہ و بے قاعدہ غفلت سے ہو وہ ناپسند ہے خوب سمجھ لو۔ "

دنیا کے کام بھی باطن کی خرابی سے خراب ہوتے ہیں: دین پر کیا موقوف دنیا کے سارے اجتماعی و سیاسی کام جن پر ہم جان دیتے ہیں وہ بھی زیادہ تر محض دلوں کی خرابی کی وجہ سے خراب و تباہ ہوتے ہیں۔ قلوب میں جب نفسانیت و خود غرضی بغض و حسد کے سوا کچھ نہ ہو تو دنیاوی کاموں میں بھی نااتفاقی پراگندگی. سازش اور ایک دوسرے کی بیخ کنی کے سوا کیا رہ جا سکتا ہے۔ جس کا شرمناک تماشہ افراد اور جماعتوں سب میں دن رات ہمارے سامنے ہے۔ خصوصاً لادینی سیاست و معاشرت میں تو دلوں کی یہ خرابی اس کی عین آبادی اور بڑا تدبر و دانائی ہے۔

عورتوں کا قرآن و حدیث میں خصوصی ذکر۔ چونکہ بہشتی زیور کا اصلاً تعلق عورتوں کی اصلاح و حفاظت دین سے ہے، اس لئے اس کے آٹھویں حصہ میں انبیاء اولیاو سلاطین کے گھرانوں کی ایسی نیک بیبیوں کے مختصر مختصر حالات مذکور ہیں کہ ان کی نیک مثالوں سے نیکی کی ہمت و سبق حاصل کریں۔ نیز بری عورتوں کی برائیوں اور مکاریوں کے کچھ قصے ہیں تاکہ عبرت حاصل ہو۔ پھر اسی حصہ میں ایک رسالہ بنام کسوۃ النسوہ شامل فرمایا گیا ہے، جس میں ایسی آیتوں حدیثوں کا خلاصہ و ترجمہ درج ہے، جن میں اللہ و رسول نے خاص کر نیک بیبیوں کی خصلت اور تعریف اور درجے بیان فرمائے ہیں۔ کیونکہ بیبیوں کو جب خبر ہوگی کہ ان میں اللہ و رسول نے ارادہ کر کے خاص ہمارا ہی بیان فرمایا ہے، تو اس سے دل بڑھے گا اور نیک خصلتوں کا زیادہ شوق ہو جاوے گا اور مشکل بات آسان ہو جاوے گی"۔

اس میں ایسی آیتوں اور حدیثوں کا بیان بھی ہے، جن پر عمل سے بی بی میاں کے تعلقات خوشگوار رہ سکیں، جو آج کل خصوصاً موجودہ تہذیب میں عنقا ہے۔ ظاہری اور بناوٹی خوشگواری کے اظہار کے لئے تو اس بے حیائی تک کو اختیار کیا جاتا ہے کہ بیبیوں کو بنا سنوار کر بازاروں اور شاہ راہوں پر بغل میں لے کر پھرایا جاتا ہے اور اپنے پرائے دوستوں اور عزیزوں سب کی صحبت میں بے تکلف خلاملا اور ہنسی مذاق تک کی بے غیرتی گوارا کی جاتی ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے ناسور بہتا رہتا ہے۔

> ایک آیت میں ہے کہ "جو عورتیں اپنی عزت و آبرو کو بچاتی ہیں۔ یعنی کسی کے سامنے ہو جانے کا اور کسی کو آواز سنانے کا اور خلاف شرع کپڑے پہننے کا، بے ضرورت کسی سے ہنسی بولنے کا اور بھی ہر طرح کی بے شرمی کا پرہیز رکھتی ہیں اور جو عورتیں اللہ کو بہت یاد رکھتی ہیں .... ایسی عورتوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے بخشش اور بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے جو عورتیں نیک بخت ہوتی ہیں ان میں یہ باتیں ہوتی ہیں کہ وہ تابعدار ہوتی ہیں اور خاوند گھر نہ بھی ہو جب بھی اپنی آبرو کا بچاؤ رکھتی ہیں"۔

"اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے اچھا خزانہ نیک بخت ایسی عورت ہے کہ خاوند اس کے دیکھنے سے خوش ہو اور جب خاوند کوئی کام بتلائے تو اس کو بجالاوے اور جب خاوند گھر میں نہ ہو تو عزت و آبرو تھامے بیٹھی رہے۔ اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت جب پانچ وقت کی نماز پڑھتی رہے اور رمضان کے روزے رکھ لیا کرے اور اپنی آبرو کی حفاظت رکھے اور خاوند کی تابعداری کرے، تو ایسی عورت بہشت میں جس دروازہ سے چاہے داخل ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ دین کی ضروری باتوں کی پابندی رکھے اور بڑی بڑی محنت کی عبادتیں اس کو کرنے کی ضرورت نہیں، جو درجہ مرد کو ان محنت کی عبادتوں سے ملتا ہے وہ عورت کو خاوند کی تابعداری اور اولاد کی خدمت گزاری اور گھر کے بندوبست سے مل جاتا ہے"۔

عورتوں کی اصلی جگہ گھر ہے: جب تک کوئی غیر معمولی صورت یا ضرورت نہ ہو تو عورت کے فطری فرائض و طبعی مناسبت اور تقسیم عمل کی بنا پر اسلامی تعلیم و تہذیب میں اس کی اصلی جگہ گھر کے اندرونی مصروفیات اور اولاد کی پرورش و پرواخت ہے۔ جب تک کوئی شدید ضرورت نہ ہو سفر تک عورتوں کے لئے پسندیدہ نہیں۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بیبیوں کو ساتھ لے کر حج فرمایا تو ارشاد ہوا کہ بس یہ حج تو کر لیا پھر اس کے بعد بوریوں پر جمی بیٹھی رہنا"۔ دوسری حدیث نقل ہے، کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عورت کا اپنے گھر میں گھرستی کا کام کرنا جہاد کرنے والوں کے جہاد کے مرتبہ کو پہنچتا ہے انشاء اللہ تعالیٰ"

ضبط تولید: آج کل "برتھ کنٹرول" کی تبلیغ کا دور دورہ ہے۔ طرح طرح سے اس کی ضرورت و فضیلت ثابت کی جاتی ہے۔ کل پرسوں ہی ۱۰ فروری ۱۹۴۷ء کے ایک انگریزی اخبار میں ہندوستان میں زبردستی کے زبردست قحط کا جو تازہ سرکاری اعلان ہوا ہے، اس کے سلسلہ میں کسی رپورٹ میں تھا کہ بڑا سبب قحط کا آبادی کی کثرت ہے، جو ہندوستان میں

بہت سرعت سے بڑھ رہی ہے، جب تک اس کی روک تھام نہ ہو یہاں کا قحط لاعلاج ہے!
یوں ہی ہوس رانیوں کو ناجائز راہوں سے پورا کرنے کے لئے ضبط تولید کی تبلیغ کیا کچھ گل
یورپ میں کھلا چکی ہے اور یہاں کھلا رہی ہے، اس پر معاشی و سماجی فوائد کے وعظ کا اضافہ
"کڑوا کریلا نیم چڑھا" مغرب کی طرح مشرق میں اور غیروں کی طرح مسلمان عورتوں میں
بھی اب اس فطری فرض سے روگردانی کی آوازیں اٹھنے لگی ہیں۔ بہشتی زیور کے اس حصہ
میں متعدد حدیثیں ایسی بھی نقل فرمائی گئی ہیں، جن میں ضبط تولید کے خلاف تولید کے فرائض
کی فضیلت کا بیان ہے۔ مثلاً

"ارشاد فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (عورتوں سے) کیا تم اس
بات پر راضی نہیں (یعنی راضی ہونا چاہئے) کہ جب تم میں کوئی اپنے شوہر
سے حاملہ ہوتی ہے اور شوہر اس سے راضی ہو، تو اس کو ایسا ثواب ملتا ہے کہ
جیسا اللہ کی راہ میں روزہ رکھنے والے اور شب بیداری کرنے والے کو اور
جب اس کو دردزہ ہوتا ہے تو آسمان و زمین کے رہنے والوں کو اس کی
آنکھوں کی ٹھنڈک (یعنی راحت) کا جو سامان مخفی رکھا گیا ہے اس کی خبر
نہیں، پھر جب وہ بچہ جنتی ہے اس کے دودھ کا ایک گھونٹ بھی نہیں نکلتا اور
اس کی پستان سے ایک مرتبہ بھی بچہ نہیں چوستا جس میں اس کو ہر گھونٹ اور
ہر چوسنے پر ایک نیکی نہ ملتی ہو اور اگر بچہ کے سبب اس کو رات کو جاگنا پڑے
تو اس کو راہ خدا میں ستر غلاموں کے آزاد کرنے کا اجر ملتا ہے"۔

"اس طرح فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت اپنی حالت
حمل سے لے کر بچہ جننے اور دودھ چھڑانے تک ایسی ہے، جیسے اسلام کی راہ
میں سرحد کی نگہبانی کرنے والا اور اگر وہ اس درمیان میں مرجائے تو اس کو
شہید کا ثواب ملتا ہے"۔

ان ترغیبات کا صاف مطلب یہ ہے کہ عورتیں اپنے جنسی و فطری فرائض سے غافل ہو
کر بلا اتفاقی و شدید مواقع کے۔ مردوں کے مردانہ سیاسی معاشی و جنگی مشاغل کی ہوس میں نہ
مبتلا ہو جائیں، جیسا کہ آج کل سیکھا اور سکھلایا جا رہا ہے۔ اور ضبط تولید کا ایک مخفی محرک

یہ بھی ہے کہ عورتوں میں مردانہ مشاغل کی ہوس پیدا کر دی گئی ہے، جس میں تولید کے فرائض مزاحم ہوتے ہیں۔

ایک اور شیطانی سبق۔ اس زمانہ کا یہ بھی کہ عورت و مرد کی بدکاری و نیک کاری مساوی ہے۔ حالانکہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بدکار عورت کی بدکاری ہزار بدکار مردوں کے برابر اور نیک کار عورت کی نیک کاری ستر اولیاء اللہ کی عبادت کے برابر ہے"۔

لباس برہنگی۔ تہذیب جدید کی سوغاتوں میں سے برہنگی اور نیم برہنگی کے فتنوں اور بے شرمیوں سے تو بس کوئی دل کا اندھا ہی اندھا ہو گا گو ایسے اندھوں کی آبادی روز افزوں ہے جو حدیث اس سلسلہ میں نقل فرمائی گئی ہے اس میں اس فتنہ کی کیسی ایمان بخش و عبرت ناک پیشین گوئی ہے کہ "فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں نے ایسی عورتوں کو نہیں دیکھا یعنی میرے زمانے کے بعد ایسی عورتیں پیدا ہوں گی کہ کپڑا پہنے ہوں گی اور ننگی ہوں گی" یعنی نام کو بدن پر کپڑا ہو گا لیکن اس قدر باریک ہو گا کہ تمام بدن نظر آئے گا اور اترا کر بدن کو مٹکا کر چلیں گی"۔

نئی مصیبت۔ نئی تہذیب کی راہ سے ہمارے گھروں میں ایک نئی مصیبت یہ داخل ہو گئی ہے کہ ایک طرف تو طرح طرح کی نئی بیماریاں نکل آئی ہیں، اور دوسری طرف گھر والیاں معمولی معمولی بیماریوں تک کی تدبیر و علاج سے جاہل و عاجز ہو رہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اپنی اور بال بچوں کی ذرا ذرا سی بیماری و شکایت پر حکیم و ڈاکٹر کے پاس دوڑنا پڑتا ہے۔ اور زیادہ تر ڈاکٹروں ہی کے پاس جن کی گراں قیمت دوائیں اور فیسیں جان کا تو خیر خدا ہی حافظ ہے، لیکن مال کا دیوالیہ نکال دیتی ہیں پھر اسی نئی تہذیب کے طفیل حرص کا اتنا غلبہ ہو گیا ہے۔ کہ ڈاکٹر تو ڈاکٹر ان کی دیکھا دیکھی اطبا کی نظر بھی مرض سے زیادہ مریض کی جیب پر رہنے لگی ہے، الا ماشاء اللہ۔

ابھی ایک نسل پہلے تک نہ بیماریوں کا اتنا زور تھا نہ دوا علاج اتنا گراں اور بچوں وغیرہ کی روزمرہ کی معمولی شکایتوں کا علاج تو گھر کی ان پڑھ بیبیاں تک کچھ نہ کچھ کر لیتی تھیں۔ خود اپنے گھر کا تجربہ ہے، کہ والدہ مدظلہا معمولی کھانسی بخار پھوڑے پھنسی وغیرہ کی دوا بے تکلف سارے گھر کی کر لیتی ہیں، اور ایسی کر لیتی ہیں کہ ہمارے محترم دوست ڈاکٹر و حکیم سید عبدالعلی صاحب ان کے نسخوں اور تدبیروں کی اکثر توثیق فرماتے ہیں۔ لیکن جب وہ گھر میں تشریف فرما نہیں ہوتیں تو پھر ہر موقع پر ڈاکٹر صاحب ہی کی خدمت میں دوڑنے دوڑانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیز تہذیب کے جدید مومنین بالغیب مانیں نہ مانیں لیکن ڈاکٹری دوائیں، کچھ ہمارے مزاج اور ہندوستانی آب و ہوا کے بھی زیادہ موافق نہیں معلوم ہوتیں، اور فوری و عارضی نفع کے ساتھ کسی نہ کسی دیرپا ضرر کا تحفہ ضرور چھوڑ جاتی ہیں۔

ان باتوں کے پیش نظر بہشتی زیور میں ایک پورا نواں حصہ حضرت علیہ الرحمہ نے خود اپنے ایک خاص مجاز طریقت طبیب حاذق حضرت حکیم محمد مصطفیٰ صاحب مرحوم بجنوری سے لکھا کر شامل فرما دیا ہے۔ "جس میں عورتیں اور بچوں کی صحت کے متعلق ضروری باتیں اور کثیر الوقوع امراض کے علاج درج کئے گئے ہیں۔ اور اس میں چند باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

(۱) ان امراض کا علاج لکھا گیا ہے، جن کی تشخیص و علاج میں چنداں لیاقت کی ضرورت نہیں۔ معمولی پڑھی لکھی عورتیں بھی ان کو سمجھ سکتی ہیں، اور جن امراض کے علاج میں علمی قابلیت درکار ہے ان کو چھوڑ دیا گیا ہے بلکہ بہت جگہ تصریح کے ساتھ لکھ دیا ہے، کہ اس کے علاج کی جرات نہ کریں بلکہ طبیب سے علاج کریں۔

(۲) نسخے اور مجرب اور سہل الحصول لکھے گئے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی رعایت رکھی گئی ہے کہ ایسی دوائیں ہوں کہ اگر تجویز میں غلطی ہو یا کوئی اور وجہ نقصان نہ کریں۔

(۳) عبارت ایسی سہل رکھی گئی ہے، کہ بہت معمولی لیاقت والا بخوبی سمجھ

نے لے"۔

عورتوں کو جھاڑ پھونک تعویذ گنڈوں کا خاص مذاق ہوتا اور اکثر دوا سے زیادہ ان پر اعتقاد ہوتا ہے، اور اعتقاد کا اثر معلوم ہے کہ خود معین شفا ہوتا ہے، جس کی بدولت بعض ناجائز بلکہ مشرکانہ حرکتوں تک میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اور بجائے خود دوا علاج کی طرح جھاڑ پھونک کا نافع ہونا بھی مجرب ہے، اس لئے آخر میں۔

"دوا دارو کا بیان لکھنے کے بعد تھوڑا سا بیان جھاڑ پھونک کا بھی لکھنا مناسب سمجھا، دوسرے یہ کہ بعض جاہل عورتیں بچوں کی بیماری میں یا اولاد ہونے کی آرزو میں ایسی ڈانواں ڈول ہو جاتی ہیں کہ خلاف شرع کام کرنے لگتی ہیں کہیں فال کھلواتی ہیں کہیں چڑھاوے چڑھاتی ہیں کہیں واہی تباہی منتیں مانتی ہیں، کہیں کسی کو ہاتھ دکھاتی ہیں۔ بددین اور ٹھگ لوگوں سے تعویذ گنڈے یا جھاڑ پھونک کراتی ہیں۔ بلکہ بعض جاہل تو ایسے وقت میں ستیلا بھوانی تک کو پوجنے لگتی ہیں جس سے دین بھی خراب ہوتا ہے اور گناہ بھی ہوتا ہے۔ بلکہ بعض باتوں سے آدمی کافر و مشرک ہو جاتا ہے۔ اور بعض دفعہ ایسے لوگ کچھ پیسے روپے یا کپڑا غلہ یا مرغا اور بکرا بھی وصول لیتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ایسے لوگوں کے پاس عورتوں کے آنے جانے یا بات چیت کرنے سے ان کی نیت بگڑ جاتی ہے اور آبرو کے لاگو ہو جاتے ہیں۔ غرض ہر طرح کا نقصان ہے اور پھر ہوتا وہی ہے، جو منظور خدا ہوتا ہے۔ اس واسطے خیال ہوا کہ کسی قدر جھاڑ پھونک کے ایسے طریقے بتلا دیئے جائیں، جو ہماری شریعت کے خلاف نہ ہوں تاکہ خدا تعالیٰ کے نام کی برکت سے شفا بھی ہو دین بھی بچا رہے اور مال و آبرو کا بھی نقصان نہ ہو"۔

ایک کامل و جامع مجدد کا بنیادی و تجدیدی کارنامہ (بہشتی زیور) ظاہر ہے کہ ان کھلے ہوئے دینی مفاسد و مصالح کی رعایت سے کیسے خالی رہ سکتا تھا۔ جو عملیات یا تعویذ وغیرہ خود حضرت علیہ الرحمہ کے معمول تھے، اور جو زیادہ تر قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں،

۱۰، ۱۲ صفحوں میں ان کا مستقلا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ گو اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میری طبیعت کو ان چیزوں سے مناسبت نہیں، لیکن امت کی مصلحت تو بہرحال طبیعت پر مقدم ہی تھی۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حضرت حاجی صاحب (یعنی حضرت کے پیر مرشد حاجی امداد اللہ صاحبؒ) کا حکم تھا کہ جو کوئی تعویذ مانگا کرے دے دیا کرو۔

دینی اعتبار سے ایک اور خطرناک فروگذاشت لوگوں سے یہ ہوتی ہے، جس میں اکثر معالج و مریض دونوں مبتلا ہیں کہ دوا علاج میں جائز و ناجائز حرام و حلال کی بہت کم پروا کی جاتی ہے۔

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ علاج معالجہ کے واسطہ جائز و ناجائز دیکھنے کی ضرورت نہیں .... یہ خیال غلط ہے خوب سمجھ لینا چاہئے کہ مریض حق تعالیٰ کی حکومت سے خارج نہیں ہوتا، ان کو جان و مال سب چیزوں پر مالکانہ حق حاصل ہے۔ (خود ارشاد فرمایا کہ) ہم اگر لوگوں پر فرض کر دیتے کہ خودکشی کر دیا جلاوطن ہو جاؤ تو سوائے شاذ و نادر کے وہ اس کی تعمیل نہ کرتے۔ حالانکہ جو بات ان کو بتلائی جاتی اس کے موافق کرنا ان کے واسطے بہتر ہوتا، جس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو یہ بھی اقتدار حاصل ہے کہ قصداً جان تلف کرنے کا حکم دے دیں تو صحت کا کیا ذکر"۔

غرض اس رسالہ میں جمادی نباتی و حیوانی چیزیں یا ان کے جو مرکبات دوا علاج میں کام آتے ہیں ان کے داخلی یا خارجی استعمالات کے جواز و عدم جواز کی تفصیل ہے جان کے ساتھ بلکہ جان سے بڑھ کر ایمان کو عزیز رکھنے والے مریض و معالج دونوں کے لئے اس ضمیمہ کی اہمیت کسی زیادہ تفصیل و تاکید کی محتاج نہیں۔

ایک آخری ضرورت: سب سے آخری دسویں حصہ میں عورتوں کی ایک آخری ضرورت کی بھی بقدر ضرورت تکمیل فرما دی گئی ہے یعنی کچھ کھانے پکانے کی چیزوں اور ترکیبوں کا یا تھوڑا سا بیان ہاتھ کے ہنر اور پیشہ کا خصوصاً اس لئے کر دیا گیا ہے کہ

"بعض لاوارث غریب عورتیں جن کے کھانے کپڑے کا کوئی سہارا نہیں ایسی پریشانی و مصیبت میں مبتلا ہیں کہ خدا کی پناہ۔ اس کا علاج دو باتوں سے ہو سکتا ہے یا تو نکاح کر لیں یا اپنے ہاتھ کے ہنر سے چار پیسے حاصل کر لیں لہٰذا اگر کسی کی عمر نکاح کے قابل ہے تو نکاح کر لے اور اگر اس قابل نہ ہو یا یہ کہ اس کو عیب تو نہیں سمجھتی مگر ویسے ہی دل نہیں چاہتا یا بکھیڑے سے گھبراتی ہے، تو اس صورت میں اپنا گزر کسی پاک ہنر کے ذریعہ سے کرو۔ اگر کوئی اس کو حقیر سمجھے یا ہنسے ہرگز پرواہ مت کرو۔ دوسرے نکاح کا بیان تو چھٹے حصہ میں پہلے آ چکا اور ہنر و پیشہ کا بیان اب کیا جاتا ہے اگر اس میں کوئی بات بے غیرتی کی ہوتی تو پیغمبران کاموں کو کیوں کرتے ان سے زیادہ کس کی عزت ہے۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بکریاں چرائیں اور فرمایا کہ کوئی پیغمبر ایسے نہیں گزرے جنھوں نے بکریاں نہ چرائی ہوں اور یہ بھی فرمایا کہ سب سے اچھی کمائی ہاتھ کی ہے"۔

ایک اہم تجدیدی جز: لیکن اس دسویں حصہ کا سب سے اہم تجدیدی جز وہ ہے، جس کو لوگوں نے سرے سے دین سے خارج بلکہ دنیا ہی سمجھ رکھا ہے

"وہ ایسی باتیں ہیں جس سے دنیا میں خود بھی آرام سے رہے اور دوسروں کو بھی اس سے تکلیف نہ پہنچے اور یہ باتیں ظاہر میں تو دنیا کی معلوم ہوتی ہیں لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ پورا مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ مسلمان کو مناسب نہیں کہ کسی سخت تکلیف میں پھنس کر اپنے آپ کو ذلیل کرے اور یہ بھی آیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم وعظ میں ان کا خیال رکھتے تھے کہ سننے والے اکتا نہ جائیں اور یہ بھی فرمایا ہے کہ مہمان اتنا نہ ٹھہرے کہ گھر والا تنگ ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بلا ضرورت تکلیف اٹھانا یا کسی کو

تکلیف دینا ایسا برتاؤ کرنا جس سے دوسرا آدمی اکتا جائے یا تنگ ہونے لگے یہ بھی دین کے خلاف ہے۔ اس لئے دین کی باتوں کے ساتھ ایسی باتیں بھی اس کتاب میں لکھ دی ہیں جن سے اپنے آپ کو اور دوسروں کو آرام پہنچے۔"

جس دین نے دنیا کو عین دین بنا دیا ہو، وہ اپنی تعلیمات و ہدایات کی فہرست سے زندگی کے اس معاشرتی پہلو کو کیسے خارج رکھتا۔ اور حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمہ تو اس اصول کو عین اسلامی تہذیب فرمایا کرتے تھے کہ اپنی اور دوسروں کی راحت و آزادی کا ہر چھوٹی بڑی بات میں پورا پورا اہتمام رکھا جائے۔ اس سے خالص دینی کام بھی نشاط و یکسوئی کے ساتھ انجام پاتے ہیں۔ باقی ہمارے تکلفات کی مصنوعی یا بناوٹی تہذیب کو تو بجائے تہذیب کے بالکل بجا طور پر تعذیب فرمایا کرتے تھے۔

بہرکیف اس حصہ میں پہلے زیادہ تر ایسی باتوں کا بیان ہے، جو روزمرہ کی اور خاص کر عورتوں کی زندگی میں اپنی اور دوسروں کی راحت و عافیت کا سامان ہیں مثلاً

"اگر کسی سے ملنے جاؤ تو اتنا مت بیٹھو یا اتنی دیر تک مت باتیں کرو کہ وہ تنگ ہو جائے یا اس کے کسی کام میں حرج ہونے لگے۔ سب گھر والے اس بات کے پابند رہیں کہ ہر چیز کی ایک جگہ مقرر کرلیں اور وہاں سے جب اٹھائیں تو برت کر وہیں رکھ دیں تاکہ ہر آدمی کو وقت پر پوچھنا ڈھونڈھنا نہ پڑے۔ جگہ بدلنے سے بعض دفعہ کسی کو بھی نہیں ملتی سب کو تکلیف ہوتی ہے اور جو چیزیں خاص تمہارے برتنے کی ہیں ان کی جگہ بھی مقرر رکھو تاکہ ضرورت کے وقت ہاتھ ڈالتے ہی مل جائیں۔ راہ میں چارپائی پیڑھی یا اور کوئی برتن اینٹ پتھر سل وغیرہ نہ ڈال دو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اندھیرے میں یا بعض دفعہ دن ہی میں کوئی جھپٹا ہوا بے کھٹکے چلا آرہا ہے وہ الجھ کر گر گیا اور جگہ بے جگہ چوٹ لگ گئی۔ کسی کے گھر میں مہمان جاؤ تو اس سے کسی چیز کی فرمائش مت کرو بعض چیز ہوتی تو ہے بے حقیقت مگر وقت کی بات گھر والا پوری نہیں کر سکتا ناحق اس کو شرمندگی ہوگی۔ بدن اور کپڑے میں بو نہ پیدا

ہونے دو۔ اگر دھوبی کے گھر کے کپڑے دھلے نہ ہوں تو بدن ہی کے کپڑوں کو دھو ڈالو نہا ڈالو۔ دامن آستین آنچل سے ناک مت پونچھو۔ مہمان کے کھانے میں اتنا تکلف مت کرو کہ وقت پر اس کو کھانا نہ ملے کھانا وقت پر پکالو چاہے سادہ اور مختصر ہی ہو۔ اگر اپنی تندرستی چاہو تو اپنے آپ کو بہت آرام طلب مت بناؤ کچھ محنت کا کام اپنے ہاتھ سے کیا کرو۔ سب سے اچھی چیز عورتوں کے واسطے چکی پیسنا یا موسل سے کوٹنا یا چرخہ کاتنا ہے، اس سے بدن تندرست رہتا ہے (۱)۔

بعض عیب کی باتیں: مذکورۂ بالا قسم کی ٦٠ باتیں "بعض سلیقہ اور آرام" کی باتوں کے عنوان کے تحت درج ہیں اس کے بعد دوسرا عنوان "بعض باتیں عیب اور تکلیف کی جو عورتوں میں پائی جاتی ہیں" اس کے تحت ۲۹ باتیں درج ہیں۔ مثلاً

"ایک عیب یہ ہے کہ آپس میں دو عورتیں جو باتیں کرتی ہیں اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک کی بات ختم ہونے نہیں پاتی اور دوسری شروع کر دیتی ہے بلکہ بہت دفعہ دونوں ایک دم سے بولنے لگتی ہیں وہ اپنی کہہ رہی ہے یہ اپنی ہانک رہی ہے نہ وہ اس کی سنے نہ یہ اس کی۔ بھلا ایسی بات کرنے ہی سے کیا فائدہ ہمیشہ یاد رکھو کہ جب ایک بولنے والی کی بات ختم ہو جائے اس وقت دوسری کو بولنا چاہئے۔ ایک عیب یہ ہے کہ پان تمباکو کا خرچ اس قدر بڑھا لیا ہے کہ غریب آدمی تو سہار ہی نہیں سکتا اور امیروں کے ہاں اتنے خرچ میں چار پانچ غریبوں کا بھلا ہو سکتا ہے۔ ایک عیب یہ ہے کہ اپنی خطا یا غلطی کا کبھی اقرار نہ کریں گی جہاں تک ہو سکے گا بات کو بنا دیں گی خواہ بن سکے یا

ا۔ چکی چرخے کا تو نام بھی نہ لو یہ کمینوں اور غریبوں کا کام ہے! عورتوں کی تندرستی کا ماڈرن سامان ٹینس اور بیڈمنٹن ہے، پوری ترقی چاہو تو غیر مردوں کے ساتھ بغل گیر ہو کر ڈانس! کیا ان باتوں میں مسلمان سیاسیات سے بھی زیادہ تجدید دین کے محتاج نہیں۔ اگر کوئی سیاسی لیڈر سیاسی مصلحت سے کہہ دے تو عورتیں کیا بڑے بڑے مرد بھی چرخہ چلانے لگتے ہیں۔

نہ بن سکے۔ ایک عیب یہ ہے کہ بچوں کو بے بھوک کھلا دیتی ہیں یا مہمان کو اصرار کر کے کھلاتی ہیں۔ پھر بے بھوک کھانے کی تکلیف ان کو بھگتنی پڑتی ہے"۔ وغیرہ وغیرہ

دیکھو ایک جامع و کامل مجدد کی نگاہ تجدید و اصلاح اندر باہر کہاں کہاں تک جاتی ہے اس کے بعد

بعض باتیں تجربہ اور انتظام کی ہیں:۔ مثلاً جہاں تک ہو سکے سودا قرض مت منگاؤ، جو بہت ناچاری میں منگانا ہی پڑے تو دام پوچھ کر تاریخ کے ساتھ لکھ لو اور جب دام ہوں فوراً دے دو۔ آٹا چاول اٹکل سے مت پکاؤ اپنے خرچ کا اندازہ کر کے دونوں وقت سب چیزیں تول ناپ کر خرچ کرو اگر کوئی تم کو طعنہ دے کچھ پروا مت کرو۔ لحاظ کی جگہ سے قرض مت لو اور زیادہ قرض بھی مت دو اتنا دو کہ اگر وصول نہ ہو تو تم کو بھاری نہ معلوم ہو۔ جو کوئی نیا یا بڑا کام کرو پہلے کسی سمجھدار خیر خواہ آدمی سے صلاح لے لو۔ ہر کام کا پہلے انجام سوچ لیا کرو اس وقت شروع کرو۔ سفر میں جانے والوں سے حتی الامکان کوئی فرمائش مت کرو کہ فلاں جگہ سے خرید لانا، ہماری فلاں چیز فلاں جگہ سے ساتھ لے آنا، یہ اسباب لیتے جانا فلاں کو پہنچا دینا یہ خط فلانے کو دے دینا۔ ان فرمائشوں سے اکثر دوسرے آدمی کو تکلیف ہوتی ہے اور اگر دوسرا بے فکر ہو تو اس کے بھروسہ رہنے سے تمہارا نقصان ہو گا۔ خط دو پیسے میں جہاں چاہو بھیج دو۔ چیز اگر یہاں مہنگی مل سکتی ہو تو مہنگی لے سکتی ہو یا ریل سے منگا سکتی ہو۔ اپنی تھوڑی سی بچت کے واسطے دوسروں کو پریشان کرنا بہتر نہیں۔ بعض کام ہوتا تو ہے ذرا سا مگر اس کے بندوبست میں بڑی الجھن ہوتی ہے۔ اور اگر بہت ہی ناچاری آ پڑے تو چیز کے منگانے میں دام پہلے دے دو اور اگر ریل میں آوے جاوے تو کچھ زیادہ دام دے دو شاید اس کے پاس خود اپنا سامان بھی ہو اور سب مل کر

تو لنے کے قابل ہو جاوے۔ کسی کو ٹھہرانے پر یا کھانا کھلانے پر زیادہ اصرار نہ کرے، بعض دفعہ اس میں دوسرے کو الجھن اور تکلیف ہوتی ہے۔ ایسی محبت سے کیا فائدہ جس کا انجام نفرت و الزام ہو۔ اگر کہیں مہمان جاؤ اور کھانا کھا چکی ہو تو جاتے ہی کہہ دو کیونکہ وہ لحاظ کے مارے خود پوچھیں گی نہیں چپکے چپکے سب فکر کریں گی .... جب سامنے آیا تو نے کہہ دیا کہ ہم نے تو کھانا کھالیا، اس وقت ان کو کتنا افسوس ہو گا۔ جو جگہ لحاظ و تکلیف کی ہو وہاں خرید و فروخت کا معاملہ مناسب نہیں کیونکہ ایسی جگہ نہ بات صاف ہو سکتی ہے نہ تقاضا ہو سکتا ہے اس کا انجام اچھا نہیں ہوتا" یہ کل ۵۹ باتیں ہیں"۔

بچوں کی پرورش و تربیت۔ عورتوں کا سب سے اہم و اصل فریضہ حیات بچوں کی تربیت ہے، جس میں ابتدا ہی سے اگر بعض بظاہر چھوٹی چھوٹی اور موٹی موٹی باتوں کا خیال نہ رکھا جائے، جو بہت کم رکھا جاتا ہے تو جسم و جان، عادات و اخلاق سب کی پہلی ہی اینٹ ٹیڑھی رکھ جاتی ہے مثلاً

"ہر روز بچے کا ہاتھ منہ گلا کان چڑھے وغیرہ گیلے کپڑے سے خوب صاف کر دیا کریں، میل جمنے سے گوشت گل کر زخم پڑ جاتے ہیں۔ (پورا غسل اگر نہ ہو سکے تو یہ اس کے لئے آسان بدل ہے) عام طور پر بچوں کو ساتھ سلانے کی عادت ہے، جس میں خرابیوں کے علاوہ ایک خطرناک بات یہ ہے کہ "شاید سوتے میں کہیں کروٹ تلے دب جائے۔ ہاتھ پاؤں نازک ہوتے ہیں، اگر صدمہ پہنچ جائے۔ تعجب نہیں، ایک جگہ اسی طرح ایک بچہ دب کر صبح مرا ملا" اس لئے ضرورت ہے کہ بچے کو الگ سلائیں اور حفاظت کے واسطے دونوں طرف کی پٹیوں سے ملا کر دو چار پائیاں بچھا دیں یا دونوں کروٹ پر دو تکیے رکھ دیں جھولے کی زیادہ عادت نہ ڈالیں کیونکہ جھولا ہر جگہ نہیں ملتا، اور بہت گود میں بھی نہ رکھیں اس سے بچہ کمزور ہو جاتا ہے۔

چھوٹے بچے کی عادت ڈالیں سب کے پاس آیا جایا کرے ایک آدمی کو زیادہ ہل جانے سے اگر وہ مر جائے یا نوکری سے چھڑا دیا جائے تو بچے کی مصیبت ہو جاتی ہے"۔ "اگر بچے کو انا کا دودھ پلانا ہو تو ایسی انا تجویز کرنا چاہئے جس کا دودھ اچھا ہو، جو جوان ہو اور دودھ تازہ ہو یعنی اس کا بچہ چھ سات مہینے سے زیادہ کا نہیں۔ اور وہ خصلت کی اچھی ہو دیندار ہو۔ احمق بےشرم بد چلن کنجوس اور لالچی نہ ہو" (بھلا ان باتوں کا کتنے آدمی خیال کرتے ہیں، اور نہ خیال کرنے سے بے دینی بد اخلاقی اور بیماری سب گویا بچے کو دودھ کے ساتھ ہی پلائی جاتی ہیں) "انا اور کھلائی پر بچے کا کھانا نہ چھوڑیں خواہ اپنے یا کسی سلیقہ دار معتبر آدمی کے سامنے کھانا کھلایا کریں تاکہ بے اندازہ کھا کر بیمار نہ ہو جائے، اور بیماری میں دوا بھی اپنے سامنے بنوائیں اور پلائیں"۔ (اس معاملہ میں بے احتیاطی گھر گھر کتنی عام ہے۔ اکثر بچوں کو خود ہی چھوڑ دیا جاتا ہے، کہ جتنا اور جس طرح تمیز و بے تمیزی سے چاہیں کھالیں") "ماں باپ خود بھی خیال رکھیں اور جو مرد یا عورت بچے پر مقرر ہو وہ بھی خیال رکھے کہ بچہ ہر وقت صاف ستھرا رہے، جب ہاتھ منہ میلا ہو جائے فوراً دھو دے"۔ (کتنے بچے ہوں گے جو ہر وقت منہ کو ناک سے لیسے رہتے ہیں یا وقت ناوقت کچھ نہ کچھ کھاتے رہتے ہیں، جو اکثر منہ تک لگا رہتا ہے اور مائیں پرواہ بھی نہیں کرتیں)"۔ بچے کی عادت ڈالیں کہ بجز اپنے بزرگوں کے اور کسی سے کوئی چیز نہ مانگے اور نہ بلا اجازت کسی کی دی ہوئی چیز لے"۔ (یہ عادت کون ڈالتا ہے اور اس کی بدولت کتنی خرابیوں کا اندیشہ رہتا ہے) "پڑھنے میں بچے پر بہت محنت نہ ڈالے شروع میں ایک گھنٹہ پڑھنے کا مقرر کرے، پھر دو گھنٹے پھر تین گھنٹے، اسی طرح اس کی طاقت اور سہارا کے موافق محنت لیتا رہے۔ ایسا نہ کرے کہ سارا دن پڑھاتا رہے۔ ایک تو تھکن کی وجہ سے بچہ جی چرانے لگے گا، پھر زیادہ محنت سے دل و دماغ خراب ہو کر ذہن و حافظہ میں فتور آ جائے گا اور

بیماروں کی طرح سست رہنے لگے گا، پھر پڑھنے میں جی نہ لگاوے گا"۔

عربی کی ایک مشہور درسگاہ ہے، جس کو قدیم و جدید کی جامعیت کا دعویٰ ہے، اور جس نے چھوٹے بچوں کے لئے ایک مکتب کی بھی ذمہ داری بڑھالی ہے، جس میں سات آٹھ سال تک کے بچے پڑھتے ہیں۔ مگر ان کا نصاب اوقات کے اعتبار سے اتنا ہی ہے، جتنا بڑے بڑے درجوں کا یعنی ۶ گھنٹے۔ درسگاہ ماشاء اللہ بڑے مشاہیر و عقلا کے انتظام میں ہے! تابہ دیگراں چہ رسد!

غرض اس طرح کی کوئی ۲۴ ہدایات ایسی درج فرمائی گئی ہیں کہ اگر ان کا لحاظ رکھا جائے تو بچوں کی تعلیم و تربیت کی بنیاد استوار ہو جائے۔ ایک اور وعظ میں جو خاص طور سے مستورات کے لئے فرمایا گیا تھا، جس کی ابتدا میں بچوں کی تربیت کے لئے عورتوں کی اصلاح کی ضرورت کے سلسلہ میں ارشاد ہے کہ

> "عورتوں کے متعلق بچوں کی بھی تربیت ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ بچہ ابتدائے عمر میں جس کے پاس رہتا ہے اسی کے اخلاق و اعمال اختیار کرتا ہے۔ اور بچے ابتدائے عمر میں زیادہ تر اپنی ماؤں کے پاس ہی رہتے ہیں۔ اس لئے بچوں کی تربیت اسی طرح عمدہ ہو سکتی ہے، کہ مستورات کی اصلاح ہو جائے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائے عمر میں بچوں کو سمجھ ہی کیا ہوتی ہے وہ اچھی بری بات کا اثر لیں .... سو خوب سمجھ لیجئے کہ یہ خیال غلط ہے۔ بچپن میں جب کہ بچہ دودھ پیتا ہے، اس وقت بھی اس کے دماغ میں اخذ کا مادہ ہوتا ہے گو وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکے اور اس کی مثال ایسی ہے، جیسے فونوگراف کہ تم جو کچھ کہتے ہو وہ سب اس میں جاکر محفوظ و منقش ہو جاتا ہے گو اس وقت آواز نہ نکلے، لیکن جس وقت ان نقوش پر سوئی چلے گی وہ سب باتیں اس میں سے بعینہٖ نکلیں گی۔ یہی حال بچوں کے دماغ کا ہے، کہ ابتدائے عمر میں بھی وہ سب باتوں کو اخذ کر کے محفوظ کر لیتا ہے، گو اس وقت اس پر عمل نہ کر سکے یا زبان سے ظاہر نہ کر سکے پھر جب اس میں قوت عمل و نطق کامل ہو جاتی ہے، تو پہلی باتوں کے آثار اس سے ظاہر ہونے

لگتے ہیں۔ ایک تجربہ کار کا مقولہ ہے کہ بچوں کی اصلاح کا وقت پانچ سال تک ہے، اس عرصہ میں جتنے اخلاق پختہ ہونے ہوتے ہیں ہو جاتے ہیں، اس کے بعد اس میں پھر کوئی عادت پختہ نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم جس زمانہ کو ناسمجھی کا زمانہ خیال کرتے ہیں وہی وقت بچوں کی اصلاح کا ہے، اور بچے اسی زمانہ میں سب کچھ اخذ کر لیتے ہیں۔ ایک مسماۃ نے بیان کیا کہ بچوں کی اصلاح کا سہل طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے بچے کی کامل تربیت کر دی جائے پھر سارے بچے اسی جیسے اٹھیں گے جیسے کام کرتا ہوا اس کو دیکھیں گے اگلے بچے بھی وہی کام کریں گے اور اس کی عادتیں خصلتیں سیکھ لیں گے"۔

اس سے بڑھ کر یہ صرف شیر خوارگی یا ۵ سال تک کی عمر ہی قابل اہتمام نہیں۔

"بلکہ اگر بچہ پیدا ہونے سے پہلے والدین اپنی حالت درست کر لیں تو بچہ نیک ہی پیدا ہو گا .... ایک حکایت ہے کہ دو میاں بی بی نے آپس میں صلاح کی کہ آؤ ہم دونوں سب گناہوں کی توبہ کر لیں اور آئندہ کوئی گناہ نہ کریں۔ تاکہ بچہ نیک پیدا ہو چنانچہ اس کا اہتمام کیا گیا، اسی حالت میں حمل قرار پایا اور بچہ پیدا ہوا تو وہ بہت صالح اور سعید تھا۔ ایک روز بچے نے کسی دوکان پر سے ایک بیر چرایا۔ مرد نے بی بی سے کہا سچ بتلا یہ اثر کہاں سے آیا۔ اس نے بیان کیا کہ پڑوسی کے گھر میں جو بیر کا درخت ہے اس کی ایک شاخ ہمارے گھر میں ہے، اس میں ایک بیر لگ رہا تھا میں نے وہ توڑ لیا تھا۔ مرد نے کہا کہ بس اسی کا اثر ہے جو آج ظاہر ہوا۔ بس اولاد کے نیک ہونے کے لئے اول درجہ تو یہی ہے کہ والدین خود نیک بنیں۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ پیدا ہونے کے بعد اس کے سامنے بھی کوئی حرکت بیجا نہ کریں اگرچہ وہ بالکل ناسمجھ ہو .... تیسرا درجہ یہ ہے کہ جب بچہ بڑا ہو جائے تو اس کو علم

ا۔ وعظ موسوم بہ "الکمال فی الدین للنساء ۲۷/ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ

دین سکھاؤ اور خلاف شریعت کاموں سے بچاؤ اور نیک لوگوں کی صحبت میں رکھو برے لوگوں کی صحبت سے بچاؤ۔ بچوں کے اخلاق کی درستی زیادہ تر عورتوں ہی کے اہتمام کرنے سے ہو سکتی کیونکہ بچہ زیادہ تر ان ہی کے پاس رہتے ہیں۔

بچوں کی نفسیات (سائیکالوجی) اور تعلیم و تربیت کا جدید سے جدید ماہر بھی اصولاً اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہے! اور وراثت کا اثر تو آج کل کے علمی مسلمات میں داخل ہے۔

پھر یہی بچے آگے چل کر مرد بنتے ہیں، اس لئے جن گودوں میں یہ پرورش پاتے ہیں ان کی اصلاح دراصل ساری امت کی اصلاح کی جڑ بنیاد ہے۔ جیسا کہ آگے اسی وعظ (الکمال فی الدین للنسا) میں فرمایا کہ "بچوں کی تربیت چونکہ زیادہ تر عورتوں کے ہاتھ میں ہے، اس لئے ان کی اصلاح سے مردوں کی اصلاح بھی متوقع ہے۔ کیونکہ یہی بچے ایک وقت میں مرد بھی بنیں گے"۔

بہشتی زیور دراصل اصلاح امت کا سنگ بنیاد ہے:۔ اس سے پوری طرح واضح ہوگیا کہ بہشتی زیور دراصل حضرت جامع المجدد دین علیہ الرحمہ کے تجدیدی و اصلاحی کارناموں کا بنیادی پتھر ہے۔ اور اگر مسلمان گھرانوں میں صرف بہشتی زیور کے عام طور سے پڑھنے پڑھانے سننے سنانے کا اہتمام کرلیا جائے، جس کی حضرت علیہ الرحمہ ہمیشہ تاکید فرماتے رہے، تو پورا تو پورا تھوڑا بہت عمل بھی اگر اس کی تعلیمات و ہدایات پر ہو تو تجربہ کر کے مسلمان دیکھ لیں کہ ایک نسل میں ان کی دنیا اور دین دونوں کی اس ترقی کا قدم کہاں سے کہاں جانکلتا ہے، جس کے لئے دن رات طرح طرح کی انجمن سازیوں چندہ بازیوں اور نعرہ بازیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل پڑا ہے، اور جس کی بدولت جان و مال و دین وایمان سب کی اضاعت ہی اضاعت کا سامان ہے۔

نیکیوں کی عام باتیں :- بچوں کے متعلق مذکورہ بالا قسم کی ضروری احتیاطوں کے بعد پھر کچھ عام باتیں نیکیوں اور نصیحتوں کی درج فرمادی گئی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں :-

"پرانی باتوں کا کسی کو طعنہ دینا بری بات ہے۔ عورتوں کی یہ ایسی بری عادت ہے کہ جن رنجوں کی صفائی اور معافی بھی ہوچکی ہے، جب کوئی نئی بات ہوگی پھر ان رنجوں کے ذکر کو لے بیٹھیں گی۔ یہ گناہ بھی ہے، اور اس سے دلوں میں دوبارہ رنج و غبار بھی بڑھتا ہے" ـــــ اگر اپنی ساس نند دیورانی جٹھانی یا دور نزدیک کے رشتہ داروں کی شکایت سنو تو اس کو دل میں مت رکھو۔ بہتر تو یہ ہے کہ اس کو جھوٹ سمجھ کر دل سے نکال ڈالو۔ اگر اتنی ہمت نہ ہو تو جس نے تم سے کہا ہے اس کا سامنا کرا کر منہ در منہ صاف کرلو۔ اس سے فساد نہیں بڑھتا۔ نوکروں پر ہر وقت سختی اور تنگی مت کرو اور اپنے بچوں کی دیکھ بھال رکھو تاکہ وہ نوکروں یا ان کے بچوں کو نہ ستانے پاویں۔ یہ لوگ لحاظ کے مارے زبان سے کچھ نہ کہیں تو دل میں ضرور کوسیں گے، نہ بھی کوسا جب بھی ظلم کا وبال و گناہ تو ضرور ہوگا اپنا وقت فضول باتوں میں مت کھویا کرو اور کچھ وقت اس کام کے لئے بھی رکھو کہ لڑکیوں کو قرآن اور دین کی کتابیں پڑھادیا کرو اگر زیادہ نہ ہو تو قرآن کے بعد یہ کتاب بہشتی زیور شروع سے ختم تک تو ضرور پڑھایا کرو۔ لڑکیاں چاہے اپنی ہوں چاہے پرائی ان سب کے لئے اس کا بھی خیال رکھو کہ ان کو ضروری ہنر بھی آجائیں۔ لیکن قرآن کے ختم ہونے تک ان سے دوسرا کام مت لو" ۔ جو لڑکیاں تم سے پڑھنے آویں ان سے اپنے گھر کا کام مت لو نہ ان سے اپنے بچوں کی ٹہل کراؤ۔ بلکہ ان کو بھی اپنی اولاد کی طرح رکھو۔ دوسروں کی چیز جب تک برت چکو یا جب برتن خالی ہوجاوے فوراً واپس کردو۔ اگر اتفاق سے کوئی اس وقت لیجانے والا نہ ہو تو اس کو اپنے برتنے کی چیزوں میں ملا جلا کر مت رکھو۔ بالکل علیحدہ اٹھا کر رکھ دو، تاکہ وہ چیز ضائع نہ ہو۔ ویسے بھی بلا اجازت کسی کی چیز برتنا گناہ ہے۔ جس آدمی کو پہچانتی

نہ ہو اس کے سامنے کسی شہر یا قوم کی برائی مت کرو شائد آدمی اسی شہر یا قوم کا ہو پھر تم کو شرمندہ ہونا پڑے۔"

اس طرح کی کوتاہیاں ہمارے اندر اتنی عام ہیں کہ عام و خاص شائد ہی کوئی ہو، جو ان میں مبتلا نہ ہو۔ ایک بڑے مشہور وجید واعظ و مصنف عالم مجھ سے خود فرماتے تھے کہ کسی سفر میں وہ جلاہوں کی کچھ مذمت کرنے لگے۔ اتفاق سے ایک ذی عزت و ذی علم جلاہے پاس ہی بیٹھے تھے، آخران بیچارے سے رہا نہ گیا، اور اپنے کو ظاہر ہی کر دیا۔ پھر ہمارے مولانا پر جو گزری گزری!

لوگوں کو بزرگوں کے تبرکات کی بہت خواہش ہوتی ہے، اس کی ایک سہل تدبیر انہیں عام نصیحتوں کے ذیل میں تحریر فرمادی گئی ہے کہ "عرب میں دستور ہے کہ جو کسی بزرگ سے کوئی چیز تبرک کے طور پر لینا چاہتے ہیں، تو وہ چیز اپنے پاس سے ان بزرگ کے پاس لاکر رکھتے ہیں کہ آپ اس کو دو ایک روز برت کر کے ہم کو دیدیجئے۔ اس میں ان بزرگ کو تردد نہیں کرنا پڑتا۔ ورنہ اگر بیس آدمی کسی بزرگ سے ایک ایک کپڑا مانگیں، تو ان کی گٹھری میں تو ایک چیتھڑا نہ رہے۔"

خود حضرت کے ہاں بھی خدام و معتقدین نے یہ سہل نسخہ سیکھ لیا تھا، اور اس سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔

بہشتی زیور کا اصل مقصد تو دینی اعتبار سے اسلامی زندگی کے سارے ضروری ابواب کا احتوا ہے، لیکن جس طرح اس خیال سے کہ کلام مجید پڑھ لینے کے بعد یہ کتاب عورتوں کی ضروری تعلیم کے لئے بھی بالکلیۃ حاوی و کافی ہوجائے اور "کوئی دوسری کتاب نہ ڈھونڈھنی پڑے شروع میں الف با تا لگادیا گیا" اسی طرح آخر میں حساب کتاب وغیرہ کی تمام ضروری باتیں اور ضروری طریقے درج فرمادیئے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ ڈاک خانہ تک کے کچھ عام قواعد لکھ دیئے گئے ہیں، اور ایسے مسائل بھی جن کی ریل کے سفر میں ضرورت پڑتی ہے۔ نیز بعض ایسی کتابوں کے نام جن کے دیکھنے سے عورتوں کو نفع یا جن کے دیکھنے سے نقصان ہے۔ کیونکہ آج کل ہر قسم کی اور ہر کس ناکس کی کتابیں فضول قصے کہانی خصوصاً

ناول وغیرہ پڑھنے کا عام عارضہ عورتوں تک میں سرایت کر گیا ہے، جس کا ضرر معلوم ہے۔

غرض اس دسویں حصہ پر اصل بہشتی زیور ختم و مکمل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد ایک گیارہویں حصہ بہشتی گوہر کا (جس میں زیادہ تر ایسے مسائل ہیں، جن کا خاص کر مردوں سے تعلق ہے) اضافہ فرما کر اس کتاب کو مردوں عورتوں سب کی شخصی و خانگی زندگی کی دینی اصلاح کے لئے کافی دوافی بنا دیا گیا ہے۔

حضرت جامع المجدد دین کی دو سب سے زیادہ اہم تجدیدی خصوصیات

اوراق بالا میں بہشتی زیور کا جو ذرا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے، اس میں حضرت جامع المجدد دین کے رنگ تجدید کی دو خصوصیات سب سے زیادہ اہم و قابل توجہ ہیں:۔

اسلام اور مسلمان دور حاضر میں جس درجہ ناموافق و نامساعد حالات سے دوچار ہیں، ساڑھے تیرہ سو سال کی تاریخ میں شاید ہی کوئی عہد دین اور دینی زندگی کے لئے اتنی آزمائش اور فتنوں کا آیا ہو۔ جس سیاست و حکومت کا دنیا میں غلبہ ہے وہ نہ صرف غیر اسلامی بلکہ سرے سے حق و باطل کسی دین سے بھی اس کو عملاً سروکار نہیں، نہ اس کے اصول و قوانین میں خدا و آخرت سے تعلق و تصور کا گزر۔ بلکہ بے دینی کی تعلیم و ترویج اس کا لازمہ ہے۔ تہذیب و تمدن تعلیم و تربیت سب کا مطمع نظر خالص دنیا طلبی رہ گیا ہے۔ خود مسلمان بھی ہر جگہ حاکم و محکوم کے ساتھ اسی تہذیب نو کے دھارے میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ حد یہ کہ دین کا نام جو کچھ لیا جاتا ہے وہ بھی زیادہ تر دنیا ہی کے کام کے لئے۔ ان حالات میں اگر اسلام کے دینی احکام و تعلیمات بالکلیہ کسی خاص سیاسی و سماجی تعلیمی و معاشی نظام ہی کے تابع ہوتے تو افراد کے لئے انفرادی و خانگی زندگی میں اسلام کا نام لینے کی بھی اب گنجائش نہ تھی۔ اور ”لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا“ کی تکلیفی وسعت و استطاعت کا دروازہ کسی نفس یا فرد کی انفرادی زندگی کے لئے کھلا نہیں رہ گیا تھا۔

اس خاص نظر سے اگر بہشتی زیور کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے، کہ ایسے مخالف اجتماعی ماحول میں بھی عقائد و اعمال دیانات و معاملات، و اخلاق و معاشرات کی اسلامی

تعلیمات کا بہت بڑا حصہ انفرادی استطاعت و ہمت ہی کا طالب و تابع ہے۔ البتہ ذرا مردانہ ہمت کا، جس میں انشاء اللہ مجاہدہ کا اجر مزید براں ہو گا۔ قلب و قالب کی ساری طاعات اور افراد کی پوری حیات میں معدودے چند چیزیں ایسی نکلیں گی، جن میں اس درجہ ناساعد اجتماعی و سیاسی حالات بھی ہاتھ پاؤں باندھ کر کسی فرد مسلمان کو ارتکاب معصیت و نافرمانی پر مضطر کر رہے ہوں۔ بلاشبہ سیاسی و اجتماعی حالات و نظامات بھی اگر اسلامی تعلیمات پر مبنی ہوں، تو نہ فقط ان تعلیمات پر صد فیصد عمل ممکن ہوتا ہے، بلکہ افراد کی تکلیفی استطاعت و وسعت کے لئے کم و بیش ہر طاعت میں تیسیر و سہولت ہو جاتی ہے، اور اس لئے نہ صرف غیر اسلامی نظامات کو رضا و رغبت کے ساتھ قبول کر لینا جائز نہیں، بلکہ حسب استطاعت جان و مال سے انقلاب کی سعی واجب ہے۔

لیکن اس سعی میں بھی بجا طور سے کامیابی اور حق تعالیٰ کی نصرت کی توقع جب ہی ہو سکتی ہے، جب کہ اگر پہلے نہیں تو ساتھ ہی ساتھ طاعات کے اس بہت بڑے حصہ کا حق ادا ہوتا رہے، جو افراد کی انفرادی وسعت و سعی پر منحصر ہے، اور جو (جیسا کہ اوپر جا بجا حسب موقع متنبہ کیا جا چکا) نہ حکومت الٰہیہ کے قیام پر موقوف ہے، نہ کسی پاکستان کے وجود پر نہ کسی سیاسی انقلاب پر یہی نہیں بلکہ قرب و ولایت صدیقیت و شہادت کا کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ مقام و مرتبہ اسلامی تعلیمات کی رو سے ایسا نہیں ہے، جو ان ناموافق سے ناموافق حالات میں بھی حاصل نہ کیا جا سکتا ہو یا کرنے والے کر نہ رہے ہوں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی رحمت اور ملت بیضا کی کیسی سماحت و سہولت ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ نہ سیاسی و سماجی نظامات کا ہر شخص کے لئے اپنی انفرادی زندگی میں انفرادی طاقت سے الٹ دینا ممکن ہے، اور نہ ایسی صورت میں دینی کمالات کا دروازہ ہر ہر متنفس کے لئے یکساں طور سے زندگی کے موافق و ناموافق تمام حالات میں کھلتا رہتا۔

لیکن ہم مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ نہ دین کی سچی طلب اور نہ صحیح فہم ہے کہ سارا زور وہی لادینی (Secular) رنگ کی سیاسیات و قومیات حاضرہ پر صرف ہوتا ہے۔ پاکستان بن گیا، بظاہر اسلامی دستور و قانون کا نفاذ بھی اصولاً منظور ہو گیا۔ لیکن جن پر قانون نافذ ہو گا خود ان کے اندر اس کے قبول و اتباع کی قابلیت و صلاحیت پیدا کرنے کی شاذ ہی کسی کو فکر ہو

گی۔ حد یہ کہ حضرات علماء تک کو ابھی حال ہی میں سننے آیا کہ فکر ہے تو یہ ہے کہ اسلام کا قانون بنایا جائے اور اس کے لئے کوئی مجلس بھی بنائی گئی ہے۔ یہ وہی بات بات میں مجلس آرائی اور کمیٹی و کمیشن سازی کی ماڈرن وبائی بیماری ہے۔ الحمد للہ کہ اسلام کا قانون بنا بنایا ہے۔ صرف نفاذی و عملی جزئیات کے لئے کچھ اچھے فقیہ و متقی ساتھ ہی زمانہ شناس علماء کی ایک مستقل مجلس کی ضرورت ہے، جو حکومت کی اعانت کرتی رہے۔ سب سے مقدم ضرورت خود مسلمانوں کو مسلمان بنانے کی ہے کہ وہ دل و جان سے اس قانون کی اطاعت کریں۔ ورنہ وہی آج کل کی سی لادینی حکومت کا حال رہے گا کہ قانون پر قانون بنتے رہتے ہیں اور خود قانون بنانے اور چلانے والے ہی اپنی نفسانی و دنیاوی اغراض اور جاہی و مالی مقاصد کے لئے ان کو توڑتے رہتے ہیں۔ رشوت ستانی ہی وغیرہ کے مفاسد کو لیجئے کہ آزاد ہندوستان اور پاکستان میں اس کی بھی کتنی آزادی اور بڑھ گئی ہے۔ پاکستان ہی کے متعلق روایت سنی تھی کہ ایک "قائد اعظم" کے علاوہ باقی ساری حکومت کے عوام و خواص میں چپڑاسیوں سے لے کر وزراء تک مشکل ہی سے کچھ اللہ کے بندے ہوں گے جو راشی و مرتشی نہ ہوں۔ اور کیوں نہ ہوں جب اس دنیا کے مالی و جاہی نفع و ضرر کے آگے نہ اس سے بڑھ کر کسی نفع کی توقع ہے، نہ کسی ضرر کا اندیشہ تو آخر کوئی چھوٹا بڑا آدمی اپنی اس نقد چھوٹی بڑی ذاتی منفعت و مضرت سے کیوں روگردانی کرے۔ ادھار تو وہ رکھے گا، جس کو معقول سود بلکہ سود در سود کی امید ہو۔

جب تک اس دنیا کا کوئی دین یا اس زندگی کے مستقبل کی کسی "خیر وابقے" آخرت کی خیر و فلاح انسان کے پیش نظر نہ ہو اس وقت تک اس دنیا کی خیر و فلاح تو الگ رہی، اس کو روز بروز سراپا شر و فساد بننے بنانے سے نہ کسی حکومت و قانون کی طاقت روک سکتی ہے اور نہ کسی جمہوریت و اشتراکیت کی خیال پرستی یا آئیڈیالوجی۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر شی اپنے مقام و حدود میں رہ کر ٹھیک رہ سکی ہے۔ دنیا بھی دین ہی کے حدود و قیود میں رہ کر ٹھیک رہ سکتی ہے اور یہی اس حدود شکن عہد کے مجدد کی تجدید کا سب سے نمایاں وصف ہے۔ کم از کم مسلمانوں خصوصاً علماء کو تو یہ بات سمجھنا ہی چاہئے کہ اہم و اقدم کام افراد و عوام کے اندر دین کا یہی بنیادی ذہنی و قلبی انقلاب پیدا کرنا ہے پھر

انشاء اللہ اس بنیاد پر ہر عمارت استوار اٹھے گی اور استوار رہے گی۔ اسی کو حضرت مجدد وقت نے فرمایا کہ "میرے ہاتھ میں حکومت ہو تو سب سے پہلے دس سال تک مسلمانوں کو صرف پورا مسلمان بنانے کی فکر و تدبیر کروں"۔

دین کی قطع و برید: دوسرا بہت بڑا ظلم جو اسلام پر خود مسلمانوں کے ہاتھ سے ہوا، وہ اس کی قطع برید چیر پھاڑ یا جسے بخروں میں تقسیم اور "کل حزب بمالدیھم فرحون" کی وبا ہے۔ کسی نے نرے بے جان ایمان پر تکیہ کر رکھا ہے، جن میں بعض نئے مجددین کی جرات یہاں تک بڑھی کہ ایمان بالرسالت تک ضروری نہیں۔ نجات کے لئے بس توحید لا الہ الا اللہ کافی ہے۔ محمد رسول اللہ پر ایمان ضروری نہیں۔ مجدد وقت علیہ الرحمتہ نے اسی خوش فہمی پر اپنے ایک وعظ "احسان الاسلام" میں متنبہ فرمایا ہے کہ

"ہمارے روشن خیال حضرات کے نزدیک اسلام کی حقیقت ایسی ہے کہ نہ اس میں کچھ منہیات ہیں نہ مامورات، کسی منہی عنہ سے منع کرو تو کہتے ہیں کیا اس سے ایمان جاتا رہا۔ مولویوں نے خواہ مخواہ تنگی کر دی ہے، اجی اسلام بہت وسیع چیز ہے۔ بس لا الہ الا اللہ کے قائل ہو گئے اور اسلام کامل ہو گیا ایک حدیث یاد کر رکھی ہے من قال الہ الا اللہ قد دخل الجنتہ سبحان اللہ اچھا ست نکالا کہ لا الہ الا اللہ کہہ لیا بس کافی ہے اور اعمال کی کیا ضرورت ہے۔ بے شک حدیث صحیح ہے مگر جو مطلب آپ سمجھے وہ اس کا مطلب ہی نہیں"۔

اور پھر صحیح مطلب ایک عام فہم مثال سے اس طرح واضح فرمایا ہے کہ نکاح میں مثلاً صرف ایجاب و قبول ہوتا ہے، اور نان و نفقہ وغیرہ دیگر واجبات کا صراحتہً کوئی ذکر نہیں ہوتا، تو اب اگر نکاح کے بعد بی بی شوہر سے مطالبہ کرے کہ

"غلہ لاؤ گھی لاؤ کپڑا لاؤ وہ لاؤ تو آپ کہتے ہیں کہ بی بی تو پاگل ہو گئی ہے کیسی لکڑی کیسا غلہ کیسا گھی میں نے ان چیزوں کی کہاں ذمہ داری لی ہے۔ اس نے کہا کہ آخر تم نے ایجاب و قبول پر کہا نہ تھا کہ میں نے قبول کیا۔ وہ کہتے

ہیں کہ پھر میں نے یہ تو نہ کہا تھا کہ غلہ وغیرہ بھی قبول کیا ہے۔ میں نے فقط تجھے قبول کیا تھا۔ غرض جھگڑا اس قدر بڑھا کہ محلہ کے لوگ فیصلہ کرنے کے لئے جمع ہو گئے ان میں آپ بھی ہیں، اب بتایئے کیا فیصلہ کریں گے؟ کیا یہ فیصلہ نہ کریں گے کہ روٹی کپڑا سب اس سے دلا دیں گے اور کہیں گے کہ ارے احمق بیوی قبول کر لینا اس کی تمام ضروریات کو قبول کر لینا ہے، اس کے لئے مستقل معاہدہ کی ضرورت نہیں"۔

"بس لا الہ الا اللہ کے معنی بھی یہی ہیں، اب ذرا سنبھل کر کہئے گا۔ اس مختصر کلمہ نے تمام باتوں کو لے لیا ہے۔ لہٰذا جب (مثلاً) وضع خلاف شرع ہو گی تو ایک جز لا الہ الا اللہ کا چھوٹا، تو مولوی اہل محلہ کے مثل ہیں اور یہ اس نادان کے مثل ہے، جو کہتا ہے کہ میں نے لا الہ الا اللہ کہا تھا یہ کہاں کا جھگڑا نکالا ہے کہ وضع خلاف شرع نہ رکھو داڑھی مت منڈاؤ یا مت کٹاؤ مونچھیں مت بڑھاؤ نماز پڑھو روزہ رکھو۔

ایک وعظ بنام تفصیل الدین میں ایک اور پر لطف واقعہ سے اس کی توضیح و تنویر فرمائی ہے کہ

"رامپور میں ایک طالب علم نے مجھ سے کسی ضرورت کے لئے وظیفہ پوچھا میں نے کہہ دیا لاحول کثرت سے پڑھا کرو۔ کچھ دنوں بعد پھر ملے اور کہا نفع نہیں ہوا۔ میں نے اتفاقاً پوچھ لیا کہ تم نے کس طرح پڑھا تو کہتے ہیں کہ لاحول لاحول۔ میں نے کہا کہ تمہاری اس لاحول پر بھی لاحول۔ تو اگر اس طالب علم کا یہ سمجھنا صحیح تھا تو ان لوگوں کی دلیل بھی صحیح ہو سکتی ہے جو من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ سے دیگر عقائد و اعمال کا کیا ذکر ایمان بالرسالت تک کو خارج کر دیتے ہیں) مگر کون نہیں جانتا کہ لاحول ایک پوری دعا کا پتہ ہے یعنی لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم جیسے الحمد قل ہو اللہ وغیرہ سورت کا یا الم پورے سپارہ کا۔ اسی طرح حدیث میں لا الہ الا اللہ پورے کلمہ کا پتہ ہے بلکہ پوری شریعت کا۔ اور مطلب حدیث کا یہ ہے کہ جو شخص مسلمان ہو جائے وہ جنتی ہے اب یہ شریعت کے دوسرے مقامات سے پوچھو کہ مسلمان ہونا کسے کہتے ہیں (ص ۶۵)

"اب تمہارے ہی اجلاس میں فیصلہ کراتا ہوں کہ مثال مذکور کی طرح اس شخص کا محض لاالہ الااللہ کو کافی سمجھ لینا صحیح ہے ذرا بھی عقل سلیم ہو گی تو کون کہے گا کہ صحیح ہے .... یہ تو امت جدیدہ کا مذاق تھا اب قدیم مذاق والوں کو لیجئے۔ ان میں جو بڑے دیندار کہلاتے ہیں انہوں نے یہ کیا کہ نماز روزہ کر لو حور قصور کا اعتقاد کر لو بس اسلام اس میں منحصر ہو گیا۔ آگے رہے معاملات اخلاقی تہذیب معاشرت تمدن اس کو سمجھا کہ اسلام میں تو ہے نہیں، پھر یا تو اس کو متروک کر دیا اور اگر کسی نے ان کا اہتمام کرنا چاہا، تو بس غیر قوموں سے لینا شروع کر دیا۔ افسوس ہمارے گھر میں کیا نہ تھا جو دوسروں سے دریوزہ گری کی گئی۔ بس ایسی مثال ہے کہ ایک ٹوکرا روٹیوں کا سر پر ہے اور بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔

یک سبد پر ناں ترا بر فرق سر　　　　تو ہمیں جوئی لب ناں در بدر

اسی طرح ایک "نئے محقق" فرمانے لگے کہ

صرف توحید: "مسلمان ہونے کے لئے صرف توحید کافی ہے۔ اعتقاد رسالت کی ضرورت نہیں .... میں نے کہا کہ اگر توحید کا عقیدہ کافی بھی تسلیم کر لیا جائے، تو بھی وہ عقیدہ بدون اعتقاد رسالت متحقق نہیں ہوتا۔ وجہ یہ کہ توحید کی حقیقت خدا کو ذات و صفات میں کامل سمجھنا ہے اور منجملہ صفات باری تعالیٰ کے صدق بھی ہے۔ اگر کوئی (معاذ اللہ منہا) خدا کو جھوٹا سمجھے، تو وہ بوجہ انکار صفت کمال صدق کے توحید کا منکر ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ یہ ہوا کہ خدا نے ہمیں خبر دی ہے کہ "محمد رسول اللہ" (یعنی محمد اللہ کے رسول ہیں) تو جس نے دل سے اس کا یقین نہ کیا تو اس نے خدا کو جھوٹا جانا تو وہ توحید اسلام کا بھی منکر ہوا۔ جواب کے لئے دس برس کی مہلت ہے۔ اس کے بعد ان صاحب کی حالت اچھی ہو گئی۔ الحمد للہ"

بعضے روشن خیال خالی عمل کے گن گاتے پھرتے ہیں، اور عمل سے مراد زیادہ تر آج کل کے رنگ کی تمدنی و سیاسی جدوجہد یا ایسے اخلاقی اعمال ہوتے ہیں، جن کا کچھ نہ کچھ نفع دنیاوی زندگی اور اس کے کاروبار میں نظر آتا ہے۔ باقی نماز روزہ اور عبادات و ریاضات کی چنداں اہمیت نہیں یا معاذ اللہ ان کے انکار و استخفاف کی نوبت ہے۔ ایسوں کو اپنے ایمان ہی کی خبر لینا چاہئے۔ کوئی صرف نماز روزہ اوراد وظائف کو دین جانتا ہے معاملات و اخلاق کو بالائے طاق کر رکھا ہے، اور معاشرت تو گویا دین میں داخل ہی نہیں۔ کسی کا محض جوارح اور ظاہر اعمال صورت شکل وضع قطع کا دین سے کوئی واسطہ نہیں۔ اعمال میں اس کتربیونت کو ایک جگہ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے اعمال کو غیر ضروری نہیں سمجھا مگر

"ان میں اختصار کیا کہ کچھ اعمال کو لے لیا اور بہت سے چھوڑ دیے۔ اس میں طبائع مختلف ہیں بعض کو عبادات بدنیہ آسان ہیں اور مالیہ مشکل انہوں نے نماز روزہ تسبیح و نوافل کو اختیار کیا، مقدس صورت بنالی، مگر ایسے مقدس ہیں کہ نہ فرض حج ادا کرتے ہیں نہ زکوٰۃ دیتے ہیں، نہ معاملات میں احتیاط کرتے ہیں ان کا لین دین نہایت خراب ہے، بعضے ایسے ہیں جن کو مالی خرچ کرنا آسان ہے وہ حج بھی کرتے ہیں زکوٰۃ و خیرات بھی دیتے ہیں، مگر جان کا خرچ کرنا دشوار ہے، اس لئے نماز روزہ سے جان چراتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو طاعات بدنیہ و مالیہ دونوں کو بجالاتے ہیں، مگر طاعات قلب کو چھوڑ رکھا ہے۔ ظاہر میں بڑے مقدس ہیں مگر دل میں تکبر حسد ریا عجب بھرا ہے محبت و خشیت الٰہی برائے نام ہے۔ بعض نے ان اخلاق کا بھی اہتمام کیا ہے مگر معاشرت گندی ہے۔ تو اس طرح ہمارے بھائیوں نے اعمال کا ست نکال لیا ہے۔ مگر بھائیوں ست کا ست نہیں نکلا کرتا۔ دین تو سارا کا سارا خود ہی ست ہے۔ اس کا ہر جز ضروری ہے۔ اب اس کا ست اگر نکالو گے تو وہ ست نہ ہو گا بلکہ اجزائے ضروریہ کا فوت کرنا ہو گا، جیسے کوئی انسان کا ست نکالنا چاہئے تو اس کا ایک ہاتھ کاٹ دے اور ایک پیر اور ایک آنکھ پھوڑ دے اور ایک کان بند کر دے تو کہا جائے گا کہ ضروری

اجزا کو حذف کر کے آدمی کو بیکار بنا دیا (تفصیل الدین ص ۵۹)

صرف اصول اسلام۔ کوئی اپنے زعم میں اصول اسلام کا حامل ہے اور فروع کو محقرات امور میں شمار کرتا ہے۔ بھول چوک اور بات ہے ورنہ اگر فروع قصداً ترک و تحقیر کی چیز تھی تو شارع نے ان کی اتنی تعلیم و تفصیل ہی کیوں فرمائی اور بعض بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں پر سخت تہدید یا بڑے بڑے عذاب و ثواب کی ترہیب و ترغیب کیوں فرمائی۔ مثلاً جو شخص وضع قطع میں کسی قوم کی شباہت اختیار کرے وہ انہیں میں سے ہے یا فرمایا کہ اللہ کی لعنت ہو ایسے مردوں پر جو عورتوں کی شباہت بناتے ہیں اور ایسی عورتوں پر جو مردوں کی شباہت بناتی ہیں۔ پیشاب میں بے احتیاطی کی نسبت فرمایا کہ عذاب قبر اکثر اس کی بدولت ہوتا ہے۔ یا فرمایا کہ مسواک کر کے دو رکعتیں پڑھنا ان ستر رکعتوں سے افضل ہیں جو بے مسواک کئے پڑھی جائیں۔ اسی طرح فرمایا کہ نماز کے سامنے سے گزرنے والے کو اگر خبر ہوتی کہ اس میں کتنا گناہ ہوتا ہے تو چالیس سال تک اس کے نزدیک کھڑا رہنا سامنے نکل جانے کے مقابلہ میں بہتر ہوتا۔ بظاہر یہ باتیں کیسی چھوٹی معلوم ہوتی ہیں۔ پھر مسلمہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے گناہوں یا صغائر پر اصرار یعنی ان کو عمداً اور برابر کرتے رہنا کبائر یعنی بڑے بڑے گناہوں کا درجہ رکھتا ہے۔ بالکل ایسی مثال ہے کہ اگر کسی عدالت یا دفتر میں یہ ہدایت لگی ہو کہ شور و غل نہ مچانا فرش یا دیواروں پر تھوکنا نہیں، تو خواہ اس کے تعزیرات میں کوئی سزا نہ بھی مقرر ہو۔ پھر بھی اگر کوئی شخص برابر یہ حرکتیں جان بوجھ کر کرتا رہے، تو کیا حاکم کی انتہائی ناراضی کا باعث نہ ہوگی اور کان پکڑ کر نکلوا نہ دے گا۔

خود فراموشی۔ پھر کسی کو ساری دنیا کے مسلمانوں کی نام نہاد اصلاح کا غم ہے اور سارا اسلام یہی ہے۔ اگر نہیں غم ہے تو خود اپنی اصلاح یا اپنے اہل و عیال کی اصلاح کا کچھ ایسے بھی ہیں کہ خود اپنی جنت کی تو فکر ہے، باقی سارے مسلمان کیا خود اپنے بال بچوں کی جہنم کا بھی اندیشہ نہیں۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر بالید و باللسان کیا معنی بالقلب کے اضعف الایمان کا جو تقاضا ہے کہ خدا کے نافرمانوں سے کم از کم تعلقات میں کمی اور بیزاری ظاہر ہو اس کا احساس تک نہیں، بلکہ اس کا نام "رواداری" ہے۔ باقی اکثریت تو

عوام و خواص سارے مسلمانوں کی ایسی ہو رہی ہے کہ "کل حزب بمالدیہم فرحون" سے بھی معاملہ آگے نکل گیا ہے۔ یعنی دین کی دراصل کوئی طلب اور اس کی طرف توجہ نہیں رہ گئی ہے۔ کچھ مردہ یا خود تراشیدہ رسوم اور مسلمانوں کے نام کے سوا باقی اسلام سے اور کوئی کام نہیں رہ گیا۔

اسلام کی دینی دنیوی برکات سے محرومی: دین سے اس عام بے پروائی اور جو کچھ رہا سہا دین ہے، اس کی بھی طرح طرح سے قطع و برید اور چیر پھاڑ کا خمیازہ اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا تھا کہ اسلام کے دینی و دنیوی انفرادی و اجتماعی تمام ثمرات و برکات سے ہم محروم ہو جائیں۔ اگر کسی شخص کے ظاہر جسم و جوارح ہاتھ پاؤں آنکھ کان وغیرہ میں سے کوئی غائب ہو جائیں تو ایسے شخص سے ظاہراً و باطناً کامل انسان کے کمالات و آثار کیسے رونما ہوں گے۔ اسی طرح اگر کسی مشین کے پرزے کچھ غائب کچھ ناتمام یا فرسودہ ہو جائیں، تو یا تو وہ سرے سے بیکار ہو کر رہ جائے گی یا اس کی ناقص مصنوعات کی بازار میں پرسش نہ ہوں گی۔ اسلام بھی ایک عضوی کل یا نظام (آرگنیزم) یا ایسی مشین ہے، جس میں پوری حیات انسانی کے سارے چھوٹے بڑے اعضا یا پرزے بالکل ٹھیک اپنی اپنی جگہ لگے ہیں۔ اگر کوئی بھی ان میں سے غائب یا ناکارہ ہو جائے، تو اسی اعتبار سے پورا مجموعہ بھی ناقص یا متاثر ہو گا۔ پھر اس مشین یا مجموعہ کا کیا حال ہو گا، جس کے اکثر پرزے یا اجزا ناکارہ یا ناقص ہو کر رہ گئے ہوں! ہماری بدحالی بھی کچھ اسی حال کو پہنچ گئی ہے کہ یا تو اسلام سے سرے سے کوئی سروکار نہیں، نہ دنیا کے لئے نہ آخرت کے لئے اس کی کاٹ چھانٹ نے افراد و جماعت سب کے اسلام کی صورت ایسی مسخ کر دی ہے کہ نہ اپنوں کے لئے اس میں دین و دنیا کی اصلی قوت و برکت رہ گئی ہے، نہ غیروں کے لئے کوئی کشش و رغبت بلکہ الٹے کچھ اس طرح کی قدرتی نفرت پیدا ہو گئی ہے، جیسے کوئی لولے لنگڑے کوڑھی آدمی سے باوجود اس کے آدمی ہونے کے پیدا ہو جاتی ہے!

اصلاح انقلاب

حضرت جامع المجدد دین کو سب سے بڑا غم اسلام کی جامع و کامل تعلیم کی اس شکست و ریخت یا قطع و برید کا ہے اور لازماً تجدیدی جامعیت کی نگاہ ایمان و عمل کے تمام ابواب اور ان کے اصول و فروع کو محیط ہے۔ جس کا اندازہ کچھ تو اوپر بہشتی زیور کی جامعیت سے ہو چکا لیکن بہشتی زیور کی حیثیت ایک درسی کتاب (ٹیکسٹ بک) کی تھی، جس میں نفس احکام و مسائل کے علاوہ اس کی تفصیل کی زیادہ گنجائش نہ تھی۔ ورنہ باقی سینکڑوں کتابیں اور رسالوں کے ہزاروں صفحات، مواعظ و ملفوظات کے ضخیم مجلدات، تعلیم و تربیت کے لاتعداد مکتوبات سب کی سب تجدید و اصلاح کی اسی جامعیت و ہمہ گیری کی مفصل شہادت ہیں۔

اصلاحی انقلاب: اس سلسلہ میں جو خالص توجہ اول اول حضرت نے فرمائی وہ غالباً اصلاح انقلاب نام مضامین کا سلسلہ تھا، جو آج سے چالیس سال پہلے (یعنی ۱۳۳۸ھ سے قبل) رسالہ القاسم میں شائع ہوتا رہا اور جو بعد میں اسی نام سے مستقل کتاب کی صورت میں دو حصوں میں شائع ہوا۔ اس میں اصل گفتگو اس پر ہے کہ جامع و کامل اسلام کے مختلف شعبے یا اجزا کیا کیا ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں مسلمانوں نے کیا کیا انقلاب یا تغیر و تبدل کر دیا ہے، اور اس انقلاب کی اصلاح کی صورتیں کیا کیا ہیں۔ نہایت قلق و درد کے ساتھ ارشاد ہے کہ

"افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ جس مرتبہ کا انقلاب عظیم اکثر احاد (یا افراد) امت میں واقع ہوا ہے اس کے دیکھتے بے اختیار زبان پر آ جاتا ہے۔"

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب　　　　خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

اس انقلاب کا اندازہ: اس سے ہو سکتا ہے، کہ ایک ہاتھ میں ایک کتاب احکام شرعیہ کی تفصیلات کی لیجئے اور ایک اور ایک نظر سے ایک ایک جزئی کو دیکھتے جایئے اور ایک نظر سے کسی غیر مطیع امتی کی حالت کو دیکھتے جایئے، تو ایک حیرت عظیم ہو گی کہ یا اللہ ان حالتوں کے مرتکب کو کیا ان احکام سے کچھ بھی مس معلوم ہوتا ہے۔ دین کے اجزا یہ ہیں عقائد دیانات (مثلاً نماز روزہ طلاق نکاح وغیرہ) معاملات (مثل بیع و شرا وغیرہ) معاشرات (مثل طعام لباس کلام سلام وغیرہ) اخلاق باطنہ (مثل ریا اخلاص کبر و تواضع وغیرہ)۔

عقائد میں: "مسلمانوں نے غنیمت ہے انکار کا انقلاب نہیں پیدا کیا گو تدین ہی کے رنگ میں کچھ تغیر و تبدل ہوا جس سے وہ بدعت میں داخل ہو گئے۔ غرض نصوص کا انکار نہیں کیا گیا البتہ تاویل باطل کی گئی۔ یہ حالت عام مسلمانوں کی ہے مگر خاص خاص جدید تعلیم یافتوں نے انکار کا انقلاب بھی اختیار کیا، بلکہ انکار سے تجاوز کر کے جمہور کے عقائد کے ساتھ استہزا و تمسخر سے پیش آنے لگے، جس پر حافظان حدود دین نے کفر کا فتویٰ لگایا، اور اس فتویٰ کی بدولت دوسری طرف سے ان کو متعصب کا لقب عطا ہوا۔ گو جو شخص کفر کی حیثیت سمجھے گا وہ ان علماء کو اس فتویٰ سے معذور جانے گا، بلکہ خود بھی ان کے ساتھ اتفاق کرے گا۔ یہ تو پہلے جز کے انقلاب کی کیفیت تھی۔

دیانات میں: رہا دوسرا جز یعنی دیانات اس میں عام مسلمانوں نے درجہ بدعت کا بھی تغیر و تبدیل نہیں کیا۔ البتہ ترک و اہمال سے کام لیا کہ کسی نے نماز روزہ کو اس طرح خیرباد کہا گویا اس کے ذمہ فرض ہی نہیں۔ کسی نے نکاح و طلاق کے ساتھ یہی معاملہ کیا کہ عقیدہ میں تو مسائل نکاح و طلاق کو دین میں داخل سمجھا .... ان کے مقابلے میں اور احکام مخترع نہیں کئے مگر عمل یہ رکھا کہ مثلاً جہاں نفس کا غلبہ ہوا تمتع کے لئے نکاح کا بھی انتظار نہیں کیا یا دنیوی ننگ و ناموس باقی رکھنے کے لئے باوجود طلاق کے بدستور بی بی سے متمتع

ہوئے اور بچے جنواتے رہے۔ لیکن خاص خاص تعلیم یافتوں کو یہاں بھی انکار میں تردد نہیں ہوا۔ بہرحال مسلمانوں میں جزو اول میں تغیر کا انقلاب ہوا، اور جزو ثانی میں ترک و اہمال کا۔

معاملات معاشرات اور اخلاق. "اب رہ گئے بقیہ اجزائے ثلاثہ یعنی معاملات معاشرات اور اخلاق ان میں ان دونوں مذکورہ انقلابوں سے بڑھ کر انقلاب ہوا۔ یعنی عام مسلمانوں نے بھی اپنی بے خبری سے ان کو جزو دین نہیں سمجھا، بلکہ دنیاوی کارروائی سمجھ کر اس کے دستور العمل کو بھی اپنے رائے واختیار کے تابع سمجھا......... اور ہر حکم شرعی کے مقابلے میں ایک ایک کارروائی اور ایک ایک رسم اور ایک ایک عادت اختراع کی اور اس میں ذرا بھی اپنے کو قصوروار یا خطاوار نہیں سمجھا، بلکہ ہنر و فخر سمجھا.......... جس کی علامت یہ ہے کہ ان امور میں احکام حقہ کی دعوت دینے والے سے سخت مزاحمت کی جاتی ہے، سو درحقیقت یہ انقلاب بہت بڑا انقلاب ہوا۔ کیونکہ اول کے دو انقلابوں میں اجزائے دین کو دین سے خارج نہیں کیا گیا نہ ان کے مقابلہ میں دوسرے امور کو مستحسن جان کر تجویز کیا گیا گویا ایک جگہ تغیر وہ بھی من حیث التدین اور دوسرے جگہ ترک وہ بھی باعتبار تقصیر واقع ہوا۔ اور ان تینوں اجزائے دین کو تو دین سے خارج ہی کر دیا گیا اور بجائے ان کے دوسرے احکام اختراع کئے اور ان اختراعات کو اصل دین پر ترجیح دی گئی تو ظاہر ہے کہ یہ انقلاب پہلے دونوں سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ اور وقوع میں اظہر و اکثر بھی تینوں ہیں۔ کیونکہ عقائد کا حصہ گو الزم (یعنی لازم زیادہ) ہے، مگر اظہر نہیں (یعنی دل سے تعلق رکھنے کی بنا پر اس کا زیادہ ظہور نہیں ہوتا) اور دیانات کا حصہ خاص خاص اوقات میں ظاہر ہوتا ہے، پس وقوع میں اکثر نہ ہو بخلاف اس کے آخر کے تینوں اظہر بھی ہیں اور اکثر بھی۔ اس بنا پر دیکھنے والوں کو اکثر افراد امت میں یہ انقلاب عظیم ہر وقت میں نظر آئے گا۔ تو جو شخص ہر وقت یہ انقلاب عظیم دیکھے اور پھر یہ دعویٰ سنے کہ "یہ محمدؐ کی امت میں ہوں تو وہ سخت حیرت میں واقع ہو گا کہ یا اللہ یہ شخص کس بات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہے جو ایسا دعویٰ کرتا ہے"۔

یہ انقلاب عقائد و عبادات سے اشد ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے معاملات، معاشرات اور اخلاق میں اسلامی نقطۂ نظر سے جو تغیر واقع ہوا ہے وہ مجدد وقت کی نظر میں اس اعتبار سے عقائد و عبادات یا دیانات سے بھی اشد ہے کہ ان کی جگہ اپنے نفس سے نئے نئے احکام و رسوم گڑھ لئے ہیں اور ان کو عیب و معصیت کے بجائے عین ہنر و فخر جانتے ہیں۔ ثانیاً دین کے ان اجزائے ثلاثہ سے جو احکام تعلق رکھتے ہیں، وہ گو عقائد دیانات کے درجہ میں لازم و واجب نہیں، لیکن چونکہ ان کا تعلق روزمرہ کی زندگی اور باہمی تعلقات سے ہے اس لئے دن رات ان سے واسطہ پڑتا اور کثرت سے ان کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ گھر باہر سفر حضر کچہری دفتر مسجد و مدرسہ بازار و میکدہ شادی و غمی دوستی و دشمنی وغیرہ ہر موقع و محل پر ان کا مظاہرہ ہوتا ہے اور اپنے پرائے سب کو کھلی آنکھوں نظر آتے ہیں۔

تجدید کی ہمہ گیری۔ اب اگر ایک طرف دین کے ان پانچوں مہمات ابواب یعنی عقائد دیانات معاملات اخلاق و معاشرت کو پیش نظر رکھو اور دوسری طرف مجدد وقت علیہ الرحمہ کی صرف ان تجدیدی و اصلاحی خدمات پر ایک سرسری نظر ڈالو جو قلمبند صورت میں رسائل و مکتوبات تالیفات و تصنیفات اور مواعظ و ملفوظات کے سینکڑوں مجلدات اور ہزاروں صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں، بلکہ صرف ان کی فہرست ہی پر ایک نگاہ سے گزر جاؤ تو تجدید و اصلاح کی اس جامعیت پر حیرت کی حد نہیں رہتی کہ دین کے ان سارے ابواب کے سارے اصول و فروع میں شاید ہی کوئی چیز محتاج تجدید و اصلاح ایسے ملے، جو حضرت کی ہمہ گیر نظر سے نظر انداز ہو سکی ہو۔

غرض امت محمدیہ (علیہ الصلوٰۃ والتحیہ) میں جو ایسا شدید و ہمہ گیر انقلاب ہوا ہے، کہ آج اس کی صورت نہیں پہچانی جاتی، اس کی ہمہ گیر اصلاح کی کیا صورت ہے؟ اس ہمہ گیر انقلاب کی ہمہ گیر یا جامع اصلاح کی فکر و تدبر حضرت جامع المجدد دین کی ساری زندگی اور خدمات کا محور ہے۔ جس کا اجمالی خاکہ اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ "یہ انقلاب ایک روحانی مرض ہے اور جس طرح جسمانی امراض کے خاص اسباب ہوتے ہیں اور ان کی

اصلاح و معالجہ ان اسباب کے ازالہ سے ہوتا ہے اسی طرح اس روحانی مرض و انقلاب کے بھی خاص اسباب ہیں اور ان کا ازالہ ہی اس کے معالجہ و اصلاح کا طریق ہے۔ لہٰذا اسباب مرض کی تشخیص اور ان کے ازالہ کی تدبیریں دوامر مرجع اہتمام قرار پائے"۔

اسباب انقلاب۔ "امر اول یعنی اسباب انقلاب کی تشخیص۔ اس میں تامل و تدبر و تتبع کرنے سے معظم اسباب دو امر ثابت ہوئے ایک قلت علم یعنی ناواقفی و بے خبری دوسرا ضعف ہمت یعنی قصد و ارادہ کی کمی یا فقدان۔ سبب اول سے خود احکام ضروریہ و واقعیہ ہی مخفی رہتے ہیں اور سبب ثانی سے باوجود خبر و آگاہی کے نوبت عمل کی نہیں آتی"۔

ان اسباب کا ازالہ۔ "امر ثانی یعنی ان اسباب کے ازالہ کی تدبیر اور یہی بڑا امر ہے جس کے لئے توجہ تام اور قوت متفقہ کی احتیاج ہے۔ سو دونوں سببوں میں سے ہر ایک کے ازالہ کی تدبیر جدا ہے۔ پس بے خبری کے ازالہ میں تو معلم و متعلم یعنی خواص و علمائے احکام اور عوام و طالبان احکام دونوں کو دخل ہے۔

طالبان احکام کا دستور العمل: "یہ ہے کہ ان میں جو زیادہ فارغ ہیں، جیسے اہل متنعم و اہل ثروت وہ اپنی اولاد کو علوم دینیہ کے لئے فارغ کر دیں گو ضروریات دنیوی کے لئے لسان ملک و فنون رائجہ کی بھی تحصیل کا مضائقہ نہیں مگر یہ درجہ تبعیت سے متجاوز نہ ہونے پاویں۔ جس سے اولاد تو یوں درست ہوئی اور خود کوئی وقت معین کر کے کسی عالم یا کامل الاستعداد طالب علم کے پاس جاکر یا اس کو بلا کر اگر علوم عربیہ سے مناسبت ہو تو وہ زیادہ بصیرت کا آلہ ہے، ورنہ اردو ہی (یا جس کی جو مادری زبان ہو اس) کے مفید و ضروری رسائل کسی محقق کے مشورے سے تجویز کر کے سبقاً سبقاً۔ بہتر تو یہ ہے کہ دو تین بار ورنہ اقل درجہ تحصیلاً ایک بار پھر مطالعہ سے چند باران پر عبور کر لیں۔ مگر یہ رسائل ایسے ہوں جن میں سب اجزائے دین کا کافی بیان ہو، عقائد دیانات معاملات معاشرات اور اخلاق۔

"اور جن کو معاش کی ضروریات سے فراغ نہیں ہے اور حرف شناس ہیں یا بآسانی ہو سکتے ہیں، وہ اپنے لئے بھی اور اپنی اولاد کے لئے بھی بجائے علوم عربیہ کے وہی اردو کے رسائل دینیہ بطور درس کے تجویز کرلیں اور پھر بطور دور کے ان کا بار بار مطالعہ کیا کریں اور مواقع خلجان میں خودرائی سے کام نہ لیں بلکہ نشان بنا کر چھوڑ دیں اور ماہر کے میسر ہونے کے وقت اس کی تحقیق کرلیں۔ اور جو لوگ نہ حرف شناس ہیں نہ بآسانی ہو سکتے ہیں، نہ اپنے بچوں کو کسی وجہ سے اس کے لئے فارغ کر سکتے ہیں، وہ ایسا انتظام کریں کہ ہفتہ میں بہتر تو یہ ہے کہ دو روز ورنہ ایک ہی روز مقرر کرلیں اور کوئی عالم یا اہل علم کا صحبت یافتہ جوان رسائل کو اچھی طرح سمجھا ہوا ہو تجویز کرلیں اور اگر کسی عالم سے تجویز کرالیں تو زیادہ احتیاط ہے۔ اور اس روز کسی خاص مقام مسجد وغیرہ میں جمع ہو کر اس خواندہ فہمیدہ شخص کو لاکر ایک معین وقت مثلاً گھنٹہ یا آدھ گھنٹہ تک اس رسائل کو سنا اور سمجھا کریں۔ اگر ایسا شخص مفت نہ ملے تو کچھ اس کی مالی خدمت کریں اور اس سنانے والے کو جہاں شبہ رہے نشان بنا کر رہنے دیں، جب کوئی عالم میسر ہو اس سے حل کریں اور سب مجمع کو پہنچا دیں اور جہاں دیہات وغیرہ میں ایسا شخص نہ ہو، تو آپس میں مشروع طریق سے چندہ کر کے کوئی ایسا آدمی باہر سے بلا کر رکھ لیں"۔

"یہ تمام طبقات مذکورین علاوہ اس تحصیل یا مطالعہ یا سماع رسائل کے دو امر کا اور بھی التزام رکھیں ایک تو یہ کہ اپنے اعمال و احوال میں جب کوئی امر جس کا حکم معلوم نہ ہو پیش آوے فوراً علمائے حقانی سے اس کو دریافت کریں اور اگر بوجہ بعد کے زبانی نہ پوچھ سکیں تو بذریعہ خط تحقیق کریں۔ اگر اوسطاً ایک مسئلہ روزانہ کی تقریراً یا تحریراً پوچھ پاچھ رکھے تو سال میں ساڑھے تین سو سے زیادہ اور دس سال میں ساڑھے تین ہزار سے زیادہ مسئلے معلوم ہو سکتے ہیں، جو بعض نام کے یا جدید عالموں کو بھی معلوم نہیں ہوتے اور یہ کوئی بڑا مشکل کام نہیں۔ دوسرے اس کا التزام رکھیں کہ علماء کی مجلس میں جایا کریں خواہ خاص مجلس ہو جیسے ملاقات کو خواہ عام جیسے جلسہ وعظ و نصیحت اور جو سنیں دل سے یاد رکھیں یہ تو مردوں کا انتظام ہوا۔

عورتوں کے لئے دستور العمل : "اب عورتیں رہ گئیں۔ ان کے لئے سہل تر طریق یہ ہے کہ اگر کوئی معلّمہ عفیفہ دیندار مل جائے تو کمسن لڑکیوں کو اس کے ذریعہ کلام مجید اور ایسے رسائل کی تعلیم دلا دیں۔ اور ان کے لئے بہشتی زیور کے دس حصے بالکل انشاء اللہ تعالیٰ کافی ہیں بلکہ گیارہویں حصہ بہشتی گوہر کے انضمام کے ساتھ مردوں کے لئے بھی کافی ہیں۔ اور اگر کوئی ایسی معلّمہ نہ ملے یا کسی لڑکی کو فراغ یا مناسبت نہ ہو تو ان کو بھی بڑی عورتوں کے انتظام میں شامل سمجھا جائے اور وہ انتظام دو ہیں ایک یہ کہ گھر کے مردوں میں سے اگر کوئی خواندہ ہو تو وہ روزانہ کوئی وقت مقرر کر کے سب گھر والیوں کو جمع کر کے رسائل بالا سنایا کریں بلکہ کئی دورے کریں دوسرا انتظام یہ ہے کہ گاہ گاہ کسی متورع متبع سنت عالم کا گھر میں وعظ کہلایا کریں کہ یہ عجیب موثر عمل ہے۔

علمائے احکام کا دستور العمل : "یہ سب دستور العمل طالبان احکام کے متعلق ہے۔ اب علمائے احکام کا دستور العمل باقی رہا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً اس میں ساعی رہیں کہ ناواقفوں تک احکام پہنچیں اور اس کی یہ صورتیں ہیں۔ ایک درس گو بعوض ہو اس میں علوم ضرور یہ کو مقدم اور مہتم بالشان رکھیں۔ یعنی دینیات سے حتی الامکان طالب علم کو پہلے فارغ کر دیں۔ اگر طالب علم دینی مختصرات یا اردو کے رسائل بھی پڑھے اور اپنے پاس وقت ہو تو ہرگز اس کے درس کو خلاف شان نہ سمجھیں۔ طالب علم کے فضول سوال پر اس کو تنبیہ کر کے جواب نہ دے۔ دوسری صورت وعظ ہے، جس میں خطاب عام ہے۔ اس میں ضرورت وقت کا لحاظ رکھیں، جن امور میں لوگ اس زمانہ میں مبتلا ہوں یا جن ضروریات میں فروگذاشت کرتے ہوں مدار بیان اس پر رکھے۔ دوسرے مضامین اگر ہوں تو بالتبع اور بقلت ۔ اور ضروری مضامین تمام ابواب کے ہوں صرف عقائد و دیانات پر اقتصار نہ کریں بلکہ معاملات و معاشرات اور اخلاق سے بھی پوری بحث کرے۔ بلکہ بوجہ متروک ہونے کے یہ ثلثہ اخیرہ زیادہ اہم ہو گئے ہیں" ۔

"وعظ میں بات صاف کہے کہ سننے والوں کو خوب سمجھ آ جائے۔ مگر خشونت اور اشتعال انگیز طرز سے بچے اور وعظ میں عوض نہ لے۔ البتہ اگر وعظ کا نوکر ہو وہ اور بات

ہے۔ تیسری صورت جواب ہے استفتا کا خواہ زبانی سوال ہو یا تحریری۔ اس میں ان امور کا لحاظ رکھے۔ حتی الامکان جواب میں توقف نہ کرے لایعنی سوال کا جواب نہ دے بلکہ سائل کو تنبیہ کر دے۔ اگر سوال محتمل دو صورتوں میں ہو تو تشقیق سے جواب نہ دے، بلکہ سائل سے پہلے صورت واقعہ متعین کرالے کیونکہ بعض وقت سائل دونوں شقوں کا حکم سن کر ایک کو اپنے مفید مطلب سمجھ کر اس کا دعویٰ کرنے لگتا ہے، جس کی وجہ سے سائل کا یا اس کے مقابل کا ضرر دینی یا دنیوی ہو جاتا ہے۔ عامی کو دلیل بتلانے کا التزام نہ کرے ہاں دوسرے علمائے مصححین کی سہولت کے لئے اگر دلیل کی طرف اشارہ کر دے یا کوئی عبارت بلاترجمہ لکھ دے مستحسن ہے۔ اگر قرائن سے معلوم ہو کہ سائل غائب تحریری جواب کو اچھی طرح نہ سمجھے گا یا سمجھنے میں غلطی کرے گا تو جواب لکھ کر یہ بھی لکھ دے کہ کسی عالم سے اس جواب کو زبانی حل کر لے۔ اگر قرائن سے معلوم ہو کہ سوال براہ تعنت ہے جواب نہ دے۔

"چوتھی صورت تالیف و تصنیف ہے خواہ اشتہار ہو یا اخبار یا رسالہ و کتاب۔ اس میں ضرورت وقت کا لحاظ اور عبارت میں سلاست و کفایت کی رعایت ہو۔ اور اگر خدا تعالیٰ معاش کی کوئی سبیل عطا فرمائے تو اپنی تصانیف کی خود تجارت نہ کرے"۔

ضعف ہمت کا ازالہ: "یہاں تک بیان تھا بے خبری کے زالہ کی تدبیروں کا۔ آگے بیان ہے ضعف ہمت کے ازالہ کی تدبیر کا

"تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ امور ذیل کو تقویت ہمت میں خاص اثر و دخل ہے ایک ان میں صحبت شیوخ کاملین جن کی علامتیں یہ ہیں۔ بقدر ضرورت علم دین رکھتا ہو۔ عقائد و اعمال و اخلاق میں شرع کا پابند ہو دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو کمال کا دعویٰ نہ کرتا ہو کہ یہ بھی شعبہ دنیا ہے۔ کسی شیخ کامل کی صحبت میں چندے رہا ہو۔ اس زمانہ کے منصف علماء و مشائخ اس کو اچھا سمجھتے ہوں۔ بہ نسبت عوام کے خواص یعنی فہیم دیندار لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوں۔ اس سے جو لوگ بیعت ہوں ان میں سے اکثر کی حالت باعتبار اتباع شرع و قلت حرص دنیا کے اچھی ہو۔ وہ شیخ تعلیم و تلقین میں اپنے مریدوں کے حال پر شفقت رکھتا

ہو اور ان کی کوئی بری بات دیکھے یا سنے تو روک ٹوک کرتا ہو۔ اس کی صحبت میں چند بار بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور حق تعالیٰ کی محبت میں ترقی محسوس ہوتی ہو خود بھی ذاکر و شاغل ہو، اس لئے بدون عمل یا عزم عمل تعلیم میں برکت نہیں ہوتی اور صدور کشف و کرامت اور استجابت دعا و تصرفات لوازم مشیخیت سے نہیں۔ غرض ایسے حضرات کی صحبت خاص طور پر موثر ہے مگر اس کی تاثیر میں شرط یہ ہے کہ نیت بھی یہی ہو کہ میرے قلب میں طاعت کی رغبت اور معاصی سے نفرت پیدا ہو اور اس کے ساتھ اس کا بھی التزام رہے کہ اپنی کیفیات قلبیہ کی اطلاع شیخ کو دے کر جو علاج "تجویز کریں اس پر کاربند ہو۔

"دوسرا امر ان میں سے بوقت میسر نہ آنے صحبت کاملین کے اہل اللہ کے حالات و مجاہدات کا مطالعہ یا استماع ہے۔ مگر ان کے جو مقالات متعلقہ اسرار غامضہ تصوف ہیں ان میں ہرگز مشغول نہ ہو۔ البتہ علوم معاملہ یعنی تربیت باطن و تہذیب نفس کے بارے میں جو کچھ ان کے اقوال ہیں وہ سرتاپا عمل در آمد کے قابل ہیں۔

"تیسرا امر مراقبہ موت و بعد الموت ہے۔ مراد اس سے ابتداء نزع روح سے دخول جنت یا نار تک جو احوال پیش آنے والے ہیں مثلاً سوال نکیرین و عذاب و ثواب قبر و حشر و وزن اعمال حساب و جزا و عبور صراط وغیرہ سب کو کسی وقت فراغ میں روزانہ کم از کم بیس منٹ سوچا کرے تقویت ہمت میں جن ملکات کو دخل ہے اس مراقبہ سے ان میں کمال پیدا ہو جائے گا مثلاً زہد و خشیت وغیرہ

"پس طریقہ اصلاح مکمل طور پر مشخص ہو گیا وللہ الحمد اور نہایت سہل اور ایسا عام و تام ہے کہ ادنیٰ توجہ سے تمام امت کم سے کم وقت میں اپنی اصلاح کر سکتی ہے آگے نفع حاصل کرنے والوں کی توفیق ہے۔

ما نصیحت بجائے خود کردیم — روزگارے دریں بسر بردیم
گر نیاید بگوش رغبت کس — بر رسولاں بلاغ باشد و بس

امر بالمعروف اور احتساب۔ جماعتی یا عمومی اصلاح کا ایک بہت بڑا اور کارگر ذریعہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر یا احتساب عام و خاص کا خود قرآنی حکم تھا اس کو

عام طور سے بالکل ترک ہی کر دیا گیا ہے۔ بلکہ اس کو قرآن و حدیث سے اسی طرح اور اسی ذہنیت کے تحت گویا بالکل خارج کر دیا گیا ہے، جس طرح جہاد کو۔ اور جس طرح خوش فہمی سے جہاد کو اکراہ فی الدین سمجھ کر اس کی طرح طرح سے تاویل کو تنسیخ تک پہنچا دیا گیا ہے، اسی طرح امر بالمعروف و احتساب کو "رواداری" کے منافی جان کر منسوخ کر دیا گیا ہے۔ اور جو لوگ اس کا کچھ خیال بھی کرتے ہیں وہ صحیح حدود و اصول کا لحاظ نہیں کرتے۔ اس لئے اس پر بھی اختصار کے ساتھ متنبہ فرمایا گیا کہ

"علمائے احکام کے دستور العمل کا متمم ایک اور امر ہے، یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور اس میں بعض پر غیر علماء بھی شریک ہیں یعنی خاص اپنے ان متعلقین پر احتساب کرنا جن پر قدرت ہے علماء کے ساتھ مخصوص نہیں۔ البتہ عام احتساب یہ خاص ہے علماء کے ساتھ اور عوام کی تصدی اس کے لئے اکثر موجب فتنہ و عداوت ہو جاتی ہے۔ نیز عوام اکثر احتساب کی حدود کو بھی نہیں جانتے اس سے غلوفی الدین کی نوبت آتی ہے۔ نیز اکثر عوام نفس کو مہذب نہیں کئے ہوتے اور ان کے احتساب میں بکثرت نفسانیت ہوتی ہے"۔

جس کی بدولت اس کو ہر جگہ یکساں واجب جان کر محل بے محل ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکنے لگتے ہیں۔ "حالانکہ یہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کہیں واجب ہوتا ہے جہاں فاعل بے خبر ہو یا فاعل پر پوری قدرت ہو یا قبول کی پوری توقع ہو ورنہ مستحب ہے اور منجملہ اس کے آداب کے یہ ہے کہ اول خلوت میں کہے اور نرمی سے کہے اس کے بعد اگر مصلحت ہو علانیہ کہے اور سختی سے کہے ورنہ اعراض کرے اور دعا کرے۔

"اور منجملہ اس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کفار کی تبلیغ بھی ہے خواہ بذریعہ تقریر خواہ بذریعہ تحریر۔ اپنے ملک کے کفار کو بھی اور دوسرے ملک کے کفار کو بھی۔ اور یہ بوجہ عموم شیوع احکام دینیہ کے گو

اس وقت واجب نہیں رہا، لیکن اگر کوئی ہمت کرے عین عزیمت ہے اور اس غرض کے لئے ان اقوام کی اگر زبان بھی سیکھ لے تو بشرط خلوص نیت عین طاعت ہے"۔

نیز "تبلیغ احکام کے متعلقات ہی سے ان احکام کی ایک خاص حفاظت بھی ہے یعنی اصول و فروع اسلام پر حملے یا اس میں آمیزشیں ہیں، خواہ اہل کفر کی ہوں یا اہل بدعت کی ان کو دفع کرنا اور رفع کرنا تاکہ طالبان حق شبہات سے محفوظ رہیں۔ اور اس مقصود کے لئے اگر اہل باطل پر ردو قدح کی حاجت ہو یا ان سے مناظرہ کرنا مصلحت ہو اس سے بھی پہلوتہی نہ کرے۔ اور اس زمانہ پر آشوب میں مناظرہ اگر مشروع ہے تو اسی غرض سے، ورنہ تعصب اس درجہ ترقی پر ہے کہ مناظرہ سے احقاق حق مقصود ہی نہیں رہا اور اس ردوقدح یا مناظرہ کے لئے اگر اہل باطل کے علوم و فنون حاصل کرنا ضروری ہو، وہ بھی طاعت ہے۔ جیسے اس وقت سائنس وغیرہ سیکھنا۔

لیکن خالی تدبیر ہی تدبیر یا اسی پر بھروسہ یہ پھر بھی دین نہ ہو گا، اس لئے آخر میں متنبہ فرماتے ہیں کہ "اس سب کے بعد بھی بڑی ضرورت دعا والتجا بہ جناب حق ہے۔"

این ہمہ گفتیم لیک اندر بسیج　　　بے عنایات خدا ہیچیم و ہیچ

پرہیز: ان تدابیر علاج کے بعد پرہیز کے بارے میں بھی چند ضروری تنبیہات فرما دی گئی ہیں۔ مثلاً دین کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے میں یہ بدپرہیزی ہوتی ہے کہ

"جو کتاب دین کے نام سے دیکھی یا سنی خواہ اس کا مضمون حق ہو یا باطل خواہ اس کا مصنف ہندو ہو یا عیسائی یا دہری یا مسلمان پھر مسلمان بھی گو صاحب بدعت ہی ہو، غرض کچھ تفتیش نہیں کرتے اس کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں۔ اور اس میں وہ مضامین بھی آگئے جو کسی مسئلہ کے متعلق اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں۔ سو اس میں چند مضرتیں ہیں بعض اوقات بوجہ کم علمی کے یہی امتیاز نہیں ہوتا کہ ان میں کون سا مضمون صحیح ہے کون سا

غلط اور کسی غلط کو صحیح سمجھ کر عقیدہ یا عمل میں خرابی کر بیٹھتے ہیں"۔

غور کیجئے یہ بدپرہیزی آج کل کتنی عام ہے! جب دنیاوی تعلیم اور درسگاہوں میں بھی ہم اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ ہر مضمون کی وہی کتابیں پڑھی پڑھائی جائیں، جو اس علم کے مستند و مسلم ماہرین کی لکھی ہوں، تو پھر دینی تعلیم و تعلم میں جس کا تعلق آخرت کے بناو بگاڑ سے ہے، یہ بدپرہیزی کیسی مہلک ہے۔

"اس لئے کسی صاحب معرفت یعنی عالم محقق سے مشورہ لے کر اس کا اتباع ضروری ہے۔ افسوس کہ اس ممانعت کو تنگ خیالی و تعصب پر محمول فرمایا جاتا ہے۔ کیا کوئی خیر خواہ باپ اگر اپنے بچے کو زہر ملی ہوئی مٹھائی کے کھانے سے روکے تو کوئی عاقل اس کو متعصب یا تنگ خیالی کا لقب دے گا اور اگر کوئی کہے کہ "خذ ما صفا دع ما کدر" کے طور پر اس کو دیکھتے ہیں۔ سو اس کا جواب اوپر واضح ہو گیا ہے کہ اس امتیاز کے لئے علم کامل و فہم وافی کی حاجت ہے اور کلام اس کے فاقد میں ہے"۔

چند کتابوں کے نام: اس ضمن میں چند کتابوں کے نام بھی تجویز فرما دیئے ہیں، جو عام لوگوں کے لئے بقدر ضرورت دینی واقفیت کو بالکل کافی و وافی ہیں۔ بہشتی زیور مع بہشتی گوہر تعلیم الدین فروع الایمان جزاء الاعمال تبلیغ دین قصد السبیل شوق وطن اگر اس سے زیادہ مطول و مفصل کی ضرورت ہو کسی عالم محقق سے دریافت کر لیا جائے۔

خود حضرت ہی کی اتنی کتابیں موجود ہیں، کہ عوام کیا خواص اور مشغول کیا فارغ کے لئے ساری عمر کے لئے کافی ہیں، جن کو پڑھتے رہنے سے نہ صرف علمی واقفیت بلکہ دین کی فہم و بصیرت بھی انشاء اللہ ایسی نصیب ہو گی کہ عام درسگاہی علماء تک کو اس کا عشر عشیر نصیب نہیں۔ کچھ نہ سہی اگر فرصت کے اوقات میں حضرت کے مواعظ و ملفوظات ہی کا مطالعہ کرتا رہے تو کافی ہونے کے ساتھ نہایت دلچسپ بھی ہو گا۔ اور مناسبت کے بعد تو دوسری کتابوں کو ہاتھ لگانے کا جی نہ چاہے گا۔ راقم الحروف کا یہ ذاتی تجربہ ہے۔

مسئلہ دریافت کرنے کا طریقہ: اسی طرح علماء سے مسائل دریافت کرنے میں بھی لوگ بہت سی غلطیاں کرتے ہیں مثلاً

"ایک مسئلہ کو کئی کئی جگہ پوچھتے ہیں اور بعض اوقات جواب مختلف ملتا ہے، تو اس وقت تعین راجح میں پریشان ہوتے ہیں یا جس میں نفس کی مصلحت ہوتی ہے اس پر عمل کرتے ہیں۔ اور کبھی اس کی عادت ہو جاتی ہے، تو استفتا سے مقصود یہی ہوتا ہے کہ نفس کے موافق جواب ملے اور جب تک ایسا جواب نہیں ملتا برابر کدو کاوش میں رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سراسر اتباع ہوا اور تلعب بالدین (دین کے ساتھ کھیلنا) ہے۔

"اپنا دستور العمل اس باب میں یہ رکھیں کہ جب کوئی ضرورت پیش آئے اپنے عمل کرنے کے لئے نہ کہ مباحثہ کے لئے تو ایسے شخص سے مسئلہ پوچھیں، جس کا معتبر و محقق ہونا صحیح ذریعہ سے معلوم ہو اور اس پر اعتماد و اعتقاد بھی ہو، اور کسی دوسرے عالم سے بلاضرورت نہ پوچھیں۔ اور اگر باوجود ان سب رعائتوں کے اس کے جواب میں شبہ رہے اور شفا نہ ہو تو ایسی ہی صفت کے دوسرے عالم سے پوچھ لیں اور اگر جواب پہلے کے خلاف ہو تو پہلے کا جواب اس کے سامنے اور اس کا جواب پہلے کے سامنے نقل نہ کریں، جس قول پر قلب مطمئن ہو عمل کریں اور یہی عمل اس حالت میں کریں جب کہ بلامراجعت دوسرے عالم کے خود بخود جواب اول کے خلاف کوئی جواب اس باب میں گوش زد ہو جائے"۔

وعظ سننے میں بے احتیاطی: کی نسبت ارشاد ہے کہ

"لوگ ہر قسم کے واعظوں کا وعظ سن لیتے ہیں۔ اس کے وہی مفاسد ہیں جو امر اول (یعنی ہر قسم کی کتابیں پڑھنے) کے اور وہی انسداد ہے جو مفاسد متعلق امر اول کا۔ یعنی جب کوئی واعظ جدید آوے اپنے شہر یا قریب کے کسی عالم معتبر سے اس واعظ کی حالت پوچھ لے اگر وہ اطمینان دلائے تو وعظ سنے ورنہ نہ سنے"۔

ایک بڑی بد پرہیزی: مضر صحبت ہے، جس کا اثر بے حد متعدی ہوتا ہے۔ اس معاملہ میں ایک بڑی بے پروائی برتی جاتی ہے کہ دوستی کرنے اور رکھنے میں دین و بیدنی کا بالکل خیال نہیں کیا جاتا۔

"یہ بھی عظیم غلطی ہے تجربہ سے ایک دوست کا اثر دوسرے دوست پر ضرور پڑتا ہے اور مضر اثر جلد پڑتا ہے۔ اس لئے ارشاد نبوی ہے کہ المرء علی دین خلیلہ فلینظر من یخالله۔ البتہ جو ملاقات بضرورت ہو وہ مستثنیٰ ہے"۔

دین کی کوتاہیوں کی تفصیل: یہ تو تمہیدی باتوں کا خلاصہ تھا۔ باقی علم و عمل میں جو خاص خاص کوتاہیاں اور خرابیاں راہ پا گئی ہیں، سب کی اس کتاب اصلاح انقلاب کے ساڑھے تین سو صفحات کے دو حصوں میں ایک ایک کر کے تصحیح و تفصیل فرمائی گئی ہے۔ دین کے معاملہ میں ہماری جہالت و غفلت جس انتہا کو پہنچ گئی ہے، اس کا سرسری اندازان خرابیوں اور کوتاہیوں کی درج ذیل مثالوں سے کیا جائے۔

قرآن مجید کی کوتاہیاں: سب سے پہلے قرآن مجید کی تعلیم و تعلم میں جو کوتاہیاں ہوئی ہیں ان کا بیان ہے۔ اولا تو قرآن مجید کا عام طور سے پڑھانا پڑھنا ہی متروک ہے، اس کے لئے مشورہ دیا ہے کہ کثرت سے "ہر بڑے گاؤں تک میں ایک ایک مکتب قرآن مجید کا قائم کیا جائے" اس معاملہ میں تجدد کے شیطان نے ایک گروہ میں بڑا وسوسہ یہ پیدا کر دیا ہے، کہ بچوں کو قرآن کے خالی الفاظ پڑھانے یا رٹانے سے کیا فائدہ۔ یہ خیال محض علمی کوتاہی نہیں بلکہ اعتقادی خرابی ہے جس کی نسبت ارشاد ہے کہ اس گروہ کے

پہلی کوتاہی: "عدم اہتمام کا منشا سوء اعتقاد ہے یعنی تحصیل الفاظ کو ایک فضول ولایعنی حرکت بلکہ معاش میں مخل سمجھ کر مضر جانتے ہیں............ کوئی صاحب کہتے ہیں کہ جب معنی نہ سمجھے تو طوطے کی طرح پڑھنے سے کیا فائدہ۔ کوئی صاحب کہتے ہیں کہ جب دو سال اس

میں صرف ہو گئے یا حفظ کرنے میں دماغ صرف ہو گیا پھر علوم معاش کی وقت میں گنجائش نہ ہو گی، یا اس میں دماغ کام نہ دے گا.......... یہ حضرات غور فرمائیں کہ فضول اس کو کہتے ہیں جس میں کوئی فائدہ نہ ہو۔ اور جو شخص خدا کو خدا اور رسول کو رسول اور دونوں کے کلام کو صادق مانتا ہے، وہ اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ فائدہ صرف دنیوی فائدہ میں منحصر نہیں.......... پس جب مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے کلام سے ثابت ہے کہ خالی الفاظ پڑھنے سے بھی ایک ایک حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں۔ اور خالی الفاظ پڑھنا بھی بڑا سبب حق تعالیٰ کی توجہ و قرب کا ہے۔ ہاں کوئی ان نیکیوں اور حق تعالیٰ کی توجہ و قرب ہی کو فضول شمار کرے تو یہاں اس سے گفتگو نہیں"۔

دوسری کوتاہی: یہ ہے کہ بہت لوگ پڑھتے پڑھاتے تو ہیں۔ مگر پڑھ کر پھر اس کا نام تک نہیں لیتے بلکہ ان میں بعض حافظ فخر کرتے ہیں کہ ہم نے سال بھر تک کھول کر بھی نہیں دیکھا باوجود اس کے ہم نے رمضان میں سنا دیا۔ اس ناواقفی کی بھی کوئی حد ہے کہ جو بات عیب کی تھی اس کو ہنر سمجھ کر فخر کیا جاتا ہے۔ ان صاحبوں کو سمجھنا چاہئے کہ مقصود پڑھنے سے تو یہ تھا کہ اس کی تلاوت سے برکات حاصل کی جائیں، جب یہ نہ ہوا تو پڑھا بے پڑھا برابر ہو گیا"۔

اس کے علاوہ نہ پڑھنے سے بھول جانے کا بھی اندیشہ ہے اور قرآن کے بھلانے پر حدیثوں میں سخت وعید آئی ہے کم فرصتی کا عذر بھی صحیح نہیں اس لئے کہ "جس چیز کا انسان ارادہ کر لیتا ہے کسی نہ کسی صورت سے اس کو کر ہی لیتا ہے خاص کر جب کام بھی آسان ہو۔ یہ بھی کوئی مشکل کام ہے کہ ۲۴ گھنٹے میں سے آدھا گھنٹہ نکال کر اگر ناظرہ خواں ہے تو ایک پارہ اور حافظ ہے تو ڈیڑھ پارہ بے تکلف پڑھ لے سکتا ہے۔ اتفاقاً ناغہ ہو جائے تو اور بات ہے"۔

ایک بڑی کوتاہی: یہ ہے کہ جو لوگ کلام مجید ناظرہ یا حافظ پڑھ بھی لیتے ہیں اور تلاوت بھی کرتے رہتے ہیں وہ بھی اکثر غلط پڑھتے اور تجوید و صحت مخارج سے بالکل جاہل

ہوتے ہیں جس کی بدولت بعض بعض جگہ معنی تک بگڑ جاتے ہیں۔

"اس کوتاہی میں اہل علم کا نمبر غیر اہل علم سے بھی کچھ بڑھا ہوا ہے۔ پھر بعضے ان میں مساجد کے امام ہوتے ہیں ان کی غلطی کا اثر دوسروں تک بھی دو طور سے پہنچتا ہے ایک یہ کہ اگر کوئی مقتدی صحیح خواں ہو اس کی نماز ایسے امام صاحب کے پیچھے نہیں ہوتی اور چونکہ غلط خواں کا حکم صحیح خواں کی نسبت سے امی کا سا ہے بہ نسبت قاری کے اس لئے اس خاص صورت میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نہ امام کی نماز ہوتی ہے نہ مقتدیوں کی یہ کتنی بڑی تباہی کی بات ہے"۔

اور "ہر چند کہ تجوید کے وجوب میں کلام طویل اور مقتضی تفصیل ہے۔ مگر اس قدر میں کسی کو کلام نہیں کہ جس قسم کی غلطیوں کا ذکر اوپر ہوا ہے، ان کی تصحیح واجب العین ہے جب تک کہ عدم قدرت و عدم مساعدت لسان متعین نہ ہو جائے۔ جس کی موٹی دلیل یہ ہے کہ بدوں اس قدر تصحیح کے قرآن کی عربیت باقی نہیں رہتی۔ اور عربیت لوازم قرآن سے ہے۔ پس اس کے نہ رہنے سے قرآن قرآن نہ رہے گا۔ پس اس کی ضرورت میں کیسے اشتباہ ہو سکتا ہے۔ اور اس میں قرآن یا عربی کی کیا تخصیص ہر زبان کی صحت اس کے خاص طرز ادا پر موقوف ہے۔ مثلاً پنکھا اورنگ میں اخفا ہے اگر نون میں اظہار کیا جائے یقیناً لفظ غلط ہو جائے گا اور لفظ کھنبا اور دنبہ میں اقلاب ہے، اگر یہ نہ ہو تو لفظ غلط ہو جائے گا۔ مگر بات یہ ہے کہ قلوب میں ادراک نہیں رہا۔ اور آخرت کی نعمتوں کی رغبت دنیا کی نعمتوں کے برابر بھی نہیں رہی"۔

تجوید بقدر واجب کی سہولت: پھر بقدر واجب تجوید کی سہولت کی طرف توجہ دلائی ہے:

"کل حروف ۲۸ ہیں ان میں بعض بعض تو قریب قریب صحیح نکلتے ہیں، ان کو

مستثنیٰ کر کے جن میں اہتمام کی حاجت ہے سات ہیں ث۔ ح۔ ذ۔ ص۔
ض۔ ط۔ ظ اور جو بالکل دیہاتی ہیں ان کے لئے اتنے ہی اور خ۔ ز۔
ش۔ ع۔ غ۔ ف۔ ق اگر ایک گھنٹہ روزانہ مشق کے لئے نکالا جائے تو
روزانہ ایک حرف کی ضرور ہی مشق ہو سکتی ہے جس میں ایک ہفتہ اور دیہاتی
کے لئے دو ہفتے کافی ہیں۔ اور احتیاطاً آدھا یا ایک مہینہ غایت سے غایت
صرف ہوگا تو کیا دین کی اتنی بڑی ضرورت کے لئے اتنی بڑی عمر میں سے اتنا
حصہ بھی نہیں دے سکتا کتنا بڑا غضب اور ستم ہے۔ اسی طرح فتحہ اور الف
کی مقدار کا فرق اگر ایک پارہ میں درست ہو جائے تو تمام قرآن یکساں ہے
تمام کے لئے کافی ہے۔ اگر ایک رکوع روزانہ درست کیا جائے تو یہ کام
بھی پندرہ بیس روز سے زیادہ کا نہیں۔ پھر بقیہ قرآن بھی تھوڑا تھوڑا کر کے
کسی ماہر کو سنا دینا جو متفرق اوقات میں سہل ہے زیادہ اطمینان و احتیاط کی
بات ہے"۔

بچپن ہی میں اس کا اہتمام: لیکن اصل یہ ہے کہ اس کا خیال بچپن ہی سے کرنا چاہئے "کہ بچے جس وقت قرآن پڑھیں پڑھنے کے ساتھ ہی تصحیح کا اہتمام رہے...... تو صحت ان کے لئے مثل امر طبعی کے ہو جائے اور مشقت کا ایک بڑا حصہ مختصر ہو جائے"۔

"اور اس کا بھی التزام رکھیں کہ جب کسی مسجد میں امام مقرر کریں کسی
ماہر کو اس کی متعدد سورتیں سنوا دی جائیں اگر وہ صحت کی تصدیق نہ کرے
تو کسی ماہر کو تلاش کریں اگر ارزاں نہ ملے گراں لا دیں۔ کیسی ظلم کی
بات ہے کہ ہر دنیوی کام کے لئے ذی ہنر اور ذی لیاقت آدمی تلاش کیا
جاتا ہے، حتیٰ کہ لوہار معمار نجار بلکہ گانے بجانے والا تک بھی اور خدا کے
روبرو جو سب کی طرف سے وکیل بن کر کھڑا ہوتا ہے وہ چھانٹ کر ایسا
رکھا جاتا ہے، جس میں نہ کمال نہ جمال۔

"اہل مدارس اس کا التزام رکھیں کہ جو طالب علم ان کے مدرسہ میں
داخل ہونا چاہیں امتحان داخلہ کا ایک جز اور اجزا سے زیادہ نہیں تو برابر

درجہ میں سہی صحت قرآن کو بھی قرار دیں۔ اور بدون تجربہ صحت یا بعض حالات میں کم از کم وعدہ تصحیح تو ضرور لے لیا جائے بدون اس کے داخل نہ کریں۔ اور وعدہ کی صورت میں جتنے سبقوں کا وہ مستحق ہے ان میں سے ایک سبق کی جگہ اس تصحیح کو رکھیں اور اس مرحلہ کو طے کرنے کے بعد پورے سبقوں کی اجازت دیں"۔

ان مثالوں سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کا مسلمان پر صرف پڑھنا ہی نہیں صحت کے ساتھ پڑھانا اتنا ضروری ہے کہ بچوں اور بڑوں سب کے لئے گھر اور مدرسہ ہر جگہ اس کا انتظام لازم ہے۔ پھر اس کی طرف سے بے اعتنائی کا اندازہ کرنے اور عبرت پذیری کے لئے ایک مشہور دینی درسگاہ کا حال سنئے۔

اس میں بچوں کے لئے ایک مستقل مکتب بھی ہے جس میں کم و بیش ڈیڑھ سو بچے پڑھتے ہیں، قرآن مجید کی تعلیم لازم ہے۔ لیکن صحت کے ساتھ اس کو پڑھانے کا کوئی لازمی اہتمام نہیں۔ اگر اتفاق سے کوئی ارزاں قاری مل گیا، تو خیر رکھ لیا گیا ہے، وہ چلا گیا تو ارباب حل و عقد میں نیچے سے اوپر تک کسی کو توجہ دلانے سے بھی توجہ و فکر نہیں بچے الٹا سیدھا غلط صحیح جو کچھ قرآن پڑھتے رہیں پڑھتے رہیں! عذر یہ کہ گنجائش نہیں۔ حساب جغرافیہ تاریخ معقولات حد یہ کہ انگریزی تک کے لئے گنجائش اور ان پر سینکڑوں ماہوار کا خرچ مگر قرآن مجید کو صحیح پڑھانے کے لئے گنجائش نہیں! پھر یہ ارباب حل و عقد ماشاء اللہ عالم فاضل دیندار بزرگ ہیں! پس وہی بقول حضرت ہی کے کہ "قلوب میں ادراک مفقود ہے اس کا احساس ہی نہیں کہ کون سی چیز کس درجہ کے اہتمام کی مستحق و طالب ہے۔" (۱)

فہم معنی سے بے توجہی: یہ کوتاہیاں تو قرآن کی تعلیم میں مدارس کے اندر اور باہر سب جگہ الفاظ کی حد تک تھیں۔ اب معانی کو لیجئے۔

۱۔ الحمد للہ اس درسگاہ والوں کی اب آنکھ کھلی اور تجوید ہی نہیں حافظہ کا بھی اہتمام کر لیا ہے۔ احسن اللہ خیراہم

"قرآن کے معنی جاننے کی رغبت اتنی کم پائی جاتی ہے کہ قریب قریب نہ ہونے کے ہے۔ سخت افسوس کی بات ہے کہ جو دراصل مدار ہے اسلام کا، جو منبع ہے تمام دینی علوم کا، جو اساس ہے دارین کی فلاح کا، جو خاص علاقہ ہے معاملہ و خطاب کا اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی امت کو نہ خبر نہ خبر کا شوق ہمارے اس جمود کی کوئی انتہا بھی ہے"۔

یہ حال عام مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ، خود دینی مدارس کے پڑھے ہوئے طلباء و علماء کا حال بھی کچھ بہتر نہیں۔ بس درس میں جلالین یا بیضاوی وغیرہ جو کچھ تھوڑی بہت ہو گئی وہی ان کی قرآن دانی ہے، جس کی حقیقت خود حضرت کے الفاظ میں یہ ہے کہ اگر "خالی قرآن غیر مترجم ان کے ہاتھ میں دے دیا جائے کہ ایک رکوع کا ترجمہ اور ضروری حل کر دو تو ہرگز نہ کر سکیں گے" جس کا بالکل صحیح تدارک یہ تجویز فرمایا ہے کہ "اہل مدارس اس طرز تعلیم میں کچھ ترمیم کریں اور جیسے بعض متون بغیر شرح کے پڑھائے جاتے ہیں اسی طرح جلالین سے پہلے قرآن مجید بھی بدون کسی خاص تفسیر کے زبانی حل کے ساتھ پڑھایا جائے"۔

افسوس مدارس عربیہ میں دارالعلوم ندوہ کے علاوہ شاید ہی کہیں اور اس ترمیم و اصلاح کی طرف توجہ کی گئی ہو۔ خود حضرت علیہ الرحمہ کے متوسلین اور دیوبند سے تعلق رکھنے والے مدارس کو خصوصاً اس کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

توجہ والوں کی کوتاہی۔ "اب جن حضرات کو معانی قرآن کی طرف کچھ اعتنا شروع ہوا ہے، ان کی کوتاہی یہ ہے کہ بدون اس کے کہ کسی استاد سے یہ فن حاصل کیا ہو یا دوسرے علوم آلیہ و درسیہ پڑھے ہوں اردو کا کوئی ترجمہ یا تفسیر خرید کر (گو مصنف کا معتبر ہونا بھی محقق نہ ہو) بطور خود اس کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں"۔

یہ تو بڑی مسرت کی بات ہے کہ آج کل بہت سے غیر عربی دانوں کو کچھ نہیں تو ترجمہ ہی کے ذریعہ قرآن مجید کے سمجھنے سمجھانے کا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی چونکہ محض

ترجمہ اور محض اپنی ہی سمجھ پر بھروسہ کر لینے سے ایمان و عمل دونوں کی بعض بہت شدید غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، لہٰذا اس معاملہ میں حضرت کی تنبیہات وہدایات توجہ کے قابل ہیں۔ ترجمہ کے ذریعہ سے کلام مجید پڑھنے پڑھانے والے دو قسم کے ہیں۔

"ایک علماء کے معتقد دوسرے کچھ انگریزی پڑھ کر انگریزی خوانوں کے پاس رہ کر خود اجتہاد کا دعویٰ کرنے والے۔ مشترک خرابی تو یہ ہے کہ اس حالت میں فہم معانی میں بکثرت غلطیاں رہ جاتی ہیں چنانچہ اس پر واقعات کثیرہ شاہد ہیں۔ اور راز اس میں یہ ہے کہ اول تو ایک زبان جب دوسری زبان میں ترجمہ ہو کر آتی ہے، ضرور بعضے مفہومات اصلی رنگ پر نہیں رہتے۔ دوسرے بہت سے مقامات میں خود اجمال ہے، جو بدون تفصیل کے وجوہ متعددہ کو محتمل ہوتا ہے۔ جن میں سے بعض وجوہ کی تعیین بلا دلیل کر لی جاتی ہے۔ جس طرح قانون کی کوئی کتاب اردو کے بڑے فاضل کو دے دی جائے اور وہ اس کو بیان کر دے۔ مگر قانون دان اس کو سن کر بہت جگہ غلط بتلا دے گا۔ تیسرے یقیناً فہم قرآن میں بعض دوسرے فنون نقلیہ کی حاجت ہے، جو شخص ان سے بے خبر ہے وہ قطعاً غلطی میں پڑے گا اور دوسری جماعت میں بالخصوص یہ خرابی زیادہ ہے کہ ان کو غلطی پر بھی کوئی مطلع کرے تو وہ اپنے کو اس بتلانے والے سے افضل اور زیادہ عقلمند سمجھ کر اس کی نہیں سنتے اور عقیدہ یا عمل میں اس غلطی پر جم جاتے ہیں پھر بعض اوقات بناء فاسد علیٰ الفاسد کے طریق پر دوسرے فاسد کو اس پر متفرع کر لیتے ہیں"۔

اس کی اصلاح: یہ ہے

"اگر کسی قدر علم یا صحبت علماء کی برکت سے فہم مع حرف شناسی حاصل ہو تب تو کسی محقق عالم سے کوئی ترجمہ یا مختصر تفسیر دریافت کر کے ان ہی عالم سے سبقاً سبقاً تمام قرآن مجید کا ترجمہ یا تفسیر خوب سمجھ کر ختم کر لیں اور بعض مضامین جو باوجود سمجھانے کے سمجھ میں نہ آویں یا کچھ شبہ رہے ان کے درپے نہ ہوں۔ بس زبانی مقصد شرع اس عالم سے دریافت کر کے اس پر اعتقاد رکھ کر تفتیش چھوڑ دیں اور ایسے مقامات پر نشان لگا دیں۔ پھر جب تلاوت کریں تو تھوڑا سا مطالعہ اس ترجمہ یا تفسیر کا بھی کریں انشاء اللہ اس

طرح معانی قرآن سے مناسبت بڑھے گی۔ پھر دوام آسان ہو جائے گا اور تدبر و عمل میں جن کا ذکر آگے آتا ہے اس سے اور اعانت ہو گی"۔

اس میں شک نہیں اگر دولت ایمان و تقویٰ یعنی اس یقین کے ساتھ کہ کلام اللہ بہرحال اللہ ہی کا کلام ہے اس کو صرف ترجمہ ہی سے حضرت کی ہدایات بالا کے مطابق پڑھتا پڑھاتا رہے اور تدبر و عمل کے ساتھ دوام تلاوت کا اہتمام رکھے تو انشاء اللہ سارے شبہات خود ہی آہستہ آہستہ زائل ہو جائیں گے۔ اور ایک اجمالی اذعان و اطمینان اس بات کا پیدا ہو جائے گا کہ یہ حقیقۃً اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے اور اگر کوئی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی تو خود ہماری سمجھ کا قصور ہے، ورنہ اپنی جگہ سب بالکل حق ہی حق ہے۔ "کل من عند ربنا"۔

بے علموں کا طریقہ: باقی جن لوگوں میں سرے سے کوئی علمی استعداد ہی نہیں نہ علماء کی صحبت کا موقع ملا ہے، ان کے لئے۔

"معانی پر مطلع ہونے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ چند اشخاص مل کر اگر کوئی عالم بلا تنخواہ میسر آ جائے تو فبہا ورنہ تنخواہ پر رکھ کر ان سے استدعا کریں کہ روزانہ یا چوتھے پانچویں روز معین وقت پر ایک ایک یا نصف نصف رکوع کا خلاصہ مطلب عام فہم زبان میں بطور وعظ فرما دیا کریں اور اس طرح قرآن کو ختم کر دیں۔ اگر ہمت ہو تو دوبارہ دورہ شروع کر دیں۔ اور جو شبہہ پیدا ہو اس کو زبانی پوچھیں جو سمجھ میں نہ آوے اس کو چھوڑ دیں اور حکم شرعی پوچھ کر اس پر کاربند رہیں"۔

ایک بڑی ناپاک کوتاہی: قرآن فروشی کی ہے، الفاظ و معانی دونوں کی فروخت کا کاروبار زور سے جاری ہے۔ الفاظ فروشی تو تراویح یا مردوں کے لئے قرآن خوانی وغیرہ پر اجرت لینے کی صورت میں یہاں تک کہ وعظ پر نذرانہ لینا وہ بھی قرآن یا دین فروشی ہی ہے اور اگر تعریف یا خوش الحانی و خوش بیانی کی داد لینے کے لئے ہو تو جاہ طلبی ہے۔ اس قسم کی

جزئیات کی طرف توجہ دلانے کے بعد معنی فروشی کی سب سے شنیع صورت کا ذکر فرمایا گیا ہے، جس میں آج کل بہت زیادہ ابتلا ہے، وہ یہ کہ وقت کے حالات و خیالات کے تحت یا ان سے مرعوب و مغلوب ہو کر قرآنی مطالب و دینی تعلیمات کو خواہ مخواہ توڑ موڑ کر ان کے مطابق کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تحریف یا تفسیر بالرائے کے سوا کیا ہے۔ بعضوں نے پورے کلام مجید کا ترجمہ اور تفسیر زمانہ کے اہوا و آرا کے مطابق اسی رنگ مین کرنے کی کوشش کی ہے حتیٰ کہ "بعضے محض شہرت یا تجارت کے لئے قرآن مجید کا ترجمہ یا تفسیر محض اپنی رائے سے یا اہل زمانہ کے مذاق کے اتباع سے لکھ کر شائع کرتے ہیں اور اس زمانہ میں اس کا فساد عظیم برپا ہے"۔

تحریف و تفسیر بالرائے۔ کا یہ "فساد عظیم" روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے۔ عوام و خواص تعلیم یافتہ ناتعلیم یافتہ جو شخص بھی دو چار لفظ لکھ بول سکتا ہے، وہ اخبار تقریر و تحریر جس میں اور جس طرح چاہتا ہے اپنے مطلب و خواہش کو پورا کرنے کے لئے بلا علم و تحقیق قرآنی آیتوں کو پڑھتا اور بے دھڑک ان کی تفسیر کرتا ہے۔ سیاسی اکھاڑوں تک میں ہر فریق اپنے لئے قرآنی نصوص ہی سے ووٹ اور وزارت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ قرآن و حدیث خدا اور رسول کے ساتھ یہ کھیل نہیں تو اور کیا ہے۔ بہت سے نام نہاد علماء تک اس میں احتیاط نہیں برتتے۔

ترجمہ و تفسیر۔ باقی اگر غیر علماء یا خالی اردو دان صدق و اخلاص کے ساتھ واقعی قرآن کے معانی و تفسیر ہی کو اپنی استعداد کے موافق سمجھنا سمجھانا چاہتے ہیں، تو اس کے لئے نہ فقط یہ کہ حضرت علیہ الرحمہ نے بعض رائج و مقبول ایسے ترجموں کی تحریفات "براصلاح ترجمہ دہلویہ" وغیرہ کے نام سے مفصلاً متنبہ فرمایا ہے بلکہ مستقلاً ایک ایسا ترجمہ و تفسیر لکھ دی ہے، جو خالی عوام اور اردو دانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ خواص و علماء کے لئے بھی فوائد کثیرہ کا خزینہ ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا انور شاہ رحمتہ اللہ علیہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند علوم عربیہ و دینیہ کے بحر ذخار تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ "میں نے عربی فارسی

کتابوں کا کثرت سے مطالعہ کیا ہے اردو کا نہیں کیا۔ مگر جب سے تفسیر بیان القرآن دیکھی ہے اردو تصانیف دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے اور معلوم ہوا کہ اردو میں بھی علوم ہوتے ہیں"۔ (تالیفات اشرفیہ ص۶)

ایک ترجمہ و تفسیر ہی پر کیا موقوف حضرت جامع المجددین علیہ الرحمہ نے مسلمانوں میں جو جو بھی دینی امراض و مفاسد محسوس فرمائے، ان کی صرف اس معنی میں ہی تجدید پر قناعت نہیں فرمائی کہ ان امراض کے اسباب کی تشخیص یا مفاسد پر مطلع فرما دیا، بلکہ ہر ہر مرض و فساد کے علاج وازالہ کی بھی تدابیر بتلائیں، سہل و کارگر نسخے تجویز فرمائے، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جہاں تک ہو سکا خود ہی دوا بھی فراہم فرما دی۔ مثلاً اس ترجمہ و تفسیر کی طرح ابھی اوپر الفاظ قرآن کے متعلق مخارج وغیرہ کی تجویدی غلطیوں اور کوتاہیوں کا ذکر تھا خالی ان کوتاہیوں پر تنبیہ نہیں فرمائی بلکہ اس سلسلہ میں مختلف اعتبارات سے کئی مستقل رسالے تجوید القرآن جمال القرآن آداب القرآن وغیرہ کے نام سے تالیف فرمائے۔

قرآن کی قوالی: قاریوں میں تجوید کے ساتھ قرآن سنانے کا اب ایک نیا طرز یہ دیکھا کہ قوالوں کی سی چوکی بنا بنا کر پڑھتے ہیں کہ ایک ایک آیت دوسرا دوسری آیت اتار چڑھاؤ کے ساتھ پڑھتا ہے کانوں پر ہاتھ بھی گویوں کی طرح رکھے جاتے ہیں پہلے پہل یہ تماشا راقم ہذا نے خود حجاز میں مسجد نبوی کے صحن میں دیکھا۔ جو بہت گراں اور ادب قرآن کے بالکل خلاف معلوم ہوا۔ پھر حیدر آباد میں بعض مواقع پر اس کا اتفاق ہوا جس میں اچھے اچھے علماء شریک تھے۔ مگر احقر کے سوا نہ کسی نے کبھی گرانی ظاہر کی نہ بے ادبی کا اشارہ کیا۔ مگر جامع المجددین کی جامع نگاہ تجدید سے بھلا کیسے کوئی چیز چھوٹ سکتی تھی فرماتے ہیں کہ

> "ایک اور طریق اختیار کیا ہے کہ ایک قاری نے ایک آیت پڑھی دوسرے نے دوسری بلکہ کبھی ایک نے آیت کا ایک ٹکڑا پڑھا اور دوسرے نے پورا کیا۔ بعض دفعہ سب مل کر ملا کر پڑھتے ہیں اور اگر ایک کے سانس لینے سے دوسرا آگے بڑھ گیا تو پھر وہ درمیان کے اجزا چھوڑ کر آگے سے شریک ہو جاتا ہے۔ یہ سب ظاہر ہے آداب قرآن کو ضائع کرنا ہے اور اس میں

تغنی مذموم و قطع کلمات اور اختلال نظم یہ مفاسد علیحدہ رہے"۔

قرآن بطور عملیات۔ "بعضے قرآن کو ناجائز اغراض میں بطور عملیات برتتے ہیں .... جیسے یٰسین پڑھ کر چور کا نام نکالنا یا ناجائز موقع پر محبت کی تدبیر یا زوجین میں یا باہم اقارب میں تفریق کہ بلا اذن شرعی مطلق دو شخصوں میں تفریق کی تدبیر کرنا یا کسی کو ہلاک کر دینا یا دست غیب کے ایسے عمل کرنا کہ روپے رکھے ہوئے مل جایا کریں یا جنات کو تابع کر کے ان سے کام لینا گو جائز ہی کام ہو اور ناجائز کو کیا پوچھنا۔ پس اگر ناجائز اغراض ہوں تو ناجائز کام کے قصد و اہتمام کا معمولی گناہ ہے ہی جو سب جانتے ہیں یہاں وہ گناہ اور بھی اس لئے اشد ہو جاوے گا کہ اس شخص نے کلام پاک کو ناپاک کام کا آلہ بنایا پس اس کی ایسی مثال ہو گئی جیسے نعوذ باللہ کوئی قرآن کو بازاری عورت کی خرچی میں دے کر منہ کالا کرے"۔

سب سے بڑی کوتاہی۔ مسلمانوں کی قرآن کے حق میں یہ ہے کہ خیر "بعضے سب طرح کی لیپ پوت کرتے ہیں مگر نزول کا جو مقصود اعظم ہے اور قرآن کا سب سے بڑا حق ہے یعنی عمل اس کا کچھ اہتمام نہیں کرتے۔ چونکہ اس کے اعتقاد کی ضرورت میں کسی کو کلام نہیں اس لئے ہم اس میں تطویل نہیں کرتے۔ البتہ یہ امر قابل تنبیہ ہے کہ عمل کا طریقہ وہی معتبر ہے، جو سلف نے بتلایا اور عمل کرنے میں ان سب علوم کو دخل ہے جن کا صحیح و حجت ہونا خود قرآن نے بتلا دیا ہے یعنی حدیث و فقہ و کلام و فرائض و تصوف جو سلف کے خلاف نہ ہو"۔

فساد عظیم: یہ اس مفسدہ عظمیہ کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی اہل قرآن بنا اور حدیث کی تغلیط و تکذیب پر تلا ہے کوئی اہل حدیث بن کر فقہ کا انکار کر رہا ہے، کوئی نادانی سے تصوف کو دین سے خارج قرار دے رہا ہے وقس علی ہذا۔ اس طرح مآخذ دین میں بھی گویا اسی قسم کی قطع و برید کاٹ چھانٹ کی گئی ہے، جس قسم کی اوپر احکام دین میں معلوم ہو چکی

کہ کوئی نرے ایمان کو لے بیٹھا کوئی خالی عمل کو اور پھر ایمان و عمل کے اجزا میں بھی کتر بیونت ہوئی کہ کسی نے ایمان بالرسالت کو غیر ضروری قرار دیا، کسی نے عمل میں معاملات کو دنیا کا معاملہ سمجھ لیا اور کسی نے معاشرت کو دین نہ جانا۔

کھلی تحریف۔ بعض اوقات قرآن مجید کی آیات کو ایسے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، جو قرآن کا مقصود قطعاً نہیں ہوتا مثلاً جنتری پر آیت لکھ دی کہ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ ہماری جنتری احسن تقوم ہے یعنی عمدہ جنتری ہے"۔ ظاہر ہے کہ کھلی تحریف ہے۔ نہ یہاں تقویم کے معنی جنتری کے ہیں۔

غرض کلام مجید کے بارے میں جن کثیر کوتاہیوں میں جہل یا بے پروائی سے لوگ مبتلا ہیں ان سب کو ایک ایک کر کے شمار کرایا گیا ہے اور شاید ہی کوئی چھوٹی بڑی کوتاہی تجدید کی ہمہ گیر نظر سے نظر انداز ہو سکی ہو۔ راقم ہذا تو یہ کتاب لکھتا جاتا اور قدم قدم پر نظر تجدید کی اس جامعیت اور دور بینی و خورد بینی سے ششدر رہے!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں کوتاہیاں۔ کلام اللہ کے بعد آگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جو کوتاہیاں راہ پا گئی ہیں ان پر بحث ہے، کہ " آپ کے حقوق امت کی گردن پر اس قدر کثیر ہیں کہ قیامت تک ان سب سے سبکدوش ہونا قریب یہ محال ہے لیکن باوجود کثرت کے وہ سب حقوق تین کلی کے احاطہ میں آئے ہوئے ہیں۔ ایک محبت دوسرے متابعت اور تیسرے عظمت"۔ گو معنی یہ تینوں باہم لازم ملزوم ہیں تاہم صورۃ چونکہ فرق ہو سکتا ہے اس لئے آج کل کے صورت پرست طبائع سے ان کا بکثرت الگ الگ ظہور ہو رہا ہے۔ "اور اس معاملہ میں یہی بڑا جدید انقلاب ہے، جس سے سلف صالح مبرا تھے" چنانچہ

جدید رنگ والوں کی کوتاہی۔ جو طبائع زمانہ کے جدید رنگ میں رنگے ہوتے ہیں ان میں تو یہ کوتاہی مشاہد ہے کہ وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف اسی قدر

دلچسپی رکھتے ہیں کہ دوسری اقوام یا مذاہب سے مقابلہ کے موقع پر آپ کی سوانح عمری یا آپ کے بعض اقوال وافعال کی حکمتوں میں (خواہ ان کی حقیقت تک ذہن کو رسائی ہوئی یا نہ ہوئی ہو) صرف وہ حصہ جس کو تمدن سے تعلق ہے محض اس غرض سے بیان کر دیتے ہیں کہ آپ کی عظمت اور آپ کے قانون کی عزت ظاہر ہو، اور اس کو اسلام کی خدمت اور آپ کے ادائے حقوق کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ باقی نہ اتباع کو ضروری سمجھتے ہیں نہ حجت (یعنی آپ کے اقول وافعال کو حجت جاننے) کا کوئی اثر پایا جاتا ہے بلکہ اتباع کو تعصب اور حجت کو وحشت سمجھتے ہیں۔

اور سبب خفی اس کا یہ ہے کہ اس زمانہ میں سب سے بڑا مقصد جاہ و عزت کو قرار دیا گیا ہے، جس کو مطلوب ہونے کا ہم کو بھی انکار نہیں مگر کلام اس میں ہے، کہ وہ مطلوب بالعرض ہے یا خود مطلوب بالذات۔ بہر حال چونکہ اس کو کمال بالذات سمجھا جاتا ہے، اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لاتعدلا تحصی کمالات حقیقیہ عظیمتہ الشان میں ان کی نظر اس کا انتخاب کرتی ہے اور دوسرے کمالات مثل محبت الٰہی و خشیت و زہد و صبر و تربیت روحانی و مجاہدہ و بشغل بحق و دیگر فضائل علیہ و عملیہ کا کبھی ان کی زبان پر نام بھی نہیں آتا۔ جس کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ گویا آپ اس غرض کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے کہ ایک جماعت کو قوم بنا کر اس کو دینوی ترقی کے وسائل کی تعلیم فرما دیں تاکہ وہ دوسری قوموں پر سابق وفائق رہ کر دنیا میں شوکت کے ساتھ زندگی بسر کرے۔

ان میں نہ محبت و متابعت ہے نہ حقیقی عظمت۔ ان لوگوں میں متابعت و محبت کا وجود نہ ہونا تو ظاہر ہے .... اگر ذرا نظر کو عمیق کیا جاوے تو ثابت ہو جاوے کہ عظمت کا احتمال بھی واقعیت نہیں رکھتا۔ آپ کی جس عظمت میں گفتگو ہو رہی ہے، وہ وہ عظمت ہے، جس کے ساتھ آپ حامل وحی ہونے کی حیثیت سے متصف ہیں اور ان لوگوں کی تقریر و تحریر میں نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قلوب میں آپ کی جو عظمت ہے، وہ اس حیثیت سے نہیں بلکہ ایک حکیم تمدن ہونے کی حیثیت سے ہے۔ (ص ۴۷)

ورنہ بحیثیت نبی و رسول یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام و پیام کے حامل ہونے کی عظمت کے آثار سے تو یہ ہوتا ہے کہ

"آپ کے احکام سنتے ہی یہ معلوم ہو کہ گویا حق تعالیٰ نے ہم سے خود فرما دیا ہے اور اس کے قبول کرنے میں حکمت و مصلحت کا ہرگز انتظار نہ ہو بلکہ بادی النظر میں اگر کسی حکمت کے خلاف بھی معلوم ہو تب بھی ویسی خوشی سے قبول کرے جیسا حکمت معلوم ہونے کے وقت کرتا اور نہ بدون حکمت سمجھے اس حکم کی وقعت میں کوئی کمی ہو، بلکہ جس طرح ادنیٰ خدمت گار حکم شاہی سن کر دیوانہ وار اس کی بجا آوری کے لئے دوڑتا ہے وہی کیفیت ہو جاوے اور اس حکم کے خلاف مستحسن ہونا خیال میں بھی نہ آوے، بلکہ اجمالاً یوں سمجھے کہ سب خیر و برکت اور فلاح و صلاح اسی میں منحصر ہے خواہ ہمارا ذہن اس کی تفصیل تک پہنچے یا نہ پہنچے بقول عارف گنجوی"

زبان تازہ کردن باقرار تو   نہ یگیختین علت از کار تو

صرف حکیم تمدن ہونے کی عظمت۔ اور صرف حکیم تمدن ہونے کے لحاظ سے جو اعتقاد و عظمت ہوتا ہے، اس کے آثار یہ ہیں کہ حکم سن کر اتنا ہی اثر ہو جو ایک مخلوق ذی رائے کی رائے سن کر ہوتا ہے، اور اس کے قبول کرنے یا اس کو نظر وقعت سے دیکھنے میں کہ اس میں عقلی (اور عقل میں بھی خالص دنیوی) مصلحت کیا ہے۔ جب تک مصلحت نہ معلوم ہو اس میں سخت تردد و خلجان رہے اور اس پر عمل کرنے میں شرح صدر نہ ہو، بلکہ ایک قسم کی تنگی اور جبر و تحکم سا اثر رہے اور دوسروں کے سامنے بھی اس کا دعویٰ کرتے ایک گونہ خجلت اور بیوقعتی کی سی کیفیت رہے .... بلکہ اسی فکر میں رہے کہ کسی طرح اس کا شرعی ہونا ثابت نہ ہو، اور جب کچھ نہ ہو سکے تو بعض تاویلات سے اس حکم کے شرعی ہونے کا انکار کر دے۔ کبھی اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے میں شبہات پیدا کرے .... اور کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے کو تسلیم کر کے خود آپ کی نسبت کسی ضرورت و مصلحت وقت کا دعویٰ کرے اور چونکہ وہ مصلحت باقی نہیں رہی لہٰذا اس حکم کو بھی موجود نہ سمجھے۔ غرض ہزاروں حیلے نکالے مگر اس حکم کو نہ مانے یا اگر مانے تو اعتقاد سے نہ مانے بلکہ بدنامی سے

بچنے کو یا قومی شیرازہ کے منتشر نہ ہونے کی ضرورت سے ماننے یا اعتقاد ہی سے ماننے مگر نشاط خاطر کے ساتھ نہ ماننے بلکہ مذہبی مجبوری سمجھ کر ماننے (اور یہ ان میں سب سے زیادہ سلیم و صالح طبائع کا حال ہے) اور یہ وہ مراتب ہیں جو کم و بیش کفر سے ملے ہوئے ہیں، کوئی صریح کفر ہے، کوئی خفی کفر ہے، کوئی کفر بننے والا ہے کمالا یخفے علی المتفطن السلیم انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جدید تعلیم یافتہ ذہنیت کا یہ جیسا صاف و شفاف آئینہ اور جیسی سچی تصویر و تحلیل ہے کیا کوئی بڑا سے بڑا ماہر نفسیات دان اس "فراستہ المومن" کی گرد کو بھی پا سکتا ہے!

اس عارضہ کا تعدیہ۔ کتاب اللہ کو کتاب تمدن و سیاست اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکیم تمدن و سیاست سمجھنے کا یہ عارضہ روز افزوں ہے، حتی کہ نئی تعلیم والوں سے متعدی ہو کر خالص دینی تعلیم والوں تک یہ زہر روز بروز اتنا سرایت کرتا جارہا ہے، کہ اچھے اچھے علما کی تحریر و تقریر میں بھی وہی رجحانات غالب ہوتے جارہے ہیں۔ حد یہ کہ اسی جماعت کے بعض صاحب قلم افراد نے ایک نئی جماعت انہی رجحانات کی تبلیغ و ترجمانی کے لئے قائم کر ڈالی۔ اس جماعت کی طرف سے جو مضامین اور کتابیں شائع ہوتی ہیں ان کے پڑھنے سے اپنے پرائے سب پر بہ حیثیت مجموعی یہی اثر پڑتا ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی دعوت بھی دراصل ایک ایسے نہایت اعلیٰ و حکیمانہ نظام تمدن و سیاست ہی کی طرف ہے جو دیگر تمدنی و سیاسی و معاشی نظامات کے مقابلہ میں انسان کی صلاح و فلاح کا زیادہ سے زیادہ ضامن ہو سکتا ہے۔ یقیناً یہ دعویٰ لفظ بلفظ حق ہے، لیکن صرف یہی حق نہیں بلکہ اسلام کی اصل دعوت آخرت کی صلاح و فلاح کی ہے اور دنیوی تمدن و سیاست اس منزل کا محض راستہ ہے، جس کے ساتھ تعلق رہ رو یا عابر سبیل کا سا رہنا چاہئے۔ اگر مسلمان منزل آخرت کی صلاح و فلاح پر اپنی نظر کو پوری طرح جما کر چلیں تو دنیا کے لئے صالح ترین تمدن و سیاست منطقی نتیجہ کی طرح از خود وجود میں آجائے گا اور اس کو نام نہاد سراپا مادی تمدن و مادی ترقی سے دور کا بھی تعلق نہ ہوگا، جس کی ظاہری چمک دمک پر ہم مٹے جارہے ہیں، اور جس طرف دانستہ یا نادانستہ اس طرح بلایا جارہا ہے کہ گویا وہی ترقی کا اسوہ و نمونہ ہے۔ اس چمک دمک سے مرعوبیت کا یہ عالم ہے، کہ ایک

بڑے ہی مخلص و متقی جوان صالح و عالم دین کی زبان قلم پر (یقیناً نادانستہ) اس ترقی کا ایسے مداحانہ انداز میں ذکر آ جاتا ہے کہ گویا اس سے محرومی کوئی حقیقی محرومی ہے۔ اور ایک ایسی راہ جو سراسر غفلت و جہالت تھی اس کو عین علم و بیداری قرار دیا جا رہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ۔

"اس موقع پر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی (جس میں ترک تنزل وانحطاط علمی پسماندگی اور جمود کا شکار ہو چکے تھے) تاریخ انسانی کا اہم ترین عہد ہے، جس کا اثر بعد کی صدیوں پر نقش ہے، یورپ اس میں اپنی لمبی نیند سے بیدار ہوا تھا اور ایک جوش و جنون کی حالت میں اٹھ کر غفلت و جہالت کے اس طویل زمانہ کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ وہ ہر شعبہ حیات میں گریز پا ترقی کر رہا تھا، طبعی قوتوں کو مسخر، کائنات کے اثرات کو منکشف اور نامعلوم سمندروں اور اقلیموں کو دریافت کر رہا تھا۔ ہر علم و فن میں اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی فتوحات جاری تھیں .... کوبرنکیس برونو گلیلیو کیپلر اور نیوٹن وہ عالم و محقق تھے جنہوں نے (طبیعیات کا) ایک جدید نظام پیدا کر دیا۔ سیاحوں اور جہاز رانوں میں کلمبس واسکوڈی گاما اور میگلن جیسے عالی ہمت اولوالعزم پیدا ہوئے جنہوں نے نئی دنیا اور نامعلوم ممالک دریافت کئے"۔

اسی جوش بیان میں آگے اس قسم کے غیر محتاط فقرے تک نکل گئے ہیں کہ "قوموں کی تاریخ اس دور میں نئے سرے سے ڈھل رہی تھی۔ کاتب تقدیر قسمتوں کے نئے فیصلے لکھ رہا تھا" حضرت مصنف ذرا خیال فرمائیں کہ ان کے عقیدہ میں "کاتب تقدیر" کون ہے! اور وہ اپنے فیصلے روز ازل ہی میں لکھ چکا تھا یا سولہویں سترہویں صدی کی آمد اور کوپرنکس و کولمبس کی ہمت و عزیمت کے نتائج کے انتظار میں قلم لئے بیٹھا تھا۔

بہرحال مصنف علام کے نزدیک "اس زمانہ کا ایک ایک لمحہ کئی کئی دن اور ایک ایک دن کئی کئی برس کے برابر تھا، جس نے فرصت و تیاری کا ایک لمحہ کھو دیا اس نے ایک طویل زمانہ کھو دیا۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس وقت لمحات ضائع نہیں کئے بلکہ صدیاں

ضائع کیں"۔ یعنی اگر ان میں بھی سولہویں و سترہویں صدی کے یورپ کی یہ خالص مادی دنیوی بیداری و مسابقت جاری ہوتی تو یہ صدیاں ضائع نہ ہوتیں۔

پھر آگے ترکی کے سلسلہ ذکر میں ہے کہ "اصلاح و ترقی کا اصل قدم سلطان سلیم ثالث نے انیسویں صدی کے آغاز میں اٹھایا" یہ اصلاح و ترقی کا اصل قدم کیا تھا۔ سنئے کہ "اس نے نئے طرز کے مدارس قائم کئے جن میں سے انجینئرنگ کالج میں وہ خود تعلیم دیتا تھا۔ نظام جدید کے نام سے ایک نئی فوج کی بنیاد ڈالی اور سیاسی نظام میں بھی کچھ تبدیلیاں کیں۔ لیکن قوم اور سلطنت کے جمود کا یہ حال تھا کہ پرانی فوج نے بلوہ کر کے سلطان کو قتل کر ڈالا"۔

بظاہران عبارتوں سے مدح کے سوا کیا طراوش ہوتا ہے کہ "سولہویں سترہویں صدی تاریخ انسانی کا اہم ترین عہد ہے"۔ حالانکہ دینی لحاظ سے یہ بدترین عہد ہے کہ اس کی فتنہ سامانیوں نے بالاخر ساری دنیا کو دنیا پرستی اور مادیت میں غرق کر دیا اور "یورپ اپنی لمبی نیند سے بیدار ہو کر غفلت و جہالت کے جس طویل زمانہ کی تلافی کر رہا تھا" کیا وہ خدا و آخرت سے غفلت و جہالت کی انتہا کی ابتدا نہ تھی، اور جس کو حضرت مصنف بھی یقیناً بدترین جاہلی عہد کہتے اور جانتے ہیں۔ اور "وہ (یورپ) ہر شعبہ حیات میں جو گریز پا ترقی کر رہا تھا" کیا یہ ترقی خدا پرستی کے اعتبار سے عین تنزّل نہ تھی!

حیرت ناک مرعوبیت۔ دین کے دشمنوں کے مقابلہ کے لئے مادی اسباب کی فراہمی کا انکار نہیں، بلکہ نص صریح کی رو سے بقدر استطاعت واجب ہے۔ لیکن دین کی نگاہ میں نہ مادی ترقی ترقی ہے نہ مادی تمدن تمدن۔ ورنہ خیرالقرون اور حضرات صحابہ بلکہ خود پیغمبر اسلام علیہ التحیہ والسلام کو معاذ اللہ موجودہ زمانہ کے کفار و فساق کے مقابلہ میں کیا غیر متمدن اور غیر ترقی یافتہ کہا جائے گا! اس قسم کی تعبیرات جو ائمہ ضلالت کے تسلط نے ہماری زبان و قلم پر جاری کر دی ہیں دین کی روح کے لئے زہر قاتل اور کم از کم مصنف موصوف جیسے صاحب نظر صالح و متقی عالم دین کی یہ مرعوبیت نہایت درجہ حیرتناک ہے۔

توحید کا ابتدائی مطالبہ: دین کی روح اور اسلامی ایمان و توحید کا تو یہ بالکل ابتدائی مطالبہ ہے، کہ مادی و ظاہر اسباب قطعاً موثر نہیں۔ فاعل و موثر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، باقی سارے موجودات فعل و اثر نفع و ضرر یا حول و قوت سے یکسر عاجز و خالی ہیں۔ اس لئے موحد کا اصل کام اسباب نہیں مسبب الاسباب کا دامن تھامنا اور اس کے ارادہ و مشیت پر نظر اور اس کی رضا و ناراضی کی فکر رکھنا ہے۔ اس کی رضا و ناراضی کا مدار وسعت و اختیار بھر اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اس کے اوامر و نواہی کا کامل اتباع ہے۔ جس کے بعد انشاء اللہ اس کی نصرت (وما النصر الا من عند اللہ) دشمنوں کے مقابلہ کے لئے ظاہری و مادی تدابیر کا بقدر ضرورت خود ہی سامان پیدا فرما دے گی۔

طبیعیات و ایجادات وغیرہ کی جن مادی قوتوں سے ہم اتنا مرعوب ہیں اور جن کو ترقی ترقی پکارتے پکارتے ہمارے لب خشک ہو رہے ہیں کیا جب مشیت الٰہی ان کے ساتھ نہیں ہوتی تو ان کے بے بسی آج بھی ہم کھلی آنکھوں مشاہدہ نہیں کر رہے ہیں۔

کیا سائنس و طبیعیات کے ماہرین و کاملین یا ان کی فراہم کردہ مادی طاقتیں اور ایجادات جرمنی کے پاس جنگ عظیم یا اس کے بعد جنگ اعظم میں اپنے حریف سے کم تھیں لیکن نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ اور اگر ہٹلر کامیاب ہو جاتا ہے تو کیا اس کی فتح و کامیابی انہیں سائنسی مادی ایجادات و تدابیر کی طرف منسوب نہ کی جاتی، اور اب کیا اس کی شکست و ناکامی کے لئے یہ اسباب پرست طرح طرح کے نکات بعد از وقوع پیدا نہیں کر رہے ہیں!

تنزع الملک ممن تشاء: اس سے بڑھ کر یہ کہ انگریز س طرح ہندوستانیوں کے مقابلہ میں ان سائنسی ایجادات اور مادی اسلحہ سے مسلح تھے، مگر جب "توتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء کی مشیت قاہرہ کا وقت آ گیا، تو ہندوستان سے اس طرح نکالے گئے (کان لم یغنو فیھا) کہ گویا یہاں ان کا کچھ تھا ہی نہیں۔ ہمارے ایک بڑے صاحب علم و قلم مشہور دوست مولانا گیلانی کو کبھی یقین نہ آتا تھا کہ انگریز اس طرح ہندوستان کو "خیرات" کر کے نکل جائیں گے۔ "تازہ والا نامہ میں ارشاد ہے کہ "ساری عمر مجھے اپنے اس خیال پر اصرار رہا کہ انگریز ہندوستان کو چھوڑ نہیں سکتا لیکن .... آنکھیں کھلی

کی کھلی رہ گئیں انگریز چلا گیا اور اپنا اربوں ارب کا سامان کمایا ہوا سب کو خیرات کر کے چلا گیا" ! بات وہی ہے کہ انگریز خوشی سے چلا گیا نہ ظاہری اسباب و آلات کے اعتبار سے وہ ہندوستانی کے مقابلہ میں بے بس تھا۔ البتہ "تنزع الملک ممن تشاء" کی مشیت وقدرت یا مسبب الاسباب نے جو اسباب پیدا کر دیئے انہوں نے اتنا بے بس کر دیا۔ اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ قدرت نے ایسے سامان پیدا کر دیئے ہیں کہ وہ ہندوستان جس غریب کے ہاتھ میں ہمارے محترم مصنف کی مفروضہ تاریخ انسانی کے اہم ترین عہد یعنی سولہویں سترہویں صدی سے قبل کی زنگ خوردہ تلوار بھی نہیں رہ گئی تھی، اس نے ایٹم بم سے مسلح انگلستان کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ ایمان کی بات وہی ہے جو ایک بڑے عارف حضرت اکبر نے لکھ دی کہ

تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں دفتر پیدا
ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا

مومن کی شان : افسوس کہ مصنف موصوف جیسے فریس مومن بھی الفاظ کے اس "دفتر بے معنی" میں بہے جا رہے ہیں۔ ورنہ مومن کی شان تو وہی ہے کہ اس کی نظر حنیف فقط حق تعالیٰ کی مشیت ونصرت اور اس کی رضا و ناراضی پر ہو، جس کا طریقہ یہ تھا کہ ایمان و عمل صالح پر استقامت کی سعی ہوتی ایسی کی گھر باہر دعوت و تبلیغ ہوتی پھر چاہے حکومت وسیاست کا نام زبان پر نہ آتا، مگر ہم دیکھ لیتے کہ استخلاف فی الارض کا اٹل دموکد وعدہ کسی طرح پورا فرمایا جاتا ہے۔ وعد اللہ الذین امنو وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض الایہ۔ ساری غلطی یہ ہے کہ موعود کو مقصود سمجھ لیا گیا ہے، ورنہ اگر آج بھی حضرات صحابہ کے نقش قدم پر چل کر مقصود صرف رضائے حق یا ایمان و عمل صالح کو بنا لیں تو موعود استخلاف یا حکومت ارض کے لئے تو اپنے نہیں پرائے اس طرح قدم پکڑیں گے کہ کسی مصلحت سے "جب مسلمان حمص سے نکلے تو یہودیوں نے توریت ہاتھ میں لے کر کہا کہ جب تک ہم زندہ ہیں کبھی رومی یہاں نہ آنے پائیں گے اور عیسائیوں نے نہایت

حسرت سے کہا کہ خدا کی قسم تم رومیوں کی بہ نسبت کہیں بڑھ کر ہم کو محبوب ہو(۱)۔"
حالانکہ آج کل کی نام نہاد ترقی و تمدن میں عرب کے "وحشیوں" کا روما کے مہذبوں اور دولتمندوں سے کیا مقابلہ تھا آج بھی اگر پاکستان ہمت کر کے اسلامی حکومت کی ایک دھندلی تصویر بھی دنیا کی آنکھوں کے سامنے کھڑی کر دے تو انشاء اللہ پھر دنیا نہ جمہوریت کا نام لے نہ اشتمالیت کا نہ اشتراکیت کا۔

ایمان کی خیر۔ غرض شارع علیہ السلام کے حکیم تمدن و سیاست ہونے پر اتنا زور دینا اور تعلیمات شریعت میں قدم قدم پر دنیاوی مصلحت و حکمت کی جستجو دراصل بقول حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمتہ کے انکار نبوت کے مرادف ہے۔ یہ رجحان حضرت مجدد الف ثانی کے عہد میں تو بس خال ہی خال تھا، لیکن اب تین سو سال بعد حضرت مجدد وقت کے عہد میں ہر کس و ناکس کی زبان پر اس کا چرچا ہے۔ حد یہ کہ مسلمانوں کی طرف سے اب جس حق کی حفاظت کا دعویٰ و مطالبہ غیروں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، وہ ان کی تہذیب و تمدن یا کلچر کی حفاظت کا دعویٰ و مطالبہ غیروں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، وہ ان کی تہذیب و تمدن یا کلچر کی حفاظت کا اور دین و شریعت کی حفاظت کا نام لیتے تو علماء بھی ڈرتے اور شرماتے ہیں!

جیسا کہ حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمہ نے اوپر فرمایا کہ جب تک شریعت کے کسی حکم میں کوئی دنیوی مصلحت و حکمت نہ معلوم ہو "اس کا دعویٰ کرتے ایک گونہ خجلت و بیوقعتی کی سی کیفیت" رہتی ہے۔ حالانکہ شریعت کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ حکم میں اس طرح کی بے وقعتی یا کمتری کے احساس کے ساتھ ایمان کی خیر منانا چاہئے۔

ضرر کا احتمال غالب۔ "اس تقریر کے یہ معنی نہ سمجھے جاویں کہ احکام شرعیہ حکمت سے خالی و عاری ہیں حاشاو کلا بلکہ مقصود یہ ہے، کہ ان کا اتباع اور ان کی خاص عظمت کا اعتقاد فہم حکمت پر موقوف نہ ہونا چاہئے۔ ہاں وہ خود ایک مستقل علم ہے جس کو اسرار

۱۔ (الفاروق ص ۱۳۰)

شریعت کا لقب دیا جاتا ہے" مگر اس کے اہل خواص و عارفین ہیں عوام الناس کو اس سے بجائے نفع کے ضرر کا احتمال غالب ہے۔ کئی وجہ سے۔

"ایک اس لئے کہ ان میں سب منصوص نہیں بکثرت اجتہادی ہیں جن میں خطا کا بھی احتمال ہے۔ سو اگر اس کا کبھی غیر صحیح ہونا ظاہر ہو گیا اور عامی کے خیال میں اس حکم کی وہی حکمت تھی، تو خود اس حکم کو غیر صحیح سمجھ بیٹھے گا۔ دوسرے اس لئے کہ کبھی خود حکمت تو صحیح معلوم ہو گی، لیکن عامی کی نظر میں وہ باوقعت نہ ہو گی، تو اس حکم ہی کو بے وقعت سمجھنے لگے گا۔ سوم اس لئے کہ ہر حکمت علت نہیں ہوتی۔ بعض اوقات عامی اس کو علت اور اصلی سبب سمجھ کر کسی موقع میں اس کے موجود نہ ہونے سے حکم ہی کے غیر موجود ہونے کا حکم لگا دے گا۔ چہارم یہ کہ ہر حکمت مقصود بالذات نہیں ہوتی بعض اوقات عامی اس کو مقصود بالذات سمجھ کر کسی محل و موقع میں اس حکمت کے حاصل ہو جانے کو کافی سمجھ کر تحصیل حکم کی ضرورت نہ سمجھے گا اور ان دونوں (سوم چہارم) صورتوں میں اجتہاد باطل کا باب وسیع ہو جائے گا۔ مثلاً سفر میں مشقت پر نظر کر کے قصر کا حکم دیا گیا ہے، لیکن یہ علت نہیں حتیٰ کہ اگر سفر میں مشقت نہ ہو تب بھی قصر ہے۔ اسی طرح وضو مشروع ہوا ہے حکمت نظافت و طہارت سے۔ لیکن اگر طہارت و نظافت حاصل ہو تب بھی وضو سے استغنا نہیں۔ پنجم یہ کہ عامی مخالفین دین کے مناظرہ میں اس کو بیان کرے گا اور اگر وہ یقینی نہیں اور مخالف نے اس میں کوئی خدشہ نکال دیا، یہ تو مغلوب ہو جاوے گا، اور اس طرح اسلام اور حق کو صدمہ پہنچے گا۔ مثلاً کسی نے کتا پالنے کی ممانعت کی یہ حکمت بیان کی کہ سبعیت کی صفت ہوتی ہے تو اگر کسی نے یہ خدشہ پیدا کر دیا کہ تعلیم کے بعد سبعیت نہیں رہتی تو یہ شخص بہ زبان حال اس حکم کو بے بنیاد کہے گا۔ بخلاف راسخ العلم کے کہ وہ بجائے اس حکمت کے کہہ دے گا کہ ہمارے آقائے عظیم الشان کا حکم ہے ہم نہیں جانتے کہ کیا مصلحت ہے، تو اس پر کوئی خدشہ ہو ہی نہیں سکتا"۔ (ص ۳۹)

خلاصہ یہ کہ وحی و نبوت کی حقیقت کو جان اور مان لینے کے بعد نبی کی بات بات میں جو دراصل خدا کی بات ہے انسانی عقل پر مبنی حکمت و مصلحت کا سہارا ڈھونڈھنا طرح طرح کے مفاسد و خطرات کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

یہاں تک تو خود حضرت حکیم الامت کے عطا فرمودہ لقب کی رو سے ان "محکوم المجدت حضرات" کے حال کی شرح تھی، جو نئی روشنی کے تابع ہو رہے ہیں اب دوسرے حضرات کی کیفیت سنئے۔

مدعیان محبت کی کوتاہی: "ان میں سے بعض میں محبت کے ظاہری آثار بھی پائے جاتے ہیں مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں مدحیہ اشعار پڑھنا یا ان کو شوق سے سننا، ان سے متاثر ہونا رو پڑنا نعرہ لگانا کثرت سے آپ کے ذکر مبارک کی مجالس منعقد کرنا و مثل ذالک۔ لیکن ان میں یہ کوتاہی دیکھی جاتی ہے کہ اس کو کافی سمجھ کر حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد فرمودۃ احکام کی بجا آوری و متابعت کے اہتمام کو ضروری نہیں جانتے اول تو خود اعمال مذکورہ میں بھی جن کو وہ محبت کے عنوان سے اختیار کرتے ہیں بسا اوقات حدود شرعیہ کو محفوظ نہیں رکھتے۔ پھر دیگر اعمال و معاملات میں تو نہ عنوان محبت رہتا ہے نہ اعمال محبت۔ کسی کو نماز با جماعت کا اہتمام نہیں۔ کسی کو رشوت و ظلم سے باک نہیں کوئی مسکرات اور حرام لذات میں مبتلا ہے، کوئی شرکیات و بدعات کو دین سمجھ رہا ہے"۔ (۳۹)

ان میں بھی حقیقی محبت و متابعت و عظمت نہیں: "یہ لوگ بھی درحقیقت تینوں حقوق کو ضائع کرتے ہیں۔ متابعت کی نفی تو ظاہر ہے، لیکن غور کیا جائے تو ان کے قلب میں حقیقی عظمت و محبت بھی نہیں۔ کیونکہ اعتقاد عظمت کے لئے لازم ہے کہ اپنے ارادہ سے اس معظم و مکوم کے سامنے فنا ہو جائیں۔ چنانچہ اگر کسی رئیس کے پاس کسی عظیم الشان با اختیار افسر کا حکم فوری حاضری کا آجائے اور فوری بھی ایسا کہ وہ حاکم دروازہ پر کھڑا جلد طلب کر رہا ہے، تو ہم اس کی حالت کا اندازہ اس کی حرکات سے کر سکتے ہیں کہ

ان کی اختیاریت کی شان پر اضطراریت کی حالت کو غلبہ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اکثر امور اس وقت معمول کے خلاف سرزد ہونے لگتے ہیں اور یہ سب علامت ہے فناء ارادہ کی۔ اور فناء ارادہ کے لئے لازم ہے کہ تعمیل ارشاد میں مباورت و سبقت ہو اور جب متابعت نہ ہوئی تو حقیقی عظمت دل میں نہ ہوئی اور جس طرح غلبہ عظمت سے ارادہ فنا ہو جاتا ہے، اسی طرح غلبہ محبت سے بھی فنا ہو جاتا ہے گو دونوں کی کیفیت جدا جدا ہے، مگر نفس فناء ارادہ دونوں کو لازم ہے۔

لو کان حبک صادقا لاطعتہ
ان المحب لمن یحب مطیع

صرف ادنیٰ درجہ کی محبت مطلوب نہیں: "البتہ (صورت مذکورہ میں) ادنیٰ درجہ کی محبت و عظمت کا انکار نہیں۔ لیکن شرعا مطلوب ان دونوں کا غلبہ اور قوت ہے، جیسا کہ اس ارشاد نبوی سے ثابت ہے کہ "لایومن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من ولدہ والناس اجمعین۔ (کہ کوئی تم میں مومن نہیں جب تک میری محبت اس کو اپنی اولاد والد اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو) ان لوگوں کا دیگر امور شرعیہ میں متابعت نہ کرنا تو ظاہر ہے"۔

جس کی ابھی اوپر تفصیل بھی معلوم ہو چکی۔ لیکن جن باتوں کو محبت کے نام سے اختیار کرتے ہیں ان میں بھی اکثر شرعی حدود کو محفوظ نہیں رکھتے۔

غلو و گستاخی۔ "مثلاً آپ کی مدح میں اس قدر غلو و مبالغہ کرتے ہیں کہ دوسرے حضرات انبیاء و ملائکہ علیہم السلام کی شان میں گستاخی ہو جاتی ہے

بر آسمان چہارم مسیح بیمار است تبسم تو برائے علاج او در کار است

اور مثلاً

شب و روز ان کے صاحبزادوں کا گہوارہ جنباں تھا

عجب ڈھب یاد تھا روح الامیں کو بھی خوشامد کا

اس کی ایک بدترین مثال راقم ہذا نے حیدر آباد میں ہر جمعہ کو مکہ مسجد کے ہزاروں مصلیوں کے مجمع کے سامنے (جن میں علماء و مشائخ سب ہی ہوتے ہیں) اکثر ایک سائل کو پڑھتے سنی کہ

جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا محمدؐ سے اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے

استغفراللہ ترک متابعت کے ساتھ حق تعالیٰ کی توحید کی کیسی تضحیک و تحقیر!

"بعض اوقات اس نام نہاد محبت کی بدولت خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی ہو جاتی ہے مثلاً ع

اے نرگس شہلائے تو آور وہ رسم کافری"

ذکر فضائل میں موضوع روایات. بیان کرتے ہیں جس پر حدیث نبوی میں سخت وعید وارد ہے۔ ظاہر ہے کہ حدیث کے خلاف کرنا ترک متابعت ہے۔ اور ان فضائل و مدائح کے بیان میں بہت سے منکرات اعتقادیہ و عملیہ کو ملا لیا ہے۔ ایک تو ان چیزوں کو خود ملا لینا ممنوع، پھر ان کو مستحسن سمجھنا اور ان پر اصرار کرنا دوسری خرابی، پھر جو شخص ان منکرات کی اصلاح کرے اس سے بغض و عناد رکھنا تیسری خرابی۔ غرض ان کے یہ طریقے اس دعوے کی پوری دلیل ہیں کہ ان میں متابعت نہیں"۔ (ص ۴۱)

صرف ضابطہ کا تعلق. "اب صرف ایک جماعت اور رہ گئی ہے جن کو احکام کی متابعت کا ضروری ہونا پیش نظر ہے اور کم و بیش اس کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ مگر کوتاہی اتنی ہے، کہ ان میں خشوع اور لین کی کیفیت نہیں، جو غلبہ محبت کو لازم ہے، کہ ابھی ان میں اتباع کی حلاوت جو محبت خاصہ کا اثر ہے پیدا نہیں ہوئی۔ ان کا طرز عمل بالکل ایسا ہے، جیسے نوکر کو اپنے آقا سے ضابطہ کا تعلق ہو کہ خدمات مفوضہ میں تو فروگذاشت نہیں کرتا مگر وقت پورا کر دینے کے بعد نہ ایک منٹ ٹھہرتا ہے نہ کبھی کوئی زائد خدمت کرتا ہے۔ نہ آقا کا کبھی ذکر خیر کرتے ہوئے دیکھا گیا نہ آقا کے اہل و عیال کا ادب و احترام کرتا ہے نہ

اپنے خواجہ تاش لوگوں سے سلام و کلام رکھتا ہے۔ یہ تو خشکی ہی تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ بجز اپنے، سب خواجہ تاشوں کو نافرمان و حقیر سمجھ کر ان سے لڑتا بھڑتا ہے، اور اپنی بجا آوری خدمت پر ہمیشہ ناز و فخر کرتا ہے اور اس وجہ سے سب سے الجھتا ہے"۔

یہ جس چہرے کے خدوخال ہیں وہ اس ضابطہ پرست نوکر کی مثال سے آئینہ ہے۔

ذکر و درود شریف میں کوتاہی: "بقیہ یہی حالت ان لوگوں کی ہے، جو کسی قدر نماز روزہ اور بعض معاملات درست کر کے اپنے کو مقدس و متبع اور تمام دنیا کو فاسق و بدعتی کا فرد جہنمی سمجھ بیٹھے ہیں.......... اور بعضے ان میں عوام سے گزر کر علماء اور بعض ائمہ اعلام یا حضرات صحابہؓ کی شان میں بدگمانی کر کے بدزبانی کرنے لگتے ہیں.......... اور جس ذات مقدسہ کے اتباع کا دعویٰ ہے، خود آپ کے ساتھ یہ برتاؤ کہ نہ آپ کا نام مبارک ادب سے لیتے ہیں، نہ کبھی آپ کا ذکر مبارک شوق سے کرتے ہیں نہ کبھی ذکر مبارک سن کر گداختہ ہوتے ہیں، نہ درود شریف کا کوئی معمول ٹھہرایا ہے"۔ (ص ۳۶)

حالانکہ خود "حضرات صحابہ کی عادت تھی کہ جب بیٹھتے ایک دوسرے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک و شمائل و طرز عمل پوچھتے۔ چنانچہ شمائل ترمذی کی روایتیں اس میں صریح ہیں۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ خاص آستانہ مبارک پر سلام پہنچانے کے لئے قاصدوں کی ڈاک کا انتظام کرتے تھے۔ اکثر سلف درود شریف کی کثرت رکھا کرتے تھے۔ خود حدیث میں ہے کہ جس مجلس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اور درود شریف نہ ہو وہ مجلس اہل مجلس کے حق میں موجب حسرت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گو یہ امور موکد نہ ہوں، مگر ان کی کمی موجب حسرت و حرماں ہے۔ اور جیسے کمی سے حرمان ہوتا ہے، اسی طرح ان کے اہتمام و التزام سے گوناگون برکت و فیضان ہوتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ پھر دنیا میں دنیوی بھی اور اخروی بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک صحابی کو جب کہ انہوں نے کئی بار سوال و جواب کے بعد یہ عرض کیا کہ بس اب میں تمام وظائف کی جگہ درود ہی ٹھہرالوں گا یہ ارشاد فرمانا کہ تو پھر تمہارے سب گناہ معاف ہوتے رہیں گے اور سب فکروں کی کفایت ہوتی رہے گی" (ص ۴۳)

حضورؐ کی جامع تعلقات ذات اور اس کے حقوق: غرض "ہر امتی کو سمجھنا چاہئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے چند تعلقات ہیں ایک یہ کہ آپ نبی ہیں اور ہم امتی۔ دوسرا یہ کہ آپ حاکم ہیں ہم محکوم۔ تیسرا یہ کہ آپ دارین میں محسن ہیں ہم زیر بار احسان۔ چوتھا یہ کہ آپ محبوب ہیں ہم محب۔ اور ان میں سے ہر تعلق جب کسی کے ساتھ ہوتا ہے تو اس پر خاص خاص حقوق و آداب کا مرتب ہونا معلوم مسلم اور معمول ہے۔ پس جب آپ کی ذات بابرکات میں سب تعلقات جمع ہوں اور پھر سب اعلیٰ و کمال درجہ کے تو آپ کے حقوق بھی ظاہر ہے کس قدر اور کس درجہ کے ہوں گے، ان سب کے ادا کرنے کا ایسا التزام و اہتمام کرنا چاہئے کہ وہ کثرت عادت اور استحضار الفت سے شدہ شدہ طبعی ہو جائیں اور پھر بھی آپ کے حقوق کے مقابلہ میں اپنی اس خدمت کو کہ درحقیقت اس کا نفع اپنی ہی طرف عائد ہے ناتمام سمجھے" (ص ۳۶)

سبحان اللہ ہمارے بلکہ ساری انسانیت کے دین و دنیا کے محسن اعظم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کی کیسی شافی و دلنشین پیرایہ سے تجدید و ترغیب فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ساری امت بلکہ ساری انسانیت کی طرف سے حضرت مجدد وقت علیہ الرحمہ کو اس کی جزا میں بے شمار درجات عالیہ عطا فرمائے۔

نشر الطیب: حقوق نبوی کے باب میں صرف زبانی ہماری ان گوناگون کوتاہیوں پر متنبہ و متوجہ فرمانے ہی پر بس نہیں فرمایا بلکہ حسب معمول عملاً نشر الطیب کے نام سے سیرت نبویہؐ پر ایک مختصر مگر ایسی جامع کتاب تصنیف فرمادی کہ اس کے پڑھنے سے حضورؐ کے نبی، حاکم، محسن و محبوب ہونے کا ادراک و تحقیق ہوتا ہے اور جس کا بقول خود حضرت علیہ الرحمہ کے "بقدر اعتقاد و عمل مطالعہ میں رکھنا ان سب اصلاحات کے لئے انشاء اللہ کافی ہو سکتا ہے"۔ (ص ۳۷)

وحی اور حامل وحی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلقات کی تجدید و تصحیح کے بعد احکام و اعمال میں جو کوتاہیاں ہوتی ہیں ان کی تجدید فرمائی گئی ہے، جن میں سب سے مقدم نماز ہے اس لئے کہ

نماز اور اس میں کوتاہیوں کی اشدیت۔ "بعد ایمان اعمال میں نماز کا جو درجہ ہے وہ کسی عمل کو حاصل نہیں .... اور نماز میں اختلال کا جو وبال ہے وہ اس خاص حیثیت کے اعتبار سے بہ نسبت دوسرے اعمال کے اختلال کے زیادہ ہے کہ نماز ہر دن رات میں پانچ بار فرض ہے، جس میں کوتاہی کرنا حق تعالیٰ کو دن بھر میں پانچ بار ناخوش کرنا ہے۔ بخلاف دوسرے اعمال کے کہ بعض فرض نہیں یا فرض ہیں تو روزانہ فرض نہیں، جیسے روزہ کہ سال بھر میں ایک مرتبہ فرض ہے۔ زکوٰۃ وہ سال بھر میں فرض ہوتی ہے۔ حج عمر بھر میں ایک بار فرض ہوتا ہے۔ پھر زکوٰۃ و حج مالداروں پر فرض ہے۔ باقی جن باتوں کا ترک کرنا فرض ہے یعنی معاصی گو وہ بھی روزانہ بلکہ ہر وقت فرض ہے، جیسے غیبت کہ اس کا ترک ہر وقت ہی فرض ہے۔ مگر "اس پر بھی ان کا اختلال نماز کے اختلال سے دو وجہ سے کم ہے۔ ایک یہ کہ یہ تروک ارکان اسلام سے نہیں اور نماز رکن اسلام ہے اور رکن کو نظر شارع میں ایک خاص مقصودیت و اہمیت ہے، اس لئے رکن کا فوت ہونا شارع کو زیادہ ناگوار ہو گا۔ دوسری وجہ یہ کہ ترک سہل ہوتا ہے فعل سے۔ کیونکہ ترک میں اکثر احتیاج اہتمام کی نہیں ہوتی اور فعل میں اہتمام کی حاجت ہوتی ہے۔ اور جو چیز سہل ہو اس کا وقوع اکثر ہی ہوتا ہے، اس لئے جو تروک فرض ہیں ان کا وقوع اکثر ہو گا اور اختلال کم اور جو افعال فرض ہیں اگر پورا اہتمام نہ کیا جائے تو ان کا اختلال اکثر ہو گا اور وقوع کم پس نماز میں اختلال کا احتمال زیادہ ہوا۔ پس ثابت ہوا کہ تمام اعمال میں خواہ وجودی ہوں یا عدمی نماز میں کوتاہی کرنے کا ضرر اکثر اور اشد ہو گا اس لئے اس کی اصلاح نہایت مہتم بالشان ہے"۔

اس باب میں سب سے بڑی اور کھلی کوتاہی: تو یہی ہے کہ بہت زیادہ لوگ نماز کے سرے سے پابند ہی نہیں اور عذر عجیب و غریب یہ کرتے ہیں کہ

> "دنیا کی ضرورتوں سے اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ مگر یہ محض بہانہ بازی و سخن سازی ہے کیونکہ جس روز یا جس وقت فرصت ہوتی ہے تب بھی نماز کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل مانع بے پروائی ہے۔ دوسرے اگر یہ مانع ہوتا تو اگر وقت پر فرصت نہ تھی تو قضا کے لئے تو کوئی

خاص وقت نہیں اور کسی نہ کسی وقت تو فرصت ہوتی ہی ہے۔ تیسرے اگر بے پروائی سبب نہ ہوتا تو اس کوتاہی پر قلق ہوتا، جیسا کہ دنیوی مطلبوں کے فوت پر مدتوں حسرت ہوتی ہے، اس کی فکر لگ جاتی ہے، تلافی کی کوشش کرتے ہیں تدبیریں پوچھتے پھرتے ہیں"۔

دنیا کے کاموں کے برابر کیا ان کے عشر عشیر بھی اگر نماز کی پرواہ ہوتی تو اس کے ترک پر قلق لازم تھا اور قلق و حسرت کو دن میں پانچ مرتبہ گویا دن بھر کون پال سکتا ہے۔ اس لئے اگر فرصت کم بھی ہوتی تو بھی آدمی کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر ضرور پابندی کرتا۔ جب مرض کی تشخیص ہو گئی۔ کہ وہ دراصل بے پروائی کے سوا کچھ نہیں۔

"تو اس کے علاج کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہے ایک یہ کہ تارک نماز کا وعیدوں میں غور کیا کریں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو کافر فرمایا ہے، خواہ تاویل ہی سے فرمایا ہو اور ایسے شخص کا دوزخ میں فرعون ہامان قارون کے ساتھ جانا ارشاد فرمایا ہے۔ اور قیامت میں سب سے پہلے نماز ہی کی پرسش ہو گی۔ ان وعیدوں کی تقویت کے لئے دوزخ کے حالات پڑھا اور سنا کریں انشاء اللہ بے پروائی جاتی رہے گی"۔

اصل علاج: یہ ہے کہ "اپنے نفس پر جبر کرے کہ بدوں ہمت کے کیسا ہی آسان کام ہو دشوار ہو جاتا ہے۔ اور جبر کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کسی کو اپنے اوپر مسلط کر دے کہ وہ زبردستی وقت پر کھینچ تان کر نماز پڑھوا دیا کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نماز کے ترک ہونے پر کچھ جرمانہ اپنے نفس پر مقرر کرے، جس کی مقدار نہ اتنی قلیل ہو کہ نفس کو ناگوار ہی نہ ہو نہ اتنی کثیر کہ ادا کرنا مشکل ہو، وہ جرمانہ مساکین کو دے دیا کرے اور یہ صورت جرمانہ کی سنت کے موافق ہے۔ نسائی کی روایت میں ترک جمعہ و جماع فی الحیض پر تصدق کا امر آیا ہے.......... ایک طریقہ یہ ہے کہ نفس پر عبادت کی مشقت ڈالے۔ مثلاً ایک وقت کی نماز فوت ہو تو بیس رکعت نفل پڑھے دو تین چار مرتبہ میں ٹھیک ہو جاوے گا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مثلاً ایک وقت نماز قضا ہو تو ایک وقت کا کھانا نہ کھاوے دو

نمازیں قضا ہوں تو دو وقت نہ کھاوے، چونکہ نفس پر یہ بہت شاق ہو گا، بہت جلد صلح کر لے گا۔ بعضے بزرگوں نے تو تہجد تک کے قضا ہونے میں یہ معمول کر رکھا تھا کہ اپنے بدن پر کئی کئی قمچیاں توڑ ڈالتے تھے۔ بعض معاصی پر شریعت میں روزہ کا کفارہ مشروع ہونا اور خود ترک صلوٰۃ پر فقہا کا تعزیر کو جائز رکھنا اس مشقت عادیہ کا ماخذ ہو سکتا ہے۔

عذرات لنگ۔ "بعض لوگ حالت صحت و حضر و فراغ میں تو پابند ہوتے ہیں مگر مرض و سفر و شغل میں پابند نہیں رہتے، جس کا سبب بجز کم ہمتی و بے فکری کے کچھ نہیں۔ ادنیٰ بات یہ ہے کہ اگر ان حالات میں پیشاب پاخانہ کا دباؤ ہو تو اس کے لئے کیا تھوڑی دیر کو سفر یا شغل منقطع نہیں کرنا پڑتا یا مرض کی حالت میں اٹھنا نہیں پڑتا۔ پھر فرق بجز اس کے کیا ہے کہ اس کو ضروری سمجھ کر ارادہ کرتا ہے اور نماز کو غیر ضروری سمجھ کر ارادہ نہیں کرتا۔ اس سے زیادہ کون سی حالت افسوس ناک ہو گی کہ پیشاب پاخانہ کی ضرورت سے تو عین مواقع میں وقت نکل آتا ہے اور نماز کی ضرورت سے وقت نہیں نکلتا۔ پھر خاص کر سفر و مرض میں تو رعایت و تخفیف بھی بہت ہے۔ بالخصوص بیماری میں نماز چھوڑنا اور بھی محل افسوس ہے کیونکہ ہر بیماری پیغام موت ہے، تو اس حالت میں تو نماز و انابت الی اللہ کا اور زیادہ اہتمام چاہئے تا کہ اگر مرے تو خاتمہ بالخیر ہو۔ بعضے بیمار اس لئے نماز چھوڑ دیتے ہیں کہ ان کا بدن اور کپڑا پاک نہیں، مگر یہ عجیب ہے، اس لئے کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ ان کو پاک کرنے پر بلا ضرر قادر ہیں یا نہیں اگر ہیں تو عذر کیسا اور اگر نہیں تو معذور ہیں اسی حالت میں نماز کا حکم ہے۔

عورتوں کی ایک غفلت۔ "ایک حالت خاص عورتوں کو علی الدوام پیش آتی ہے، جس کے احکام نہ جاننے سے یا جان کر بے پروائی کرنے سے بڑی دیندار عورتوں کی نماز میں کھنڈت پڑتی ہے، وہ حالت انقطاع حیض کی ہے۔ حکم تو یہ ہے کہ انقطاع کے وقت نماز کا اخیر وقت ہو اور اتنا ہی ہو کہ جلدی جلدی بدون اس کے سر میں سرسوں یا کھلی ڈال کر دھوئے یا بدن کا میل اتارے تمام بدن پر پانی بہا کر کپڑے پہن کر ایک بار اللہ اکبر کہہ سکے تو اس وقت کی نماز اس کے ذمہ فرض ہو جاتی ہے، اور اس کو دوسرے وقت قضا کرنا

پڑے گا اور اگر پورا وقت ملا تو ادا پڑھنا فرض ہو گا۔

اب عموماً عورتوں میں یہ بے پروائی دیکھی جاتی ہے کہ اول تو اس کا خیال نہیں رکھتیں کہ کس وقت انقطاع ہوا۔ ممکن ہے، کہ کسی نماز کے اتنے اخیر وقت میں منقطع ہوا ہو، جس میں ضروری غسل اور تکبیر تحریمہ کی گنجائش ہو، اور اس لئے وہ نماز ان پر فرض ہو گئی ہو لہٰذا ان کے ذمہ ہے کہ ہر نماز کے اخیر وقت ضرور پاکی ناپاکی کو دیکھ لیا کریں۔

چونکہ عورتوں کو ہر ماہ میں بوجہ ایام کے کئی کئی روز تک نماز پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوتا، اس کا اثر پاک ہونے کے بعد بھی یہ رہتا ہے کہ بعض اوقات نماز میں سستی ہو جاتی ہے۔ گو اس کا اصل علاج تو یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا کیا جاوے۔ مگر سبب ظاہری کا علاج وہ ہے جس کو فقہا نے ذکر فرمایا ہے کہ عورت کو حالت حیض میں بھی مستحسن ہے کہ نمازوں کے اوقات میں مصلیٰ پر جا بیٹھے اور تھوڑی دیر تسبیح و تہلیل میں مشغول رہے۔ اس سے جو سستی کہ عادت کے سبب ہو سکتی ہے وہ نہیں ہوتی۔

دو خاص طبقوں کا جہل مرکب۔ تارکین نماز کے دو ان خاص طبقوں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے، جو جہل مرکب کی وجہ سے اپنے حق میں نماز کی فرضیت ہی کو سرے سے ساقط جانتے ہیں اور "باوجود دعوائے اسلام نماز فرض نہیں سمجھتے۔ پھر ان میں دو قسم کے لوگ ہیں بعض فلسفیت کے رنگ میں بعض تصوف کے رنگ میں"۔

> "قسم اول کی تقریر یہ ہے کہ اصل مقصود شارع کی تہذیب اخلاق ہے۔ حکم صلوٰۃ کے زمانہ نزول میں لوگوں میں صفات ذمیمہ کبر و ظلم وغیرہ کا غلبہ تھا اور نماز کی اوضاع و اذکار تواضع و لین (یا نرمی) کی تعلیم دیتے ہیں، اس لئے ان کو نماز کا حکم کیا گیا۔ ہم چونکہ مہذب ہو چکے ہیں لہٰذا ہم کو نماز کی ضرورت نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ یہ سب مبنی ہے کہ احکام شرعیہ کو مقصود بالذات نہ کہا جاوے مقصود بالغیر کہا جاوے۔ پھر وہ غیر یہی وہی باتیں ہوں جن کا تم

دعویٰ کرتے ہو۔ سو اس میں دو دعوے تمہاری طرف سے
ہیں، جن کا ثابت کرنا بھی تمہارے ہی ذمہ ہے، جن پر
قیامت تک بھی قادر نہ ہو گے۔ غرض عقلاً و سمعاً ایسا
اعتقاد یقیناً الحاد و زندقہ ہے اور ایسا شخص ہرگز مسلمان
نہیں۔ اس کو نماز کے ساتھ تجدید ایمان کا خطاب کرنا بھی
ضروری ہے۔"

"یہ جواب جب ہے کہ ہم اس کو مان لیں کہ واقعی یہ لوگ
اپنی تہذیب نفس سے فارغ ہو چکے ہیں۔ حالانکہ ترفع و تجبر،
تعلی و تکبر، ظلم و نخوت قساوت و غفلت، جس درجہ ان
مدعیوں میں بڑھی ہوئی ہے، اس زمانہ میں اس کا عشر عشیر
بھی نہ تھا۔ اگر مشروعیت صلوٰۃ ان ہی مصالح کے لئے ہوئی
تب بھی یہ لوگ بہ نسبت اس زمانہ والوں کے نماز کے زیادہ
محتاج ہوئے"۔ (ص ۵۰)

یہ مرض دراصل جہل کا ہے جس کا علاج اولاً تو جیسا کہ حضرت نے فرمایا جواب بالا کی
تقریر ہی میں غور کرنے سے ہو سکتا ہے، اور اگر تقریر بالا کافی نہ ہو تو یہ مرض ایسا مہلک ہے
کہ دوسرے محققین سے ان شبہات کو ضرور دور کر لینا چاہئے۔ اس کے بعد دوسری قسم کا
بیان ہے۔

"یعنی جو تصوف کے رنگ میں ہیں، ان کی تقریر یہ ہے کہ اصل مقصود قرب
الٰہی ہے اور نماز و دیگر طاعات اس کا واسطہ ہیں اور واسطہ بھی بالصورت
نہیں بلکہ بالحقیقت اور وہ حقیقت ذکر ہے (بلکہ بعض مدعیان تصوف کے
نزدیک جن پر تفلسف کا غلبہ ہے ذکر کے بجائے اصل مقصود علم و معرفت
ہے۔ راقم ہٰذا) پس اگر کسی کو ذکر دائم یا علم و معرفت میسر ہو جائے اس کو
نماز کی حاجت نہیں۔ یا نماز ہی پڑھ پڑھ کر اگر قرب میسر ہو جاوے تو پھر
نماز کی حاجت نہیں۔ اس کے بعد بھی اگر پڑھتا رہے تو اس پر فرض نہیں

رہی۔ فرائض اس کے حق میں نوافل ہو گئے۔ اس کے جواب میں وہی تقریر بالا جو فلاسفہ کے مقابلہ میں لکھی گئی کافی ہے۔ اور اس پر وہی فتویٰ اور وہی علاج عرض کیا جاوے گا۔ البتہ دونوں کے خطاب میں اس مثال کا پیش کرنا مفید و معین ہو گا کہ جس طرح بعض دوائیں (اور جدید تحقیق میں تو ساری کی ساری) فاعل بالخاصہ ہوتی ہیں، اور اس کی تعیین اطبائے ماہرین کے حکم سے ہوتی ہے، اسی طرح اگر ان سب عبادات شرعیہ کو محض اپنی صورت نوعیہ و خاصیت کے اعتبار سے خاص ثمرات مثل اخلاق مرضیۂ حق و نجات و قرب و رضا میں فاعل و موثر کہا جاوے تو اس کی نفی کی کیا دلیل ہو گی۔ اور اثبات کی دلیل نصوص کا سیاق و اطلاق ہے کہ کہیں ان کا فاعل بواسطہ ہونا نہیں بتلایا گیا اور جو کہیں بعض طاعات کی حکمت بتلائی گئی ہے تو غایت مافی الباب اس حکمت کا مرتب علی الاحکام ہونا ثابت ہوتا ہے نہ کہ مرتب علیہ الاحکام"۔

(یعنی یہ حکمت احکام پر مرتب یا ان کا ثمرہ ہوتی ہے، نہ کہ احکام اس مرتب یا اس کے تابع ہوتے ہیں (۱)۔)

تاخیر کی کوتاہی: "بعضے آدمی حتی الامکان نماز فوت نہیں ہونے دیتے مگر وقت کا اہتمام نہیں کرتے۔ اکثر تنگ وقت میں پڑھتے ہیں۔ بعض دفعہ قضا بھی ہو جاتی ہے۔ پھر بعض کو کوئی ظاہری مجبوری ہوتی ہے، گو وہ معتبر اس لئے نہیں کہ سعی و توجہ سے ضرور کوئی نہ کوئی صورت انتظام کی نکل آتی ہے۔ مگر بعض تو محض بیکار گپوں میں مشغول رہ کر وقت کو اخیر کر دیتے ہیں۔ اور افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ بعض ان میں مشائخ ہیں اور محض تضلیل شیطانی یا تسویل نفسانی سے تاخیر صلوٰۃ کے خوگر ہوتے ہیں۔

ا۔ جیسے نماز ہی کے بارے میں کہ ناہی عن الفحشاء والمنکر ہونا، نماز کا ثمرہ ہے، جو اس پر بالخاصہ مرتب ہوتا ہے نہ یہ کہ حکم نماز اس پر مرتب ہوتا ہے، یعنی نماز کا حکم محض اس لئے نہیں دیا گیا ہے، کہ وہ ناہی عن الفحشاء والمنکر ہوتی ہے۔ مولف ہذا۔

"جو لوگ ظاہراً کوئی مجبوری بتلاتے ہیں، ان میں سے بعض کو تو کسی درجہ میں بھی مجبوری نہیں جیسے تاجر و مزدور اور حاکم اجلاس واہل حرفہ یہ لوگ بالکل آزاد ہیں تھوڑی دیر کے لئے کام چھوڑ سکتے ہیں۔ بعض کو البتہ کسی درجہ میں مجبوری ہے، جیسے ایسے افسر کا نوکر جس کے سامنے اپنی رائے سے کچھ نہیں کر سکتا، وہ اولاً تو اوقات نماز میں اجازت حاصل کرنے کی کوشش کرے اور باستثناء شاذ و نادر کوئی افسر نماز سے منع نہیں کرتا اور اگر کسی طرح اجازت نہ حاصل ہو نہ خود اس سے نہ اس کے افسر بالا دست سے تو اس صورت میں ایسی نوکری ہی جائز نہیں"۔

لیکن حدود شناس حکیم الامت مجدد وقت کی شان یہ ہے کہ کسی موقع پر بھی حدود و حکمت کا دامن ہاتھ سے نہیں جاتا اس لئے ارشاد ہے کہ

"البتہ جس شخص کے پاس بظاہر سردست کوئی سبیل ضروری معاش کی نہ ہو نوکری میں نہ سرمایہ ہو کہ تجارت کرے نہ مزدوری کی عادت ہو تو ایسی حالت میں نوکری چھوڑنے میں تعجیل نہ کرے۔ فکر میں لگا رہے دوسرے خیر خواہوں سے بھی سعی کرا دے اور سبیل کے حاصل ہونے تک اختلال وقت صلوٰۃ کی اس بلا سے استغفار اور دعائے استخلاص کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے خلاصی عطا فرمائیں"۔
(ص ۵۴)

ایک کوتاہی اور یہ ہے، کہ بعض لوگ شرائط و ارکان میں ذرا ذرا سے عذر موہوم سے ایسی رخصت پر عمل کرنے لگتے ہیں جو عذر قوی کے متعلق ہے مثلاً ذرا حرارت کا شبہ ہوا یا ذرا ہوا میں خنکی ہوئی بجائے وضو و غسل کے تیمم کر لیا۔ ذرا طبیعت میں کسل ہوا بیٹھ کر نماز پڑھنے لگے۔ ریل میں ذرا جگہ کی تنگی ہوئی، جس کا آسانی سے انتظام ہو سکتا تھا، بیٹھ کر اور بعض دفعہ بے رخ بعض دفعہ اشارہ سے نماز پڑھنا شروع کر دی بلکہ ریل میں بالکل نماز ہی اڑا دی بالخصوص عورتیں تو ریل میں شاذ و نادر ہی نماز پڑھتی ہوں گی .... بڑی وجہ اس

کی دو امر ہیں ایک مسائل سے ناواقفی دوسرے نماز کی عظمت دل میں نہ ہونا اول کا علاج علم و واقفیت ہے (خواہ اہل علم سے جو ان مسائل سے واقف ہوں خواہ کتاب سے جس کے لئے بہشتی زیور کا پڑھتے پڑھاتے رہنا کافی ہے) دوسرے کا علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کی مخالفت پر جو عذاب یا وعیدیں ہیں دل میں ان کو سوچا کرے، تو اس سے ان حکموں کی عظمت پیدا ہوگی اور جب عظمت ہوگی تو ضرور اس کی کوشش و ارادہ کرے گا۔ اور جب کوشش و ارادہ کرے گا تو خود ان عذروں کا لغو ہونا معلوم ہو جاوے گا"۔
ص ۵۵

تعدیل کی کوتاہی: یہ ہے کہ بعض لوگ تعدیل ارکان اور ادائے سنن کا اہتمام نہیں کرتے، نہ قومہ ٹھیک ہے نہ جلسہ، رکوع میں بھی ہیئت مسنونہ نہیں، قیام بھی مقدار مسنون سے کم، قرات میں بھی غلط صحیح کی خبر نہیں۔ نماز کیا پڑھتے ہیں بیگار ٹالتے ہیں۔ حدیث میں ایسے شخص کو نماز کی چوری کرنے والا فرمایا ہے۔ اور ایک حدیث میں ایسے شخص کو نماز کے اعادہ کا حکم دیا کہ جا پھر نماز پڑھ تو نے نماز نہیں پڑھی۔ یعنی تیری نماز نہیں ہوئی۔ یہ فقہی مسئلہ الگ رہا کہ اس کی نماز ہوئی یا نہیں۔ لیکن اگر ہوئی بھی تو ایسی جیسے کوئی لنگڑی لولی اندھی بہری گونگی اپاہج بیمار کنیز ہو کہ گو وہ ایک درجہ میں آدمی تو ہے، مگر اس قابل نہیں کہ کسی صاحب کمال صاحب جمال اور صاحب جلال بادشاہ کی نذر میں پیش کی جا سکے اور وہ اس کو قبول کر لے"۔

امراء کی ایک کوتاہی: جو کہ بالخصوص نمازی امرا میں کثرت سے ہے، وہ جماعت کا ترک کرنا ہے۔ نصوص سے اس کا حد درجہ اہتمام ثابت ہے حتیٰ کہ اس کے ترک پر جو وعیدین آئی ہیں ان پر نظر کر کے بہت علماء نے واجب کہا ہے۔ اور بعض محققین فقہا حنفیہ نے بھی اس کو اختیار کیا ہے۔ اور واجب عمل میں اور ترک کے گناہ و سزا میں فرض کے برابر ہے۔ پس ایک فرض کو ادا کرنا اور اس کے مساوی کو ادا نہ کرنا یہ کس درجہ کی غلطی ہے............ ترک جماعت کا سبب اکثر دو امر ہیں ایک سستی کہ اتنی دور کون جائے دھوپ میں کون جائے دوسرے تکبر کہ ذلیل لوگوں کے ساتھ کھڑا ہونا یا ان کے پیچھے نماز

پڑھنا پڑے گی اور کبھی اس کا سبب مسجد میں لوگوں کی شان و عادت کے موافق سامان آسائش کا مفقود ہونا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک صاحب کو یہ عذر کرتے سنا کہ وہاں وضو کا موقع ایسا ہے کہ کپڑوں کو کائی لگ جاتی ہے، چٹائیاں سڑی ہوئی ہیں، جن میں گرد و غبار بھرا ہے۔ ہوا کا گزر نہیں دل پریشان ہو جاتا ہے۔

"سستی کے متعلق تو اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ اگر اس وقت دنیا کا کام جس میں مال و جاہ کا نفع ہو نکل آوے یہی حضرات اس طرح دوڑیں گے کہ ذرا بھی نہ کسل ہو نہ گرانی۔ افسوس کیا آخرت کی ضرورت اس درجہ پر نہیں رہی .... علاج اس کا وہی وعیدوں کا یاد کرنا ہے۔ اور تکبر کے باب میں یہ ہے کہ اول تو آپ کی شان ہی کیا۔ شاید وہ مساکین خدا تعالٰی کے نزدیک تم سے زائد محبوب و مقبول و ذیجاہ ہوں .... دوسرے اگر تمہاری شان ان مساکین سے زائد بھی مان لی جائے تو تم مساجد میں ان مساکین کی تعظیم کے لئے تو نہیں بھیجے جاتے بلکہ تم اور وہ سب ایسے عظیم الشان کی تعظیم کے لئے جمع ہوتے ہو، جس کی تعظیم سے تمہاری شان بڑھتی ہے۔ کیا کسی بادشاہ کے دربار عام کے موقع پر کوئی شخص محض اس بنا پر حاضر ہو کر سلام کرنے سے اعراض یا اغماض کی ہمت کر سکتا ہے کہ وہاں تو غربا بھی جا کر سلام کرتے ہیں اگر کوئی ایسا سمجھ کر نہ جاوے تو کیا وہ سرکش و گستاخ نہ سمجھا جاوے گا۔ تعجب ہے کہ دربار شاہی کے ساتھ تو وہ برتاؤ اور دربار الٰہی کے ساتھ یہ پیچ ہے ماقدروا اللہ حق قدرہ ان اللہ لقوی عزیز"۔

اور اگر کسی مسکین کے امام ہونے سے عار آئی ہے تو اول تو وہ عار کی بات نہیں۔ کیا بڑے بڑے حکام کے درباروں میں حاضر ہونے کے وقت اردلی خاص کہ رتبہ و ریاست میں تمہاری برابر نہیں پیش کرتے وقت تمہارا پیش رو نہیں ہوتا؟ اصل یہ ہے کہ وہاں تو خوشنودی مقصود ہے، وہ جس طریق سے بھی حاصل ہو اور یہاں یہی مقصود نہیں۔ دوسرے اگر پھر بھی عار آتی ہے تو آپ لیاقت علمی و عملی ان مساکین سے زیادہ حاصل کیجئے۔ پھر آپ کے ہوتے ہوئے وہ غریب خود ہی امام نہ بنے گا۔ افسوس خود تو الحمد اور قل ہو اللہ بھی صحیح نہ جانتے ہوں اس تک کی خبر نہ ہو کہ سجدہ سہو کن کن صورتوں میں واجب ہے، اس لئے خود تو امامت کے قابل نہیں، اور جو دوسرا اس قابل ہو اس سے عار

کریں یہ عار نہیں نار ہے"۔

"ایک عذر مسجد میں سامان آسائش نہ ہونے کا ہے، تو اس عذر کو زبان پر لاتے ہوئے بھی ان حضرات کو شرمانا چاہئے .... اگر یہ معنی ہیں کہ خدا کا گھر ہے خدا کو ایسا کرنا چاہئے تو کیا اس کہنے کی جرات کر سکتے ہو.......... اگر کر سکتے ہو تو جواب سنو۔ خداتعالیٰ نے آپ کو اور غربا سب کو غلام بنایا ہے، اور من جملہ دوسری خدمتوں کے یہ خدمت بھی سپرد کی ہے کہ اس کے دربار میں آسائش و ضروریات کا سامان بھی جمع کرو۔ سب اموال اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں پس غربا سے زیادہ تمہارے ذمہ واجب ہے کہ اس دربار یعنی مسجد کا انتظام کرو"۔

ترک جماعت کی ایک اور آڑ۔ "بعض لوگ دینداروں میں شمار ہوتے ہیں اور امام میں شرعی عیب نکال کر جماعت ترک کرتے ہیں۔ کبھی تو اصل سبب اس کا دنیوی رنج ہوتا ہے اور عیب ڈھونڈھ کر اس کی آڑ لیتے ہیں کہ وہ تو فلاں معصیت میں مبتلا ہے فلاں بدعت میں مبتلا ہے۔ اور کبھی اصل سبب تدین بھی ہوتا ہے مگر احکام کے نہ جاننے سے یا اہتمام نہ کرنے سے غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً دل سے بدعت سے نفرت ہے اور اس لئے امام سے بغض للدین ہے اور کوئی دنیوی رنج نہیں مگر اس مسئلہ کی ان کو خبر نہیں کہ انفراد سے ہر حالت میں جماعت کی نماز افضل ہے اگرچہ امام بدعتی ہو بشرطیکہ بدعت حد کفر تک نہ پہنچ گئی ہو.......... رہی کراہیت سو اول تو کراہیت اقتدا اس کے لئے ہے، جو امام کو معزول کرنے پر قادر ہو۔ پھر یہ کراہیت ترک جماعت کی کراہیت یا حرمت سے اخف ہے۔ البتہ اگر ایسے مقام پر شریک جماعت سے احتمال فتنہ کا ہو تو یکسوئی بہتر ہے"۔

خشوع کی کوتاہی۔ "ایک کوتاہی جس کو عوام تو عوام بعضے خواص بھی کوتاہی شمار نہیں کرتے۔ اور حیثیت سے وہ خاص طور پر قابل اہتمام ہے، وہ نماز میں خشوع اور حضور قلب کا نہ ہونا ہے، جس کے مطلوب ہونے کے لئے آیت قد افلح المومنون الذین ھم فی صلوتھم خاشعون" اور اس میں تقصیر کی مذمت کے لئے آیت الم یان للذین امنوا ان تخشع

فلو بھم الخ کافی ہے۔ سبب اس کا دو امر ہیں بعض کو تو اہتمام ہی نہیں ان کے لئے تو بے التفاتی سبب ہے اور بعض کو اہتمام ہے مگر اس کی حقیقت نہ جاننے سے اختیار و قدرت سے باہر سمجھتے ہیں، اس لئے اس کی تحصیل کا ارادہ ہی نہیں کرتے .... پہلے سبب کا علاج تو آیات بالا کے مضمون میں غور کرنا ہے۔ اور دوسرے کا علاج اس کی حقیقت سمجھنا ہے، جس کو مختصراً بیان کرتا ہوں"۔

خشوع کی حقیقت۔ "سو لغوی حقیقت خشوع کی سکون ہے اور شرعی حقیقت قلب و جوارح کا ارادی سکون، اور سکون مقابل ہوتا ہے حرکت کے، تو جوارح کی حرکت کے مقابل میں ان کا سکون یہی ہے کہ جس حرکت کا شرعاً حکم نہیں وہ حرکت نہ کرے یعنی ارادہ کر کے بیکار ہاتھ پاؤں نہ ہلائے۔ ادھر ادھر گردن یا نظر کو نہ پھیرے سر اوپر کو نہ اٹھاوے بدون ضرورت نہ کھجلاوے نہ کھنکارے وغیرہ۔ اور قلب کی حرکت فکر ہے، اس کا سکون عدم فکر ہے یعنی اپنے ارادہ سے کسی بات کو نہ سوچے۔ سو جیسے جوارح کی حرکت اگر بلاقصد مثلاً رعشہ سے کسی کی گردن ہلتی ہو تو وہ خشوع کے منافی نہیں۔ پس غلطی لوگوں کی یہ ہے کہ خشوع کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ بالکل خیال نہ آوے اور اس بنا پر اس کو محال عادی سمجھتے ہیں۔ مگر اس بنا کا فاسد ہونا تقریر بالا سے معلوم ہو گیا۔ جس سے متعین ہو گیا کہ خشوع اختیاری فعل ہے اور ہر شخص اس پر قادر ہے اور بہت آسان ہے، البتہ ارادہ و توجہ کی ضرورت ہے۔ جیسے سب ارادی افعال کی شان ہے، کہ ارادہ کرو تو آسان نہ ارادہ کرو تو دشوار۔ حتیٰ کہ اگر منہ میں لقمہ لے کر بیٹھ جاؤ اور نگلنے کا ارادہ نہ کرو تو وہ بھی آسان نہیں۔ پس اگر لقمہ نگلنا آسان ہے، تو خشوع بھی اتنا ہی آسان ہے۔ اور سہل طریقہ یہ ہے کہ نماز میں جو کچھ منہ سے نکلے محض یاد سے نہ پڑھے بلکہ ہر ہر لفظ مستقل ارادہ کر کے اس کو منہ سے نکالے کہ اب سبحانک اللھم کہوں گا اب بحمدک کہہ رہا ہوں۔ اب تبارک اسمک منہ سے نکل رہا ہے وعلی ہذا

اس مراقبہ کا اول سے آخر تک التزام رکھے انشاء اللہ تعالیٰ اول تو بلاقصد بھی کوئی خیال نہ آوے گا اور اگر فرضاً آ جائے تو پھر اس سوچ میں نہ پڑے کہ ارے یہ تو پھر

خطرات آنے لگے۔ یہ سوچ بھی غیر کا خیال ہے، بلکہ وہی مذکورہ بالا طریقہ سے توجہ کی پھر تجدید کر لے تو یہ خطرات رفع ہو جاویں گے۔ ہٰذا من افادات استاذی استاذ الکل حضرت مولانا محمد یعقوب علیہ رحمۃ اللہ علام الغیوب"۔ (ص ۶۰)۔

راقم ہٰذا کو تو اس مراقبہ پر یہ آیت صراحیہ نص معلوم ہوتی ہے کہ حتی تعلمو ماتقولون یعنی ہم جو کچھ نماز میں کہیں جان کر کہیں۔ بعض اہل علم نے اس سے سمجھ لیا ہے، کہ معنی سمجھ کر پڑھنا لازم ہے۔ حالانکہ "ماتقولون" سے صاف ثابت ہے کہ "مقول" (یعنی جو کچھ زبان سے کہے اس) کا علم ضروری ہے نہ کہ معنی یا مفہوم کا۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ نماز میں خشوع یا حضور قلب کو جس درجہ دشوار بلکہ ناممکن خیال کیا جاتا ہے، اس کی حقیقت مذکورہ بالا کو سمجھ لینے اور اس مراقبہ کو کچھ دن جاری رکھنے کے بعد ویسا ہی آسان ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ یہ خشوع و خضور نماز کی جان ہے، اس لئے حضرت مجدد وقت نے اپنے مواعظ و ملفوظات وغیرہ میں کثرت سے اس کی تفہیم و تفصیل فرمائی ہے۔ مواعظ اشرفیہ کے نام سے ایک مستقل وعظ اس پر ہے جس میں کہ "خشوع کے ہر پہلو پر مفصل بحث ہے۔ اس کے ملاحظہ سے انشاء اللہ اس بات میں کسی قسم کا خفا نہ رہ جائے گا"۔

بعض عام و شدید کوتاہیاں: سب سے آخر میں بعض اور کوتاہیوں کا ذکر ہے، جن کی بدولت نماز میں طرح طرح کی خرابیاں اور غلطیاں واقع ہوتی ہیں کہ ایک طرف تو

"نماز اتنی بڑی ضروری چیز اور پھر روزانہ پانچ بار واقع ہونے والی، اور اس کے شرائط وارکان کے ہر جزکی اور ہر موقع پر بے شمار صورتیں پیش آتی ہیں، جن کے احکام بہت لوگوں کو معلوم نہیں، مگر باوجود اس کے بہت کم دیکھا جاتا ہے کہ ان احکام و مسائل کو لوگ معلوم کرتے ہوں"۔

مثلاً "بہت لوگ ایسے لباس غیر مشروع سے نماز پڑھتے ہیں کہ نماز قبول نہیں ہوتی بالخصوص یعنی اقسام ریشم و مخمل کے استعمال میں تو خواص تک بے احتیاطی کرتے ہیں۔ بعض لوگ ہجوم میں امام سے پہلے نیت باندھ لیتے ہیں کہ وہ نماز ہی نہیں ہوتی۔ (عیدین کی نماز میں لباس و نیت کی ان دونوں

کوتاہیوں کا خصوصیت سے ارتکاب ہوتا ہے۔ راقم احقر) بعض لوگ امام کے ساتھ رکوع میں اس طرح شامل ہوتے ہیں کہ اللہ اکبر کہتے ہیں رکوع میں پہنچ جاتے ہیں اور اول قیام نہیں کرتے ان کی نماز نہیں ہوتی۔ بعض لوگ قعدۂ اخیرہ میں امام کے ساتھ شریک ہونا چاہتے ہیں، مگر ان کی تکبیر تحریمہ ختم ہونے سے پہلے امام سلام پھیر دیتا ہے، تو وہ اقتدا صحیح نہیں ہوتی اور انفراد کی صورت میں اقتدا کی نیت مفسد صلوٰۃ ہے، لہٰذا ان کی نیت بھی نہیں ہوتی (ان دونوں غلطیوں کا مشاہدہ بھی ہر مسجد میں مسبوقین کی جلد بازی میں کیا جاتا ہے۔ راقم) بعض اوقات امام سہواً قعدۂ اخیرہ کے بعد کھڑا ہو جاتا ہے، تو مسبوق بھی مقتدی کی حیثیت سے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ حالانکہ اس وقت مسبوق کو اقتدا جائز نہیں تو اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ علیٰ ہذا اگر امام مسافر بعد دو رکعت کے سہواً کھڑا ہو جائے تو مقتدی مقیم کو اس کے ساتھ مقتدی رہنا مفسد صلوٰۃ فرض ہے"۔

غرض یہ اور اس قسم کی بہت سی دوسری غلطیاں و کوتاہیاں محض مسائل کی ناواقفیت کی وجہ سے ہوتی رہتی ہیں، جن کی بدولت نماز پڑھنے کے باوجود نہیں ہوتی پھر بھی لوگوں کو مسائل معلوم کرنے کی فکر نہیں۔

"یہ مختصر ضروری بیان ان کوتاہیوں کا تھا، جو کثیر الوقوع ہیں، اور جن کا وقوع قلیل ہے ان کو ترک کر دیا گیا اول بوجہ قلت وقوع کے، دوسرے اس لئے کہ ان کا مذموم ہونا کسی پر مخفی نہیں، سو تنبیہ کے لئے یہ علم ہی کافی ہے، جیسے شرم سے بے وضو نماز پڑھا لینا یا پڑھا دینا یا وضو کر کے سو جانا اور کسی کے جگانے پر جھٹلا دینا کہ میں تو سویا نہ تھا اور اس طرح نماز پڑھ لینا وغیرہ"

اصل یہ ہے کہ نماز اگر نماز کی طرح پڑھی جائے تو اس میں شک نہیں کہ یہ دین کی ساری عمارت کا ستون ہے۔ اگر یہ ستون استوار ہو اور اقامت صلوٰۃ کو قلب و قالب کی کم از کم ان ہی کوتاہیوں یا فروگذاشتوں سے محفوظ رکھا جائے، جو حضرت مجدد وقت علیہ

الرحمہ نے اوپر بیان فرمادی ہیں، تو پھر انشاء اللہ سارا دین استوار و مستحکم ہو جائے۔ بات یہ ہے کہ نماز کی حقیقت اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی، وحدت و یکتائی اس کی حاکمیت و مالکیت رحمت و ر حمانیت علم و قدرت وغیرہ صفات جمال و جلال اور ایسی کامل صفات والی ذات کے ساتھ بندہ کے تعلقات کی یاد یا ذکر ہے۔ یہ یاد اگر یاد کی طرح دن میں پانچ دفعہ صبح اٹھنے سے لے کر رات کے سونے تک برابر ہوتی رہے، تو غفلت و نسیان یا نافرمانی و طغیان کی جرات ہی کیسے ہو سکتی ہے کیا اگر دنیا کا کوئی معمولی حاکم اپنے سامنے بٹھا کر دن میں پانچ دفعہ اپنی اطاعت و فرمانبرداری کی یاد دہانی کرتا رہے، اور پھر ہر وقت برابر ہماری ہر ہر حرکت کی نگرانی کرتا رہے، تو کیا ہم اس کے کسی چھوٹے بڑے حکم کو ٹالنے کی ہمت کر سکتے ہیں۔ اسی طرح یہی تعلق و تصور ہمارا اگر احکم الحاکمین کی حاضر و ناظر ذات کے ساتھ کسی معتد بہ درجہ میں قائم ہو جائے، تو پھر اس کی آنکھوں کے سامنے وہ بھی دن میں پانچ پانچ بار یاد دہانی کے باوجود اس کی عدول حکیموں کی جسارت کیسے جاری رہے گی یہی معنی ہیں "ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر ولذکر اللہ اکبر" کے کہ اللہ کی یاد یقیناً ایسی ہی بڑی چیز ہے، کہ اس کے ساتھ فحشا و منکر جمع ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اس ذکر اکبر کا ظاہر و مظہر نہر میں جو دن میں پانچ پانچ بار غوطے لگاتا ہو اس کے ظاہر و باطن میں کوئی کثافت کیسے رہ سکتی ہے! ہر شخص اپنی نماز کو ذرا نماز بنا کر اس حقیقت کا تجربہ کر سکتا ہے۔ اور مسلمانوں کی دینی و دنیوی اصلاح کے لئے قسم قسم کی انجمن سازیوں اور تقریر بازیوں کے بجائے اگر صرف ان کو نمازی اور ان کی نمازوں کو نماز بنانے کی سعی کی جائے تو باقی تمام چیزوں کی اصلاح انشاء اللہ خود بخود ہو جائے گی۔

روزہ۔ نماز کے بعد روزہ کے باب میں جو کوتاہیاں ہوتی ہیں ان کا بیان ہے۔ سب سے پہلے رویت کے بارے میں جو گڑبڑ ہوتی ہے، اس کی اصلاح فرمائی گئی ہے۔ آج کل تار کی خبروں سے بہت جھگڑا پڑتا ہے اس کی نسبت ارشاد ہے کہ

> "کبھی کہیں سے تار آ جانے پر اعتبار کرتے ہیں .... اور کہتے ہیں کہ صاحب لاکھوں روپیہ کی تجارت تار پر چلتی ہے پھر اس کا اعتبار نہ کرنے کا سبب۔ لیکن اگر ان سے کوئی پوچھے کہ گواہ کے پاس سمن آنے کے بعد اگر

تار پر شہادت ادا کر دے تو قانوناً کیوں معتبر نہیں۔ اور معاملات تجارت اور اس شہادت میں کیوں فرق ہے اور اس شہادت اور رویت ہلال کی شہادت میں کیا فرق ہے تو اس کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکتے" (ص ۶۴)

خود حضرت علیہ الرحمہ نے رویت کے بارے میں

"ایسی تشویشات کو دیکھ کر ایک مقام پر یہ انتظام کیا تھا کہ سب علماء کو متفق کر کے خاص ایک عالم کو اس بات میں محط خبر و مدار حکم ٹھہرایا کہ جو خبر ہلال کے متعلق جس عالم کے پاس آوے وہ ان کی خدمت میں پہنچا دی جائے، اور جو شخص جس سے فتویٰ پوچھے وہ سائل کو انہیں کے پاس بھیج دے اور جس کو کوئی اختلاف کرنا ہو انہیں سے ظاہر کرے عوام کو اس اختلاف کی اطلاع نہ ہو اور حکم حاصل کرنے میں ان کو تشویش نہ ہو پس سب خلجانوں سے نجات ہو گئی۔ اگر سب جگہ ایسا انتظام کر لیا جائے تو اقرب الی الاتفاق ہے۔ اور ایک انتظام یہ ضروری ہے کہ چاند دیکھنے پر یا اس کی خبر سننے پر بلاضرورت دوسرے مقامات پر تار نہ دوڑا دیا کریں، بلکہ کسی عامی کے پوچھنے پر جواب نہ دیا کریں۔ دوسری جگہ عوام کے ہاتھ میں ایسی خبر پہنچ جانے سے چونکہ اس وقت خودرائی کا غلبہ ہے، ضرور مفاسد پیش آتے ہیں، جن کا انسداد قابو سے باہر ہوتا ہے اور شرعاً کوئی ضروری امر نہیں کہ از خود دوسری جگہ خبر بھیجا کرو"۔

اصل میں زیادہ مفاسد اسی سے پیدا ہوتے ہیں کہ لوگ شریعت کے احکام و مسائل پر قناعت نہیں کرنا چاہتے اور اپنی عقل مندی کو خواہ مخواہ کھسرتے ہیں۔ ایک بڑی مسلمان ریاست کے وزیر مذہبی کو احکام مذہب سے جہل کے باوجود یہ اپج سوجھی کہ وہاں کی رویت کا تار سارے ہندوستان میں بھجوانا شروع کر دیا تاکہ سب جگہ عید ایک ہی دن ہو حالانکہ مسئلہ کی رو سے نہ تار بھجوانا ضروری نہ ہر جگہ ایک ہی دن عید ضروری۔

"علیٰ ہذا اس قسم کی تخمینی باتوں کا رویت میں کوئی اعتبار نہیں کہ "مثلاً رجب کی چوتھی کا غرہ رمضان کے موافق ہونا، چاند کا بڑا ہونا یا دیر تک ٹھہرنا اونچا

ہونا یا مدر کامل ہونا دو شب تک غائب رہنا۔ جنتری میں ۲۹ یا ۳۰ کا لکھا رہنا وغیرہ یہ سب شرع میں غیر معتبر ہیں اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اکثر ایسے امور حسابی اور مطابق واقع کے ہیں تو شرع نے امور واقعہ کی نفی کیسے کی .... وجہ اس شبہ کے وارد نہ ہونے کی یہ ہے کہ شرع نے ان امور کے وقوع کی نفی نہیں کی بلکہ ان کے اعتبار کی نفی کی ہے۔ یعنی ہم ان امور پر اپنے احکام کا مدار نہیں رکھتے تو یہ حق ہر صاحب قانون کو حاصل ہے۔ مثلاً کوئی نوکری مشروط ہو بی۔ اے کے ساتھ تو وہ انٹرنس والے کو نہ ملے گی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس شخص کے انٹرنس ہونے کی نفی کی گئی بلکہ معنی یہ ہیں کہ انٹرنس ہونا معتبر و مدار استحقاق اسی موقع پر نہیں تو اگر غرۂ شرعی غرۂ حسابی ہو تو اس کو یکم کہنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ واقع میں یکم ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ خواہ وہ واقع میں کسی دوسرے اعتبار سے دوم ہو، مگر فلاں فلاں قواعد کی رو سے روزہ اسی سے شروع کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، اور روزہ شروع کرنے کی تاریخ کو ہماری اصطلاح میں یکم کہا جاتا ہے۔ اور لغت و اصطلاح کا تطابق ضروری نہیں، جیسا کہ تاریخ کو کوئی طلوع سے شروع کرتا ہے کوئی غروب سے اور کوئی نصف شب سے جو اپنی اپنی اصطلاح ہے"۔

سب سے بڑی کوتاہی: باقی نفس روزہ میں سب سے بڑی کوتاہی تو یہی ہے کہ بہت سے لوگ بلا کسی قوی یا ضعیف عذر کے رکھتے ہی نہیں۔ ان میں بعضے تو محض کم ہمتی کی وجہ سے نہیں رکھتے۔ ایسے ہی ایک شخص کو جس نے عمر بھر روزہ نہیں رکھا تھا، اور سمجھتا تھا کہ پورا نہ کر سکے گا حضرت نے اس سے فرمایا کہ

"تم بطور امتحان ہی رکھ کر دیکھو چنانچہ رکھا اور پورا ہو گیا پھر اس کی ہمت بندھ گئی اور رکھنے لگا۔ کیسے افسوس کی بات ہے کہ رکھ کر بھی نہ دیکھا تھا اور پختہ یقین کر بیٹھا تھا کہ کبھی رکھا ہی نہ جاوے گا یہ لوگ سوچ کر دیکھیں کہ اگر طبیب کہہ دے کہ آج دن بھر نہ کچھ کھاؤ نہ پیو ورنہ فلاں مہلک مرض ہو جائے گا، تو اس نے ایک ہی دن کیلئے کہا یہ دو دن نہ کھاوے گا کہ احتیاط

اسی میں ہے۔ افسوس خدا تعالیٰ صرف دن کا کھانا چھڑا دیں اور کھانے پینے سے عذاب مہلک کی وعید فرمائیں اور ان کے قول کی طبیب کے برابر بھی وقعت نہ ہو انا للہ"۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ آج کل کے نئے ڈاکٹروں نے تو بہت سے امراض کا علاج ایک دن کیا ہفتوں اور مہینوں کا مسلسل فاقہ تجویز کیا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر آج کل کا "سیاسی مرن برت" ہے کہ ہفتوں اور مہینوں بلکہ مرنے تک نہ کھانے کا عہد کر لیتے ہیں اور اس کو پورا کرتے بلکہ بعضے مر ہی جاتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ ۱۰، ۱۲ گھنٹے کھانا پینا چھوڑ دینا کیا بڑی بات ہے، اور اس کی وجہ بے ہمتی یا خدا تعالیٰ کے حکم کی بےوقعتی کے سوا کیا ہو سکتی ہے۔

بعضوں کی یہ بےوقعتی اس بدعقیدگی تک پہنچ جاتی ہے کہ روزہ کی ضرورت ہی کا طرح طرح سے انکار کرنے لگتے ہیں، مثلاً روزہ قوت بہیمیہ کے توڑنے یا تہذیب نفس کے لئے ہے اور ہم علم کی بدولت یہ تہذیب حاصل کر چکے ہیں۔ ایسے لوگوں کا وہی جواب ہے جو اوپر نماز کے سلسلہ میں انہیں مہذبوں کو دیا جا چکا ہے"۔

"اور بعضے تہذیب سے بھی گزر کر گستاخی اور تمسخر کے کلمات کہتے ہیں مثلاً روزہ وہ رکھے جس کے گھر کھانے کو نہ ہو یا بھائی ہم سے بھوکا نہیں مرا جاتا۔ سو یہ دونوں فریق بوجہ انکار فرضیت صوم زمرہ کفار میں داخل ہیں۔ اور پہلے فریق کا قول محض ایمان شکن اور دوسرے کا ایمان شکن بھی اور دل شکن بھی"۔

بلاعذر کا عذر۔ "اور بعض بلاعذر تو روزہ ترک نہیں کرتے مگر اس کی تمیز نہیں کرتے کہ یہ عذر شرعاً معتبر ہے یا نہیں۔ ادنیٰ بہانہ سے افطار کر دیتے ہیں۔ مثلاً خواہ ایک ہی منزل کا سفر ہو روزہ افطار کر دیا۔ کچھ محنت مزدوری کا کام ہوا روزہ چھوڑ دیا ایک طرح سے یہ بلاعذر روزہ توڑنے والوں سے بھی قابل مذمت ہیں۔ کیونکہ بلاعذر نہ رکھنے والے خود بھی اپنے کو فعل قبیح کا مرتکب سمجھتے ہیں، اور یہ لوگ اپنے کو معذور جان کر بے گناہ سمجھتے ہیں، حالانکہ شرعاً وہ معذور نہیں اس لئے گنہگار ہوں گے۔

"ان کو چاہئے کہ ایسے لوگوں پر نظر کریں جو سخت سے سخت حالت میں بھی روزہ نہیں چھوڑتے۔ میں نے ریلوے کے ایک ڈرائیور کو دیکھا کہ ہر وقت انجن میں رہتا اور سخت گرمی کی فصل تھی، پھر بھی روزہ رکھتا۔ بہت سے کھیتی کاٹنے والے جیٹھ بیساکھ میں کھیتی کاٹتے اور روزے رکھتے ہیں۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ قدرے عادت اور زیادہ ہمت یعنی پختہ ارادہ دونوں کے جمع ہونے سے مشکل سے مشکل کام بھی سہل ہو جاتا ہے اور ذوق و وجدان سے کام لیا جاوے تو روزہ میں خدا کی طرف سے تسہیل و تائید کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس پر بھی ہمت توڑ دینا اور بہانہ ڈھونڈھنا سخت محرومی ہے"
(ص ۶۷)

عذر والوں کی کوتاہی۔ "بعضے لوگوں کا افطار تو عذر شرعی سے ہوتا ہے مگر ان سے یہ کوتاہی ہوتی ہے کہ بعض اوقات اس عذر کے رفع ہونے کے وقت کسی قدر دن باقی ہوتا ہے اور شرعاً بقیہ دن میں امساک یعنی کھانے پینے سے بند رہنا واجب ہوتا ہے، مگر وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ مثلاً سفر شرعی سے ظہر کے وقت واپس آ گیا یا عورت حیض سے ظہر کے وقت پاک ہو گئی تو ان کو شام تک کھانا پینا نہ چاہئے۔ علاج اس کا مسائل و احکام کی تعلیم و تعلّم ہے"۔

بچوں کے بارے میں کوتاہی۔ "بعض لوگ خود تو روزہ رکھتے ہیں لیکن بچوں سے (باجود ان کے روزہ رکھنے کے قابل ہونے کے) نہیں رکھواتے خوب سمجھ لینا چاہئے کہ عدم بلوغ میں بچوں پر روزہ رکھنا تو واجب نہیں، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے اولیاء پر بھی رکھوانا واجب نہیں، جس طرح نماز کے لئے باوجود عدم بلوغ کے ان کو تاکید کرنا بلکہ مارنا ضروری ہے اسی طرح روزہ کے لئے بھی۔ اتنا فرق ہے کہ نماز میں عمر کی قید ہے اور روزہ میں تحمل پر مدار ہے (کہ جب بچہ روزہ کی تکلیف برداشت کر لے سکے) اور راز اس میں یہ ہے کہ کسی کام کا دفعتہً پابند ہونا دشوار ہوتا ہے تو اگر بالغ ہونے کے بعد ہی تمام احکام شروع ہوں، تو ایکبارگی زیادہ بوجھ پڑ جائے گا، اس لئے

شریعت کی رحمت ہے کہ پہلے ہی سے آہستہ آہستہ سب احکام کا خوگر بنانے کا قانون مقرر کیا"۔

افراط کی غلطی: "یہاں تک روزہ میں تفریط کا ذکر تھا، اسی طرح بعض لوگ افراط سے کام لیتے ہیں۔ اور ظاہر میں یہ لوگ اقرب الی الدین ہیں، لیکن شریعت میں چونکہ افراط بھی پسند نہیں، اس لئے ان کی حالت بھی دین کے موافق نہیں۔ مثلاً بعضے لوگ سفر یا مرض میں جان کو آ جاتے ہیں، مگر دینداری جتلانے کو افطار پر صوم کی ترجیح دینے کو افطار نہیں کرتے، جو سخت غلطی ہے۔ اگر اول نیت ہے تو بہت برا ہے اور اگر ثانی ہے، تو اس لئے جہل ہے کہ صوم کو مطلقاً افطار پر ترجیح نہیں، بلکہ ایسی شدت کی حالت میں افطار ہی کو ترجیح ہے ورنہ حدیث میں لیس من البر الصیام فی السفر (کہ سفر میں روزہ رکھنا نیکی کا کام نہیں ہے) کے کوئی معنی نہ ہوں گے بلکہ اس جہل کا اثر عقیدہ تک پہنچتا ہے، اس لئے اول سے بھی اشد ہے۔ کیونکہ علمی غلطی عملی سے زیادہ بری ہے اور عقیدہ پر اثر کی وجہ یہ ہے کہ شرع نے جس کو راجح قرار دیا یہ شخص اس کو مرجوح سمجھتا ہے، اور جس کو مرجوح قرار دیا اس کو راجح اعتقاد کرتا ہے، اور شریعت کی آسانی یا رخصت سے دل تنگ ہوتا ہے تو گویا اس کو ناقص سمجھتا ہے اور شرع کی طرف نقص کی نسبت کرنا کتنا برا عقیدہ ہے۔ یہی حکم ان عورتوں کا ہے، جو اس یقین کے باوجود کہ روزہ رکھنا دودھ پینے والے بچے کو ضرر کرے گا اپنی ہٹ دھرمی اور ہیکڑی سے باز نہیں آتیں بلکہ ان کی حالت پہلے شخص سے زیادہ بری ہے کیونکہ اس نے صرف اپنا ہی نقصان کیا تھا مگر اس عورت نے ایک بے گناہ بچے کو بھی ضرر پہنچایا"۔

روزہ کی محض صورت: "بعض لوگ نفس روزہ میں افراط تفریط نہیں کرتے۔ لیکن روزہ محض صورت کا نام سمجھ کر صبح سے شام تک صرف جوفین (یعنی فم و فرج) کو بند رکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ حالانکہ روزہ کی نفس صورت کے مقصود ہونے کے ساتھ اس میں اور بھی حکمتیں ہیں جن کی طرف قرآن مجید میں اشارہ بلکہ صراحت ہے کہ لعلکم تتقون" ان سب کو نظر انداز کر کے اپنے صوم کو جسد بے روح بنا لیتے ہیں۔

خلاصہ ان حکمتوں کا معاصی و منہیات سے بچنا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ اکثر لوگ روزہ میں بھی معاصی سے نہیں بچتے۔ اگر غیبت کی عادت تھی تو وہ بدستور رہتی ہے۔ اگر بد نگاہی کے خوگر تھے وہ نہیں چھوڑتے۔ اگر حقوق العباد کی کوتاہیوں میں مبتلا تھے ان کی صفائی نہیں کرتے، بلکہ بعض کے معاصی تو غالباً بڑھ جاتے ہیں کہیں دوستوں میں جا بیٹھے کہ روزہ بہلے گا اور باتیں شروع کیں جن میں زیادہ حصہ غیبت کا ہو گا یا چوسر گنجفیہ تاش ہار مونیم گراموفون لے بیٹھے اور دن پورا کر دیا۔ بھلا اس روزہ کا کوئی معتدبہ حاصل کیا۔ اتنی بات عقل سے سمجھ میں نہیں آتی کہ کھانا پینا جو فی نفسہ مباح ہے، جب روزہ میں وہ حرام ہو گیا، تو غیبت وغیرہ دوسرے معاصی جو فی نفسہ بھی حرام ہیں وہ روزہ میں کس قدر سخت حرام ہوں گے۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص بدگفتاری و بدکرداری نہ چھوڑے خدا تعالیٰ کو اس کی کچھ پروا نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ بالکل روزہ ہی نہ ہو گا۔ لہٰذا رکھنے ہی سے کیا فائدہ، روزہ تو ہو جائے گا لیکن ادنیٰ درجہ کا جیسے اندھا لنگڑا کانا گنجا اپاہج آدمی تو ہوتا ہے، مگر ناقص۔ لہٰذا روزہ نہ رکھنا اس سے بھی اشد ہے کیونکہ ذات کا سلب صفت کے سلب سے سخت تر ہے۔

ایک سنگین شبہ: یہ شبہ نہ ہو کہ پھر غیبت وغیرہ سے روزہ ٹوٹ کیوں نہیں جاتا۔ سو شرع میں روزہ کی خاص ماہیت ہے لہٰذا "اکل و شرب وغیرہ گو اہون ہوں مگر روزہ کی مشروعہ، ماہیت کے منافی ہیں۔ دیگر معاصی گو اغلظ ہوں مگر اس کی ماہیت کے منافی نہیں، گو اس ماہیت کی اغراض کے منافی ہوں۔ سو غایت مافی الباب ان معاصی سے وہ اغراض فوت ہو جاویں گی، جس کو ہم بھی مانتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ بھلا اس روزہ کا معتدبہ حاصل کیا، اور اصل ماہیت صوم کے پائے جانے سے یہ اثر ہو گا کہ قیامت میں باز پرس نہ ہو گی کہ روزہ کیوں نہیں رکھا بلکہ یہ پوچھا جائے گا کہ روزہ کو خراب کیوں کیا۔ سو بڑا فرق ہے اس میں کہ حاکم کے حکم کے بعد سالانہ کاغذ ہی نہ بنایا اور اس میں کہ کہیں کہیں غلطیاں رہ گئیں"۔

سبحان اللہ کیسے سنگین شبہ کی کیسی دلنشین تفہیم ہے۔ اور مثالیں تو حضرت کی بس ایسی ہوتی ہیں کہ مغلق سے مغلق مسائل کو پانی کر دیتی ہیں۔

روزہ میں گناہ سے بچنے کی تدابیر: پھر روزہ کو خراب کرنے والے غیبت وغیرہ گناہوں سے بچنے کی حسب معمول تدابیر بھی بتلا دی گئی ہیں جو صرف تین باتیں اور نہایت آسان ہیں۔

(۱) خلق سے بلاضرورت تنہااور یکسو رہنا (۲) کسی اچھے شغل مثلاً تلاوت وغیرہ میں لگے رہنا (۳) اور نفس کو سمجھانا یعنی وقتاً فوقتاً یہ دھیان کرتے رہنا کہ ذرا سی لذت کے لئے صبح سے شام تک کی مشقت کو کیوں ضائع کیا جائے۔ اور تجربہ ہے کہ نفس پھسلانے سے بہت کام کرتا ہے تو نفس کو یوں پھسلاوے کہ ایک مہینے کے لئے تو ان باتوں کی پابندی کر لے پھر دیکھا جائے گا۔ پھر یہ بھی تجربہ ہے کہ جس طرز پر آدمی ایک مدت رہ چکا ہو وہ آسان ہو جاتا ہے۔ بالخصوص اہل باطن کو رمضان میں یہ حالت زیادہ مدرک ہوتی ہے کہ اس مہینہ میں جو اعمال صالحہ کئے ہوتے ہیں سال بھر ان کی توفیق رہتی ہے۔ پس اس طریق سے بعد رمضان وہی عادت ترک معاصی کی تھوڑی توجہ سے انشاء اللہ محفوظ رہے گی۔ نیز حتی الامکان رمضان میں غذائے حلال کا زیادہ اہتمام رکھے شرم کی بات ہے کہ حلال سے دن بھر رکا رہے اور حرام پر افطار کرے۔

اس میں شبہ نہیں کہ روزانہ کی نماز اگر کسی درجہ میں بھی اپنی روح کے ساتھ ادا ہوتی رہے اور روزوں میں سالانہ ایک مہینہ مستقل و مسلسل اعمال صالحہ اور ترک معاصی کا اہتمام رکھا جائے اور رمضان ختم ہوتے ہی قصد کر کے پھر ان کے خلاف نہ کیا جائے تو انشاء اللہ ہماری روحانی و اخلاقی حیات کی بقا و قوت کے لئے روزانہ کی یہ غذا (نماز) اور سالانہ مسہل (روزہ) بالکل کافی ووافی ہے۔

سحور وغیرہ کی بعض فروگذاشتیں: اس کے بعد سحور وغیرہ کی بعض فروگذاشتوں کا ذکر ہے۔ مثلاً بعض آدمی " آدھی رات سے سحری کھا کر بیٹھ رہتے ہیں سو اول تو اس قدر تعجیل ہی مشروعیت سحر کے خلاف ہے۔ غرض مشروعیت یہ ہے کہ اہل کتاب اور مسلمانوں میں فرق رہے اور روزہ میں قوت و طاقت رہے۔ دوسرے اکثر عوام کا یہ اعتقاد ہے کہ جب سحر کھا کر روزہ کی نیت کر لی یا سو گئے تو اس کے بعد گو رات باقی ہو کھانا پینا جائز نہیں سو

یہ دین میں اختراع ہے جس سے توبہ واجب ہے۔ دوسری طرف بعض لوگ خصوصاً جن کے پاس گھڑیوں اور نقشے بھی ہیں اس قدر تاخیر کرتے ہیں کہ بعض اوقات اشتباہ ہوتا ہے کہ صبح صادق کے بعد تو نہیں کھایا۔ اس قدر مبالغہ بھی ضرور بے احتیاطی ہے"۔

افطار میں کوتاہی: یہ ہے کہ افطاری کے سامان میں اس قدر اہتمام کرتے ہیں کہ اس کے کھاتے کھاتے مغرب کی جماعت بالکل یا کسی قدر فوت ہو جاتی ہے۔ جماعت کی جو تاکید ہے اس کے اعتبار سے یہ عادت نہایت منکر ہے۔ اول اس قدر اہتمام ہی کیا ضرور۔ دوسرے یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ شغل بعد کو ہو اور پہلے کسی مختصر چیز سے افطار کر کے نماز میں حاضری ہو جائے۔ آسان طریقہ یہ ہے کہ افطار مختصر ہو یا مطول مسجد میں ہونا چاہئے۔ مکان پر روزہ کھولنے سے اکثر جماعت برباد ہو جاتی ہے۔

تراویح میں خرابیاں: اس طرح کی پیدا کرتے ہیں کہ مثلاً "قرآن مجید اس قدر تیز پڑھتے ہیں کہ تجوید کیا تصحیح حروف بھی نہیں ہوتی بعض دفعہ سامعین کو صاف سنائی بھی نہیں دیتا کہ کیا پڑھ رہا ہے۔ اکثر ثناء رکوع سجود وغیرہ مقتدی پورا کرنے نہیں پاتا کہ امام صاحب قراء ت قومہ یا جلسہ وغیرہ کی طرف چل دیتے ہیں بعضے ایک ہی رات میں دو دو جگہ پوری تراویح پڑھا دیتے ہیں۔ بعض لوگ اجرت پر قرآن سناتے ہیں۔ اور بھی بہت سی خرابیاں ہیں جو اصلاح الرسوم میں لکھ دی ہیں۔ بعض متفرق منکرات ہیں جیسے منجھلے روزہ کے لئے خاص اہتمام ختم قرآن کے دن شیرینی کا لزوم۔ آخری جمعہ کو الوداع کے خطبہ کے التزام۔

خطبہ الوداع: جس کو دہلی لکھنؤ وغیرہ بعض جگہ دیکھا کہ عید سے بڑھا دیتے ہیں۔ راقم ہذا کے مکان کے قریب لکھنؤ میں شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلہ والی مسجد میں الوداع کا جمعہ خاص اہتمام و التزام کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، جس میں دور دور کے محلوں سے عید کی طرح بڑے چھوٹے بچے بوڑھے سب ہی زرق برق کپڑے پہن کر عید ہی کی طرح جمع ہوتے ہیں۔ عورتیں تک آتی ہیں۔ اور دوکانوں وغیرہ سے ایک میلہ لگ جاتا ہے۔

نماز عیدین: اس کے برخلاف عید کی نماز کا بوجھ اکثر محلہ ہی کی مسجد میں اتار دیتے ہیں حتیٰ کہ "بعضے جو بزعم خود مقتدا ہیں مستقلاً متبوع (امام) بننے کی غرض سے عید گاہ کو چھوڑ کر محلہ ہی کی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔ حالانکہ جس مسجد کی یہ فضیلت ہو کہ وہاں کی ایک نماز پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہو (یعنی مسجد نبوی) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تو چھوڑ کر عمر بھر عید گاہ تشریف لے جائیں۔ اور یہ مدعی اپنی مسجد کو عید گاہ پر ترجیح دیں۔ البتہ معذوروں کے لئے اگر شہر میں کسی کو نماز پڑھانے کے لئے چھوڑ دیں مضائقہ نہیں مگر مقتدا لوگ خود نہ رہیں اپنے کسی متعلق قابل امامت کو چھوڑ دیں یا اتفاقاً کوئی عذر خود مقتدا یا عام لوگوں کو پیش آ جائے تو دوسری بات ہے، چنانچہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار بارش کے عذر سے مسجد میں نماز ادا فرمائی"۔

کہتے شرم آتی ہے کہ ہمارے اس مشہور شہر (لکھنؤ) میں مقتداؤں کا مشہور گھرانا محلے کیا گھر ہی کی مسجد میں یا مسجد خانہ میں عیدین کی نماز عذراً نہیں التزاماً پڑھتا پڑھاتا رہتا ہے!

صفوں کی بے ترتیبی: عید کی نماز میں خود عید گاہوں میں بالعموم ایک بہت بڑی کوتاہی یہ کی جاتی ہے کہ "صفیں نہایت بے ترتیب ہوتی ہیں حالانکہ صفوں کے برابر کرنے کی سخت تاکید آئی ہے۔ اور ایک بڑی کوتاہی یہ ہے کہ خطبہ سننے کو بالکل امر فضول سمجھتے ہیں اگر سب ایسا ہی کریں تو خطیب خطبہ کس کے سامنے پڑھے اور بعضے بیٹھے تو رہتے ہیں مگر باتیں کرتے رہتے ہیں یہ بھی گناہ ہے"۔

زکوٰۃ کا معاملہ: یہ ہے کہ "جس طرح عبادات بدنیہ میں نماز سب سے اہم ہے، اسی طرح عبادات مالیہ میں زکوٰۃ سب سے اہم ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ اقیموا الصلوٰۃ کے ساتھ ساتھ ہی اتوا الزکوٰۃ آتا ہے"۔

اس میں بھی سب سے بڑی کوتاہی: تو یہی ہے کہ بہت سے لوگ زکوٰۃ دیتے ہی نہیں۔ اس کی اصلاح یہ ہے کہ زکوٰۃ کی تاکید و فرضیت کی نصوص اور ترک پر جو وعیدیں آئی ہیں ان کو دیکھیں سنیں غور کریں اور اس کا جو اصل سبب بخل ہے اس کا علاج مال کی محبت کا گھٹانا ہے. جس کی سب سے اچھی تدبیر موت کا بکثرت یاد کرنا اور یاد رکھنا ہے۔ اور اگر اس کوتاہی کا سبب زکوٰۃ کی فرضیت کا اعتقاد نہ ہونا ہے، گو ایسا شخص سنا نہیں گیا لیکن اگر نادر ایسا ہو تو اس کی اصلاح اپنے شبہات کا کسی محقق عالم سے رفع کرنا ہے اور اگر رفع نہ کیا اور منکر فرضیت رہا تو کافر ہے"۔

فرضیت کے صریح انکار کی مثالیں بلاشبہ نادر ہو سکتی ہیں، لیکن فرضیت کا اعتقاد مضمحل یقیناً بہت ہے، اور اس کی وجہ آج کل زیادہ تر نفس دین ہی کے اعتقاد کا اضمحلال ہے، تو اس کے فرائض و واجبات کا کیا ذکر یہی وجہ ہے کہ اہل ثروت میں کتنے ہیں، جن کو بخیل نہیں کہا جا سکتا۔ اور طرح طرح کے فضولیات میں خود اپنے اور دوسروں پر بے دریغ خرچ کرتے ہیں لیکن زکوٰۃ کا خیال ہی دل میں نہیں آتا۔ بالکل وہی حال جو نماز کا ہے کھیل کود فضول گپوں اور بیکار پڑے رہنے تک میں وقت گنوا دیں گے، لیکن دس پانچ منٹ کی نماز کو پہاڑ سمجھتے ہیں، جس کی وجہ خدانخواستہ اگر ایمان کا فقداں نہیں تو اس کے ضعف شدید یا اس کے واجبات سے شدید جہل و بے پروائی کے سوا کیا وجہ ہو سکتی ہے! حد یہ کہ راقم ہذا کے ایک عزیز یوں تو اپنی آمدنی کے ہر روپیہ میں سے ایک آنہ التزام کے ساتھ خیرات کرتے ہیں مگر زکوٰۃ کے باقاعدہ حساب و اہتمام پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے!

"بعضے زکوٰۃ دیتے ہیں مگر اس کا ٹھیک حساب نہیں رکھتے، یا بعض اموال کی دیتے ہیں اور بعض کی نہیں دیتے مثلاً چاندی سونا ہے کہ خواہ سکہ کی صورت میں ہو خواہ زیور کی صورت میں خواہ گوٹا پٹھا ہو خواہ ویسے ہی ٹکڑے رکھے ہوں خواہ پاس موجود ہو خواہ نہ ہو مگر اس کا وصول کرنا یا اس سے منتفع ہونا ممکن ہو، جیسے نوٹ لے لئے ہوں یا بینک میں ہو یا کسی کے ذمہ قرض ہو خواہ نقد خواہ کوئی چیز فروخت کی ہو اور وصول سے ناامیدی نہ ہو۔ البتہ قرض میں یہ اختیار ہے کہ خواہ پہلے دیتا رہے یا جب وصول ہو، لیکن وصول

ہونے پر تمام گذشتہ ایام کی بھی دینا پڑے گی۔ دوسرا مال تجارت ہے، اور مال تجارت وہ ہے، جس کے خریدتے وقت نیت ہو کہ ہم اس کو بیچیں گے خواہ منقولات میں سے ہو یا غیر منقولات میں سے۔ تیسرا مال وہ مواشی ہیں جن کو نسل بڑھانے کے لئے پالا ہو جیسے بعضے لوگ بکریاں گائیں وغیرہ اس غرض سے پالتے ہیں۔ چوتھا مال عشری زمین کی پیداوار ہے۔ عشری زمین کی حقیقت یہ ہے کہ جو اس وقت مسلمان کی ملک ہو اور اس کے قبل اس کا کسی کافر کی ملک میں آنا معلوم نہ ہو.......... ایسی زمین عشری ہے اس میں جو کچھ پیدا ہو.......... سب میں زکوٰۃ واجب ہے اس زکوٰۃ کو عشر کہتے ہیں اور ہندوستان میں اس سے بڑی غفلت ہے"۔

زکوٰۃ کے بعض مسائل و جزئیات ذرا نازک ہیں، جن میں سے بعض کا مثالاً حضرت نے اس سلسلہ میں ذکر بھی فرما دیا ہے، مگر جن لوگوں پر زکوٰۃ واجب ہو، ان کو یا تو کسی معتبر کتاب سے کام لینا چاہئے یا کسی مستند عالم سے دریافت کرتے رہنا چاہئے۔ کتابیں گو اردو میں بھی موجود ہیں، تاہم ان میں بھی اگر کہیں شبہ ہو یا کوئی مسئلہ مذکور نہ ہو تو وہ واقف و مستند عالم سے ضرور معلوم کر لینا چاہئے۔ جس کو دین کا اہتمام اور زکوٰۃ کی فرضیت کا ادراک ہو گا اس کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔

حرام مال میں بھی زکوٰۃ ہے: زکوٰۃ سے بچنے کے لئے یہ عذر بھی صحیح نہیں کہ فلاں مال حلال نہیں "حرام مال جب اپنے مال میں مل گیا تو وہ ملک میں داخل ہو گیا۔ گو ملک خبیث ہی ہو، اور وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک ہونا شرط ہے طیب ہونا شرط نہیں۔ طیب ہونا مقبولیت کی شرط ہے۔ سو زکوٰۃ واجب ہو گئی قبول نہ ہو گی۔ پھر دینے سے کیا فائدہ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نہ دینے سے جو عذاب ہو گا اس سے محفوظ رہے گا۔ اور قبول نہ ہونے سے عذاب نہیں ہوتا بلکہ ثواب سے محرومی رہتی ہے۔ تو کیا عذاب نہ ہوا اور ثواب نہ ہوا دونوں ایک بات ہیں۔ البتہ خود کسب حرام کا جو عذاب ہے وہ الگ ہے۔ لیکن نہ دینے سے دو عذابوں کا مستحق ہو گا کسب حرام کا الگ اور زکوٰۃ نہ دینے کا الگ اور اب ایک ہی ہو گا"۔

ایک اور کوتاہی: یہ ہے کہ بعضے لوگ زکوٰۃ کے روپیہ یا غلہ کا کھانا پکوا کر مساکین کو دعوت میں کھلا دیتے ہیں سو سمجھ لینا چاہئے کہ اگر کھانا پکوا کر ان کے ہاتھ میں دے دیا جائے کہ ان کو اختیار ہو لے جانے کا یا بیٹھ کر کھا لینے کا اور اس کی ان کو اطلاع کر دی جائے اور وہ کھانا قیمت میں زکوٰۃ کے بقدر ہو تب تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ مثلاً ایک شخص کو ۲۰ روپیہ زکوٰۃ کے دینا ہیں مگر کسی وجہ سے خواہ کوئی جنس خریدنے میں ٹھگا گیا یا مزدوری زیادہ دے دی یا کھانا بگڑ گیا غرض کسی طور پر یہ تیار کھانا اگر بیس روپیہ کا نہ ہو بلکہ سترہ اٹھارہ کا ہوا تو یوں نہ کہیں گے کہ اس نے بیس خرچ کر دیئے اس لئے پوری زکوٰۃ ادا ہو جانا چاہئے، بلکہ یوں کہیں گے کہ مساکین کو سترہ اٹھارہ ہی روپے پہنچے، اس لئے دو یا تین روپے اور باقی بچے۔ اسی طرح زکوٰۃ کی رقم کا کپڑا خریدا اور سلوایا اگر وہ بعد تیاری اتنی رقم کا ہے تب اس کے دینے سے پوری زکوٰۃ ادا ہو گی اور اگر کسی وجہ سے اس کی قیمت گھٹ گئی مثلاً ناواقفی سے کپڑا گراں لیا یا سلوانے میں بگڑ گیا تو گھٹنے کے بقدر اور زکوٰۃ دینا پڑے گی"۔

ایک اور کوتاہی: یہ ہے کہ بعض آدمی دیکھتے ہیں کہ ہم کو پانچ روپیہ زکوٰۃ دینا ہیں اور فلاں غریب آدمی پر ہمارا قرض یہی پانچ روپیہ ہے لاؤ اس کو زکوٰۃ کی نیت سے معاف کر دیں سو یاد رکھا جائے کہ اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ کیونکہ زکوٰۃ میں تملیک کامل شرط ہے۔ البتہ ایک تدبیر اور جائز ہے کہ پہلے یہ پانچ روپیہ اس کو بہ نیت زکوٰۃ دے دے، جب وہ ان کا مالک و قابض ہو جاوے اس سے اپنا قرض مانگ لے اگر نہ دے جبراً چھین لینا جائز ہے"۔

حج کا معاملہ: اب ارکان کی کوتاہیوں میں حج کا معاملہ رہ گیا۔

"عملی کوتاہی تو یہ ہے کہ اس کے ادا کرنے میں لوگ سستی بہت کرتے ہیں وہمی ضروریات و خیالی تعلقات سے فارغ ہونے کے منتظر رہتے ہیں کہ فلاں کام سے فارغ ہو کر چلیں گے پھر اس کام کے بعد دوسرے کام کا انتظار رہتا ہے یہ سلسلہ عمر بھر منقطع نہیں ہوتا (اکثر حج رہ جاتا ہے)۔

ہر شبے گویم کو فردا ترک ایں سودا کنم　　باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

"اس کا علاج یہی ہے کہ بیچ ہی میں سارے کام چھوڑ کر اور ظاہر سرسری طور سے ان کا انتظام کر کے اور باطناً خدا تعالیٰ کے حوالہ کر کے چل کھڑا ہو۔ اور اس علاج کی ہمت باندھنے کے لئے ان وعیدوں کو یاد کرے جو باوجود فرضیت کے اسکے ترک پر آئی ہیں قرآن مجید میں تو ایسے ترک حج کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے اور حدیث شریف میں یہودیت و نصرانیت کی حالت پر موت آجانے کی برابر بتلا گیا ہے۔ اس سے زیادہ کیا وعید ہوگی"۔

علمی کوتاہیاں: باقی علمی کوتاہیوں میں کچھ کا تعلق عین دوران حج کے مسائل سے ہے. جو کام علماء کو بھی ۔روقت مستحضر نہیں رہتے، اس لئے علماء اور غیر علما سب کو مناسک حج کی کوئی معتبر کتاب ساتھ رکھنا اور پڑھتے سنتے رہنا چاہئے یا واقف کار علماء سے پوچھتے رہنا چاہئے۔ اور مطوف بھی ایسے علماء سے دریافت کر کے مقرر کرے جو حج کر آئے ہیں ورنہ بعض مطوف بھی قابل اعتبار نہیں ہوتے، جس کی بدولت ایسی غلطیاں ہوتی ہیں کہ حج ہی فاسد یا مثل فاسد کے ہو جاتا ہے۔ لوگ اکثر مطوفین کو دنیوی آسائش کے لئے مقرر کرتے ہیں حالانکہ دینوی حوائج تو کسی نہ کسی طرح پورے ہو ہی جاتے ہیں زیادہ ضرورت تو دینی حاجت کے انتظام کی ہے، جس کے لئے اتنا بڑا سفر اور اتنے کثیر مصارف برداشت کئے جاتے ہیں۔

"دیگر علمی کوتاہیوں میں ایک یہ ہے کہ بعض لوگ سفر حج کو اس وقت فرض سمجھتے ہیں جب مدینہ منورہ کے سفر کے لئے بھی وسعت ہو.......... یہ سخت غلطی ہے مدینہ طیبہ کا سفر ایک مستقل طاعت ہے خواہ واجب ہو خواہ مستحب علی اختلاف الاقوال.......... اگر کوئی صرف حج کی استطاعت رکھتا ہو اور سفر مدینہ کی نہ رکھتا ہو اس کے ذمہ حج فرض ہے۔ نہ کرے گا تو تمام ان وعیدوں کا مستوجب ہو گا جو ترک حج پر آئی ہیں باقی حج کے بعد اگر کچھ سامان سفر مدینہ کا ہو جائے یا پیادہ چلنے کی ہمت ہو، جیسا شوق کے غلبہ میں ہو

جاتا ہے تو اس شرف کو بھی حاصل کرے ورنہ سردست واپس آجائے اور عزم رکھے کہ خدا توفیق دیگا تو مستقل سفر مدینہ کا کروں گا۔ اور اگر عمر بھر سامان نہ ہو تو انشاء اللہ تعالیٰ اس تمنا و عزم کا اجر بھی اس سفر مبارک کے قریب قریب ہی ہو گا، جیسا کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خیر کی نیت بھی اجر میں مثل فعل خیر ہی کے ہے"۔

ادا و قبول کا دقیق فرق: حرام مال سے استطاعت کی صورت میں حج کی فرضیت کا وہی معاملہ ہے، جو اوپر زکوٰۃ کی فرضیت کا معلوم ہو چکا کہ حج فرض ہو جائے گا اور ادا بھی البتہ قبول نہ ہو گا۔

"یعنی اس شخص پر یہ مواخذہ نہ ہو گا کہ حج کیوں نہیں کیا گو یہ مؤاخذہ ہو کہ مال حرام کیوں جمع کیا اور اس سے کیوں منتفع ہوا سو ادا ہونا اور چیز ہے اور قبول ہونا دوسری چیز۔ اگر قبول ہونا بھی چاہتا ہے اور بجز اس مال حرام کے اس کے پاس اور کچھ نہ ہو تو ایسا کرے کسی کافر سے قرض لیکر اس کو حج کیلئے الگ رکھے پھر خواہ وہ قرض تھوڑی ہی دیر بعد اس مال حرام سے ادا کر دے تو یہ قرض لیا ہوا روپیہ اس کی بہ نسبت غنیمت ہو گا .... اور اس تدبیر بتلانے کا یہ مطلب نہیں کہ ایسا کرنے کے بعد حرام مال جمع کرنے کا گناہ اتر گیا وہ گناہ اب بھی باقی ہے اور اس کا تدراک اب بھی واجب ہے"۔

دیگر کوتاہیاں: "ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ جن کے پاس نہ تو حج کا سامان ہے نہ قلب میں غناد قوت توکل مگر لوگوں سے بھیک مانگ مانگ کر ان کو پریشان کر کے حج کو جاتے ہیں۔ سو اس طرح حج کرنا حرام ہے۔ ایک کوتاہی بعض عورتوں کی ہے کہ باوجود شوہر یا محرم کے ہمراہ نہ ہونے کے حج کو چلی جاتی ہیں۔ اور گو بعض آئمہ کے قول پر بعض خاص قیود و شرائط کے ساتھ اس کی گنجائش ہے، لیکن اول تو عوام کو ایسی بے قیدی کی اجازت نہیں کہ جس وقت جس کا قول دل چاہا لے لیا۔ دوسرے جانے والیاں ان قیود و شرائط کو نہ جانتی ہیں نہ ان کی پروا کرتی ہیں، ہر حال میں چلی جاتی ہیں، جو ان آئمہ کے نزدیک بھی ناجائز

ہے۔ تیسرے اس وقت اتنا فساد تھا ثقہ عورتوں کے ساتھ امن غالب اور اس زمانہ میں فساد اس قدر غالب ہے کہ عورتوں کے ہوتے ہوئے بھی شریر طبیعتیں شرارت سے نہیں چوکتیں۔ باقی استطاعت کی صورت میں ایسی عورتوں پر بعض فقہا کے نزدیک حج بدل کی وصیت واجب ہے اور بعض کے نزدیک نہیں، لیکن احتیاط اسی میں ہے، کہ وصیت کر دے اگر ورثہ نے وصیت پوری نہ کی تو گنہگار نہ ہو گی"۔

ایک اشنع واقبح کوتاہی: "ایک کوتاہی جو باعتبار تعدیۂ ضرر کے سب سے اشنع واقبح ہے کہ بعض لوگ حج کر کے آتے ہیں اور وہاں کے مصائب اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والا حج کو جانے سے ڈر جائے۔ ایسے شخص کے یصدون عن سبیل اللہ کے مصداق ہونے میں کیا شبہ اور اگر وہ شکایات یا ان کے بعض اجزا غیر واقعی ہوں .... تو یہ لوگ یصدون عن سبیل اللہ کے ساتھ ویبغونھا عوجا کے بھی مصداق ہوں گے اور چونکہ باوجود علم واقعہ کے (اکثر) غصہ میں ایسا کرتے ہیں اس لئے انتم شھداء کے بھی مخاطب ہوں گے"۔

"اور آج کل تو زبانی کرنے سے بڑھ کر حج کے سفرناموں کا زور ہے جس کا یہ تعدیہ بطور "شر جاری" نسلھا نسل چلتا رہتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو مطوفین وغیرہ کی ہی طرح طرح کی شکایات سے غصہ نکالا جاتا ہے ہی حالانکہ "اگر مصائب واقعی بھی ہوں تب بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ محبوب کے دربار میں حاضری دینے کے لئے یہ سفر عشق ہے اور سفر عشق میں خار بھی گل، اور زاغ و زغن بھی بلبل معلوم ہوتا ہے"۔

قربانی میں کوتاہیاں: اس کے بعد قربانی کی بعض کوتاہیوں کے سلسلہ میں سب سے بڑھ کر خطرناک اس غلطی یا غلط فہمی کا ازالہ فرمایا ہے کہ

> "بعض اس کے عبادت ہونے ہی میں شبہ کرتے ہیں بالخصوص حج کی قربانی کو تو بوجہ کثرت ذبائح محض اضاعت مال ہی سمجھتے ہیں، ان کی اصلاح یہ ہے کہ علماء محققین سے اپنی تسلی مفصل شبہات پیش کر کے کرلیں۔ مجمل یہ ہے کہ عبادت کی حقیقت امتثال امر الٰہی ہے جب اس کا مامور بہ ہونا ثابت ہے پھر

عبادت ہونے میں کیا شبہ رہا۔ یہ سوال کہ اس امر الٰہی کی حکمت کیا ہو تو گو
ایسے سوالات کے جواب میں اس وقت خاص دلچسپی لیجاتی ہے، مگر سچا جواب
یہ ہے کہ ہم بانی قانون نہیں، جو قانون کی لم جاننے کا دعویٰ کریں، ہم
قانون کے صرف ناقل و حاکی ہیں۔ جب واضع قانون کے سامنے کھڑے کئے
جاؤ گے ہمت ہوگی پوچھ لینا۔ دفعات قوانین کی علل وکلا یا مجسٹریٹ و جج سے
پوچھنا سخت نادانی ہے اور ان کو جواب دینے کا حق ہے کہ واضعان قانون
سے پوچھو ہم اس کے بتلانے کے ذمہ دار نہیں، تو علما ایسے سائلوں کو ایسا
جواب کیوں نہیں دیتے۔ اسی طرح اضاعت مال کے شبہ کا جواب یہ ہے کہ
اضاعت اس وقت ہوتی جب اس میں کوئی فائدہ نہ ہوتا اور جب اس میں
رضائے حق ہے، جس کا مقابلہ کوئی فائدہ نہیں کر سکتا تو اضاعت کیسے
ہوئی"۔

ورنہ پھر تو ایک قربانی کیا معاذ اللہ سارا حج ہی سرے سے اضاعت ہے، کہ ہزاروں
لاکھوں آدمی ہزاروں میل کا سفر کر کے بظاہر چند رسوم ادا کرنے کیلئے وقت و قوت اور
لاکھوں کروڑوں کے مال کی اضاعت کرتے ہیں۔

"ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے وسعت والے قربانی تو کرتے ہیں مگر کوشش اس
کی ہوتی ہے کہ کوئی سستا حصہ مل جائے گو اس میں کچھ عیب بھی ہو، مگر ایسا نہ
ہو جو مانع جواز قربانی ہو۔ وجہ اس کی دو ہیں ایک بخل جس کا علاج اوپر گذر
چکا اور دوسرے یہ غلط خیال کہ قیمت کے بڑھنے یا مال کے عمدہ ہونے سے
ثواب میں زیادتی نہ ہوگی یا اگر زیادتی بھی ہوگی تو ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے
کہ بری الذمہ ہو جائیں۔ اس کی اصلاح یہ ہے کہ یہ خیال بالکل غلط ہے
جس قدر مال عمدہ ہوگا یا قیمت زیادہ ہوگی، ثواب زیادہ ہوتا جاوے گا لن
تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون اور لا تیمموا الخبیث منہ تنفقون ولستم
باخذیہ الا ان تغمضوا فیہ اور حدیث سمنوا ضحایاکم اور حضرت عمر رضی اللہ
عنہ کے متعلق تفسیر مظہری میں ہے کہ ایک ایسی اونٹنی ذبح فرمائی تھی، جس کے

تین سو دینار ان کو ملتے تھے"۔

"ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ محض نادار ہیں یا ان کے ذمہ ایسے حقوق العباد ہیں جن کا اداد ایفاء قرض مقدم ہے، مگر سب حقوق کو نظر انداز کر کے محض فخرو وضع بتانے کے لئے قربانی کی پابندی کرتے ہیں اور پاس نہیں ہوتا تو ادھار کرتے ہیں۔"

دیگر طاعات مالیہ میں کوتاہیاں۔ اس کے بعد وقف وغیرہ دیگر طاعات مالیہ میں جو عام کوتاہیاں ہوتی ہیں ان کی اصلاح فرمائی گئی ہے مثلاً وقف میں۔

"ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ اس کے مصارف میں محض بدعات و معاصی کو شریک کر دیتے ہیں، جیسے فلاں مزار پر عرس کیا جاوے، جس میں طرح طرح کی بدعات کثیرہ کا ہونا ظاہر ہے یا اس کی آمدنی کا ایک حصہ متعارف انگریزی تعلیم میں صرف کیا جائے، جس کا متضمن و مورث قبائح و مفاسد عظیمہ ہونا شاہد ہے"۔

حتیٰ کہ اب جو اوقاف حکومت کی نگرانی میں آگئے ہیں ان کی نسبت سنا کہ بعض ہمارے نام کے خود مسلمان لیڈر ہی اس فکر میں لگے ہیں کہ اگر واقف نے انگریزی تعلیم کے لئے وقف نہیں بھی کیا ہے، تو بھی اس کی منشا کے خلاف وقف کی آمدنی کو اس تعلیم کی اشاعت و ترویج میں صرف کیا جائے۔ ارشاد ہے کہ

"بعض کوتاہیاں متولی و منتظم کی طرف سے ہوتی ہیں۔ مثلاً بعضے وقف کی آمدنی اس کے مصارف میں نہیں صرف کرتے بلکہ اپنی رائے کی موافق جائز ناجائز سے قطع نظر کر کے جو چاہیں تصرف کرتے ہیں۔ بعض اوقات اس کی شرائط کی مخالف کی جاتی ہے۔ مثلاً واقف نے ایک جماعت کو مشیر قرار دیا ہے، مگر جس کا زور ہوا وہی قابض ہو کر مستقل و مستبد بن بیٹھا اگر واقف نے حساب داخل کرنے کی شرط لکھدی ہے اور کوئی دباؤ بھی پڑا تو فرضی حساب تصنیف کر لیا بعض وقت اپنی دنیوی اغراض کیلئے وقف کی مصلحت برباد کی جاتی ہے۔ بعض اوقات منتظم آمدنی خود ہی کھا جاتا ہے"۔

"بعض لوگ جو وقف کے مصرف نہیں ہیں وہ بھی اس سے انتفاع کرتے ہیں۔ مثلاً ایک مسافر خانہ خاص مساکین کے لئے ہے، مگر اس میں امراد اغنیا بھی بوجہ بخل کے قیام کرتے ہیں جو کسی طرح جائز نہیں"۔

"ایک کوتاہی بہت عام یہ ہے کہ وقف میں ہر قسم کے تصرفات کو جائز سمجھتے ہیں ...... جس میں اکثر دیندار لوگ تک مبتلا ہیں۔ مثلاً مسجد کے بدھنے میں مریض کے لئے پانی پڑھوا کر لے جاتے ہیں۔ پھر بعض دفعہ کئی کئی روز تک گھر ہی رکھا رہتا ہے۔ اگر فوراً ہی واپس آجائے تب بھی خود لے جانا ہی ناجائز ہے .... اس میں وہ بے احتیاطی بھی داخل ہے کہ بعض طلبہ مسجد کے لوٹے پنکھے اٹھا اٹھا کر حجروں میں رکھ لیتے ہیں یا بعض آدمی مسجد کے سقادہ سے گرم پانی وضو کے لئے گھر لے جاتے ہیں یا بعض آدمی مسجد کا فرش شامیانہ وغیرہ اپنے یا کسی دوسرے مدرسہ انجمن و مسجد کو ضرورت میں خلاف نیت معطی یا کچھ اینٹ چونا وغیرہ دوسری مسجد میں لگا دیتے ہیں کہ مسجد مسجد ایک ہے"۔ وغیرہ وغیرہ۔

طلبہ اور عوام کا ذکر ایک بڑے عربی و دینی مدرسہ میں دیکھا کہ مسجد کی چٹائی خود مدرسہ کے ایک ذمہ دار عہدہ دار عالم و بزرگ مہمان کے لئے بے تکلف کئی دن استعمال میں رہی۔ احقر کے ٹوکنے پر بھی خود مدرسہ کے بعض اساتذہ و علما کی نظر میں بھی اس کی اہمیت نظر نہ آئی۔

اصل یہ ہے کہ ان باتوں کو چھوٹی سمجھ کر زیادہ بے احتیاطی و بے پروائی کی جاتی ہے، جس کی بڑی وجہ دین یعنی خدا اور رسول کی عظمت کی کمی ہے، ورنہ جس کی جتنی دل میں زیادہ عظمت ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ ہم چھوٹی سے چھوٹی باتوں میں بھی اس کی خوشی و ناخوشی کا خیال رکھتے ہیں۔ اور مقدور بھر اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ اس کو ہماری کسی ادنیٰ فروگذاشت سے بھی اس کا احتمال نہ ہو کہ ہم کو اس کی خوشنودی کی پروا نہیں یہی تعلق اگر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو تو ان کی رضا و ناراضی کی چھوٹی بات بھی بڑی معلوم ہونے لگے۔

نذر میں کوتاہیاں۔ نذروں کے معاملہ میں بڑی کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ "بعض لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ جس فعل کی نذر مان رہے ہیں وہ شرعاً جائز ہے یا نہیں اور اسلئے بعض معاصی کی نذر کرتے ہیں مثلاً قبروں پر غلاف چڑھانا عرسوں میں جانا یا بطرق بدعت مولود شریف کرانا سو ظاہر ہے کہ ایسی نذر خود معصیت ہے اور اس کا ایفا جائز نہیں، بلکہ توبہ واجب ہے۔ اس کا علاج علم دین حاصل کرنا اور اہل حق کی صحبت اختیار کرنا ہے"۔

"ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ نذر کی تمام تخصیصات کو واجب ولازم سمجھتے ہیں۔ مثلاً یہ نذر کی دو روپیہ کی مٹھائی دوں گا یا مسجد میں بھیجوں گا یا اتنی رقم مکہ معظمہ بھجوا دوں گا یا رمضان میں خیرات دوں گا تو اس کا اہتمام کرنا کہ مٹھائی ہی ہو اور مسجد ہی میں جاوے یا مکہ معظمہ ہی بھیجے یا رمضان ہی کا انتظار کرے ضروی نہیں۔ بعض اوقات بعض تخصیصات پر آسانی سے قدرت نہ ہونے کی بدولت اصل نذر ہی ادا ہونے سے رہ جاتی ہے۔ مثلاً مکہ لیجانے والا نہ ملا اور اس میں موت آ گئی تو گنہگار مرا یا اگر تخصیصات پر قدرت بھی ہو، لیکن کسی وجہ سے دوسرا مصرف یا دوسری صورت افضل ہوئی تو التزام تخصیص میں اس فضیلت سے محروم رہتا ہے مثلاً اکثر مسجد میں مٹھائی بانٹنے سے افضل یہ ہوتا ہے کہ گھر بیٹھنے والے محتاجوں کو دو روپیہ نقد یا اس کا غلہ دیدیا جاوے"۔

فدیہ میں غلطیاں۔ صوم وصلوٰۃ کے فدیہ کے باب میں جو غلطیاں کی جاتی ہیں ان میں ایک

"نئی غلطی مگر بہت گندی غلطی یہ ایجاد کی گئی ہے کہ روزہ قضا ہو جاوے۔ تو باوجود صحت بدن کے سبھی اس کی طرف سے فدیہ دے دنیا کافی ہے روزہ رکھنا فرض نہیں اس کا بطلان احقر نے اچھی طرح رسالہ اصلاح ترجمہ دہلویہ کے متن میں مختصراً اور اس کے خاتمہ میں مبسوطا لبعبارت عربیہ کر دیا ہے، ملاحظہ فرمایئے، ایک یہ کہ بعض لوگ باوجود اس کے کہ وہ نمازیں قضا کر سکتے ہیں اور صحت سے بھی مایوس نہیں ہوتے لہٰذا صحت کے بعد روزے قضا کر سکتے ہیں پھر بھی ارزاں فدیہ کہ نسخہ یاد کر کے اس کو کافی سمجھتے ہیں سو سمجھ لینا چاہئے کہ قدرت یا امید قدرت کے ہوتے ہوئے فدیہ دنیا درست نہیں"۔

"خصوصاً نماز میں تو ایسی صورت مشکل ہی سے اور شاذ ہی پیش آتی ہے کہ سرے سے قدرت نہ رہ جائے اس لئے کہ "اگر رکوع سجود بھی نہ ہو سکے تو اشارہ ممکن ہے پس مرض میں بھی وقتیہ کو ادا اور فائتہ کو قضا کر سکتا ہے، اس کا فدیہ تو اس لئے جائز نہیں رہا روزہ تو جب تک صحت کی امید ہے بعد صحت بقدر زمانہ قدرت قضا کرنا واجب ہو گا۔ البتہ اگر ایسا مرض ہو گیا کہ صحت کی بالکل امید نہیں رہی یا ایسا بوڑھا ہو گیا کہ اب قوت کی بالکل امید نہیں رہی .... تو ان حالات میں زندگی میں بھی روزہ کا فدیہ دے دینا جائز کافی ہو گا"۔

"ایک کوتاہی وارثوں کی ہے کہ باوجود وصیت اور وسعت کے اس کی کچھ پروا نہیں کرتے (کہ مرنے والے کی طرف سے فدیہ ادا کر دیں) اور میت پر بوجھ رہتا ہے۔ حالانکہ ثلث کے اندر وصیت ترکہ پر بھی مقدم ہے۔ اس سے کم درجہ کی کوتاہی یہ ہے کہ اگر وہ بلا وصیت مر جائے تو اس فدیہ سے کم درجہ کے مصارف میں بلکہ فضول مصارف اور اس سے بڑھ کر یہ کہ معاصی میں میت کا ترکہ اڑاتے ہیں مگر اس طرف توجہ نہیں ہوتی کہ اور مصارف بند کر کے کچھ فدیہ میں دیدیں اور بعض فقہاء کے نزدیک مثل حالت وصیت کے اس سے بھی واجب کا اسقاط ہو جائے گا اور اگر واجب نہ بھی ساقط ہو تو نافع ہونا سب کے نزدیک یقینی ہے کہ میت کو اس کا ثواب ہی پہنچ جاوے گا اور کیا عجب ہے کہ وہ ثواب ترک واجب کے عذاب کو زائل کر دے"۔ (ص ۱۱۳)

نفل صدقات میں غلطیاں۔ ایک عجیب و شدید غلطی یہ ہے کہ بہت سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ اگر زکوٰۃ و فطرہ وغیرہ کے واجبات ادا کر دیئے جائیں تو پھر نفل صدقات اور کچھ خیر و خیرات اگر سرے سے اور کسی صورت و حالت میں بھی کئے جاویں تو کوئی گناہ یا مواخذہ کی بات نہیں حالانکہ

"ان کو نفل کہنا خصوصیات سے قطع نظر کر کے محض ان کی ذات کیوجہ سے ہے ورنہ عوارض و خصوصیات کے اعتبار سے وہ واجب ہی ہیں۔ پس واجبات کی مشہور فہرست مطلق واجب کی فہرست نہیں بلکہ ایسے واجبات موظفہ کی فہرست ہے جو فی نفسہ واجب ہیں عوارض و خصوصیات کو دخل نہیں، جیسے زکوٰۃ و صدقہ فطر وغیرہ کہ خواہ کوئی مستحق پیش نظر ہو یا نہ ہو مال میں سے مقدار خاص کا نکال دینا ضروی ہے۔ پھر مستحق کو تلاش کر کے اس کو پہنچانا ضروری ہے۔ دوسرے وہ واجبات ہیں کہ کوئی مستحق معلوم نہ ہو تو اس کو تلاش کرنا ضروری نہیں اعلیٰ مرتبہ میں وہ نفل ہے، لیکن اگر کوئی مستحق روبرو آجائے اور اس کی احتیاج مثلاً درجہ اضطرار تک ہو یا مصرف دینی پیدا ہو جائے اور اس کی تکمیل درجہ ضرورت تک ہو تو اس وقت خرچ کرنا واجب ہو گا کہیں علی الکفایہ کہیں علی العین۔ مثلاً کوئی مسافر محلہ کی مسجد میں اترے اور سب اہل محلہ اپنے گھروں میں کھائیں پئیں اور اس کو نہ پوچھیں تو سب گنہگار ہوں گے۔ اور اگر کوئی کھانا لیکر بیٹھا ہے اور کھانا اس کی حاجت سے زائد ہے اور ایسے میں کوئی بھوکا آگیا، جس کی جان بھوک سے نکلی جاتی ہے تو حضرت استاذی مولانا محمد یعقوب رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کیا کوئی اس کا قائل ہو سکتا ہے کہ اس شخص پر اس سائل کو بقدر ضرورت کھانا دینا واجب نہیں اور یہ وجوب اس وقت علی العین ہو گا۔ پس حاصل یہ ہوا کہ بعض صورتیں نفل صدقات کی بھی واجب ہیں"۔

خلاصہ یہ کہ صدقات واجبہ بالذات واجب ہیں اور نافلہ بالعرض بس اتنا ہی فرق ہوا دوسری طرف بعض لوگوں کو اس کے بالعکس کی کوتاہی میں اس قدر غلو ہوتا ہے کہ گو " حقوق واجبہ ضائع ہوں قرض خواہ روتے پھریں، مگر ان کو اس کا شوق ہے کہ کوئی سائل و مسافر محروم نہ رہ جائے۔ خاص خاص تاریخوں میں خاص صدقات قضانہ ہوں۔ اس پر بعض اوقات یہ خود بھی فخر کرتے ہیں اور دوسرے خود غرض لوگ یا بعضے بے غرض مگر کم فہم مدح بھی

کرتے ہیں۔ حالانکہ حدیث وابدء بمن تعول اس طریقہ کو ناجائز بتلا رہی ہے
کہ حقوق واجبہ خواہ اہل وعیال کے ہوں یا قرض خواہوں کے یہ ان نوافل
پر مقدم ہیں۔

بلکہ حضرت حکیم المجدد دین علیہ الرحمہ کی خاص حکیمانہ شان تجدید کی رو سے اس سے بھی
بڑھ کر یہ ہے کہ

"اگر کسی کے ذمہ کوئی حق واجب بھی نہ ہو، مگر اپنی طبیعت کے انداز سے
جانتا ہو کہ ناداری کا تحمل نہ کر سکے گا تو ایسے شخص کو بھی جائز نہیں کہ تمام
ذخیرہ مصارف خیر میں صرف کر کے خالی ہاتھ رہ جائے۔ جیسا کہ حدیث
افضل الصدقات ما کان عن ظہر غنی اس پر صاف دلالت کرتی ہے۔ اور
اکثر تو ایسے لوگ ریا و فخر کی راہ سے خرچ کیا کرتے ہیں، سو اس کا مذموم ہونا
ظاہر ہی ہے"۔

مزید مجددانہ و حکیمانہ تنبیہ چندہ جمع کرنے والوں کو فرمائی گئی ہے، کہ ایسے لوگ اگر
اپنی حیثیت سے زائد جوش میں آکر دینا چاہیں تو یہ حضرات نہ لیا کریں"۔ بھلا ان باتوں پر
کس کی نظر ایک حکیم النظر مجدد کے سوا جاتی ہے بلکہ ایسے ناعاقبت اندیش جوش میں آنے
والوں کی تو خوب خوب قصیدہ خوانیاں کی جاتی ہیں۔

"اور بعض اوقات تو باوجود گنجائش و تحمل کے بھی بعض سائلوں کو دینا بجائے
جائز و ثواب کے ناجائز و گناہ ہوتا ہے۔ فقہا نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر
سائل قوی مکتسب ہو یعنی ہاتھ پاؤں سے درست اور معاش کی قدرت
رکھتا ہو تو ایسے سائل کو مانگنا بھی حرام ہے اور دینا بھی۔ کیونکہ یہ اعانت علی
المعصیت ہے، تو ایسے دینے کی وہی مثل ہوگی کہ نیکی برباد گناہ لازم۔
اور اکثر تو بلا ٹالنے کے لئے دے دیتے ہیں ثواب کی نیت ہی نہیں ہوتی اس
صورت میں ثواب نہ ملنا اور بھی ظاہر ہے"۔

"پھر یہ سمجھ لیا کہ ہم پر سے بلا ٹل گئی، لیکن یہ نہ سمجھا کہ ہمارے دینے سے
سائل سمجھے گا کہ لپٹنے اور سر ہونے ہی سے ملا کرتا ہے، تو یہ سمجھ کر اور بھائی

مسلمانوں کو پریشان کرے گا تو اپنی بلا تو ٹالی مگر دوسروں کے سر ڈالی "۔
سبحان اللہ کہاں کہاں مجددانہ نگاہ جاتی ہے!
البتہ کسی قوی مکتسب کو بلا سوال دیدینے میں مضائقہ نہیں۔ یا بعض مواقع میں سوال بھی جائز ہوتا ہے مثلاً "بوجہ قرض کے یا کسی مقدمہ وغیرہ کے مالی بار اتنا پڑا کہ کمانے سے اتنا ذخیرہ نہیں ہو سکتا کہ روز مرہ کے حوائج پورے ہو کر اس بار سے سبکدوش ہو سکے، تو ایسا شخص سوال نہ کرے تو کیا کرے"۔

قرض لینے دینے کی کوتاہیاں۔ "بعض لوگ قرض دینے کو ثواب نہیں جانتے یا بخل و بے رحمی کی وجہ سے نہیں دیتے، حالانکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جنت کے دروازہ پر لکھا دیکھا کہ صدقہ دینے سے دس گنا ثواب ملتا ہے اور قرض دینے سے اٹھارہ گناہ۔ اور حدیث ہی میں اس کی وجہ بھی ہے کہ صدقہ تو وہ شخص بھی مانگ لیتا ہے جس کو حاجت نہ ہو مگر قرض حاجت بلکہ اضطراری حاجت کے بغیر کوئی نہیں مانگتا کہ اپنی گردن کون بندھائے۔ یعنی غالب عادت یہ ہے" (گو افسوس ہے کہ آج کل بالخصوص مسلمانوں کی عادت اس کے خلاف ہو رہی ہے کہ نفس حاجت یا حاجت اضطراری کا کیا ذکر بیاہ برات وغیرہ کے فضول بلکہ ناجائز مصارف کیلئے قرض مانگتے ہیں، جو دینے والے کو ثواب کیا الٹے اعانت معصیت ہوتی ہے۔ جامع)

"لیکن اس سے کوئی بھی یہ نہ سمجھ لے کہ قرض کا ثواب علی الاطلاق صدقہ سے زیادہ ہوتا ہے .... سو بات یہ ہے کہ مختلف احکام مختلف حیثیات سے ہوتے ہیں تو ایک حیثیت سے جس کا ذکر ہوا قرض کا ثواب زیادہ ہے مگر دوسری حیثیات سے صدقہ کا ثواب قرض سے زیادہ ہے۔ مثلاً قرض میں واپسی ہوتی ہے اور صدقہ میں واپسی نہیں ہوتی اس وجہ سے صدقہ لینے والے کے قلب پر کوئی بار نہیں رہتا"۔

البتہ اس زمانہ میں لوگ قرض لیکر دینے کی فکر کم کرتے ہیں "بلکہ بعض دیتے ہی نہیں یا بہت ٹال کر دیتے ہیں اور تقاضا کیجئے تو برا مانتے ہیں" جس سے

ایک طرف تو قرض محبت بڑھانے کی بجائے الٹے مقراض محبت ہو جاتا ہے، دوسرے قرض دینے والے حاجت و ضرورت پر دیتے گھبراتے ہیں، اس لئے تاکید فرمائی کہ "قرض لینے والے کو وصیت کرتا ہوں کہ اس کو چاہئے کہ قرض دینے کا احسان مانے اور اس کو تکلیف نہ دے وقت پر اس کی امانت پہنچادے تاکہ پھر بھی قرض لینے کا منہ رہے اور نادہندی کی بدولت اکثر آپس میں قرض نہیں ملتا پھر کافروں سے سودی لیتے ہیں اور تباہ ہوتے ہیں"۔ ص ۱۲۵)

عاریت کا معاملہ۔ قرض کی طرح کا ایک کار خیر اور ثواب کا کام

"کسی کو کوئی چیز عاریتاً دینا ہے۔ اس میں بھی بعض لوگ بہت بخل کرتے ہیں۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے اس میں بخل کو منافقین کا کام فرمایا ہے الذین ھم یراؤن و یمنعون الماعون۔ اور اس حکم میں وہ چیز ہے، جو بطور عاریت نہ مانگی جائے بلکہ بطور ملکیت ہی مانگی جائے مگر ہو بہت کم قیمت تولہ بھر نمک لوٹا بھر پانی ایک مٹھی گھانس اور عاریت جیسے دیگچی چمٹا قلم بنانے کو چاقو وغیرہ۔ البتہ اگر کوئی عذر ہو، جیسے ایک شخص کا تجربہ ہو گیا کہ وہ چیز لیکر نہیں دیتا یا خراب کر دیتا ہے یا بے پروائی سے کہیں ڈال دیتا ہے تو ایسے شخص سے انکار کر دینا جائز ہے لیکن کم قیمت چیز دینے سے کسی سے بھی انکار نہ کرے۔ ص ۱۲۶)

ایک بہت بری بات اکثر لوگوں میں صدقات و خیرو خیرات کے معاملہ میں یہ ہوتی ہے کہ "دیتے تو ہیں لیکن جس کو دیتے ہیں گویا اس کو خرید لینا چاہئے ہیں۔ یعنی اس کے منتظر رہتے ہیں کہ وہ ہمارا احسان مند ہو شکریہ ادا کرے جب ملے سلام کرے کچھ حکم دیں اس کو بجالائے۔ اور اگر ان باتوں میں کوتاہی ہو سخت تعب و ناگوار ہوتا ہے اور آئندہ کو احسان کا سلسلہ بند کر دینے کا ارادہ کر دیتے ہیں۔ بالخصوص اگر کسی معاملہ میں اس

کی طرف سے خواہ وہ حق ہی پر ہو صفائی کا برتاؤ ہو تو اس وقت تو کہنے لگتے ہیں کہ یہ بڑا نمک حرام ہے ہم نے اس طرح احسان اس کے ساتھ کئے اور اس نے ہمارا خیال نہ کیا۔ یہی وہ من واذی یعنی احسان جتلانا اور اس سے تکلیف پہنچانا ہے جس کی قرآن مجید میں ممانعت آئی ہے۔ اور ایسے دینے والوں کی مدح و فضیلت بیان فرمائی ہے، جو دیگر اس کا صلہ و شکریہ نہیں چاہتے۔ یہی لوجہ اللہ یعنی محض خدا کی خوشنودی کے لئے خدمت کرنا ہے جیسا کہ فرمایا کہ انما نطعمکم لوجہ اللہ لانرید منکم جزاء ولا شکورا"۔

سفر کی کوتاہیاں: تجدید و اصلاح کی کیا جامعیت و ہمہ گیری ہے کہ کسی معاملہ میں کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی، جو اصلاح طلب ہو اور حضرت جامع المجدد دین کی نظر نہ پڑی ہو۔ ایک مستقل عنوان "اصلاح بمعاملہ سفر" کا ہے جو ایک معمولی روزانہ کی حالت ہے، جس کی وجہ سے اس کے انقلاب کی طرف ذہن نہیں جاتا۔ مگر ہماری بے علمی، بدعلمی سے اتنا خفیف امر بھی انقلاب سے محفوظ نہیں رہا ہے۔

"سو منجملہ ان کوتاہیوں کے جو سفر کے متعلق ہیں ایک یہ ہے کہ بکثرت سفر بلا ضرورت کیا جاتا ہے، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں ناپسند فرمایا کہ جب سفر میں تمہاری حاجت پوری ہو جائے تو گھر جلدی لوٹ آؤ اس واسطے کہ سفر سے کھانے پینے سونے میں خلل پڑتا ہے۔ جب سفر میں بلا ضرورت رہنا پسند نہیں تو بلا ضرورت سفر کرنا تو بدرجہ اولیٰ ناپسند ہو گا اور جس طرح سفر میں طبعی آسائش میں خلل پڑتا ہے، اسی طرح شرعی یعنی دینی معمولات میں بھی۔ اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ ایک حدیث میں ہے کہ اگر مرض یا سفر سے معمولات میں خلل پڑتا ہے تو حق تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ میرے بندہ کے لئے اتنا ہی ثواب

لکھنا جتنا حالت صحت و حضر میں لکھتے تھے۔ کیونکہ یہ اس سفر کے لئے ہے جو بضرورت ہو۔ نہ کہ جو محض بلا معتد بہ مصلحت کے کیا جائے۔ مثلاً صرف تعطیل پوری کرنے کا یا محض شہروں کی سیر کرنے کو یا تماشہ دیکھنے کو یا اس سے بڑھ کر اور کسی معصیت کیلئے۔

"البتہ دینی ضروریات سفر اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یا ایسی دنیوی ضروت جیسے معاش حلال کی تلاش کے لئے یا تعدیل مزاج کے لئے جبکہ کہ طبیب نے تجویز کیا ہو یا کسی دوست و عزیز سے ازدیاد محبت و سرور کیلئے یا کسی نافع تحقیق کے لئے بشرطیکہ اس میں غلو نہ ہو، جیسا بعض شائقان تحقیقات جدیدہ کو غلو ہو گیا ہے، جن کی مساعی شاقہ کوہ کندن کاہ بر آوردن کا مصداق ہوتی ہیں جن کی مذمت اس آیت میں ہے کہ کم اھلکنا قبلھم من قرن ھم اشد منھم بطشا فنقبو افی البلاد۔

"اور جب بلا ضرورت سفر مذموم ہے تو معصیت کیلئے تو بہت ہی قبیح ہو گا جیسے ناچ رنگ دیکھنے یا کسی نامشروع شادی میں شریک ہونے کیلئے سفر کرنا۔ اور بعض امور عوام کے نزدیک طاعات و قرب ہیں، مگر اہل علم کے نزدیک معصیت ہیں جیسے آج کل عرسوں میں جانا یا مزارات پر نذر و نیاز کے لئے حاضر ہونا۔ یہ عوام کے نزدیک مباح ہیں مگر اہل علم کے نزدیک قبیح ہیں، جیسے ان شادیوں باراتوں میں شریک ہونا جن میں ناچ رنگ وغیرہ نہ ہو، لیکن تفاخر و ناموری کے سارے کام ہوں عوام تو یہ سمجھ کر تسلی کر لیتے ہیں کہ اس میں ناچ رنگ نہیں گناہ کی کیا بات ہے، لیکن اہل علم کے نزدیک جس طرح یہ امور معصیت ہیں اسی طرح کبر و فخر و ریا و جاہ کا سامان بھی سب معصیت ہے"۔

ریا حلال شمارند و جام بادہ حرام
زہے شریعت و ملت زہے طریقت و کیش

(ص ۱۴۳)

پھر اس فخر و نمائش کا تو یہ غلبہ ہے، کہ شادی وغیرہ کی کوئی تقریب کیا دو چار آدمیوں کی معمولی دعوت بھی شاید ہی اس مرض سے پاک ہوتی ہے ایک اچھے اہل علم دوست اور مشہور شیخ کے پوتے کی صاحبزادی کے عقد میں شرکت کا موقع ہوا تو دیکھا کہ جہیز کا سارا سامان باقاعدہ صحن میں محض اس لئے مرتب کر کے جمایا گیا کہ لوگ آ آ کر دیکھیں یہ نہ بھی ہو تو دور دور سے سفر کے شادیوں میں ہونے کی بھی شادی ہی کو سند واصل مل سکے۔

ایک بڑی دقیق مثال۔ ایک مثال اور ایسے امور دقیقہ کی ہے جن کو بعض اہل علم بھی مباح یا قربت سمجھتے ہیں، مگر محققین راسخین اس کو روکتے ہیں۔ نفل حج کے لئے سفر کرنا ظاہراً قربت معلوم ہوتا ہے، مگر بعض اشخاص کے خاص حالات سے محقق کو اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا حج کرنا اسلئے مضر ہو گا کہ یا تو اس سے فرض نمازوں کی پابندی نہ ہو گی یا اہل و عیال کے حقوق واجب ضائع ہوں گے یا قلت زاد راہ کے سبب تکلیفیں اٹھاوے گا اور قلب میں بیت اللہ یا صاحب البیت سے شکوہ پیدا ہو گا یا سوال حرام میں مبتلا ہو گا و نحو ذالک۔ اسلئے وہ محقق ایسے شخص کو حج سے منع کرتا ہے"۔

"ایک محقق کا یہاں تک قول ہے کہ اگر کسی شخص کو شریعت سفر حج کی اجازت نہ دے اور قرائن قویہ سے یہ معلوم ہو کہ اگر وہاں کے حالات اس شخص کے سامنے بیان کئے جاویں گے تو اس قدر شوق ہو گا کہ یہ اضطراً چل کھڑا ہو گا تو ایسے شخص کے سامنے ایسے شوق انگیز حالات بیان کرنا تک جائز نہیں" واقعی ایسے وقائق پر محققین و راسخین ہی کی نظر پڑ سکتی ہے ورنہ ع

نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

دوران سفر کی زیادتیاں۔ مزید بر آں دوران سفر جو زیادتیاں ہوتی ہیں، ان کی بھی بعض مثالیں بیان فرمائی گئی ہیں مثلاً ریل میں روز یہ ظلم ہوتا اور دیکھا جاتا ہے کہ

"اکیلا آدمی یا دو آدمی مل کر کئی کئی آدمیوں کی جگہ گھیر لیتے ہیں کچھ خود پھیل کر کچھ اسباب و بستر پھیلا کر اور نئے آنے والوں کو اکثر تو آنے ہی نہیں

دیتے طرح طرح کے حیلے کرتے ہیں، کبھی زور و ظلم سے کام لیتے ہیں اور اگر وہ چلے ہی آئے تو بیٹھنے کی جگہ نہیں دیتے۔ کئی کئی اسٹیشن وہ کھڑے کھڑے قطع کرتے ہیں اور ان کو ذرا رحم و مروت نہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ اگر ہم ان کی جگہ ہوتے اور وہ ہماری جگہ تو ہم ان سے کس معاملہ کے متمنی ہوتے اور نہ سوچتے ہیں کہ یہ شرعاً بھی جائز نہیں"۔

"بعض آدمی ایسی حرکت کرتے ہیں جس سے دوسروں کو اذیت ہوتی ہو مثلاً شب کے وقت غل مچانا باتیں کرنا یا گانا بجانا کوئی اور بیہودہ ہنسی مذاق کرنا۔ چاہئے کہ یہ دوسروں کو راحت پہنچائے اور اگر اس کی توفیق نہ ہو تو کم از کم اس پر تو عمل رکھیں کہ مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں"۔

بعض دفعہ راقم ہذا کو طویل سفر میں سکنڈ کلاس تک کے ایسے بھلے مانسوں (جنٹلمنوں) سے سابقہ پڑا کہ جن کی اس قسم کی حرکتوں سے قریباً ساری رات بے چینی میں کروٹیں بدلتے گذری۔ ایک آدھ بار ٹو کا بھی تو اس "مولوی صورت" کا "مہذب" مذاق اڑایا گیا!

"بعض آدمی مزدور یا قلی کی مزدوری نہیں ٹھہراتے پھر بعض تو بلا کسی ضابطہ کے جو جی میں آیا دیدیا خواہ دوسرا راضی ہو یا نہ ہو اس کا ظلم ہونا تو ظاہر ہے اور بعض اپنے زعم میں ضابطہ کی پابندی کرتے ہیں یعنی قواعد کے موافق دے دیتے ہیں۔ اسی طرح گاڑی وغیرہ کا کرایہ گھنٹوں کے حساب سے دینے کو کافی سمجھتے ہیں (اور بعد کو اکثر لڑائی جھگڑے تک نوبت آتی ہے) سو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ عقد اجارہ میں خود مزدور یا مالک کی رضامندی شرط ہے۔ کوئی ضابطہ مقرر ہو جانا شرعاً کافی نہیں"۔

"البتہ اس سے منتفع ہونے کی ایک صورت ہے جو شرع کے موافق ہے کہ پہلے ہی سے کہہ دیا جائے کہ دیکھو ہم ضابطہ کے موافق دیں گے، اس کے بعد جب اس نے کام شروع کر دیا یا سواری میں بٹھایا اب وہ اس کے حق میں حجت و لازم ہو گیا"۔

حق یہ ہے کہ اگر سفر و حضر میں اس طرح قدم قدم پر شریعت کا اتباع ہو تو دنیا بھی کچھ نہ کچھ جنت بن جا سکتی ہے اور بات بات میں شر و فساد کی جگہ، جو موجودہ تہذیب و تمدن کا خاصہ ہے، کتنا امن و امان پھیل جاسکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ دین کو چھوڑ کر انسان نے دنیا ہی کو اپنے ہی لئے جہنم بنالیا ہے۔ مگر جب خود مسلمان ہی اپنے گھر کی اس سراپا راحت تہذیب سے اجنبی ہوگئے تو اجنبیوں سے کیا گلہ!

دیانات میں غلطیاں: "یہ غلطیاں تو معاملات کے متعلق تھیں جو سفر میں ہوتی ہیں بعض غلطیاں دیانات کے متعلق ہوتی ہیں مثلاً بعض آدمی سفر میں نماز ہی چھوڑ دیتے ہیں اور جی کو سمجھاتے ہیں کہ وضو نماز میں بڑی مشکلیں پڑتی ہیں .... بعض نماز تو پڑھتے ہیں لیکن شرائط دار کان کی پروا نہیں کرتے۔ کوئی تیمم ہی کر رہا ہے حالانکہ پانی اسٹیشن پر یا نل میں موجود ہے مگر طبیعت قبول نہیں کرتی کہ وہ پانی پاخانہ کا ہے گویا اس میں پاخانہ ملا ہوا ہے۔ غضب ہے شریعت کے ہوتے ہوئے طبیعت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ بعض آدمی کھڑے ہو کر نہیں پڑھتے گو کھڑے ہوسکتے ہیں سو ان کی نماز بھی نہیں ہوتی۔ البتہ اگر قیام پر قدرت نہ ہو یعنی کسی سہارے سے بھی کھڑے نہ ہو سکیں۔ تب البتہ بیٹھ کر پڑھنا درست ہے .... اسی طرح اگر آدھی قرآت میں کھڑا ہو سکتا ہے یا بقدر تکبیر تحریمہ کھڑا ہو سکتا ہے تو اتنا ہی کھڑا ہونا فرض ہے۔ بعض آدمی گو کہ جماعت کر سکتے ہیں پھر بھی تنہا تنہا پڑھ لیتے ہیں۔ اگر دو ہی دو آدمی جماعت کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں تب بھی جماعت کرلیں۔ اگر آواز میں تزاحم نہ ہو تو ایک ہی وقت میں مختلف جگہ ورنہ یکے بعد دیگر اور چونکہ یہ محلہ کی مسجد نہیں، اس میں تکرار جماعت کا اختلاف نہ ہوگا۔

بعض اور کوتاہیاں: "بعض لوگ سفر میں جاکر گھر والوں کو ایسا بھولتے ہیں کہ اپنی خیریت تک کی اطلاع نہیں دیتے اور وہ پریشان ہوتے ہیں کیونکہ سفر میں ہزاروں حوادث ہوتے ہیں۔ یا بعض اپنی واپسی کے وقت کی اطلاع کر دیتے ہیں لیکن بلا کسی خاص مجبوری کے بھی وقت پر پہنچنے کا اہتمام نہیں کرتے، اس سے بھی گھر والوں کو پریشانی ہوتی ہے، کہ خدا جانے کیا بات ہے اور بعض باوجود اطلاع کر سکنے کے بلا کسی مصلحت کے دفعتہً گھر

آجاتے ہیں۔ حالانکہ احادیث میں اس کی بھی مانعت ہے جس کی حکمتوں میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ شریف عورتیں شوہر کے گھر پر نہ ہونے کی وجہ سے زیب و زینت چھوڑ دیتی ہیں، سوا ایسا نہ ہو کہ مبتذل حالت میں دیکھ کر اس کو نفرت ہو جاوے"۔ (ص ۱۵۵)

سفر آخرت کی کوتاہیاں: یہ تو دنیا کے معاملات سفر میں ہماری طرح طرح کی کوتاہیوں کا "مشتے نمونہ از خروارے" تھا اب اسی سلسلہ میں ذرا سفر آخرت کے معاملہ میں ہماری غفلتوں کا کچھ حال سن لیجئے، جس میں مرض پھر موت اور پھر بعد از موت جو کوتاہیاں ہوتی ہیں ان کا اور ان کی اصلاح کا بیان ہے۔

"مثلاً مرض میں ایک کوتاہی یہ ہے کہ بوجہ غایت ترحم مریض کو نماز کے وقت کی اطلاع نہیں دیتے بعض مریض خود جاہل یا کاہل ہوتے ہیں۔ مگر پہلے سے پابند ہوں مگر مرض میں (یا تو اس وسوسہ سے کہ کپڑے خراب ہیں بدن ناپاک ہے یا وضو و غسل نہیں کیا جاتا اور تیمم کو دل نہیں چاہتا و مثل ذالک نماز قضا کر دیتے ہیں۔ یہ تو جہل ہے یا کم ہمتی ہوتی ہے کہ اب تیمم کا یا رخ سیدھا کرنے کا اہتمام کون کرے (اگرچہ وہ تحمل سے زائد نہ ہو) اور دل کو سمجھا لیتے ہیں کہ اچھے ہو کر سب نمازیں پوری کرلیں گے۔ اس کاہلی کا علاج یہ ہے کہ ان کو سمجھایا جائے کہ شریعت نے ہر حال میں آسانی کی ہے اکر کپڑا یا بدن ناپاک ہے اور ان کو پاک کرنے میں زیادہ تکلیف نہیں تو آخر تھوڑی بہت مشقت تو ہر کام میں ہوتی ہے بعض وقت دوا پینے اور کروٹ بدلنے تک ہیں مشقت ہوتی ہے، مگر صحت بدن کیلئے اس کو گوارا کرلیتے ہیں، تو نماز کی روحانی مصلحت کیلئے جو بدن سے مقدم ہے اگر کسی قدر مشقت برداشت کرلی جائے تو کیوں گرانی ہوتی ہے۔

"اور خیال کہ اچھے ہو کر قضا پڑھ لیں گے نہایت جرات کا خیال ہے۔ کیا کوئی ان کے پاس پروانہ ہے، کہ اس مرض سے ضرور اچھے ہو جائیں گے بلکہ مرض میں کہ ہر مرض پیام موت ہے آدمی کو آخرت کی طرف زیادہ توجہ

چاہئے کہ شاید ہمیں نفس نفس واپسین بود۔ "

بعضوں کی نیند کے غلبہ یا ضعف کی وجہ سے آنکھیں بند ہوجاتی ہیں اور نماز کے وقت کی خبر نہیں ہوتی "لیکن اگر ان کو آگاہ کر دیا جائے تو ہرگز کوتاہی نہ کریں۔ مگر اوپر کے لوگ مریض کی راحت کے خیال سے اطلاع نہیں کرتے یا اس کو اطلاع ہوگئی تو تیمم وغیرہ میں مدد نہیں کرتے۔ ان کو سمجھنا چاہئے کہ جس عزیز کی معمولی سی تکلیف گوارا نہیں اس کے دوزخ میں جلنے کی تکلیف کیسے گوارا کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ خود اپنی کیسے گوارا کریں گے اس لئے کہ یہ تعاون فی الدین واجب ہے اور یہ بالید امر بالمعروف کی ایک فرد۔ہے "۔

"بعض مریض یہ بے احتیاطی کرتے ہیں کہ باوجود یہ کہ وضو سے کوئی ضرر نہیں پھر بھی تیمم کر لیتے ہیں۔ بعض دفعہ اوپر کے لوگ روکتے ہیں کہ میاں تیمم کر لو شرع میں آسانی ہے۔ بعض دفعہ نماز ہی میں باوجود قدرت ضبط کے کم ہمتی سے کراہتے ہیں۔ "

"بعض ان ظاہری بے احتیاطیوں کے مقابل میں ایک دقیق بے احتیاطی کرتے ہیں، جو ان کے زعم میں بڑا تقویٰ ہے کہ خواہ کچھ ہی مصیبت ہو کیسا ہی مرض بڑھ جائے خواہ مر ہی جاویں مگر تیمم جانتے ہی نہیں وضو ہی کریں گے۔ سو اس غلو کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ نے تیمم وغیرہ کی آسانی کا ایسا حکم دیا جو واقع میں ناقص ہے، اسلئے ہم اس کو قبول نہیں کرتے۔ تو اصل میں شیطان کے مردود ہونے کا سبب بھی اس کا یہی خیال تھا، کہ حق تعالیٰ کا حکم مناسب نہیں اسلئے عمل نہیں کیا۔یہ تو عقیدہ کی معصیت ہوئی۔ اور اگر وضو سے نہیں ضرر پہنچ گیا تو اہلاک نفس کی عملی معصیت ہوگی۔ لیس من البر الصیام فی السفر وغیرہ احادیث اس کی دلیل ہیں۔ خوب فرمایا کہ

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا   ولیکن میفزائے بر مصطفیٰ

ایک بڑی کوتاہی. دواعلاج کے متعلق کی جاتی ہے کہ حلال و حرام طاہر و نجس ہونے کی کچھ پروا نہیں کی جاتی خصوصا امرا کے ہاں برانڈی تک سے پرہیز نہیں خواہ استعمال کے ساتھ دم نکل جائے مگر کچھ انقباض ہی نہیں ہوتا مسلمانوں کے اس حال پر تعجب ہے کہ جس چیز کو طبیعت قابل نفرت بتلادے مثلاً پیشاب پینا اس سے تو نفرت ہو اور جس چیز کو شریعت قابل نفرت بتلادے مثلاً شراب پینا اس سے نفرت نہ ہو۔ تو گویا اس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ یہ شخص اپنے کو نفس کا بندہ سمجھتا ہے، خدا کا بندہ سمجھتا تو کیا مسلمان ہونے کے معنی یہی ہے کہ از کہ گستی و باکہ پیوستی۔

"اور اگر یہ وسوسہ ہو کہ دوا کے لئے تو شرع میں بھی اجازت ہے، تو یہ دعویٰ علی الاطلاق محض غلط ہے۔ اصل مذہب میں تو کسی حالت میں بھی دوا کے لئے بھی ایسی چیزوں کی اجازت نہیں۔ ہاں مضطربا مخمصہ یا مغصوص باللقمہ (یعنی جو بھوک سے مر ہی رہا ہو) اس کیلئے ایسی چیز سے جان بچانا مشروع ہے۔ اور دوا کا اس پر قیاس اسلئے صحیح نہیں کہ مقیس علیہ (یعنی ایسی بھوک میں کہ جان باقی ہو) کچھ کھانے سے نفع عادۃً متیقن ہے اور مقیس یعنی بیماری میں غیر متیقن - چنانچہ اطبا خود فن ہی کو ظنی کہتے ہیں، اسی لئے نفس معالجہ ہی واجب نہیں۔ بخلاف اس کے اساغۃ مغصوص واجب ہے۔ اس لئے دوا میں ایسی چیزوں سے علاج اجازت نہیں خواہ مرض کیسا ہی مہلک ہو اور وہ دوا کا نفع کیسا ہی مجرب سمجھا جاتا ہے۔

"البتہ بعض متاخرین نے ضرورت شدیدہ اور تجربہ نفع کی قید کے ساتھ اجازت دیدی ہے، مگر جو بے احتیاطی کرتے ہیں وہ ان قیدوں کا کیا لحاظ کرتے ہیں، بلکہ وہ تو نفع کے محض احتمال یا جلد نفع ہو جانے ہی کیلئے بلکہ بعض وقت بدوں مرض کے محض تقویت کیلئے بے تکلف ان چیزوں کا استعمال کرتے ہیں"۔

"اور حرام ادویۃ کچھ برانڈی وغیرہ کے ساتھ خاص نہیں۔ بہت سی یونانی ادویۃ بھی ایسی ہی حرام ہیں جیسے جند بید ستر۔ زمایہ اشترا عرابی اور لبوب کبیر میں قضیب گاؤ وغیرہ (میں نے اپنے ایک طبیب دوست سے استدعا کی ہے کہ ایسی دواؤں کی ایک فہرست شائع کر دیں) اور خاص کر ایسی چیزوں کا استعمال ایسی جگہ کرانا ظلم عظیم ہے جہاں

مریض خود محتاط اور ایسی اشیاء سے نفور ہو"۔

"ایک کوتاہی دوسرے قسم کے معالجہ یعنی دعا و ختم و صدقہ ونذر میں ہوتی ہے کہ حدود شرعیہ کالحاظ نہیں رکھا جاتا۔ مثلاً دعاشکایت کی صورت میں ہوتی ہے کہ اے اللہ کیا ہو گا بس میں تو بالکل ہی تباہ ہو جاؤں گا یا ہو جاؤں گی یہ بچے کس پر ڈالوں گی میرا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ رہے گا۔ اے اللہ ایسا نہ کیجئے۔ گویا شکایات الگ کی جاتی ہے اور رائے الگ دی جاتی ہے استغفر اللہ کیا حق تعالیٰ کا یہی ادب یہی عظمت ہے۔ دعا غلاموں کی طرح کرو آگے جو اس کا حکم ہو راضی رہنا چاہئے۔ ہرچہ آں خسرو کند شریں بود"۔

جان کے بدلے جان۔ بعض لوگ مریض کی طرف سے بکرا ذبح کرتے ہیں۔ اور ذبح کرنے ہی کو دفع بلا میں موثر سمجھتے ہیں، جس کی حقیقت اس کی طرف سے ایک جان دیکر اس کی جان بچانے کا خیال ہے، جس کا علم و ادراک مشاہدہ یا راے سے تو ہو نہیں سکتا بلکہ ضرورت ہے نقل کی اور نقل کوئی موجود نہیں اسلئے یہ اعتقاد تقول علی اللہ ہونے کے سبب ناجائز ہے۔ اور عقیقہ پر قیاس درست نہیں کیونکہ وہ خود قیاسی نہیں اور غیر قیاسی حکم صرف نص ہی تک منحصر رہتا ہے۔ اور اگر کوئی کہے کہ میرا مقصود صدقہ ہے، تو اس کی تکذیب کیلئے یہ امتحان کافی ہے کہ اس بکرے کے عوض اس قیمت کا گوشت خرید کر کے غریبوں کو صدقہ کر دو، تو ہرگز اس عمل کا التزام کرنے والے اس پر راضی نہ ہوں گے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ ذبح کو مقصود سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ ذبح کا اہتمام نہیں کرتے تو گوشت خرید کر چیلوں کو کھلانے کو موثر جاننا۔ سو اس میں دو بدعت ہیں گوشت کو خصوصیت کے ساتھ مؤثر جاننا اور پھر چیلوں کے کھلانے کو مؤثر جاننا۔ ایسی تخصیصات پر ابھی گفتگو آتی ہے۔

"کہ بعض لوگوں نے صدقہ کے لئے خاص خاص چیزیں مقرر کر رکھی ہیں، جیسے ماش تیل اور پیسے جس میں امر مشترک سیاہ رنگ کی چیز معلوم ہوتی ہے گویا بلا کو ایک کالی چیز جان کر اس کے دور کرنے کے لئے بھی کالی چیز تجویز کی" یہ سب تخصیصات بے اصل اور بدعات ہیں۔

"بعض اوقات مریض خلاف شرع وصیت کرتا ہے اور کوئی اس کو تنبیہ بھی نہیں کرتا بلکہ بعض اوقات ایسی وصیتوں کی رائے و ترغیب دیتے ہیں۔ مثلاً ثلث سے زیادہ کی وصیت یا کسی وارث کے لئے وصیت یا کسی جائز وارث کو محروم کرنے کی وصیت یا کسی معصیت کی وصیت۔ مثلاً کسی بدعت یا تفاخر کے کام کی وصیت کہ میرا تیجا دسواں وغیرہ کرنا یا قبر میں عہد نامہ رکھ دینا یا میرا عرس کرنا۔ اسی طرح ان کاموں کے لئے کچھ وقف کرنا یہ سب ناجائز ہے۔ اگر مریض اس میں غلطی کرے تو دوسرے کو اسکی اصلاح کر دینا چاہئے۔ پھر بھی نہ مانے تو ایسی وصیت لازم نہیں ہوتی بلکہ بعض پر تو عمل جائز ہی نہیں جیسے معاصی کی وصیت"۔

موت کے وقت کی کوتاہیاں: باقی موت کے وقت جو کوتاہیاں ہوتی ہیں ان میں زیادہ حصہ عورتوں کا ہوتا ہے۔

"مثلاً بجائے اس کے کہ کچھ کلمہ وغیرہ پڑھیں میت کے لئے نزع میں سہولت و خاتمہ بالخیر کی دعاء کریں رونا پیٹنا شروع کر دیتی ہیں۔ جزع فزع کی باتیں کرنے لگتی ہیں۔ اگر مریض کو کچھ ہوش ہو تو پریشان ہوتا ہے، جس سے دو خرابیاں ہوتی ہیں۔ کبھی تو اگر اس وقت تک اس کو نا امیدی نہ ہوئی ہو تو بھی نا امید ہو کر دل شکستہ ہوتا ہے اور مریض کی دل شکنی اور اس کو نا امید کرنا خود مذموم ہے۔ حدیث میں نص ہے کہ مریض کو امید دلاتے رہو اور کبھی اس سے وہ خلق کی طرف مشغول ہو جاتا ہے حالانکہ وہ خالص اللہ کی طرف توجہ کا ہے۔

اور مثلاً بعض عورتیں اس وقت بی بی کو سامنے لا کھڑا کرتی ہیں کبھی بی بی صاحبہ خود ہی تشریف لا کر کھڑی ہو جاتی ہیں، اور پوچھا جاتا ہے، کہ اس کو یا مجھ کو کس پر چھوڑے جاتے ہو۔ اسی طرح بعض اوقات بچوں کو سامنے لاتی ہیں کہ ان کا کون ہو گا یا ان کو پیار تو کر لے ان کے سر پر ہاتھ تو رکھ دے، جس سے وہ غریب پریشان ہوتا ہے اور مخلوق کی طرف توجہ کا ضرر الگ ہوتا ہے۔ پھر بچے کس قدر دل شکستہ و نا امید ہوتے ہیں۔ یہ احمق اتنا نہیں خیال

کرتیں کہ اس وقت اگر وہ خود بھی بچوں کو یاد کرتا تو کہا جاتا کہ تم حق تعالیٰ کی طرف خیال کرو۔ البتہ اگر بہت ہی یاد کرے تو سرسری طور پر سامنے کر دیں تاکہ اس کا دل ان میں نہ اٹکا رہے۔ لیکن اگر خود نہ یاد کرے تو ہرگز یاد نہ دلائیں۔ بلکہ بچوں کو وہاں سے ہٹا دیں کہ وہ بھی پریشان نہ ہو اور اپنے آنسو پونچھ کر ان کو دلاسا دیا جائے کہ کیوں گھبراتے ہو ہم تمہارے شفیق اور خدمت کرنے والے موجود ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمان کے دل کو خوش کرنا اور غم میں تسلی دینا بڑی عبادت ہے"۔

"بعض لوگ یہ غلو کرتے ہیں کہ بزعم خود اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں ذرا غافل ہوا اور تقاضا شروع ہوا کہ کلمہ پڑھو استغفار پڑھو۔ اور اگر ہوش آگیا اور اس نے پڑھ بھی لیا تو اس پر کفایت نہیں کرتے پھر پڑھواتے ہیں کہ دم نہ لے۔ اللہ بچائے اس جاہلانہ زہد خشک سے۔ اس بات میں علماء کا ارشاد یہ ہے کہ اگر ہوش میں ہو تو نرمی سے کلمہ و استغفار کی طرف متوجہ کر دیں اور جب ایک بار پڑھ لے توبہ کر لے چھوڑ دیں۔ پھر جب تک کوئی دنیا کی بات نہ کرے دوبارہ پڑھنے کو نہ کہیں۔

"اور بعضے آدمی اس سے بڑھ کر یہ کرتے ہیں کہ اخیر وقت تک اس سے باتیں کرانا چاہتے ہیں اور بڑھ کر اس لئے کہا کہ ان زاہدان خشک نے تو اس سے کلمہ پڑھوانا چاہا تھا جو دین کا کام ہے اور انہوں نے دنیا کی باتیں کرنا چاہا یعنی جہاں ذرا ہوش ہوا اس کو پکارتے ہیں کہ فلانے ذرا آنکھ تو کھولو مجھ کو تو دیکھو میں کون ہوں۔ تم کیسے ہو کچھ کہو گے کسی بات کو دل چاہتا ہے .... ان عقل کے پتلوں سے کوئی پوچھے کہ یہ ان باتوں کا وقت ہے۔ البتہ کوئی ایسی بات ہو جو شرعاً ضروری ہے مثلاً کسی امانت کو پوچھا جائے کہ کہاں رکھی ہے یا کچھ قرضہ یا لین دین کے بارے میں پوچھا جاوے، جس کا حال بغیر اس کے کہے نہ معلوم ہو سکے، تو ایسی باتوں کے متعلق پوچھ پاچھ

کرنے کا مضائقہ نہیں بلکہ ضروری ہے بشرطیکہ اس کو تحمل سے زائد تنگی و تکلیف نہ ہو۔ کیونکہ ایسی بات دراصل دنیا کی بات نہیں۔ بلکہ ادائے واجب ہے جو طاعت کی فرد اعظم ہے"۔

"اب کوتاہی جو بہت عام ہے یہ ہے کہ جب کوئی عورت مرنے لگتی ہے کہتے ہیں کہ شوہر کو مہر معاف کر دے اور وہ معاف کر دیتی ہے اور شوہر اس معافی کو کافی سمجھتا ہے۔ سو خوب سمجھ لیا جائے کہ اس وقت کی معافی وصیت ہے اور وصیت وارث کے حق میں نافذ نہیں ہوتی جب تک کہ سب ورثہ بشرط بلوغ اس کو منظور نہ کرلیں۔

موت کے بعد۔ اب مرنے کے بعد

"دفن میں اعزہ وغیرہ کے انتظار میں دیر کرنا، قبر پر اناج لے جانا جانماز اور اوپر کا چادر ترکہ میں سے خریدنا۔ میت کے کپڑے ترکہ تقسیم کئے بغیر مساکین کو دے دینا تیجہ دسواں وغیرہ کرنا برادری یا مساکین کو تفاخراً کھانا دینا کئی بار عورتوں کا جمع ہونا، جس میں ایک اجتماع انقضاء عدت کے دن ہوتا ہے۔ بلاضرورت دور دور سے مدتوں تک مہمانوں کا آنا اور میت والوں پر بار ڈالنا، حفاظ وغیرہ کو کچھ دے کر قرآن مجید پڑھوانا، مدت تک سوگ کرنا وغیرہ، یہ تو عام مرنے والوں کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے۔ اور بعض خاص معلامات بزرگوں کے ساتھ ہوتے ہیں جیسے عرس و فاتحہ مروجہ وغیرہ کے منکرات"۔

ان سب کی مفصل و مدلل بحث حضرت کے رسالہ اصلاح الرسوم میں ملاحظہ فرمائی جائے۔ اصلاح انقلاب میں صرف بعض ایسی کوتاہیوں کی کچھ تفصیل فرما دی ہے جو اصلاح الرسوم میں مذکور نہیں۔ مثلاً

"ان میں سے ایک یہ ہے کہ بعضے تقوی کے جوش میں آکر ترکہ مشترکہ

میں سے بلاوصیت میت نماز روزہ کا فدیہ دلوا دیتے ہیں سو اس میں حکم یہ ہے کہ اگر وصیت کرے تو ثلث میں دینا حق ورثہ پر مقدم ہے اور اگر وصیت نہ کرے تو جس کو دینا ہو خاص اپنے حصہ یا اپنے پہلے مال سے دے۔

"ایک بڑی کوتاہی یہ ہے کہ بعض دیہات میں جہاں کوئی نماز پڑھانے والا میسر نہیں بدوں نماز جنازہ کے دفن کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر ایک آدمی بھی ایسی صورت میں وضو کر کے اور جنازہ سامنے رکھ کر صرف چار بار اللہ اکبر کہہ دے تو جنازہ کی فرض نماز ادا ہو جائے گی۔ باقی دعائیں وغیرہ سنن ہیں، تو کم از کم اتنا ہی کر لیں اور ترک فرض کی معصیت سے محفوظ رہیں۔

"ایک کوتاہی یہ کرتے ہیں کہ مردہ کو قبر میں رکھ کر صرف منہ تو قبلہ کی طرف کر دیتے ہیں باقی سارے بدن کو کروٹ نہیں دیتے۔ سو کتب فقہ میں تصریح ہے کہ بدن کو اچھی طرح کروٹ دینا چاہئے۔ نیز قبر میں رکھنے کے بعد اس کا منہ کھول کر قبر کو دکھانا ضروری سمجھتے ہیں سو شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔

"ایک کوتاہی یہ ہے کہ قبر میں عہد نامہ شجرہ وغیرہ رکھتے ہیں اور میت گلنے سڑنے سے اس کی بے ادبی ہوتی ہے سو اس کو بھی ترک کرنا چاہئے۔ البتہ جس چیز کا ادب شریعت میں اس درجہ کا نہیں اس کو قبر میں رکھ دینا درست ہے جیسے کسی بزرگ کا کپڑا وغیرہ۔ بعضے قبر پختہ بناتے ہیں حدیث میں صریح ممانعت آئی ہے۔

سخت ظلم: ایک سخت کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ لڑکیوں کو میراث نہیں دیتے، جو نص قرآن کی رو سے حرام اور ظلم ہے۔ بعض بیوہ عورتیں اپنے کو تمام منقولات کا مالک سمجھتی ہیں یہ بھی ظلم ہے، جو چیز شوہر نے اس کو سپرد کر دی ہو وہ بیشک اس کی ہے ورنہ اور سب ترکہ مشترکہ ہے حسب فرائض سب کو دینا چاہئے۔ ایک کوتاہی یہ ہے کہ اگر دلہن

میکے میں مرجائے تو اس کے تمام سامان پر وہ لوگ قبضہ کر لیتے ہیں اور سسرال میں مرے تو وہ قابض ہو جاتے ہیں۔ اس میں تقسیم شرعی ہوتے سنا ہی نہیں۔ یاد رہے سب قیامت کے دن اگلنا پڑے گا۔

شدید کوتاہی: "ایک شدید کوتاہی یہ ہے کہ میت کے قرض ادا کرنے کا اہتمام بہت کم کرتے ہیں خصوصاً جو کہیں لکھا پڑھا نہ ہو اور محض دست گرداں حالانکہ حدیث کی رو سے "جب تک قرضہ ادا نہ ہو اس کی روح جنت میں جانے سے معلق رہے گی تو کیا اپنے عزیز کے لئے اتنا بڑا حرماں گوارا کرنا چاہئے اسی طرح میت کا دوسروں پر جو قرض ہوتا ہے اس کو بھی لوگ اس کے بعد دبا جاتے ہیں۔

پیٹ کے بچہ کا معاملہ: "ایک کوتاہی یہ ہے کہ کبھی میت کے وارثوں میں وہ بچہ بھی ہوتا ہے جو ابھی ماں کے پیٹ میں ہے۔ ہم کو یاد نہیں کہ کسی فتویٰ لینے والے نے سوال میں اس کو ظاہر کیا ہو اور ہم جواب دینے والوں کی بھی کوتاہی ہے کہ اس کا احتمال ہی نہیں ہوتا اور سائل سے اس کی تحقیق ہی نہیں کرتے حالانکہ مذہب کا ضروری مسئلہ اور بہت زیادہ قابل اعتنا ہے کہ بغیر اس کے پیدا ہوئے ترکہ کی تقسیم ہی معلق رہتی ہے اور پیدا ہونے کے بعد صحیح سوال قائم ہو گا۔

"بعضے لوگ شوہر کو اس کی مردہ بی بی کا منہ نہیں دیکھنے دیتے ہیں یہ محض لغو ہے۔ میت کو ہاتھ لگانا تو بلاضرورت جائز نہیں لیکن منہ دیکھنا درست ہے اور پایہ پکڑنا مستحب ہے۔ اور عورت کے لئے تو مردہ شوہر کو دیکھنا اور ہاتھ لگانا بھی درست ہے۔

ایک اور کوتاہی: "یہ ہے کہ بعض جگہ نماز جمعہ کے انتظار میں جنازہ کو رکھے رہتے ہیں کہ زیادہ نمازی نماز پڑھیں سو یہ بالکل جائز نہیں۔ جس قدر جلد ممکن ہو نماز اور دفن سے فراغت کرنا واجب ہے۔ بعضے مرنے والے کسی خاص شخص سے نماز پڑھوانے یا کسی خاص جگہ دفن ہونے کی وصیت کر جاتے ہیں تو لوگ اس کا اس قدر اہتمام کرتے

ہیں کہ بعض اوقات بعضے واجبات شرعیہ بھی ضائع ہو جاتے ہیں سو جان لینا چاہئے کہ ایسی وصیتیں شرعاً لازم نہیں ہوتیں اگر کوئی امر خلاف شرع لازم آوے تو اس پر عمل جائز نہیں"۔

کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا، رسول اللہ کا اللہ کا رسول ہونا، نماز روزہ حج زکوٰۃ کا اللہ کے احکام ہونا، یہ باتیں خالص دیانات کی ہیں، جن کا اجزائے دین بلکہ عین دین ہونا ہر وہ شخص جانتا اور مانتا ہے، جو کسی درجہ میں بھی اپنے کو مسلمان کہتا اور سمجھتا ہے، لیکن ان مسلمات میں بھی ہر طبقہ کے مسلمانوں نے سرے سے ترک یا طرح طرح کے مفاسد کے اتنے بے شمار انقلابات پیدا کر لئے ہیں کہ حضرت جامع المجددین علیہ الرحمہ کو ان کی سرسری تجدیدی و اصلاح کے لئے بھی اصلاح انقلاب کا پورا ایک حصہ قریباً دو سو صفحات کا وقف فرما دینا پڑا اور راقم ہذا ان کی ضروری تلخیص میں کوشش اختصار کے باوجود پچاس ساٹھ سے کم پر قناعت نہ کر سکا۔

پھر آخر ان مسلمات دین کے بھی جو ہم بالکلیہ تارک یا ان میں گوناں گوں کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کے مرتکب ہیں، اور جن کے لئے کوئی ضعیف سے ضعیف عذر بھی ایسا نہیں، جس کو حضرت مجدد نے قطع نہ فرما دیا ہو یا جس کی تدبیر و علاج نہ بتا دیا ہو، اس کے بعد بھی اگر ہم ان کو اختیار نہ کریں یا ان میں جو کوتاہیاں کر رہے ہیں ان کو دور نہ کریں تو آخر ہمارے مسلمان ہونے کے دعوے کا کیا مطلب اور کیا معنی ہیں! کیا اس میں بھی حکومت یا ہم وطن ہمارا ہاتھ پکڑتے ہیں یا ان کی اصلاح و معالجہ کی جو تدابیر بتائی گئی ہیں ان میں کوئی ایسی مزاحمت پیدا کر رہے ہیں کہ جس کا مقابلہ تکلیف مالایطاق ہو!

اصلاح انقلاب (حصہ دوم)

اس کے بعد اصلاح انقلاب کے دوسرے حصہ میں زیادہ تر ان انقلابات کی اصلاح فرمائی گئی ہے، جو دوسرے درجہ کے دیانات یعنی نکاح و طلاق کے متعلقات میں پیدا کر لئے گئے ہیں۔ یہ حصہ بھی قریباً ڈیڑھ سو صفحوں کا ہے۔

نفس نکاح کے لئے عورتوں کا معاملہ مردوں سے زیادہ توجہ طلب ہے بیوہ کا عقد اب اتنا معیوب نہیں سمجھا جاتا جتنا پہلے تھا، لیکن اس کو اچھا یا ضروری اب بھی شاذ و نادر ہی لوگ جانتے ہیں، اور چونکہ استحسان نہیں، اس لئے اہتمام بھی نہیں۔ اگر کوئی غیر معمولی ترغیب کی صورت پیدا ہو گئی تو خیر ورنہ بالعموم جوان، جوان بیواؤں کو بھی اپنی جوانی اب بھی زیادہ تر بیوگی کے سوگ میں کاٹ ڈالنا پڑتی ہے اور کوئی خاص فکر و تدبیر ان کے نکاح ثانی کی نہیں ہوتی۔ حالانکہ

کنوارے سے بیوہ کا نکاح مقدم ہے: "اگر غور سے کام لیا جائے تو نکاح ثانی اول کی بہ نسبت اہم ہے۔ کیونکہ پہلے تو وہ خالی الذہن، تھی مصالح زوجیت کا یا تو علم ہی نہ تھا یا تھا تو علم الیقین نہ تھا اور اب تو عین الیقین ہو گیا ہے۔ اس حالت میں اس پر وساوس و حسرات کا ہجوم زیادہ ہوتا ہے، جس سے کبھی صحت کبھی آبرو کبھی دین سب برباد ہو جاتے ہیں، بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے پوچھا تھا وہ راضی نہیں ہوتی۔ مجھ کو اس میں بھی کلام ہے کہ جو طریقہ پوچھنے کا ہوتا ہے، اس طرح پوچھا تھا یا چلتی ہوئی بات کہہ کر الزام اتار دیا تھا۔

بالعموم ایک آدھ بار پوچھنے میں تو وہ اس لئے انکار کرتی ہے کہ "اگر ایک دم سے راضی ہو جاؤں گی تو خاندان کے لوگ کہیں گے کہ یہ تو منتظر ہی بیٹھی تھی، خاوند کو ترس رہی

تھی اس خوف سے وہ ظاہراً انکار کر دیتی ہے۔ چاہئے یہ کہ اس کو اچھی طرح سب مصلحتیں بتلاؤ، اس کے وسوسے رفع کرو شفقت و اہتمام سے گفتگو کرو اس کی غلط فہمیاں دور کرو۔ پھر ایک دفعہ نہیں چند بار ایسی گفتگو کرو۔ اگر اس پر بھی راضی نہ ہو تو تم معذور ہو۔ غرض حتی الامکان بیوہ کا نکاح کر دینا ہی مناسب ہے۔ البتہ اگر وہ بچے والی ہو اور عمر بھی ڈھل چکی ہو اور کھانے پینے کی بھی گنجائش ہو اور وہ انکار کرتی ہو اور قرائن سے زوج سے اس کا استغنا معلوم ہو تو اس کے لئے اہتمام ضرور نہیں"۔

لڑکیوں کے نکاح میں تاخیر: "اسی طرح بعضے بداندیش کنواری لڑکیوں کو بالغ ہو جانے پر بھی کئی کئی سال بٹھائے رکھتے ہیں اور محض ناموری کے سامان کے انتظار میں شادی نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ تیس تیس اور کہیں چالیس چالیس برس کی عمر کو پہنچ جاتی ہیں اور اندھے سرپرستوں کو کچھ نظر نہیں آتا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ حدیثوں میں جو اس پر وعید آئی ہے کہ اس صورت میں اگر عورت سے کوئی لغزش ہو گئی تو وہ گناہ باپ (یا جو ذی اختیار ہو اس پر) بھی لکھا جاتا ہے۔ اگر کسی کو اس وعید کا خوف نہ ہو تو دنیا کی آبرو کو تو دنیا دار بھی ضروری سمجھتے ہیں سو اس کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ کہیں حمل گرائے کہیں لڑکیاں کسی کے ساتھ بھاگ گئیں"۔

اور اس آزادی و بےقیدی اور اسکولی و کالجی تعلیم نسواں کے زمانہ میں تو یہ واقعات اتنے زیادہ ہونے لگے ہیں کہ شاید ہی کوئی شخص ہو، جو بھائی برادری یا پاس پڑوس کے اس قسم کے دو چار شرمناک واقعات سے واقف نہ ہو۔ ابھی اس تحریر کے دوران ہی میں راقم ہذا کے علم میں دو واقعے اس طرح کے آئے کہ ایک لڑکی گھر کے ملازم کے ساتھ بھاگ گئی اور ایک کا تعلق بعد نکاح ایک غیر مسلم سے ثابت ہوا اور طلاق کی نوبت آئی۔ اور یہ دونوں واقعے اچھے معزز اور شریف گھرانوں کے ہیں۔

> "ایسا نہ بھی ہو تو وہ لڑکیاں سرپرستوں کو دل ہی دل میں کوستی ہیں اور چونکہ وہ مظلوم ہیں انکا کوسنا خالی نہیں جاتا۔ ان لوگوں کو یہ بھی شرم نہیں آتی کہ خود تو باوجود بڈھے ہو جانے کے ایک بڑھیا کو کہ وہ اس لڑکی کی

ماں ہے خلوت میں لے جا کر عیش و عشرت کرتے ہیں اور جس غریب
مظلوم کی عیش کا موسم ہے وہ پہرہ داروں کی طرح ماما اصیلوں کے ساتھ
گھر کی چوکسی کرتی ہے"۔

اسباب تاخیر: اور یہ تاخیر زیور جہیز وغیرہ فخر کے ساز و سامان مہیا نہ ہونے ہی کی بدولت نہیں ہوتی، بلکہ بارہا دیکھا گیا ہے، کہ لڑکی کی طرح یہ سامان بھی پڑا سڑتا ہے مگر رشتہ اپنی مرضی کا نہیں ملتا۔ اور شرطیں سب پوری ہونا ضروری ہیں۔ ذات پات کا بھی ہیٹھانہ ہو، صورت شکل بھی ہو، کھاتا پیتا بھی ہو، پڑھا لکھا بلکہ گریجویٹ بھی ہو خوش مزاج یا ہنستا بولتا بھی ہو۔ ہاں اگر کسی چیز کے ہونے کی ضرورت نہیں، تو وہ صرف دین و اخلاق ہے۔ حتیٰ کہ اگر بد عقیدہ آزاد خیال ہو تو اس کی بھی پرواہ نہیں۔ اور کچھ آوارہ مزاج ہو تو اس میں بھی مضائقہ نہیں اور اگر رشوت وغیرہ خوب کھاتا ہو، تو گویا تنخواہ کم ہے لیکن یہ کیا کم ہے کہ "ماشاء اللہ اوپر کی آمدنی اچھی ہے! استغفر اللہ بلاشبہ لائق جوڑ کی جہاں تک ہو سکے فکر کرنا اولاد کے حقوق میں سے ہے۔

"لیکن دو امر قابل لحاظ ہیں ایک یہ کہ غلو ہر امر میں مذموم ہے، دوسرے یہ کہ ایک شخص میں تمام اوصاف کا جمع ہونا بھی شاذ و نادر ہے۔ پس اگر صفات مذکورہ میں بقدر ضرورت جمع ہوں یا بعض صفات ہیں بعض نہیں، مگر جو اہم ہیں وہ موجود ہیں۔ ایک قوت اکتساب دوسرے کفاءت (ذات پات) میں زیادہ تفاوت نہیں تیسرے دینداری، تو زیادہ کاوش چھوڑ دے، ورنہ وہی بات پیش آوے گی جس کا ذکر حدیث میں ہے، کہ "جب خلق و دین و کفارت ہو تو نکاح کر دیا کرو ورنہ زمین میں بڑا فساد ہو گا" ....

"غرض یہ عذر کہ رشتہ موقع کا نہیں ملتا اکثر بے موقع ہوتا ہے"۔

پھر داماد میں تو دین و اخلاق کے سوا سب ہی کچھ تلاش کیا جاتا ہے، لیکن خود اپنی حیثیت یا صاحبزادی کی حالت پر نظر بہت کم جاتی ہے، ورنہ اگر مجموعی اعتبار سے برابر کا

جوڑ تلاش کیا جائے تو چنداں دشواری نہ ہو۔ ایک نئی مصیبت یہ چھا گئی ہے کہ "نئی تعلیم و ترقی" نے لڑکوں کو مال و جاہ کا حریص اس بے غیرتی کی حد تک بنا دیا ہے کہ، وہ لڑکی کے حسب و نسب صورت و شکل اخلاق و عادت ہنر و سلیقہ سب سے زیادہ سسرال والوں کے موٹر و بنگلہ عہدہ و عزت کو دیکھتے ہیں، اور جہیز میں خود اپنے لئے بھی موٹر و بنگلہ اور بارہا ولایت کی تعلیم کے تعلیمی مصارف کے امیدوار ہوتے ہیں اور بعض جگہ تو سب شرائط مہینوں کے نامہ و پیام میں پہلے ہی سے باقاعدہ طے کر لئے جاتے ہیں۔ ہاں اب مزید ترقی کے بعد اس لڑکی کا گریجویٹ اور کہیں کہیں بے پردہ ہونا بھی شرط ہے۔ خیر سے اس کوشش میں تو "ترقی پسند" والدین بھی کمی نہیں کرتے اور بے پردگی میں بھی مضائقہ نہیں جانتے۔ لیکن داماد کے لئے موٹر و بنگلہ یا ولایت کی تعلیم کا خرچ فراہم کرنا کتنے والدین یا سرپرستوں کے لئے آسان ہوتا ہو گا خصوصاً اگر کسی خوش نصیب کی لڑکیاں زیادہ ہوئیں۔ لہٰذا ایک وجہ خصوصاً حیدر آباد (دکن) و بہار کے مسلمانوں میں بھی بنگال کے ہندوؤں اور بمبئی کے پارسیوں کی طرح بر نہ ملنے کی یہ بھی ہو گئی ہے، اور بعض لڑکیاں تیس چالیس برس کیا ساری عمر ہی "کنواری" بنی رہتی ہیں اور دین و اخلاق کی تو پرواہی کس کو ہے۔ عزت و آبرو کا بھی خدا ہی حافظ!

مصیبت بالائے مصیبت: یہ ہے کہ نام نہاد خاندانی علماء و مشائخ جو ہمارے رہبر ہو سکتے تھے اور کچھ نہ کچھ اب بھی اثر رکھتے ہیں، وہ خود بھی اسی الٹی راہ پر پڑتے جاتے ہیں اور خود اپنی لڑکیوں کے لئے "اپٹوڈیٹ" داماد کی فکر میں لگے رہتے ہیں!

مکمل قانون: "ایک کوتاہی یہ ہے کہ اکثر متناکحین (خصوصاً لڑکی) کی مرضی حاصل نہیں کی جاتی۔ تعجب ہے نکاح جو عمر بھر کے لئے دو شخصوں کا تعلق ہے جس کے ساتھ ہزاروں معاملات وابستہ ہیں، وہ کسی کا اور رائے دوسروں کی .... یہ مطلب نہیں کہ ہر جگہ لڑکا لڑکی سے کہلوانا ضروری ہے یا اولیاء کو مصالح مخصص کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یقیناً بعض جگہ تو لڑکا بھی اور لڑکی تو اکثر جگہ ذی رائے نہیں ہوتی .... نیز اکثر جگہ اولیاء اپنے تجربہ و شفقت سے جو تجویز کریں گے وہ مصلحت ہی ہو گا۔ اس واسطے شریعت مقدسہ نے

اپنے احکام و قواعد میں سب باتوں کا لحاظ کر کے مکمل قانون بنا دیا ہے۔ اس لئے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں اور نہ کوئی عاقل یہ بات تجویز کر سکتا ہے کہ بالکل متناکحین کی رائے پر رکھ دو بلکہ مطلب یہ ہے لڑکا لڑکی اگر بالغ ہوں تو نکاح سے پہلے ان کی رائے دریافت کر لی جائے، جس کا اچھا طریقہ یہ ہے کہ جن سے وہ بے تکلف ہیں جیسے ہم عمر دوست اور سہیلیاں ان کے ذریعے سے اس طور پر کہ ان کو معلوم ہو کہ ہمارے بزرگ ہم سے دریافت کر رہے ہیں ان کا مافی الضمیر معلوم کر لیا جائے .... اور بعض دفعہ تو بے دریافت کئے وہ خود ہی ایسے بے تکلف دوستوں سے اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی ظاہر کر دیتے ہیں اور اولیاء کو خبر بھی ہو جاتی ہے، مگر ظلم و ستم یہ ہے کہ پھر بعض مہمل و موہوم مصلحتوں کے پیش نظر گھونٹ داب اس کو اس بلا میں پھنسا دیتے ہیں۔

البتہ اگر ناکح و منکوح نابالغ ہوں اور کوئی اچھا موقع فوت ہو رہا ہو تو دوسری بات ہے۔ اور اگر کوئی ضروری مصلحت نہیں محض رسم ہی کا اتباع ہو تو خود یہ رسم ہی مٹانے کی ہے، گو نکاح صحیح ہو جاتا ہے، تاہم وابتلوا الیتامی حتی اذا بلغو النکاح صاف مشیر ہے کہ نکاح کا پسندیدہ زمانہ بلوغ ہی ہے۔

یورپ زدگی کا غلو۔ "اور اس کوتاہی کے مقابل دوسرا غلو ہے، جو اس وقت اکثر تعلیم یافتوں میں بڑھتا جاتا ہے کہ خلاف مرضی کے نکاح کے بعض مضر واقعات دیکھ کر انہوں نے احکام شرعیہ پر طعن اور ان کے مقابلہ میں یورپ کے رسم و رواج کو ترجیح دینا شروع کیا۔ تعجب ہے کہ یہ حضرات اتباع فطرت و تحقیق واقعات کے از حد مدعی ہیں پھر ان کی نظر سے یہ واقعہ کیسے مخفی رہا کہ ہر قسم کے مواقع پیش آتے ہیں جن کے لئے کوئی ایک ہی کلیہ کافی نہیں ہو سکتا ایک پورے جامع قانون کی ضرورت ہے" جس میں تمام مصالح کی رعایت ہو اور ہر موقع پر کام دے سکے"۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ اس زمانہ میں منکوحہ میں زیادہ تر جمال کو اور ناکح میں زیادہ تر مال کو دیکھتے ہیں حالانکہ سب سے کم قابل التفات یہی مال و جمال اور سب سے زیادہ قابل التفات دین ہے۔ اسی واسطے حدیث میں بھی عورت کے بارے میں ہے کہ عورت

سے چار وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے، شرافت، مال خوبصورتی اور دینداری کی وجہ سے۔ اس کے آگے ہے کہ فاظفر بذات الدین تربت یداک (بی بی دیندار حاصل کرو) اور مرد کے باب میں ہے، کہ "جب کوئی ایسا مل جائے کہ جس کا خلق و دین پسندیدہ ہو تو اس سے نکاح کر و ورنہ زمین میں بڑا فساد برپا ہو گا"۔

کیا بد بختی ہے کہ آج کل لڑکی لڑکے میں جس چیز کو سرے سے نہیں دیکھا جاتا وہ دین ہی ہے۔ جس کی وجہ محض یہ ہے کہ اسلام کے دعوے کے باوجود مسلمانوں کے دل میں جو چیز سب سے زیادہ بےقیمت ہے وہ دین و آخرت ہی ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ حالانکہ اگر زوجین میں دین و آخرت کا خیال ہو تو دنیا میں بھی زیادہ خوبصورتی و محبت کے ساتھ نباہ کی امید کی جا سکتی ہے اس لئے کہ جن کے پیش نظر نری دنیا ہی دنیا ہو، وہ تو زیادہ سے زیادہ بلکہ سب کچھ دنیا ہی میں حاصل کر لینا چاہتے ہیں اور لازماً ایک دوسرے کی کمی و کوتاہی کو کم سے کم گوارا کر سکتے ہیں۔ بخلاف ایک سچے دیندار کے کہ وہ آخرت کے ابدی اجر و راحت کے لئے دنیا کی عارضی کلفت کو بھی گوارا کر لے سکتا ہے، جس طرح منزل کے ذوق و شوق میں مسافر سفر کی کلفت کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتا۔ کسی طرح راستہ کاٹ دیتا ہے کہ گھر پہنچ کر آرام ہی آرام ہے۔

> "پھر مال و جمال کی عمر ہی کیا۔ مال تو (چوروں کے ہاتھ) ایک ہی رات میں بےوفائی کر جا سکتا ہے اور جمال ایک بیماری میں ختم ہو جاتا ہے۔ اور بعض امراض میں پھر لوٹ ہی نہیں سکتا، جیسے آنکھ پھوٹ جائے یا چیچک نکل آوے اور داغ نہ جاویں یا سر کے بال گر جاویں تو جو محبت و الفت اس پر مبنی تھی وہ بھی ختم ہو گئی اور نباہ مشکل ہو گیا"۔

عمر بھر حرام کاری: "ایک امر یہ بھی قابل التفات ہے کہ آج کل نو تعلیم یافتہ طبقہ میں بعضے ایسے آزاد و بےباک ہو جاتے ہیں کہ ملاحدہ کی تقلید یا ہوا پرستی و خود رائی کی بدولت بے تکلف دینی قطعیات تک میں کلام کرنے لگتے ہیں، کسی کو رسالت میں کلام ہے، کسی کو نماز روزہ کے احکام پر نکتہ چینی ہے کسی کو واقعات معاد میں شبہات ہیں، سو خوب سمجھ

لو کہ ایسا آدمی کافر ہے خواہ اپنے کو مسلمان ہی سمجھے۔ اور مسلمہ کا نکاح کافر سے نہیں ہوتا یا اگر نکاح ہونے کے بعد کوئی ایسی باتیں کرے تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور عمر بھر حرام کاری ہوتی ہے۔ پس بے حد ضروری ہے کہ نکاح کے قبل داماد صاحب کی داڑھی اور فیشن کو اگر نہ دیکھو تو اس کے مسلمان ہونے کی تو تحقیق کر لو اور بعد نکاح ایسا ہو تو توبہ کرا کر تجدید نکاح کرا دیا کرو۔ بہت مہتم بالشان بات ہے۔

ایک کوتاہی نفس نکاح کے معاملے میں یہ ہے کہ

> "بعضے لوگ باوجود ضرورت و وسعت سرے سے نکاح نہیں کرتے اور بعضے ایک بیوی کے مرنے یا طلاق کے بعد پھر نہیں کرتے .... سو خوب جان رکھو کہ جب ضرورت یعنی نفس میں تقاضا ہو اور وسعت بھی ہو گو اسی قدر کہ روز کے روز کماؤں گا اور کھلاؤں گا تو نکاح کرنا واجب اور اس کا ترک گناہ ہے۔ اور اگر وسعت کے ساتھ بہت زیادہ تقاضا ہے کہ بدوں نکاح کے حرام میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے تو نکاح کرنا فرض ہو گا اور فعل حرام میں نظر حرام اور استمنا بالید بھی داخل ہے"۔

فعل حرام سے اگر کوئی شاذ و نادر ایسی صورت میں بچ بھی جائے، تو نظر حرام یا نامحرم عورتوں کے ساتھ اختلاط و بے تکلفی سے تو شاید ہی کوئی بچتا ہو، اور اندھیر یہ ہے کہ اس کو اچھے اچھے گھرانوں میں بھی معیوب تک نہیں خیال کیا جاتا، بلکہ بھاوج اور سالیوں کے ساتھ تو گویا اس کا قانونی حق حاصل ہے۔ حال کا واقعہ ہے کہ احقر نے ایک عزیز قریب کو اس فتنہ میں مبتلا پا کر رشتہ کی ایک بھاوج کے پاس ایک ہی پلنگ پر قریب بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے، سختی سے سارے گھر میں نامحرموں کا پردہ کرا دیا تھا۔ لیکن آج رات ہی کو معلوم ہوا کہ اس کی پابندی نہیں ہو رہی ہے، تو قدرۃً طبیعت کو زیادہ برہمی ہوئی اور زیادہ سختی کی تو جو جواب ملا وہ کیسا بے حیائی و بیباکی کا تھا کہ "جو کچھ کرتا ہوں نیک نیتی کے ساتھ" اس سے بڑھ کر قرآن داں روشن خیال "بھاوج" صاحبہ کی طرف سے جواب ملا کہ "قرآن میں تو یہ پردہ نہیں" انا للہ وانا الیہ راجعون! یہ قرآن دانی و روشن خیال ایک مشہور تعلیمی ادارہ کا تحفہ ہے جس کے ساتھ "اسلامیہ" بھی لگا ہوا ہے اور جہاں کی صرف

اتنی ہوالگ گئی ہے کہ شوہر کے ساتھ وہاں ایک مدت تک قیام رہا! ۔ یہ تو عمل کا رنگ تھا ایمان کا بھی حال سن لیں جو زیادہ عبرت ناک ہے کہ "بھائی جان (احقر کو خطاب کر کے) میں پہلے قبر کے عذاب سے بہت ڈرا کرتی اور اس سے بچنے کی بہت دعائیں مانگا کرتی تھی، مگر معلوم ہوا کہ قرآن شریف میں تو عذاب قبر کا ذکر ہی نہیں" —— کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا اور رات ہی کا واقعہ جس سے قلب اب تک شدید متاذی ہے، اب نفس نکاح کے فرض ہونے کی صورت بالا کے بعد دوسری صورت یہ ہے کہ گو ضرورت نکاح کا جو درجہ اوپر بیان کیا گیا ہے، وہ نہ بھی پایا جائے۔ لیکن ادائے حق کی نفس قدرت اگر حاصل ہے، تب بھی نکاح کرنا سنت ہے۔ اور اسی معنی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "النکاح سنتی ومن رغب عن سنتی فلیس منی" کہ نکاح میری سنت ہے، جو اس سے بے رغبت ہو وہ مجھ سے نہیں"۔

> "البتہ اگر اندیشہ ہے بی بی کے حق ادا نہ کر سکنے کا خواہ حق نفس خواہ حق مال تو ایسے شخص کے لئے البتہ نکاح ممنوع ہے اور اگر ضرورت ہو مگر وسعت نہ ہو تو اس صورت میں اقوال مختلف ہیں"۔

مگر حکیم المجدد دین علیہ الرحمہ کی حکیمانہ و دوربین نگاہ میں اس صورت میں بھی وجوب ہی کا قول راجح ہے۔ رہی وسعت تو اس کی نسبت ارشاد ہے کہ

> "اس کا تدارک مزدوری سے کرے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ قرض لے کر کرے۔ البتہ اس کے ادا کرنے کی نیت مصمم رکھے اور کوشش بھی کرے اس پر بھی ادا نہ کر سکا تو امید ہے کہ حق تعالیٰ اس کے مخاصم کو راضی فرما دیں گے۔ کیونکہ اس نے دین کی حفاظت کے لئے قرض لیا تھا۔ مگر فضولیات کے لئے یہ قرض جائز نہیں، صرف نان نفقہ کے لئے یا مہر کے لئے جہاں کہیں مہر پورا یا کچھ فوراً لیا جاتا ہو"۔

لیکن آج کل فضولیات یعنی تقریب نکاح کی جائز و ناجائز رسوم کی تکمیل کے لئے قرض زیادہ تر لیا جاتا ہے۔ ورنہ نفس نکاح کے لئے ایسا کوئی شاذ و نادر ہی ہو گا کہ کسی نہ کسی قسم

کی محنت و مزدوری سے روز روز کما کر واجب نان و نفقہ کو پورا نہ کر سکے۔

وسعت کا معیار۔ دوسری طرف اس زمانہ میں خصوصاً نئی تعلیم کے نوجوانوں میں وسعت کا معیار اتنا بلند ہو گیا ہے کہ بہتوں کو دیکھا کہ اچھی اچھی سینکڑوں ماہوار کی تنخواہ رکھتے ہیں مگر اس انتظار میں جوانی کے دن کھوتے رہتے ہیں کہ موجودہ آمدنی موٹر و بنگلہ کے لئے کافی نہیں اور جوانی کے دن کھونے والے بھی شاذ و نادر ہی ہیں، ورنہ زیادہ تر ناجائز راستوں سے نفس کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں کچھ اور نہیں تو اپنے ہی جیسے آزاد خیال دشمنِ غیرت و حمیت اعزہ و احباب کی بیبیوں بیٹیوں سے گھر یا کلب میں دل بہلاتے ہیں۔ اس کا منشا بھی وہی بد دینی ہے کہ بد نگاہی وغیرہ ظاہری و خارجی تمتعات کو سرے سے حرام یا برا ہی نہیں جانتے۔ پھر اس خارج سے داخل کا جو فاصلہ ہے، اس کے طے ہو جانے کے واقعات کیا کم ہوتے رہتے ہیں! اور کس کے علم میں نہیں ہیں۔ انہیں عواقب کے پیش نظر شریعت کا حکم بہرحال یہی ہے، کہ جب "ضرورت و وسعت دونوں ہوں تو نکاح واجب یا فرض ہو گا"۔

"پھر بھی بعض لوگ نہیں کرتے جس کے اسباب مختلف ہیں بعضے تو نکاح نہ کرنے کو قرب و عبادت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ اعتقاد رہبانیت و بدعت ہے اور اصل عمل شرعاً مامور بہ نکاح ہی ہے، تو اس کا ترک فی نفسہ ظاہر ہے کہ عبادت نہیں ہو سکتا۔ اور بعضے بی بی کے مرنے سے بد دل ہو کر بزعم خود تارک دنیا بنتے ہیں .... حالانکہ جب ضرورت ہے تو ترک نکاح سبب ہو جائے گا۔ فتن کثیرہ کا وساوس و خطرات کا ہجوم عبادات میں حلاوت و طمانیت کو بالکل ہی برباد کر دے گا۔ یہ تو مشترک حالت ہے اور بعضوں سے ان وساوس سے متاثر ہو کر ان کے مقتضاء پر بھی عمل ہو جاتا ہے۔ بعض تو عورتوں سے مبتلا ہو جاتے ہیں اور بعضے ظاہری تقدس کی حفاظت کے لئے عورتوں سے بچتے ہیں کہ اس میں آدمی جلد بدنام ہو جاتا ہے، نو عمر لڑکوں سے مبتلا ہو جاتے ہیں، جو اس سے بھی بڑھ کر فتنہ ہے۔ کیونکہ عورت کسی حالت میں بھی محل حلت تو ہے۔ بخلاف اس کے حرام محض

ہے۔ پھران میں بعض اصل فعل سے تو بچتے ہیں مگر بوس و کنار وغیرہ کے مقدمات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جس میں دوسرے بدگمان نہ ہوں۔ حتیٰ کہ خود جس سے متمتع ہو رہے ہو اس کو بزرگانہ شفقت پر محمول کر لے گا۔ نعوذ باللہ من الفتن ماظہر منھا وما بطن" (ص ۱۴۳)

لڑکی کے مال پر نظر۔ "ایک کوتاہی یہ ہے کہ لڑکی کے مال کو دیکھتے ہیں اور درحقیقت اس سے کیا بدتر ہے کہ لڑکی یا لڑکی والے مال کو دیکھیں۔ کیونکہ وہ تو اگر غلو نہ ہو معقول ہی ہے کیونکہ مرد پر نفقہ ہے، تو اس کی استطاعت کو دیکھنے میں مضائقہ نہیں بلکہ ایک قسم کی ضروری مصلحت ہے۔ البتہ غلو نہ چاہئے کہ اس کو دوسرے ضروری اوصاف پر ترجیح دی جائے۔ لیکن عورت کے مال پر نظر کرنا کہ ہم اس سے متمتع ہوں گے انفقات وغیرہ کا بار کم پڑے گا، بڑی بے غیرتی و بے حمیتی ہے۔

جو باز باش کہ صیدے کنی و لقمہ دہی طفیل خوار مشوچوں کلاغ بے پرو بال

"البتہ اگر منکوحہ کے زیادہ مفلس نہ ہونے پر ایک مصلحت کے حصول اور ایک مضرت کے دفع کے لئے نظر کی جائے تو نازیبا نہیں بلکہ مناسب ہے۔ منفعت یہ ہے کہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ مفلس محض میں دو امر کی کمی ہوتی ہے ایک سلیقہ کی دوسری سیر چشمی کی سلیقہ کی کمی سے اس میں خدمت کی لیاقت نہیں ہوتی اور سیر چشمی کی کمی سے بعض اوقات ضروری خرچ میں کمی کرتی ہے، جس سے بعض اہل حقوق کے حقوق بھی ضائع ہوتے ہیں اور بعض مواقع پر شرمندگی ہوتی ہے، کسی مہمان کو روٹی کم دے دی کسی حاجت مند سائل کو محروم کر دیا اور مضرت یہ ہے کہ بعض کو دیکھا گیا ہے کہ دفعتہً مال و دولت دیکھ کر آنکھیں پھٹ جاتی ہیں اچھلنے لگتی ہیں اور سلیقہ ہوتا نہیں بدتمیزی سے اڑانا شروع کر دیتی ہیں۔ چنانچہ اکثر نو دولتیوں کو یا تو بخل کی بلا میں مبتلا پایا یا اسراف کی۔ اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ خاوند کے گھر سے اس کو محبت نہیں ہوتی۔ نقد الگ جنس الگ کبھی ظاہر میں کبھی خفیہ جس طرح بن پڑتا ہے اپنے میکے والوں کو بھرنا شروع کر دیتی ہے۔ عمر بھر یہی نزلہ بہتا رہتا ہے، جس سے گھر میں بے حد بے برکتی ہوتی ہے اور یوں کسی کی طبیعت خاص رنگ کی ہو اس کا ذکر

نہیں"۔

سبحان اللہ ہر بات اپنی جگہ پر ہے۔ کسی امر کی اصلاح و تجدید میں افراط و تفریط یا حدود سے تجاوز نہیں یہی توسط و اعتدال اسلام کی صراط مستقیم ہے، ورنہ اگر ایک طرف دولتمند سسرال اور لڑکی کی تلاش ہے، تو دوسری طرف یہ بھی سنا کہ لڑکی تو بس غریب ہی بھائی کے گھر کے ٹھیک ہوتی ہے، یہی افراط و تفریط مسلمانوں میں ہر معاملہ میں پیدا ہو گئی ہے۔ اور ان کے مصلحین کی نظر بھی بالعموم ایک ہی طرف ہوتی ہے۔

اور حماقت۔ "ایک کوتاہی یہ ہے کہ جس طرح بعض لوگ لڑکے کے بی۔ اے ایم۔ اے ہونے کو دیکھتے ہیں افسوس ہے کہ بعضے نئے مذاق کے منکوحہ ایسی تلاش کرتے ہیں جس نے نئی تعلیم حاصل کی ہو یا تعلیم کے ساتھ ڈاکٹری وغیرہ بھی پاس ہو۔ کوئی ان عقلا سے پوچھے کہ اس سے مقصود کیا ہے۔ اگر یہ کہ یہ خود بھی کمانے میں امداد دے، تو بے حد بے حمیتی ہے کہ مرد ہو کر عورت کے ہاتھ کو تکا جاوے .... اگر یہ مقصود ہے کہ ایسی عورت سلیقہ دار ہو گی راحت زیادہ پہنچا دی گی، سو خوب سمجھ لو کہ راحت رسانی کے لئے صرف سلیقہ کافی نہیں بلکہ اطاعت خلوص و خدمت گزاری کے مادہ کی اس سے زیادہ ضرورت ہے۔ اور اگر نرا سلیقہ ہو اور یہ اوصاف نہ ہوں، تو اول تو وہ خدمت ہی کیوں کرے گی۔ کیونکہ تجربہ سے اس جدید تعلیم کا اثر یہ ثابت ہوا ہے کہ اس سے تکبر خود غرضی و خودرائی اور بیباکی آزادی بےحیائی چالاکی نفاق وغیرہ اخلاق ذمیمہ پیدا ہو جاتے ہیں جو تمام اخلاق ذمیمہ کی جڑ ہیں، تو وہ تمہاری خدمت و راحت کی کیا پرواہ کرے گی الٹے تم سے اپنے بیجا حقوق کا مطالبہ کرے گی بلکہ عدالت تک پہنچے گی۔ اور اگر کہو کہ یہ بہت کم ہوتا ہے، تو عرض کروں گا کہ پھر وہ تعلیم یافتہ نہیں۔ اگر کہو کہ ہم ایسی تعلیم یافتہ نہیں چاہتے بلکہ کسی قدر نئی تعلیم سے بہرور ہو تو نیز وہ بیشک اس قدر خطرناک نہ ہو گی لیکن آزادی و بےحیائی مکر و فریب چالاکی و نفاق اس پوری اور ادھوری تعلیم سب کا مشترک تحفہ ہے .... میں تو کہتا ہوں کہ عورت میں کوئی ہنر بھی نہ ہو لیکن حیا ہو تو اور کچھ نہیں عورت تو ہے، لیکن حیا نہ ہو تو وہ سب کچھ عورت نہیں اور نکاح کے مصالح کے لئے چاہئے عورت

جب وہ حکماً عورت ہی نہیں تو پھر نکاح سے کیا فائدہ۔ باقی بالائی مصالح کے لئے چار مہذب نوکر رکھ لو اور آب ریزی کے لئے اہل فرانس نے بہت سے طریقے ایجاد کر لئے ہیں ان پر کفالت کر لو رہی اولاد، وہ ہر بدتر عورت سے بھی حاصل ہو سکتی ہے، اس کے لئے اتنی کج و کاو بیکار"۔

"البتہ اگر عورتوں میں تعلیم ڈھونڈھی جاوے تو علوم دینیہ کی جو انسان کو کامل مہذب بناتی ہے۔ بشرطیکہ عمل ہو اور غالب یہ ہے کہ جب علم دین حاصل ہوتا ہے تو کبھی کبھی عمل کی بھی توفیق ہو ہی جاتی ہے۔ اصل میں دینی تعلیم سے خدا تعالیٰ کا خوف پیدا ہوتا ہے، جو ساری تہذیب اور حقوق شناسی کی بنیاد ہے"۔

اس کے بعد شہادت و رضاعت ولایت وغیرہ کے بارے میں اور تحلیل محرمات یا تحریم محلات یعنی حرام عورتوں کو حلال بنانے یا حلال کو حرام قرار دے دینے وغیرہ کی جو کوتاہیاں ہوتی ہیں ان کا بیان فرمایا گیا ہے۔ چھوڑنے کے قابل تو وہ بھی نہ تھیں، مگر مضمون نے رسالہ کی صورت اختیار کی اور رسالہ اب کتاب بن گیا ہے۔ راقم ہذا خود حیران ہے کہ کیا لے کیا چھوڑے۔ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم۔ بہرحال آگے کچھ کفو وغیرہ کی زیادہ عام کوتاہیوں کو گنایا جاتا ہے۔

نسب کے متعلق ایک بڑی غلطی: کفاءت یعنی زوجین کے باہم کفو و ہمسر یا برابر ہونے میں شریعت نے جن جن اوصاف کا اعتبار کیا ہے ان میں سے ایک نسب یا ذات پات بھی ہے۔ اس کے متعلق جو کوتاہیاں ہوتی ہیں، ان میں سے ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ

> "نسب میں ماں کا بھی اعتبار کرتے ہیں۔ اگر ماں کسی کی نجیب نہ ہو تو اس کو نجیب نہیں سمجھتے اور اس لئے اپنا ہمسر نہیں جانتے۔ حالانکہ شریعت نے اس باب میں ماں کا کچھ اعتبار نہیں کیا۔ لہٰذا جس کا صرف باپ ہی نجیب ہو وہ نجیب الطرفین ہمسر یا کفو ہے۔ صرف ایک استثناء ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیادت نسبیہ حضرت فاطمہؓ کے لئے بھی ثابت

ہے، وہ بھی سید ہیں اور دوسرے بنی ہاشم سے افضل ہیں۔ حتیٰ کہ جو لوگ حضرت علیؓ کی اولاد سے ہوں مگر حضرت فاطمہؓ کے بطن سے نہ ہوں وہ سید نہ ہوں گے۔ بلکہ علوی ہوں گے۔ اور بعض نسب ناموں میں جو علویوں کے ساتھ لفظ سید ملا ہوا ہے صحیح نہیں"۔

ایک اور بڑی کوتاہی۔ یہ ہے کہ "نسب پر فخر بہت کرتے اور دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ نسب کوئی فخر کی بات نہیں حق تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جس پر شکر کرنا چاہئے، نہ کہ کبر و تحقیر جو کہ پوری ناشکری ہے۔ خصوصاً جب کہ اس پر کوئی کافی دلیل نہیں کہ یہ فخر کرنے والے جس جد کی طرف انتساب کا دعویٰ کرتے ہیں صحیح بھی ہے۔ بلکہ بعض قرائن سے خلاف کا شبہ ہوتا ہے۔ ایک شبہ احقر نے بڑے بڑے مجمعوں میں جہاں ایسے حضرات کا اجتماع تھا بیان کیا وہ یہ کہ اکثر جگہ لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ چند صحابہ کی طرف اپنے کو منسوب کرتے ہیں مثلاً حضرات خلفائے اربعہ حضرت عباسؓ حضرت ابوایوب انصاریؓ اب خلجان یہ ہے کہ کیا ہندوستان میں فتوحات و غزوات کے سلسلہ میں ان ہی حضرات کی اولاد منتخب ہو کر آئی تھی یا اوروں کی نسل منقطع ہو گئی۔ ایسے شبہ کے ہوتے اس قدر فخر کرنا نادانی نہیں تو کیا ہے"۔

اس سے بھی اشد حرکت۔ یہ ہے کہ "جو لوگ عرفاً شریف نہیں زبردستی اپنے کو اصطلاحی شریفوں میں داخل کرتے ہیں اور غیر معروف و غیر ثابت کا محض مجازفت سے دعویٰ کرتے ہیں۔ حدیث میں ایسے مدعی پر لعنت آئی ہے ان عرفی غیر شریفوں میں بعض اس دھبہ کو دھونے کے لئے سرے سے نسبی شرافت ہی کی نفی کرنے لگے کہ سب بنی آدم برابر ہیں۔ اس کا اگر یہ مطلب ہے کہ یہ ایسا شرف نہیں جس پر دنیوی فخر کیا جائے یا جس کو اخروی نجات میں کچھ دخل ہو تو ٹھیک ہے۔ اور نصوص وغیرہ میں ایسے مضامین سے ہی انتفایے فخر مقصود ہے اور اگر مطلب ہے کہ شرف نسب کا بالکلیہ کسی حکم میں اعتبار نہیں تو محض غلط ہے۔ خود شریعت نے نکاح میں اس کا اعتبار کیا ہے، (امامت کبریٰ میں قریشیت کو شرط ٹھہرایا ہے اور امامت صغریٰ (یعنی نماز کی امامت) میں اس کو مرجحات

میں ٹھہرایا ہے"۔

ایک اور عجیب منطق: یہ ہے کہ "بعض قصباتی دیہاتی لوگ تمام پردیسیوں کو (خواہ بجائے خود وہ ان سے زیادہ شریف النسب ہوں) رذیل سمجھتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک شرافت چند قریوں میں محصور ہے جس پر کوئی دلیل نہیں۔ اسی وجہ سے اگر کوئی شخص باہر سے نکاح کر کے لاوے برادری کی عورتیں ہرگز اس کو اپنے برابر نہیں سمجھتیں اور اس کی اولاد کی برادری میں شادی مصیبت ہو جاتی ہے۔

افراط و تفریط۔ عملاً اس باب میں افراط و تفریط کی دو کوتاہیاں ہیں کہ ایک طرف تو "بعضے لوگ خصوصاً پرانے زمانہ کے اس کو اس قدر مہتم بالشان سمجھتے ہیں کہ اور کسی وصف کو نہیں دیکھتے نہ لیاقت کو نہ دین کو نہ صحت کو نہ عمر کو نہ مالی وسعت کو اور اس عنوان سے فخر کرتے ہیں کہ میاں ہڈی بوٹی اچھی ہونی چاہئے۔ کسی ظریف نے نہایت لطیف جواب دیا کہ ہم تو کتے نہیں ہیں جو فقط ہڈی بوٹی کو دیکھیں۔ واقعی اس خیال کا لغو ہونا ظاہر ہے۔
"بعض دفعہ ایسا ناکح محض نالائق بد دین یا مریض بیکار یا بہت بوڑھا یا بالکل بچہ یا فاقہ زدہ ہوتا ہے اور منکوحہ کو عمر بھر کا جیل خانہ ہو جاتا ہے۔"
دوسری طرف تفریط یہ ہے کہ "بعضے لوگ خصوصاً نئے زمانہ کے دوسرے اوصاف کے ہوتے ہوئے نسب کا لحاظ نہیں کرتے کہیں حب دین کے غلبہ میں اور کہیں حب دنیا کے غلبہ میں اور زیادہ حب دنیا ہی کا غلبہ ہوتا ہے"۔

خود ساختہ فیصلہ۔ "اور بعض نے اس افراط و تفریط کے درمیان بزعم خود ایک معتدل فیصلہ اختراع کیا ہے کہ کم ذات کو خواہ لڑکی دے دے مگر لے نہیں۔ اور نکتہ یہ نکالا ہے کہ کم ذات کے گھر لڑکی چلی گئی تو اس کی نسل سنورتی ہے .... اس حکم کی بنا میں شریعت کے ساتھ یہ مخالفت کی نسب میں ماں کا اعتبار کیا حالانکہ شرع نے صرف باپ کا اعتبار کیا ہے۔ دوسری مخالفت یہ کہ اصل حکمت اس اعتبار کفائت کی یہ ہے جیسا کہ در مختار میں ہے

کہ شریف عورت کمینہ کی ہم بستری سے ابا کرتی ہے پس یہ فیصلہ ہر طرح بناء فاسد علی الفاسد ہے۔

"یہ قانون شرعی کی تفصیل تھی۔ باقی مصلحت یہ ہے کہ منکوحہ بھی اپنے کفو کی ہو۔ غیر کفو کے عادات و اخلاق اکثر موافق نہیں ہوتے تو ہمیشہ ناچاقی رہتی ہے۔ نیز منکوحہ مرد کے خاندان میں بےقدر رہتی ہے، تو مسلمان عورت کو بےوجہ مدت العمر بیقدر کرانا کیا ضرور۔ نیز عرفاً اس کی اولاد کی شادی میں دشواریاں پیش آتی ہیں تو بلا ضرورت ان کلفتوں میں کیوں پڑے"۔

عام و عظیم غلطی: ایک اور عام و عظیم غلط فہمی ہے کہ کفو و غیر کفو کے مسئلہ میں صرف نسب کا اعتبار کرتے ہیں۔ حالانکہ شریعت میں دیگر اوصاف کا بھی اعتبار کیا گیا ہے، اور سب سے اہم واقدام دین ہے۔

"اس میں بھی نسبی کفاءت کی طرف عورت کا مرد سے کم ہونا مضر نہیں۔ مرد کا عورت سے کم ہونا مضر ہے۔ سو اس میں چند کوتاہیاں ہو رہی ہیں۔ جن کی تحقیق یہ ہے کہ مرد کی بددینی تین طرح کی ہوتی ہے۔ ایک اصول اعتقاد میں دوسرے فروع اعتقاد میں اور تیسرے عمل میں۔

"قسم اول جیسے عورت مسلمان ہو اور مرد غیر مسلمان خواہ کتابی یا غیر کتابی۔ اس کا حکم ظاہر ہے کہ سرے سے نکاح ہی صحیح نہ ہو گا۔ البتہ عورت کتابیہ ہو تو نکاح درست ہو جاتا ہے گو مناسب نہیں کیونکہ کافرہ کا اختلاط یا میل جول بہرحال برا ہے۔ اور درست بھی جب ہی ہے کہ عورت واقعاً باعتبار عقائد کے یہودی یا عیسائی ہو اور اگر صرف قوم کے اعتبار سے ہو جیسے آج کل بہت سے نام کے عیسائی ہیں اور عقیدہ میں دہری ایسی عورت سے نکاح ہرگز درست نہیں۔

"قسم ثانی جیسے عورت سنیہ ہو اور مرد متبدع جیسے شیعی وغیرہ۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کی بدعت حد کفر تک پہنچ جائے مثلاً حضرت عائشہؓ کو تہمت لگانا وحی لانے میں حضرت جبریل کی طرف غلطی منسوب کرنا وغیرہ یا اس

زمانہ میں مرزا کی نبوت کا قائل ہونا تو اس کا حکم بھی قسم اول کا ہے۔ یعنی ایسے شخص سے سنیہ کا نکاح جائز نہیں۔ اور اگر اس کی بدعت کفر تک نہیں پہنچی تو وہ مسلمان تو ہے مگر سنیہ کا کفو نہیں۔ اور اس کا حکم وہی ہے جو نسبی غیر کفو کا۔

بعض متبدع فرقوں کے کفر میں علماء کا اختلاف ہے، جیسے شیعہ۔ سو ان کے مکفّرین کے نزدیک تو سنیہ کا نکاح ایسے شخص سے باطل ہے اور غیر مکفّرین کے نزدیک یہ نکاح غیر کفو ہے، جس کی وہی تفصیل ہے، جو ابھی غیر کفو کے ساتھ نکاح ہونے میں مذکور ہوئی"۔

حضرت کا جامع حکمت و مصلحت فتویٰ۔ لیکن حضرت علیہ الرحمہ کا اس معاملہ میں جو فتویٰ و معمول تھا وہ حسب معمول احتیاط و اعتدال اور حکمت و مصلحت کا جامع ہے۔ فرماتے ہیں کہ

"احقر کا معمول اس مختلف فیہ صورت میں فتویٰ دینے کا یہ ہے کہ جب تک نکاح نہ ہوا ہو بطلان نکاح کے قول پر عمل لازم ہے کہ اس میں احتیاط ہے کہ ایک خوش اعتقاد عورت کا ایک بداعتقاد مرد سے نکاح ہو اور بداعتقاد بھی ایسا جس کی بداعتقادی بعض کے نزدیک حد کفر تک پہنچی ہو۔ اور جب نکاح ہو چکا تو صحت نکاح کے قول کو قبول کرنا لازم ہے کہ اس میں احتیاط ہے کیونکہ اگر اس صورت میں بطلان کا قول لے کر دوسرے سے نکاح کر دیا جائے تو احتمال ہے کہ واقع میں پہلا نکاح صحیح ہو گیا ہو تو دوسرا ہمیشہ کے لئے زنا ہوا اور صحت نکاح کے قول پر اس احتمال کا اعتبار نہیں گیا اس لئے کہ الاسلام یعلو ولا یعلی۔

"قسم ثالث جیسے عورت صالحہ ہو اور بقول بعض فقہا صالح شخص کی لڑکی بھی صالحہ کے حکم میں ہے اور مرد فاسق ہو یا بقول بعض فقہا کے معلن ہونا بھی شرط ہے تو یہ مرد اس عورت کا کفو نہیں"۔

غیر کفو کی تین قسمیں اور ان میں کوتاہیاں: غرض یہ تین قسمیں ہیں غیر کفو کی اب ان میں جو کوتاہیاں ہوتی ہیں ان کا مختصر بیان یہ ہے کہ بعضے لوگ یورپ سے ایسی عورت لاتے ہیں جو صرف قوم کے اعتبار سے عیسائی ہوتی ہے اور مذہب کے اعتبار سے محض لامذہب۔ ایسی صورت میں ہرگز نکاح صحیح نہیں۔ بعضے گو لاتے عیسائی ہی عورت مگر اس سے اس قدر مغلوب ہو جاتے ہیں کہ رفتہ رفتہ خود اپنے مذہب سے اجنبی ہو جاتے ہیں، اس سے بھی احتراز کا واجب ہونا ظاہر ہے۔

"بعضے لوگ محض مال و جاہ کی طمع میں یا دیگر موہوم خاندانی مصالح وغیرہ کے سبب کسی بد عقیدہ یا بدعمل مرد سے نکاح کر دیتے ہیں۔ کبھی وہ بد اعتقادی حد کفر تک پہنچی ہوتی ہے تو عمر بھر کے علاوہ ظاہری کلفت کے جو آئندہ اولاد ہوئی وہ بھی غیر حلالی۔ اور اگر کفر تک نہ پہنچے تب بھی ہر وقت کا سوہان روح نقد حال رہتا ہے۔ اس باب میں احتیاط لازم ہے۔

"خصوصاً اس کی تحقیق قبل نکاح ضروری ہے کہ ناکح کسی گمراہ فرقہ کا معتقد نہیں۔ اور صرف قدیم گمراہ فرقوں سے نہ ہونے پر بھی قناعت نہ کی جاوے۔ آج کل روزانہ نئے نئے فرقے نکل رہے ہیں اور زمانہ آزادی کا ہے، اس لئے نئے فرقوں میں بھی نہ ہونے کی مستقل تحقیق ضروری ہے۔ اسی طرح اگر وہ انگریزی خواں ہے تو دیکھ لیا جاوے کہ جدید تعلیم کے اثر سے اس کی آزادی استخفاف دین یا انکار ضروریات دین تک تو نہیں پہنچی ہے۔ ورنہ اگر ایک کلمہ بھی کفر کا منہ سے نکل گیا تو بدوں تجدید اسلام و تجدید نکاح حرام کا ارتکاب ظاہر ہے۔ جس کو نہ اسلامی غیرت قبول کرتی ہے نہ اسلامی حمیت"۔

مہلک غفلت: بے احتیاطی کیا اس معاملہ میں تو آج کل دونوں طرف نہایت مہلک بے پروائی و غفلت پھیل گئی ہے۔ ایک طرف تو ہمارے انگریزی خواں صاحبزادوں میں ضروریات دین سے صاف و قطعی انکار تو خیر کم ہے، لیکن استخفاف دین تو اکثروں میں قدم قدم پر ہے، جس کی وجہ ظاہر ہے کہ قلب نئے تعلیمی ماحول کی صحبت و آزادی، اور اساتذہ اور کتابوں وغیرہ کی نوعیت کی بدولت خدا اور رسول کی عظمت یا خوف آخرت تو قلب سے کہنا

چاہئے کہ رخصت ہی ہو جاتا ہے۔ پھر دین کا استخفاف و استہزا نہ ہو تو تعجب ہے۔ اور یہ استخفاف و استہزا یقیناً بارہا کفریہ کلمات تک پہنچتا ہے دوسری طرف دنیا طلبی اور جاہ پرستی اس قدر ہر طبقہ پر مسلط ہے کوئی بی۔ اے۔ ایم۔ اے ذرا معقول تنخواہ یا معزز عہدہ والا دیکھ کر ہمارے علماء و مشائخ تک کے منہ میں پانی بھر آتا ہے، تو پھر اس کے دین و بد دینی کی فکر و تحقیق کس کو ہو! دیندار یا "مولوی" داماد اگر کوئی ملتا بھی ہو، تو "مسٹر" کے مقابلہ میں اکثر خود ہمارے بڑے بڑے "حضرات" اور "مولانا" اس کو ٹھکرا دیں گے! حسب ونسب دین و اخلاق سب بالائے طاق رکھ کر ہر شخص پہلا سوال یہ کرتا ہے کہ تعلیم کیا ہے۔ بی۔ اے۔ ہے یا ایم۔ اے ہے! ہمارے مولانا گیلانی فرمایا کرتے ہیں کہ نوکری و تنخواہ کی بحث بھی بعد کی ہے۔ "بہار میں تو جو بی۔ اے نہیں اس کو بی بی ملنا ہی مشکل ہے"۔ تعلیم یافتہ کا مفہوم ہی انگریزی تعلیم یافتہ ہے۔ عالم دین غریب تو گویا سرے سے "غیر تعلیم یافتہ" ہے۔ ایسی مسخ حالت میں داماد کے کفر و ایمان یا لڑکی بیچاری کے مبتلائے حرام کاری یا اولاد کے حرامی حلالی ہونے کی طرف ذہن ہی کس کا جاتا ہے کہ اس کی تحقیق و تفتیش ہو! اور "تعلیم یافتہ" تو اکثر ایسی ضروری تحقیق کی بھی ہنسی اڑائیں گے جس کی وجہ وہی استخفاف دین ہے۔

مہر کا معاملہ۔ اب مہر کا معاملہ لیجئے۔

"اس میں ایک کوتاہی جو بعض وجوہ سے سب سے زیادہ سخت ہے یہ ہوتی ہے کہ اکثر لوگ مہر کے ادا کرنے کا ارادہ ہی دل میں نہیں رکھتے۔ پھر خواہ جانب ثانی بھی وصول کرنے کا ارادہ نہ کرے اور خواہ طلاق یا موت کسی سبب عارض سے وہ یا اس کے ورثاء وصول کرنے کی کوشش کریں، لیکن ہر حال میں زوج کی نیت ادا کرنے کی نہ ہو تو گو ان کی نظر میں یہ نہایت سرسری امر ہے، جیسا کہ مہر کی زیادتی و کمی کی گفتگو میں بے دھڑک کہہ دیتے ہیں کہ میاں کون لیتا ہے کون دیتا ہے، جس سے یہ لوگ اپنے اعتقاد کا صریح اقرار کرتے ہیں کہ مہر محض نام ہی کرنے کو ہوتا ہے، دینے لینے کا کوئی تعلق نہیں۔ سو اول تو یہ دعویٰ فی نفسہ بھی غلط و باطل ہے اور نص شارع ایک لازم و واجب حق ہے، اور مثل دیگر دیوں کے دین مہر کا ادا کرنا بھی فرض ہے اور ادا کی نیت نہ رکھنا اتنی بڑی سخت بات

ہے کہ .... ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص عورت سے نکاح کرے اور اس کا کچھ مہر ٹھہرا دے پھر نیت رکھے کہ اس مہر میں اس کو کچھ نہ دے گا یا پورا نہ دے گا تو وہ شخص زانی ہو کر مرے گا اور اللہ سے زانی ہو کر ملے گا۔ یہ کتنی بڑی سخت وعید ہے کہ باوجود صورت نکاح پھر بھی اس شخص کا شمار زانیوں میں ہوا .... نیز اس حدیث کا ایک جز اور بھی ہے کہ اگر کسی سے کچھ خریدے اور اس کی قیمت ادا کرنے کی نیت نہ رکھے یا کسی کا کچھ دین ہو یا قرض لیا ہو اور ادا کرنا نہ چاہتا ہو تو ایسا شخص موت کے وقت اور قیامت کے روز خائن اور چور ہو گا۔ اور ظاہر ہے کہ مہر ایک دین ہے تو ایسے شخص پر دو جرم ہوئے زانی ہونے کا بھی اور خائن و سارق ہونے کا بھی۔ کیا اب بھی یہ کوتاہی ہی قابل تدارک نہیں۔

"اور تدارک یہی ہے کہ ادا کرنے کی مصمم نیت رکھی جاوے۔ مگر تجربہ و وجدان شاہد ہے کہ اکثر مصمم نیت اس عمل کی ہو سکتی ہے جس پر عادۃً قدرت ہو، ورنہ نیت کا محض تخیل ہوتا ہے تحقق نہیں ہوتا اور ظاہر ہے کہ جس شخص کو سو روپیہ دینے کی بھی قدرت نہ ہو وہ لاکھ سوا لاکھ کیا دس پانچ ہزار دینے پر بھی قادر نہیں ہوتا تو اس کے ادا کرنے کی نیت بھی نہ رکھے گا اور لامحالہ وعید بالا کا محل بنے گا۔ پس نیت ادا کے تحقق کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ وسعت سے زیادہ مہر نہ مقرر کیا جاوے۔ اور چونکہ وسعت اکثر لوگوں کو اکثر زمانوں میں قلیل ہی ہوتی ہے اس لئے اسلم واحوط طریقہ یہی ٹھہرا کہ مہر قلیل ہو۔

"اسی واسطے حدیثوں میں مہر زیادہ ٹھہرانے کی کراہیت اور کم ٹھہرانے کی ترغیب آئی ہے۔ حضرت عمرؓ نے خطبہ میں فرمایا کہ مہر میں زیادتی نہ کیا کرو کیونکہ یہ اگر یہ دنیا میں عزت کی بات یا اللہ کے نزدیک تقویٰ کی بات ہوتی تو سب سے زیادہ اس کے مستحق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو کسی بی بی اور کسی بیٹی کا مہر چار اوقیہ سے زیادہ نہیں ہوا (ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے اور ایک درہم قریباً چار آنے چار پائی کا)۔

اور اگر حضرت عمر کی روایت پر کسی عجوزہ کے مشہور معارضہ کے بعد حضرت عمرؓ کے رجوع کا شبہ ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہو گئی تھی کہ اس کو

ایک قانون بنادیں کہ ایک مقدار خاص سے زیادہ مقرر کرنا باطل قرار دیا جاوے اور اس کو واجب بھی نہ کیا جاوے سو اس سے آپ نے رجوع فرمالیا یعنی ایسا قانون نہیں بنایا۔

باقی رہا کہ تقلیل کی بھی کوئی حد ہے یا نہیں سو امام شافعی کے نزدیک اس کی کوئی حد نہیں قلیل سے قلیل مقدار بھی مہر بن سکتی ہے۔ بشرطیکہ متقوم ہو خواہ ایک ہی پیسہ ہو اور احادیث کثیرہ کے ظاہر الفاظ اس کے موافق ہیں۔ اور امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ کے نزدیک اس قلیل کی حد دس درہم ہے۔ یعنی اس سے کم جائز ہی نہیں حتی کہ اس سے کم تصریحاً مقرر بھی کیا جاوے تو بھی دس درہم ہی واجب ہوں گے۔ اور امام صاحب کی دلیل میں بھی کچھ حدیثیں مشہور ہیں۔ اس کی مزید تحقیق احیاء السنن اور اس کی تعلیق ہے، باقی تمسکات شافعی کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ وہ سب مہر معجل پر محمول ہیں۔ اور موضع اختلاف میں احوط پر عمل مناسب ہے اور دس درہم کا جواز متفق علیہ ہے اس لئے احوط بھی یہی ہے۔
(ص ۱۷)

زیادتی مہر کی دنیوی خرابیاں: دینی گناہ و وبال کے سوا زیادتی مہر کی دنیوی خرابیوں کا یہ حال ہے کہ

"مثلاً بہت جگہ موافقت نہیں آتی اور زوجہ کے حقوق ادا نہیں کئے جاتے، مگر طلاق اس لئے نہیں دی جاتی کہ مہر زیادہ ہے لوگ دعویٰ کر کے پریشان کریں گے۔ پس کثرت مہر بجائے اس کے کہ عورت کی مصلحت کا سبب ہوتا الٹے اس کی کلفت کا سبب ہو گیا۔ بعض عقلا کثرت میں یہ بھی۔ مصلحت سمجھتے ہیں کہ چھوڑ نہ سکے گا۔ مگر یہ نہیں سمجھتے کہ چھوڑ نہ سکنا ہر جگہ تو مصلحت نہیں مثلاً اسی صورت مذکورہ میں۔

یہ تو عورت کے لئے مصیبت ہوئی اور زوج کے لئے یہ کہ اگر طلاق یا موت کی صورت میں دعویٰ ہو گیا تو جو سیکڑوں کی حیثیت نہیں رکھتا اگر اس کو ہزاروں لاکھوں ادا کرنے پڑے، تو "وہ خود یا اس کے ورثاء نان شبینہ کو محتاج ہو جاتے ہیں۔

یہ سب تو کثرت مہر کی وہ خرابیاں ہیں، جب ادا نہ کیا جائے یا ادا کا ارادہ نہ ہو۔ اور اگر مرد پر خدا کا خوف غالب ہو اور سبکدوش ہونا چاہا تو اتنی مقدار ادا کرنا اکثر اس کے تحمل سے زیادہ ہوتا ہے، اور طرح طرح تنگی برداشت کرنا پڑتی ہے۔ پھر اس سے دل میں تنگی و پریشانی ہوتی ہے۔ یہ تو مرد کو تکلیف ہوئی، اور چونکہ اس کا سبب عورت ہے، اس لئے انجام کار اس سے انقباض پھر انقباض سے تنفر بلکہ عداوت تک پیدا ہو سکتی ہے تو اتحاد زوجین سے جو نکاح کے مصالح تھے وہی برباد ہوئے۔ اوپر جو خطبہ حضرت عمرؓ کا مذکور ہوا اس میں یہ بھی ہے کہ ان احدکم یغلے صدقہ المراۃ حتی یکون لھا عداوۃ فی نفسہ الخ"۔

چنانچہ اس کا تجربہ خود حضرت علیہ الرحمہ کو ہوا فرماتے ہیں کہ "میری ایک اہلیہ کا مہر پانچ ہزار اور دوسری کا پانچ سو تھا بفضلہ تعالیٰ دونوں ادا کئے گئے۔ مگر اول کے ادا میں جو گرانی ہوئی اگر والد صاحب مرحوم کا ذخیرہ اعانت نہ کرتا تو وہ گرانی ضرور کدورت کی صورت پیدا کرتی"۔ یہی تجربہ اب اس احقر راقم کو ہو رہا ہے کہ مرحومہ بی بی کا مہر پانچ ہزار تھا، اور گو انہوں نے معاف کر دیا تھا، مگر اب اس معافی پر قلب راضی و مطمئن نہیں، اور ورثا کو ادا کر دینے کا جی چاہ رہا ہے، اور گو یہ مقدار بوقت نکاح میری حیثیت سے زائد نہ تھی اور اب بھی انشاء اللہ انتظام ہو جائے گا۔ تاہم اس وقت جبکہ ادا کا خیال ہوا تو پنشن کی کمی اور مصارف و گرانی کی زیادتی کی بدولت، اس میں بھی گرانی و تنگی لاحق ہو رہی ہے جس سے معلوم ہوا کہ آدمی کے حالات و خیالات بدلتے رہتے ہیں اس لئے حیثیت و وسعت کے باوجود مہر میں قلت ہی اسلم واحوط ہے، کہ جس وقت بھی ادا کا ارادہ کرے آسانی و انشراح قلب کے ساتھ بے تکلف ادا کر دے۔ اس سلسلہ میں معافی مہر کا جو رواج ہے، اس کی قباحت بھی سن لیجئے۔

معافی کی ذلت۔ "اگر کوشش پر بھی ادا نہ ہو سکا تو نفس میں ایک دوسری خلاف غیرت کم ہمتی پیدا ہوتی ہے کہ عورت سے معاف کرایا جائے۔ سو اول تو معافی کی درخواست کا

پورا کرنا اس کے اختیار میں ہے (اگر نہ معاف کیا اور مرد باوجود کوشش نہ ادا کر سکا تو قرض دار مرا) دوسرے خود یہ درخواست بھی ذلت سے خالی نہیں"۔

پھر یہ معافی معافی بھی جب ہے کہ "مرد طلب معافی میں حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا لحاظ رکھے کہ فان طبن لکم عن شی منه نفسا الایہ۔ یعنی بالکل بطیّب خاطر اور خوشدلی سے وہ معاف کر دیں۔ ورنہ اگر غیرت کے ساتھ خشیت بھی مفقود ہے، تو وہ صرف لفظی معافی کی ناجائز تدبیر نکالے گا، یعنی عورت کو دھوکا دے گا، دھمکائے گا جبر کرے گا۔ مگر یاد رہے کہ ایسی معافی عنداللہ ہرگز معتبر و مقبول نہیں"۔ اور بدستور قرضدار ہی رہا"۔

زیادتی مہر کی مزعومہ مصلحت۔ رہی زیادتی مہر میں شوہر پر دباؤ کی مصلحت تو جو دینے والے نہیں ان کو کون دبا سکتا ہے۔

"ایسے واقعات پیش نظر نہیں کہ بڑے بڑے مہروں کے مدیوں ہیں باوجود اس کے منکوحہ کا کوئی حق ادا نہیں کرتے اور نہ دوسری طرف ملتفت ہونے سے رکتے ہیں۔ خواہ حلال ہو یا حرام۔ ایسے ظالموں کا کوئی کچھ نہیں کر سکتا خواہ اس وجہ سے کہ وہ صاحب وجاہت ہے اس سے ڈرتے ہیں خواہ اس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں اور نرا جیل خانہ کرانے سے کیا ملتا ہے۔ پھر داماد کے جیل سے اپنی بیٹی کو کیا آرام ملا"۔

"بعض لوگ یہ مصلحت بیان کرتے ہیں کہ قلت میں ذلت ہے اور کثرت میں عزت سو اول تو ہر قلت میں جبکہ وہ درجہ اعتدال پر ہو ذلت نہیں دوسرے اگر ایک مصلحت بھی ہوئی مگر مفاسد لاتعداد وہ تو مصلحت ہی کیا .... حقیقت یہ ہے کہ سب رسم پرستی ہے ورنہ واقع میں مصلحت کچھ نہیں اور مفاسد طرح طرح کے۔ پس رسم کو چھوڑو اور عقل و شرع کا اتباع کرو"۔

البتہ ایک دشواری مہر مثل کی رہ جاتی ہے تو اس کا یہ حل بیان فرما دیا گیا ہے کہ

مہر مثل کا حل۔ جن صورتوں میں مہر مثل سے کم مقرر کرنا ولی یا عورت کو جائز نہیں وہاں اس پر عمل کی صورت یہ ہے کہ سب متفق ہو کر اپنے عرف کو بدل لیں، جس سے خود

قلیل ہی مہر مثل بن جاوے گا"۔

مبہم مقدار مہر. "ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض بدون ذکر مقدار محض شرع محمدی کے عنوان سے مہر ٹھراتے ہیں اور پھر اس کے مفہوم کی تعیین میں کوئی اصطلاح نہیں بیان کرتے تو اس طرح ٹھرانا بجائے نہ ٹھرانے ہی کے ہے، جو گناہ ہے، جیسا کہ اوپر مہر ادا کرنے کی نیت نہ ہونے کو مشابہ زنا کے قرار دینے کی تقریر میں مذکور ہوا۔ پھر اگر کسی وقت وصول کے لئے نزاع ہو تو کیا مقدار ادا کی جائے گی۔ اور چونکہ ساری قوم کی قوم میں یہی رسم ہے، اس لئے مہر مثل کی تحکیم بھی دشوار ہے۔ اور اسی قبیل سے بعض نواح کی یہ رسم معلوم ہوئی کہ سوا سیر کودوں کے عنوان سے مہر ٹھراتے ہیں، جس کی شرح تحقیق سے یہ معلوم ہوئی کہ سوا سیر کودوں کے شمار سے روپے مراد ہوتے ہیں۔ سو اگر سوا سیر کودوں کے دو انبار ہوں یقیناً ان کے شمار میں تفاوت ہو گا پس یہ مبہم رہا جس کی خرابیاں مذکور ہوئیں۔ جس کے علاوہ کثرت مقدار کی خرابیاں مزید براں"۔

بیہودگی کی انتہا. "ان سب سے، بڑھ کر بعض جگہ یہ بیہودگی سننے میں آئی کہ مچھر پسو کھٹمل کئی کئی مٹکے ٹھراتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ مہر ایسا ہو کہ شوہر کو ادا پر قدرت ہی نہ ہو سو سمجھ لینا چاہئے کہ مہر کے لئے مال ہونا شرط ہے اور یہ چیزیں جب مال ہی نہیں تو سرے سے شوہر کے ذمہ واجب ہی نہ ہونگی۔ ان کا ذکر و عدم ذکر برابر ہے اور شرح میں تغیر کا گناہ الگ رہا"۔

استغفراللہ دین و شرع کے ساتھ یہ استہزا و مذاق کے سوا کیا ہے!

ایک اور کوتاہی. یہ ہوتی ہے کہ اکثر زوجہ بعد وفات زوج اس کی تمام منقولہ و غیر منقولہ چیزوں جس جس پر قبضہ ہو سکے قبضہ کر کے دل کو سمجھا لیتی ہے کہ اپنے مہر میں رکھ لیا سو سمجھ لینا چاہئے کہ جب یہ چیزیں جنس مہر سے نہیں تو از خود مہر میں لگا لینا جائز نہیں۔ اس کے لئے یا تو حکم حاکم کی ضرورت ہے یا دوسرے ورثا کی رضامندی کی بشرطیکہ ان میں کوئی نابالغ نہ ہو اور اگر کوئی نابالغ ہو تو اس کے حصہ کے اعتبار سے پھر بھی شرط ہے کہ جائداد قیمت میں مہر

سے اس قدر زیادہ نہ ہو کہ اس کو قیمت لگانے والے زیادہ بتلائے ہوں۔ البتہ جہاں نہ حاکم سے رجوع کرنے کا سامان ہو نہ ورثا اس کا حق دینا چاہتے ہوں۔ اس خاص صورت میں البتہ اگر اس کو قدرت ہو تو جائداد مہر میں لگ سکتی ہے بشرطیکہ وہ مہر کی برابر ہو"۔

ایک کوتاہی اس کے مقابل: میں زوج سے یہ ہوتی ہے کہ اپنی رائے سے زیور کپڑا سامان یا کپڑا و زمین کوئی چیز بی بی کو دیدی اور مہر کی نیت کرلی سو سمجھ لینا چاہئے کہ مہر کے عوض میں یہ چیزیں دینا بیع ہے اور بیع میں تراضی طرفین مطلقاً شرط ہے اور بعض میں تساوی مقدار بھی شرط ہے، پس اگر ان چیزوں کا مہر میں دینا منظور ہے تو زوجہ سے صریح الفاظ میں پوچھ لینا چاہئے۔ پھر اگر وہ رضامند ہو تو اگر وہ چیز جنس مہر سے نہیں، مثلاً مہر روپیہ تھا اور یہ چیز مکان یا کپڑا ہے تو بلا شرط قلیل و کثیر کے رضامندی سے یہ مبادلہ جائز ہے اور اگر جنس مہر ہے مثلاً مہر روپیہ تھا اور چاندی کا زیور ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ دونوں کی مقدار برابر ہو"۔

ایک اور عام و عظیم غلطی: یہ ہے کہ

"اکثر عورت اپنے مرض الموت میں مہر معاف کر دیتی ہے اور زوج اس معافی سے بالکل بے فکر ہو جاتا ہے۔ سو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ معافی وصیت للوارث کی فرع ہے، جو بدوں دوسرے ورثا کی رضا کے ناجائز ہے۔ البتہ زوج کو جس قدر میراث میں پہنچے گا وہ بیشک معاف ہو جائے گا باقی واجب الادا رہے گا جو دوسرے وارثوں کو دیا جائے گا"۔

"**ایک عملی غلطی:** یہ ہے کہ عورتیں مہر مانگنے کو یا بے مانگے ہی لے لینے کو عیب سمجھتی ہیں۔ اور اگر کوئی ایسا کرے تو اس کو بدنام کرتی ہیں۔ تو اپنے حق کا مانگنا یا وصول کرنا جب شرعاً کچھ عیب نہیں تو محض رسم کی بناء پر اس کو عیب سمجھنا گناہ سے خالی نہیں"۔

ایک اہم سوال: یہ ہے کہ جس طرح قرض میں زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔

"آیا اسی طرح عورت کا جو دین مہر زوج کے ذمہ ہے، اس میں بھی زوجہ کے ذمہ زکوٰۃ ہے یا نہیں سو عوام کو اس طرف التفات ہی نہیں جس کی وجہ دین کا عدم اہتمام ہے۔ البتہ خواص کو تردد ہوا، سو ان میں جو غیر محقق تھے قیاس سے وجوب زکوٰۃ کے معتقد ہو بیٹھے۔ لیکن اس طرح سارا مہر زکوٰۃ ہی کی نذر ہو جاتا۔ اس لئے اپنے نزدیک دانائی سے کام لیکر روپیوں کے بجائے مہر میں تانبے کے ٹکوں کی رسم تجویز کی کہ یہ ٹکے اموال زکوٰۃ سے نہیں.......... اور جو محقق تھے انھوں نے فقہ کی طرف رجوع کیا تو تحقیق سے ثابت ہوا کہ جو دین بدل تجارت یا قرض ہے، وہ قوی ہوتا ہے اور مہر دین خفیف ہے۔ یہ جب تک وصول نہ ہو جائے زکوٰۃ واجب نہیں۔ اور وصول ہونے کے بعد بھی زمانہ گذشتہ کی واجب نہ ہوگی"۔

معاذ اللہ دین کے باب میں مسلمانوں کی کوتاہیوں کی بھلا کچھ حد ہے کہ ایک نکاح اور اس کے بھی محض ایک جز مہر ہی میں ہم طرح طرح کی اور کتنی بے شمار کوتاہیوں کے مرتکب ہیں۔ یہی حال ہمارا اکثر دینی احکام کے اصول و فروع میں ہے۔ پھر ہم اپنے تنزل و ادبار کے اسباب خدا جانے کہاں کہاں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ اور جس طرح امکان بھر دین کے تمام ابواب و احکام کی چھوٹی چھوٹی ہر کوتاہی کی اصلاح و تجدید کی فکر و تدبیر فرمائی گئی ہے۔ وہ یقیناً ایک جامع المجددین کی جامعیت وہمہ گیری ہی کا کام ہے۔

تعدد ازدواج: معاملات نکاح میں ایک بڑا نازک اور بڑے ابتلا کا معاملہ تعداد ازدواج کا ہے۔ حضرت جامع المجددین علیہ الرحمہ کو خود اس معاملہ سے گزارا گیا، اور اس راہ میں جو جو امتحانات و تجربات پیش آئے اور سلوک کے جو جو مقامات طے ہوئے او جس استقامت کے ساتھ اس پل صراط کو عبور کرنے کی توفیق عطا ہوئی وہ حضرت کی زندگی کی ایک مستقل اور بہت بڑی کرامت ہے۔ نیز اس سلسلہ میں امت کیلئے جو مجددانہ و حکیمانہ ہدایات فرمائی گئی ہیں، یہ سب چیزیں گوناگوں "علمی و عملی و حالی و شرعی" فوائد پر مشتمل اور حرف حرف پڑھنے اور نقل کر دینے کے لائق ہیں، تاہم اس میں بھی کچھ نہ کچھ اختصار کی کوشش ہوگی۔

یہ مضمون دراصل کسی عزیز کے نام ایک بہت طویل مکتوب کی صورت میں تحریر فرمایا گیا تھا، اور اب وہ اسی رسالہ اصلاح انقلاب میں بطور ضمیمہ شامل ہے اور قریباً اس کے بیس صفحوں میں آیا ہے اس مکتوب کا جو عنوان الخطوب المذیبہ للقلوب المنیبہ تجویز فرمایا گیا ہے۔ وہ عبرت و بصیرت کے لئے اس کی جان ہے یعنی "وہ واقعات جو خدا کی طرف رجوع ہونے والے قلوب کو گداختہ و نرم کر دیں"۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ جہاں ہماری رائے و رواج کے خلاف کوئی بات ہوئی پھر بالعموم اس میں نہ دین و شریعت کے مسئلہ کی تحقیق کی جاتی ہے نہ خدا ورسول کے حکم کی پروا ہوتی ہے، نہ کذب وافترا سے دریغ نہ بہتان و تہمت کا خیال، نہ آخرت کا ڈر نہ کل تک جس کو ولی سمجھتے تھے، اس کی ولایت و بزرگی کا پاس، بس جو جی میں آیا گلی کوچے گاتے پھرنا۔ لعن و طعن طنز و تشنیع کسی چیز سے باک نہیں یہی نہیں بلکہ شریعت کے مسلم مسائل تک کے خلاف خود ہی فتویٰ دینے لگنا۔ اب ذرا خود حضرت کے متعلق ان فتووں کو سنئے۔

حضرت کی شان میں: "جی بس مولویوں کا اعتبار نہ رہا۔ بھلا بدون پہلی منکوحہ کی اجازت کے دوسرا نکاح جائز کب ہو سکتا ہے۔ ہائے بیٹی بیٹی کہا کرتے تھے جورو بنا کر بیٹھ گئے ہائے استاد ہو کر شاگردنی کو کر بیٹھے۔ اور مریدنی بھی تو تھی، پیر میں اور باپ میں کیا فرق ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ساز باز ہو گا۔ معاذ اللہ!

حضرت علیہ الرحمہ کے مرتبہ و مقام کے ساتھ اس تہذیب و حسن ظن کا تو ذکر ہی کیا۔ جب خدا ورسول کی حلال کی ہوئی بات کی حرمت کا فتویٰ اس بیباکی سے صادر کیا جا رہا ہے، تو سوال یہ ہے کہ ایمان ہی کا کیا ٹھکانا رہا! اس جہالت کی بھی کوئی حد ہے۔ اس کے بعد "مخدومہ جدیدہ" کی خدمت میں جو تحائف بھی پیش ہوتے کم تھے کچھ نمونہ ان کا بھی ملاحظہ ہو۔

> "بس جی ایسی عورت کا کیا اعتبار اس کا تو حقیقی نانا زندہ ہوتا اس کو بھی لر بیٹھتی۔ ایسی بے حیا تو ستر کرے گی چھوڑے گی"۔

پھر دونوں کے لئے دعا کا اسلامی حق بھی ادا کیا گیا "خدا کرے ان کو آرام ہی نصیب

نہ ہو"۔

اور یہ زیادہ تر ایسی عورتوں کے اقوال کا نمونہ ہے "جو بڑی پڑھی لکھی بڑی تسبیح نفلوں کی پابند مگر یہ تمیز نہیں کہ ہم منہ سے کیا بک رہے ہیں اس میں کفر ہوگا یا گناہ ہوگا"۔

حضرت کا برتاؤ قدیمہ سے : اب خود حضرت کے طرز عمل سے ایسی صورت میں جو سب سے پہلا سبق ملتا ہے، وہ یہ کہ مخدومہ "قدیمہ" کے غیر معمولی صدمہ و تاثر کو ملاحظہ فرماکر غیر معمولی نرمی و دلجوئی کا برتاؤ فرمانے لگے۔ فرماتے ہیں۔

بوجہ پختگی سن و کثرت مشاغل ان سے بالکل بے فکر ہو گیا تھا۔ بعض اوقات دن بھر گھر جانے کی نوبت نہ آتی عشاء کی نماز پڑھ کر فوراً سو رہتا بات کی فرصت نہ ملتی، مگر اب ان کی دل جوئی کا خاص اہتمام شروع کر دیا ذرا ذرا بات میں ان کی رعایت کرنے لگا۔ میرا مزاج فطرۃً تیز ہے اور عورتوں میں کجی لازم ہے کسی میں کم کسی میں زیادہ جب کوئی ایسا موقعہ پیش آتا تحمل نہ کرتا تھا قولاً بھی تیز الفاظ کہتا اور عملاً بھی بعض اوقات کھانا چھوڑ کر مدرسہ چلا آتا جب سے یہ واقعہ ہوا اس برتاؤ کا نام ونشان نہیں رہا۔ اس قدر نرم برتاؤ اختیار کیا کہ بعض لوگ مجھ کو بے غیرت کہنے لگے بعض بیوی سے ڈرنے والا کہنے لگے"۔

لیکن اس رعایت کو بھی حضرت نے شریعت کی رعایت پر کبھی غالب نہیں آنے دیا اور "جب کبھی شریعت پر اعتراض کا اثر پہنچنے لگا گو ان کو احسان نہ ہوا یا بیہودگی کو زیادہ امتداد ہونے لگا، اول نرمی سے فہمایش کر دی اگر پھر اصرار ہوا دوبارہ فہمایش میں قدرے آواز بلند ہو گئی، مگر اس میں بھی سخت الفاظ سے زبان کو نہایت تکلف کے ساتھ روکا"۔

اس برتاؤ پر تو واقعی اگر مخدومہ اور ان کے ہمدرد ذرا دانش مندانہ غور فرماتے، تو اس واقعہ نے نہ صرف صبر بلکہ شکر کی ایک صورت پیدا کر دی تھی، اور جیسا حضرت نے تحریر فرمایا۔

اس برتاؤ کی قدر: "اگر یہاں تک ذہن نہ پہنچتا تو خیر صبر ہی کی تسلیم کی جاتی۔ اگر دو چار عورتیں بھی اس طرف توجہ کرتیں تو ان کے رنج و غم کی یہاں تک نوبت نہ پہنچتی مگر جو آئی ان کے خیالات کی جن میں اکثر بلکہ کل کی کل لغو و بے بنیاد تھے تصدیق کرتی آئی الا ماشاء اللہ اور تصدیق صرف خوشامد میں کی کہ یوں نہ کہیں کہ فلاں کو میرے ساتھ ہمدردی نہیں بس وہ مثال ہو گئی جیسے کسی میاں جی کو مکتب کے لڑکوں نے باہم متفق ہو کر بیمار ڈال دیا تھا، کہ جو آتا ہے یہی پوچھتا ہے کہ خیر ہے کہ چہرہ اداس کیوں ہے"۔

اصلاحی طریقوں کا استعمال: پر حضرت تو خالی شوہر یا عادل و حکیم شوہر ہی نہ تھے بلکہ مصلح کامل تھے اس لئے فرماتے ہیں کہ

> "میں نے اصلاح باطن کے طریقوں سے اس قدر کام لیا کہ شاید بیس پچیس برس کی مدت میں کسی کے لئے نہ لیا ہو گا۔ ان طریقوں میں بعض منقول تھے اور بعض بزرگوں کے کلام سے مستنبط کئے اور ایسے ایسے لطیف تھے کہ کوئی قدر کرتا تو ضبط کرنے سے سلوک کا ایک بینظیر رسالہ بنتا اور عمل کرنے سے انسان کامل بن جاتا، مگر پہلے سے بھی معلوم تھا اور اب تجربہ سے زیادہ معلوم ہو گیا، کہ جو اپنی صلاح نہ چاہئے۔ اس کی اصلاح کوئی نہیں کر سکتا حتیٰ کہ نبی بھی نہیں کر سکتا۔ دوسرے یہ معلوم ہوا کہ اصلاح کے لئے مصلح کے ساتھ اعتقاد و عظمت کا ہونا شرط ہے اور شوہر کے ساتھ دونوں امر ضعیف ہیں۔ بہرحال میں نے تھک کر حق تعالیٰ سے التجاو دعا شروع کی اور حضرت زکریا علیہ السلام کے قول کے موافق ولم اکن بدعائک رب شقیا امید قبول رکھتا ہوں، اور غالباً پہلے کی نسبت سکوت و سکون دونوں کی رفتار ترقی پر ہے۔ اور جس مرض میں روزانہ انحطاط ہو وہاں قوی امید صحت ہی کی ہوتی ہے"۔

کلفت بھی مسرت ہے۔ جن عزیز کے خط کا یہ جواب ہے انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ یہ معاملہ "آپ کو بھی باعث مسرت نہ ہوا"۔ آگے اس کا کیسا عارفانہ جواب عطا فرمایا گیا ہے کہ

"ظاہر ہے ایسی حالت میں کیا مسرت ہو سکتی ہے، جب کہ مسرت کے اسباب پر کلفت کے اسباب غالب ہوں مگر مسرت کی یہ نفی ظاہری مسرت کے اعتبار سے ہے، ورنہ باطناً تو اگر اللہ تعالیٰ معرفت نصیب کرے یہ کلفت بھی مسرت ہی ہے کیونکہ مسرت کے جو منافع ہیں اس کلفت میں ان سے کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ حاصل ہیں" (اس سے بڑھ کر معرفت و عبدیت کی تعلیم یہ ہے کہ) "اس زیارت پر نظر کر کے نہ اس کلفت کی تمنا کرے اور نہ اس کی رفع ہونے کی دعا ترک کرے حق تعالیٰ سے برابر عافیت ہی مانگتا رہے۔ لیکن جب تک ظاہری عافیت عطا نہ ہو اس کلفت ہی کو مصلحت و حکمت سمجھ کر دل سے راضی اور ثواب کا متوقع رہے" (جاننے والے جانتے ہیں کہ اس تعلیم پر خود حضرت کا عمل کیسا رہا ہو گا مگر اس کے اظہار عجز و عبدیت کی شان ملاحظہ ہو کہ) "الحمد اللہ اس پر کچھ کچھ عمل بھی ہے، جس سے زخم پر مرہم رکھا جا رہا ہے۔

ع بلا بودے اگر ایں ہم نبودے

اصلاح و عرفان کی ان فوائد و ثمرات کے باوجود حضرت کو اس معاملہ میں جو تجربات ہوئے ان کی بناء پر ہدایت یہی ہے کہ

تا بہ امکان تعدد سے اجتناب کی ہدایت۔ "بدون شدید اضطرار کے جس کا فیصلہ نفس سے نہیں بلکہ عقل سے بلکہ عقلا کے مشورے سے کرانا چاہئے، ہر گز نکاح ثانی نہ کرنا چاہئے۔ خصوصاً پختگی سن کے بعد منکوحہ اولیٰ کو بے فکری کے بعد فکر میں ڈالنا ہے۔ ور جہاں اس کا لازم حال ہے وہ اپنا رنگ لاوے ہی گا۔ جس کے چھینٹوں سے نہ ناکح بچے گا نہ منکوحہ ثانیہ۔ خواہ مخواہ دریائے غم بلکہ دریائے خون میں سب غوطے لگا دیں گے۔

خصوصاً جب مرد بھی عالم و متحمل نہ ہو۔ علم نہ ہونے سے وہ حدود عدل کو نہ سمجھ سکے گا اور تحمل نہ ہونے سے ان حدود کی حفاظت نہ کر سکے گا، اس وجہ سے ضرور ظلم میں مبتلا ہو گا، چنانچہ اکثر ازواج متعددہ والے جور و ظلم کے معاصی میں مبتلا ہیں۔ کیونکہ اس تعدد کے حقوق اس قدر نازک ہیں کہ ہر ایک کا وہاں تک ذہن پہنچ سکتا ہے نہ ان کی رعایت کا حوصلہ ہو سکتا ہے باوجود یہ کہ شب باشی اور ماکول و ملبوس میں برابر رکھنے کا وجوب سب جانتے ہیں مگر اس تک کا اہتمام نہیں۔

"باقی ان مسائل کا تو خیال ہی کون کرتا کہ فقہا نے لکھا ہے، کہ اگر ایک بی بی کے پاس تو بعد مغرب آ جاتا ہے اور دوسری کے پاس بعد عشاء تو عدل کے خلاف کیا۔ نہ ایک کی باری میں دوسری سے صحبت جائز ہے خواہ دن ہی کو ہو۔ ایک کی نوبت میں دوسری کے ہاں جانا ہی نہ چاہیے۔ اگر بیمار ہو گیا اور دوسری کے پاس نہیں جا سکا، اس لئے ایک ہی کے پاس رہ گیا، تو صحت کے بعد اتنی ہی مدت دوسری کے پاس رہنا چاہیئے۔"

نیز دینے لینے میں بھی برابری کے جزئیات اس قدر دقیق ہیں کہ ان کی رعایت ہر شخص کا کام نہیں مجھ کو اس قدر دشواریاں اس میں پیش آئیں کہ اگر علم دین اور حسن تدبیر حق تعالیٰ عطا نہ فرماتے تو ظلم سے بچنا مشکل تھا"۔

حقوق مروت۔ "پھر بعض حقوق مروت کے ہوتے ہیں گو وہ واجب نہ ہوں، مگر ان کی رعایت نہ ہونے سے دل شکنی ہوتی ہی ہے جو حقوق رفاقت کے خلاف ہے ان کی رعایت اور بھی دقیق و غامض ہے۔ غرض کوئی شخص ہر وقت کے واقعات و معاملات کے جزئیات کو خیال رکھے تو عمر بھر کے لئے تعدد ازدواج سے توبہ کر لے ...... اسی لئے حق تعالیٰ نے فرمایا فان خفتم ان لاتعدلوا جو صریح دلیل ہے کہ عدم عدل کا اندیشہ بہت قوی ہے۔ پھر ایک پر اکتفا کی نسبت ادنیٰ ان لا تعولوا فرمایا جو اس اندیشہ کے جانب وجود کو عدم پر صاف ترجیح دے رہا ہے۔ اس لئے اگر خواہی سلامت بر کنار ست"۔

اور کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ خود کیوں اس مشورہ کے خلاف کیا" (تو کیا خوب جواب ہے کہ) "خلاف ہی سے تو یہ مشورہ سمجھ میں آیا۔ ع

من نکردم شما حذر بکنید"

تعدد حرام بہرحال نہیں۔ لیکن اس مشورہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شریعت نے جس چیز کو حلال کیا ہے معاذ اللہ حضرت اس کے حرام ہونے کا فتویٰ دے رہے ہیں۔ اصل میں یہ اللہ تعالیٰ کی عین رحمت اور شریعت کی عین وسعت و حکمت ہے کہ اس میں گنجائش ہر قسم کے حالات کی ہے، تاکہ کسی حالت میں ایسی تنگی نہ ہو کہ آدمی اہون البلتین کے بجائے اشد البلتین میں مبتلا ہوجائے۔ مثلاً اسی تعدد کو لو کہ بعض ایسی صورتیں پیش آسکتی ہیں کہ اگر یہ بالکلیہ حرام ہو تو اس کے بجائے آدمی حرام کاری ہی میں مبتلا ہو جاسکتا ہے۔ فرض کرو ایک جوان و قوی شخص ہے، جس کے نفس میں جوانی کا تقاضا بھی پوری قوت کے ساتھ موجود ہے، اور بی بی کو ایسا مرض ہے کہ شوہر سرے سے یا کماحقہ متمتع نہیں ہوسکتا، اور اس کو طلاق دیتا ہے تو بظاہر کوئی دوسرا بھی ایسی بیماری کی حالت میں اس کا پرساں یا خبرگیری کرنے والا نظر نہیں آتا، نہ خود وہ اس لائق کہ اپنے سدرمق تک کا انتظام کرسکے۔ اس کے علاوہ مثلاً شوہر اتنا قوی و تندرست ہے کہ وہ بی بی کے ایام حیض، زمانہ حمل و زچگی و رضاعت وغیرہ کے دوران بھی آسانی سے نفس کے تقاضے کو دبا نہیں سکتا، اور اگر کوئی جائز راہ نہ ہو تو ناجائز راستہ پر پڑجانے کا اندیشہ ہے۔ ظاہر ہے ایسی استثنائی صورتوں میں اگر عدل میں کچھ کوتاہی ہو تو بھی تعدد کے نفس جواز کا دروازہ بند کرنا درحقیقت تعدی کا دروازہ کھول دینا تھا اس لئے متنبہ فرما دیا کہ اصل "احکام شرعیہ میں تحریف نہ کی جاوے۔

"جیسا کہ اس زمانہ میں بعض نے فان خفتم ان لاتعدلوا کی آیت اور دوسری آیت ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء کو جمع کرکے معنوی تحریف کی ہے، جس کی تحقیق تفسیر بیان القرآن میں کردی گئی ہے۔

"بہرحال حکم شرعی تو یہی ہے کہ تعدد ازدواج میں نکاح تو ہرحال میں منعقد ہو ہی جاتا ہے، خواہ عدل ہو یا نہ ہو، لیکن عدم عدل کے وقت گناہ ہوگا۔ اور چونکہ اس وقت عدم عدل (خصوصاً) غالب ہے، اسلئے اسلم یہی ہے کہ تعدد اختیار نہ کیا جاوے اور ایک ہی پر قناعت کی جاوے اگرچہ ناپسند ہو۔

فان کرھتموھن فعسیٰ ان تکرھو شیئا و یجعل اللہ فیہ خیرا کثیرا"

حضرت کے عقد ثانی کے دواعی و مصالح کی تفصیل: چونکہ حضرت نے ان عزیز کو غالبًا یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ یہ عقد ثانی کسی ضرورت کی بنا پر نہیں کیا گیا بلکہ مشیت پر مبنی تھا اور چند شرعی مصلحتیں تھیں، اس اجمال میں چونکہ "مریدان می پرانند" کے فتنہ کا احتمال تھا اسلئے آگے اس کے انسداد کے لئے جو تفصیل فرماتے ہیں اسکی حکیمانہ و مصلحانہ شان ملاحظہ ہو کہ

"تفصیل نہ ہونے سے محبین و معتقدین کے بڑھا لینے کا احتمال ہے۔ کیونکہ اس کے معنی یہ سمجھائے جاویں گے کہ کوئی الہامی حکم ہوا ہو گا، اس لئے میں اصل حالت کو منکشف کرتا ہوں۔ سب سے اول اس امر کا اقرار کرتا ہوں کہ میرا یہ فعل کسی مصلحت کی نیت سے یا کسی غیبی اشارہ عمل کرنے کے قصد سے نہیں ہوا سبب قریب محض طبیعت کا تقاضا تھا۔

سبحان اللہ ایسے اقرار کی ہمت وہی کر سکتا ہے جو امت کی اصلاح اور دین کی تجدید ہی کے لئے مبعوث کیا گیا، اور اس کے فرائض کو انبیاء علیہم السلام کی طرح خانگی معاملات میں بھی قدم قدم پر ملحوظ رکھتا ہو۔ اور یہ حضرت جامع المجددین و حکیم المجددین علیہ الرحمہ کا خاص مذاق تھا کہ اپنی ہر نقل و حرکت میں دیکھنے والوں کی اصلاح و تنبیہ کا بھی بہ حیثیت مقتدا ضرور لحاظ فرماتے تھے۔ غرض سبب قریب "تو اس نکاح ثانی کا" محض طبیعت کا تقاضا تھا"۔

"گو پھر اس پر بہت سی مصلحتیں مرتب ہو گئی ہوں۔ بلا تشبیہ ایسی مثال ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا طور پر تشریف لیجانا بقصد نبوت نہ تھا محض آگ کی ضرورت سے طبعی تقاضا تھا، مگر وہاں جانے پر نبوت عطا ہو گئی۔ قصہ یہ ہے کہ مدت ہوئی ایک خواب دیکھا تھا کہ مجھ سے اس نکاح کے لئے کہا جا رہا ہے اور میں بطور تردد کے کہہ رہا ہوں کہ میرے گھر میں اس سے کیا حال ہو گا، تو جواب دیا جاتا ہے کہ وہ قرآن شریف پڑھا کریں گے میں بیدار ہوا تو قرآن شریف پڑھنے کے معنی تو یہ سمجھا کہ مشاغل دینیہ میں

مشغول ہو کر اس غم کو بھول جاویں گی۔ چنانچہ اس کا سامان بھی ہوتا معلوم ہو رہا ہے۔ لیکن خواب کو کچھ باوقعت نہیں سمجھا۔ چنانچہ اپنے بھانجے سے نکاح کر دیا اور طبیعت خالی ہو گئی، مگر خدا کی قدرت کہ بیوہ ہو گئی تو اس کی کوشش کی کہ کہیں اور نکاح کر دیا جائے لیکن کہیں سامان نہ ہوا۔ نیز میں نے بڑی تدبیروں سے اس کو اپنے سے پردہ کرا دیا اور اپنے مکان میں تدبیر لطیف سے اس کی آمدورفت قریب قریب منقطع کر دی"۔

حضرت کے خود اپنے مذکورہ بالا خواب کے علاوہ اور کئی صلحا اور بزرگوں نے بھی اس سلسلہ میں بعض منامات و مکاشفات بیان کئے۔ مگر حضرت نے ان چیزوں کی طرف زیادہ التفات نہیں فرمایا بلکہ ان کو دباتے ہی رہے۔ "یہاں تک کہ رمضان ۱۳۳۴ کے نصف کے بعد پھر خواب دیکھا جس کا عنوان پہلے سے زیادہ موثر تھا۔

"اس خواب کے بعد طبیعت میں وہی تقاضا جو مٹا دیا گیا تھا پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ پیدا ہوا اور ایسا غالب آیا کہ اس کی مخالفت نہ کر سکا، اور سب مصالح و موانع مغلوب ہو گئے یہاں تک کہ ایک عزیز کو پیام کے واسطے تجویز کیا۔ اور ان سے ذکر کیا تو انہوں نے ایک بہت بڑے شیخ و ظاہری و باطنی افادہ میں بفضلہ مشغول ہیں۔

نام لیا کہ انہوں نے تصریحاً فرمایا تھا کہ ایسا ہو جانا بہتر ہے۔

ایک مرتبہ خلوت میں حضرت کا قلب دفعتاً اس کی جس حکمت و مصلحت کی طرف ملتفت ہوا وہ ان لوگوں کے زیادہ سننے کے لائق ہے، جو دوسروں کی اصلاح میں اپنی صلاح کی فکر میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ

"بے ساختہ ذہن میں آیا کہ بہت سے درجات موقوف ہیں سقوط جاہ و بدنامی پر جن سے تو اب تک محروم ہے کیونکہ تیری جاہ ہر پہلو سے انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ بس اس واقعہ میں حکمت یہی ہے کہ بدنام ہو گا، اور حق تعالیٰ درجات عطا فرمائیں گے۔ بس یہ تھی وہ مشیت خاص جس پر یہ قصہ مبنی تھا اور یہ تھیں وہ مصلحتیں جو اس قصہ پر مرتب ہوئیں"۔

کوئی غلو نہ ہو اس لئے پھر متنبہ فرمایا ہے کہ " خلاصہ یہ ہے کہ میری تحریک تو طبیعت کے تقاضے کی تھی۔ باقی یہ تقاضا خواہ ان واقعات ہی سے ہوا ہو اور پھر اس میں یہ حکمتیں بھی رہی ہوں۔ بہر حال نکاح ہو گیا اور یہ "خبر جب گھر پہنچی۔

موت کی محبوبیت۔ "تو ہوا جو کچھ ہوا جس کا اثر میرے قلب پر اس درجہ تھا کہ موت محبوب معلوم ہوتی تھی۔ گھر میں کا صدمہ دیکھا نہ جاتا تھا۔ سختی کرنا اس لئے گوارا نہ تھا کہ ضبط سے اندیشہ امراض صعبہ کا تھا۔ ان اسباب سے بے حد تنگی واقع ہوئی۔ اس وقت دین کی قدر معلوم ہوئی کہ بجز دین کے کوئی چیز دل کو سنبھالنے والی نہ تھی۔ اور منجملہ ان مصالح کے جو اس واقعہ میں مضمر تھیں اور بعد کو ظاہر ہوئیں دین کے اثر کا یہ مشاہدہ بھی تھا، جو پہلے علم الیقین کے درجہ میں تھا مگر اب عین الیقین ہو گیا والحمد اللہ علیٰ ذالک۔ ایک مصلحت یہ بھی ظاہر ہوئی کہ اس سے پہلے موت کی محبوبیت کی دولت نصیب نہ تھی گو عقلاً محبوب تھی مگر طبعاً نہ تھی بلکہ ایک گونہ حیات سے دلچسپی تھی۔ الحمد للہ کے اس واقعہ سے یہ دولت بھی نصیب ہو گئی۔ اور گو اس کی ابتدا دل کی تنگی کے سبب ہوئی مگر الحمد للہ کہ پھر باوجود رفع سبب کے مسبّب باقی ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر مصلحت عبدیت اور ازالہ استغنا کی ملاحظہ ہو جو بہت سے مدعیوں کی آنکھیں کھولنے والی ہے کہ "مجھ کو ثواب آخرت سے طبعاً کم رغبت تھی۔ امتثال اور امر کو جنت سے بھی افضل سمجھتا تھا۔ مگر اس کے ثمرہ میں ثواب کا تصور کم ہوتا تھا۔ صرف رضائے حق و طلب نجات کا اکثر خیال تھا۔ اب معلوم ہوا یہ ایک قسم کی کمی اور صورت استغنا تھی۔ الحمد اللہ کہ اس کوتاہی کا تدارک ہو گیا اور استحضار ثواب نے پورا کام دیا والحمد للہ علی ہذہ النعمتہ۔

"ایک مصلحت یہ ظاہر ہوئی کہ اس وقت تک صبر اور رضا بالقضا و تفویض کی حقیقت کا مشاہدہ نہ ہوا تھا۔ الحمد للہ کہ ان محبوبوں کا جمال آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ایک مصلحت یہ ظاہر ہوئی کہ حلم و تحمل کا ذوق نہ تھا خدا تعالیٰ کا احسان ہے کہ یہ کام بھی بوجہ احسن لیا گیا، جس سے آئندہ بھی کام لے سکنے کی امید ہے توکلاً علی اللہ کہتا ہوں"۔

نفس تعدد کے مصالح دقیقہ ولطیفہ۔ اب نفس تعدد کے کچھ لطیف و دقیق مصالح پر نظر کیجئے۔

"مثلاً صفت عدل کا استعمال عجیب طرز سے کرنا پڑتا ہے۔ دو حالتیں ہیں ایک یہ کہ آدمی کسی پر حاکم ہی نہ ہو یا حکومت سے استعفیٰ دیدے، اس کو اس صفت کے استعمال کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ دوسری یہ کہ ایسے لوگوں پر حاکم ہو جن کے ساتھ استعمال عدل میں سیاست و ضابطہ کا برتاؤ کر سکے۔ یہ بھی آسان ہے کہ اس میں صرف ایک حکومت کا حق ادا کرنا پڑتا ہے، جس میں کوئی امر مزاحم نہیں۔ بخلاف صاحب ازواج متعددہ کے کہ اس کے ماتحت ایسے دو محکوم ہیں جو محبوب بھی ہیں اور محبوبیت کی وجہ سے ایک درجہ میں معنیٰ اس پر حاکم بھی ہیں۔ پھر محکوم بھی کیسے جن میں دل وانصاف صرف اس حالت میں خاص نہیں جبکہ ان میں جھگڑا ہو۔ بلکہ وہ خود نہ بھی جھگڑیں تو بھی ہر وقت کے برتاؤ میں برابر ہی رکھنا واجب ہے۔ پھر جھگڑے کی صورت میں یہ کشاکش کہ ان کی محکومیت کے حقوق ادا کرتا ہے تو محبوبیت کے فوت ہوتے ہیں اور محبوبیت پر نظر کرتا ہے تو محکومیت کے حقوق فوت ہوتے ہیں۔ جو جمع بین الاضداد سے کم نہیں۔ غرض نہایت ہی عقل و دین کی ضرورت ہے۔ کوئی کر کے دیکھے تو معلوم ہو پھر اجلاس کا کوئی وقت نہیں ہر وقت آمادہ رہنا چاہئے۔ پھر استغاثہ کا انتظار نہیں خود دست اندازی لازم۔ تو جو شخص اس نازک موقع پر عدل کو کام لایا۔ وہ اعلیٰ درجہ کا عادل ہو گا اور دوسری جگہ اس کو عدل سے کام لینا پانی ہو گیا"۔

حضور نبی الانبیاء علیہ السلام کہ جن کو نبوت کے ساتھ سلطنت بھی عطا ہوئی تھی اور جن کو حکومت و سلطنت کے لئے کامل ترین انصاف و عدل کا نمونہ دنیا کی رہنمائی کے لئے بننا اور چھوڑنا تھا ان کے تعدد ازدواج پر زبان کھولنے والے اس نکتہ پر ذرا غور فرمائیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی دینی دنیوی مصالح ہیں۔

"مثلاً صحت کا اچھا ہو جانا کیونکہ ہر دن ایک جدید چیز میسر ہے اور جدت کے لئے نشاط لازم ہے اور نشاط کے لئے درستی صحت عادۃً لازم ہے۔
ایک مصلحت اس تعدد میں یہ ہے کہ عفیف رہنے میں زیادہ مدد ملتی ہے اور بھی مصالح متعددہ ظاہر ہوئے۔

"ظرف قدح خوار"۔ لیکن ان مصالح اور حکمتوں کے باوجود سوال وہی "ظرف قدح خوار" کا ہے اور ہر ظرف اس "بادہ" کا متحمل نہیں، اس لئے پھر ارشاد ہے کہ یہ مصالح سابق الذکر خطرات کے سامنے ایسے ہی ہیں، جیسے جنت کے راستہ میں پل صراط کہ لغزش ہوئی تو سیدھا جہنم پہنچا۔ اس لئے گو

بدریا در منافع بے شمار است　　وگر خواہی سلامت برکنار است

اور چونکہ "ان خطرات و مہالک سے عبور کرنے کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہے وہ ارزاں نہیں دین کامل عقل کامل نور باطن نفس کی ریاضت سے اصلاح ہو چکنا وغیرہ۔ اور ان کا جمع ہونا شاذ ہے، اس لئے تعدد میں پڑنا یا تو دنیا برباد و تلخ کرنا یا آخرت و دین کو تباہ کرنا ہے"۔

خود حضرت کے حق میں سب سے بڑی مصلحت۔ باقی خود حضرت علیہ الرحمہ کو اپنے حق میں جس سب سے بڑی مصلحت کا اس میں مشاہدہ ہوا، وہ سقوط جاہ تھا کہ اتنی بدنامی و ملامت ہوئی کہ فرماتے ہیں کہ "شاید تمام عمر بھی اگر خدانخواستہ واقعی عیب کرتا تب بھی اس قدر نہ ہوتی"۔ اور ایک نہیں تین تین مواقع اس کے پیش آئے۔ پہلے تو نفس دوسرے نکاح پر جو زبان درازیاں ہوئیں ان کا کچھ ذکر اوپر ہو چکا۔ دوسرا موقع یہ تھا کہ جب مخدومہ اولیٰ کا صدمہ حد سے گذرا اور اندیشہ ہوا کہ کہیں زیادہ نوبت نہ پہنچے ادھر اپنے قلب کو تحمل سے عاجز پایا تو بعض عاقل احباب سے مشورہ فرما کر جدیدہ سے بواعدہ صریحہ قطع تعلق فرما لیا۔ گو قدیمہ نے اس سے روکا بھی مگر حضرت کو اس مصیبت کا کوئی علاج اس کے سوا نظر نہ آیا۔ اس پر پھر بدنامی و ملامت ہوئی"۔ اول موقع پر

عوام نے زیادہ بدنام کیا تھا اور اس موقع پر اہل فہم نے زیادہ بدنام کیا"۔

"اب تیسرا موقع سب سے زیادہ عجیب ہوا کہ منکوحہ اولیٰ کو یہ خیال ہوا کہ افسوس میرے سبب انہوں نے اپنے ایک رغبت کے معاملہ کو قطع کیا، ان کو عمر بھر رنج وقلق رہے گا اور مجھ کو سخت شرمندگی رہے گی، اور لوگ بھی یہ سمجھیں گے کہ اس کے سبب سے ہوا۔ غرض ان خیالات کا اس قدر غلبہ ہوا کہ اصل واقعہ سے زیادہ صدمہ کے آثار ظاہر ہونے لگے۔" اور بالآخر حضرت کے انکار کے باوجود سخت اصرار سے خود ہی بیچ میں پڑ کر تجدید نکاح کرادی۔"

"پھر کیا تھا" کسی نے کہا طلاق کے بعد بلا حلالہ تجدید کہاں جائز ہے۔ کسی نے کہا واحدہ صریحہ میں تجدید کی کیا حاجت تھی کسی نے کہا بس مسئلے مولویوں کے قبضہ میں ہیں جس چیز کو چاہا درست کرلیا کبھی نکاح کو کبھی طلاق کو وغیرہ وغیرہ۔ غرض تینوں موقعوں پر مختلف عنوانات سے اطراف و نواح میں آگ لگی کا ساغل تھا جس کو دیکھئے یہی قصہ یہ چرچا دو کانوں پر یہی تذکرہ نشست گاہوں میں یہی مشغلہ۔ کوئی میرے احباب کو چھیڑتا ہے۔ کوئی احباب ہونے کے دعوے کے بعد شبہات واعتراضات کرکے اپنے دوست ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

سنت سے توافق۔ "ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ایک جماعت اہل فہم کی بھی قائم کردی تھی، جو ان سب واقعات کو سنت کے موافق سمجھ رہے تھے اور ان کی محبت زیادہ بڑھتی جاتی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلا واقعہ خواب کا تھا تو اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہؓ کی صورت ایک حریر کے ٹکڑے پر دکھلائی گئی تھی، کہ یہ آپ کی زوجہ ہیں۔ دوسرا واقعہ بھانجے کی بیوی سے نکاح کا تھا، اس میں سنت کی موافقت یہ تھی کہ اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے متبنیٰ کی بی بی حضرت زینبؓ سے ان کے طلاق دینے کے بعد نکاح فرمانا تیسرا واقعہ وہ جو جہلا کے اقوال میں نقل کیا گیا کہ معلوم ہوتا ہے ان میں پہلے سے ساز باز تھا اسی طرح نعوذ باللہ حضور کی نسبت کہا گیا کہ حضرت زینب پر

عاشق ہو گئے تھے۔ چوتھا واقعہ تفاوت عمر کا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہؓ کی عمر میں اس سے زیادہ تفاوت تھا پانچواں واقعہ منکوحہ اولیٰ کی دل جوئی کے لئے ثانیہ کو جواب دیدینے کا تھا، اس سنت کی دو موافقتیں ہوئیں ایک جو اس آیت میں مذکور ہے لم تحرم ما احل اللہ لک تبتغی مرضات ازواجک اور دوسری جو اس آیت کا شان نزول یا ایہا النبی اذا طلقتم النساء الایہ یعنی حضرت حفصہؓ کو ایک طلاق دیدی تھی پھر رجعت فرمائی ساتواں واقعہ مہر کے خفیف ہونے کا، جس میں سنت کی موافقت خود عملاً ظاہر ہے۔ غرض اہل فہم کو خدا تعالیٰ نے اس طرح سمجھا دیا"۔

اس کے بعد پھر "ما ابری نفسی" کا اعلان فرمایا گیا ہے کہ" میں جھوٹا دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ سب کام میں نے اتباع سنت کی نیت سے کئے ہیں، بلکہ یہ بھی محض خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ اضطراراً سنت کی موافقت ہو جائے جس سے زیادہ برکت کی امید ہوتی ہے۔

بہر حال یہ تو حضرت ہی جیسے بلند حوصلہ و عالی مقام بزرگوں کی شان ہے کہ اس ابتلا میں پڑ کر ان کے اور بھی عالی تر مقامات طے ہو جائیں یا اتباع سنت کی اختیاری خواہ اضطراری گوناگوں سعادتیں نصیب ہو جائیں۔ ورنہ اصل نصیحت و وصیت حضرت کی بار بار یہی ہے کہ

> "تعدد ازدواج ایک پر خطر مسلک ہے۔ جس طرح قضا یعنی حکومت کے قبول کرنے سے حدیث میں نہایت تہدید ہے۔ یہ بھی اس سے کم نہیں۔ بلکہ اوپر صفت عدل کی مصلحت حصول کی متعلق جو تقریر کی گئی ہے، اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ بعض وجوہ سے یہ قضا یا حکومت سے بھی اشد ہے، جب اس سے تحذیر وارد ہے تو اس کی جرات کب زیبا ہے"۔

ابتلائے تعدد کی صورت میں دستور العمل : تحذیر قضا سے تحذیر تعدد کا یہ استنباط بھی کیسا دقیق و عجیب ہے۔ لیکن حضرت کا اصل کمال جس طرح ہر معاملہ میں صحت کھو چکنے اور سخت سے سخت امراض خرید لینے والوں کی دستگیری اور تیر بہدف نسخوں کی تجویز فرمائی ہے۔ اسی طرح تعدد کی بلا میں اگر کوئی گرفتار ہی ہو چکا ہو تو اس کی تعدی سے متاثر شوہر منکوحہ اولیٰ یا قدیمہ اور منکوحہ ثانیہ یا جدیدہ تینوں کے لئے الگ الگ مجرب نسخہ تحریر فرمایا گیا ہے" پہلا دستور العمل شوہر کے لئے" ہے، جس کے اجزاء نمبروار یہ ہیں۔

شوہر کا دستور العمل : "(۱) ایک بی بی کا راز دوسری سے نہ کہے (۲) دونوں کا کھانا رہنا بالکل الگ رکھے ان کا اجتماع آگ اور بارود سے کم نہیں (۳) ایک سے دوسری کی شکایت ہرگز نہ سنے (۴) اگر ایک دوسری کی کوئی بات پوچھے ہرگز نہ بتلادے نرمی سے منع کردے (۵) دینے لینے میں اسکا شبہ نہ ہونے دے کہ ایک کو زیادہ دیدیا ہو (۶) باہر سے آنے والی عورتوں کو سختی سے روکے کہ وہ ایک سے دوسری کی حکایات و شکایات بیان نہ کریں (۷) ایک کے ساتھ محبت کا اظہار دوسری کے سامنے نہ کرے (۸) ایک کی تعریف دوسری سے نہ کرے (۹) غرض ایک کا تذکرہ نہ دوسری سے سنے نہ کرے (۱۰) نہ خوشامد میں ایک کے سامنے دوسری سے کم محبتی کا دعویٰ کرے (۱۱) اگر موقع ہو ایک سے ایسی روایت کردے کہ دوسری تمہاری تعریف کرتی تھی (۱۲) لطف سے اگر اس کی تدبیر ہوسکے تو مفید ہے کہ ایک دوسری کے پاس ہدیہ وغیرہ بھیجا کرے"۔

قدیمہ کا دستور العمل : دوسرا دستور العمل قدیمہ کے لئے یہ ہے کہ (۱) جدیدہ پر حسد نہ کرے (۲) طعن و تشنیع نہ کرے (۳) بہ تکلف جدیدہ کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ کرے تاکہ اس کے دل میں اگر محبت نہ ہو تو عداوت بھی نہ ہو (۴) شوہر سے ایسی بے تکلف گفتگو نہ کرے، جس کا اس کو جدیدہ کے سامنے ہونا اسلئے ناگوار ہو کہ وہ بھی ایسی بے تمیزی نہ سیکھ لے (۵) شوہر سے جدیدہ کا کوئی عیب وغیرہ بیان نہ کرے کہ اپنے محبوب کی عیب گوئی خصوصاً رقیب کی زبان سے کوئی پسند نہیں کرتا (۶) جدیدہ سے ایسا برتاؤ کرے کہ اس کی زبان اس کے سامنے ہمیشہ بند رہے (۸) شوہر کی اطاعت و خدمت و ادب پہلے سے بڑھ کر کرے تاکہ اس کے دل سے اتر نہ جاوے (۸) اگر شوہر ادائے حقوق میں کچھ کمی کرے، جو حد تکلیف تک نہ ہو، تو اس کو زبان پر نہ لاوے اور اگر حد تکلیف تک ہو تو جس وقت مزاج خوش دیکھے ادب سے عرض کردے (۹) جدیدہ کے اعزہ سے خوش اخلاقی و مدارات برتے تاکہ اس کے دل میں گھر ہو (۱۰) کبھی کبھی اپنا دن جدیدہ کو دیدیا کرے تاکہ شوہر کے دل میں قدر بڑھے۔

جدیدہ کا دستور العمل ۔ آخری تیسرا دستور العمل منکوحہ جدیدہ کے لئے ہے کہ (۱) وہ قدیمہ کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے جیسا اپنے بڑوں سے کرتے ہیں (۲) شوہر پر اس گمان سے زیادہ ناز نہ کرے کہ میں زیادہ محبوب ہوں خوب سمجھ لے کہ قدیمہ سے جو تعلقات رفاقت ہیں وہ دل میں جاگزیں ہو چکے ہیں جن کا مقابلہ نفسانی نیا جوش نہیں کر سکتا (۳) شوہر سے خود جدا رہنے سہنے کی درخواست نہ کرے (۴) اگر شوہر جدا رکھ دے تب بھی گاہ گاہ قدیمہ سے ملنے جایا کرے اور اس کو دعوت وغیرہ کیلئے بلایا کرے (۵) شوہر کو سمجھاتی رہے کہ قدیمہ سے بے پروائی نہ کرے (۶) اگر قدیمہ کچھ سختی وطعن وغیرہ کرے تو اس کو ایک درجہ میں معذور سمجھ کر معاف کر دے اور شوہر سے تو ہرگز شکایت نہ کرے (۷) قدیمہ کے عزیزوں کی خوب خدمت کرے (۸) قدیمہ کی اولاد سے بالخصوص ایسا معاملہ رکھے کہ اس کے دل میں اس کی محبت وقدر ہو جائے (۹) ضروری امور میں قدیمہ سے مشورہ کرتی رہے کہ اس کے دل میں قدر بھی ہو اور اس کو تجربہ بھی زیادہ ہے (۱۰) اگر اپنے میکے جاوے قدیمہ سے خط و کتابت رکھے"۔

ما نصیحت بجائے خود کردیم روز گارے دریں بسر بردیم
گر نیا ید بگوش رغبت کس بر رسولاں بلاغ باشد و بس

نسخوں کے مجرب و تیر بہدف ہونے میں شبہ نہیں ہر ہر جز حکیمانہ و عارفانہ ہے تاہم ان کے تمام اجزاء کا فراہم کر سکنا یا ہو جانا نہ ہر شخص کی ہمت ہے نہ قسمت پھر بھی جو شخص مرض میں گرفتار ہو چکا ہو، وہ اگر مقدور بھر ان نسخوں کے زیادہ سے زیادہ اجزاء کو استعمال کرتا رہا تو انشاء اللہ مرض ہلاکت کے درجہ تک ہرگز نہ پہنچے پائے گا۔

طلاق کا معاملہ ۔ اب طلاق کے سلسلہ کی کچھ کوتاھیاں و غلطیاں قابل ملاحظہ ہیں۔ سب سے بڑی تو نفس طلاق میں افراط و تفریط ہی کی غلطی ہے کہ

"بعض لوگ تو طلاق دینے کو اس قدر عار سمجھتے ہیں کہ کیسی ہی مصلحت و ضرورت ہو خواہ کتنی ہی زوجین میں نا اتفاقی ہو، جس سے ایک یا دونوں حقوق زوجیت ادا کرنے سے قاصر ہوں یا خواہ زوجہ میں کسی درجہ کی بھی

بد دینی ہو، جس کی اصلاح شوہر کی قدرت میں نہ رہی۔ اور یہی اسباب طلاق کی مشروعیت کے ہیں (چنانچہ عورت کے موذی ہونے یا بالکلیہ تارک صلوۃ ہونے کی صورت میں فقہاء نے طلاق کو مستحب اور عورت کے حقوق ادا نہ ہوسکنے کی صورت میں واجب کہا ہے) پھر بھی خاندانی وضع کے خلاف ہونے کے خیال سے اس کو گوارا نہیں کرتے اور عمر بھر اپنی یا زوجہ کی زندگی تلخ کرتے ہیں"۔

اور اس کا سبب ظاہر ہے کہ طلاق کا ابغض المباحات ہونا نہیں ہوسکتا کیونکہ ایسی صورت میں مبغوض ہونا کیا معنی اس کے برخلاف کبھی واجب ہو جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں نص ہے ولا جناح علیکم ان النساء۔ حضورؐ نے خود حضرت سودہؓ کو طلاق دینے کا ارادہ فرمایا تھا، پھر ان کے عرض کرنے پر نہیں دی۔ نیز صحابہ کے بکثرت واقعات طلاق کے منقول ہیں۔ تو ایسی حالت میں علی الاطلاق کیسے مبغوض کہہ سکتے ہیں یہ مبغوضیت اس صورت میں ہے جبکہ کوئی معتدبہ وجہ نہ ہو۔

طلاق کو معیوب سمجھنے کے مفاسد۔ "اور طلاق کو اس درجہ معیوب سمجھنے سے بہت سے عملی مفاسد پیدا ہوتے ہیں مثلاً کبھی جوش غضب میں طلاق دے بیٹھتے ہیں، تب بھی عار سے بچنے کے لئے اس کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں .... حتیٰ کہ اکثر باوجود تین طلاقیں واقع ہو جانے کے بی بی بنائے رکھتے ہیں۔ اور چھوڑنے میں ذلت و بدنامی سمجھتے ہیں۔ اور آخرت کی رسوائی و عقوبت کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں"۔

کیونکہ یہ کھلم کھلا حرام کاری ہے اور اولاد بھی حرام کی پیدا ہوتی رہتی ہے۔

"اور بعض جگہ خود عورتیں درخواست کرتی ہیں کہ خیر میاں بی بی کی طرح نہ رہیں گے مگر گھر میں رہنے دیا جائے اور نان نفقہ جاری رہے تاکہ طلاق کا نام نہ ہو۔ یہ اور بھی طرح طرح کے مفاسد کا منبع ہے۔ مثلاً ایک مکان میں رہنے کی صورت میں کسی وقت ایسی خلوت ہو جاسکتی ہے کہ کوئی تیسرا نہ ہو تو ایسی خلوت اجنبیہ کے ساتھ حرام ہے۔ نیز اس کا کام بھی احتمال

ہے کہ ایسی صورت میں دونوں نفس خلوت سے زائد کسی فتنہ میں مبتلا ہو جائیں"۔

افراط کی کوتاہیاں: یہ ہیں کہ "بعضے لوگ دینے سے ذرا نہیں رکتے۔ ادنیٰ بہانہ کافی ہوتا ہے اور ذرا نہیں سوچتے کہ بلا قوی سبب کے طلاق کی اجازت نہیں۔ ابغض الحلال الی اللہ الطلاق کی حدیث اسی صورت کے لئے ہے اور ایسی طلاق سے اس آیت میں منع فرمایا گیا ہے کہ فان اطعنکم فلا تبغو علیھن سبیلا ای لا تطلبوا الفراق (کما فسرہ الشامی)"

"اور ایسی طلاق میں بلا وجہ اتنے ممنوعات کا ارتکاب ہوتا ہے۔ رائے کی حماقت و سفاہت، نکاح کی نعمت کا کفران، زوجہ اس کے خاندان اور اولاد کی ایذار سانی۔ مزید براں زوجہ کی ذلت و بدنامی بھی ہوتی ہے۔ کوئی اس پر بدکاری کا شبہ کرتا ہے کوئی بد خلقی کا، تو دوسری جگہ نکاح مشکل ہوتا ہے اور تمام عمر مصیبت میں گزرتی ہے"۔

"بعض لوگ طلاق کے معاملہ میں ایک کوتاہی یہ کرتے ہیں کہ "ایک دم سے تین ہی طلاق دے دیتے ہیں، جو اول تو گناہ ہے، اس کے علاوہ دنیاوی مصلحت کے بھی خلاف ہے، اس لئے کہ بعض دفعہ طلاق کے بعد آدمی نادم ہوتا ہے، تو اگر وہ رجعی ہو تب تو رجعت سے تدارک کر سکتا یا اگر بائنہ ہو تو زوجہ کی رضامندی سے پھر سے نکاح ہو سکتا ہے۔ بخلاف تین طلاقوں کے کہ جب تک حلالہ نہ ہو زوج و زوجہ دونوں کی قدرت سے تدارک خارج ہے۔ اور حلالہ میں صحبت کے بعد طلاق کی شرط ٹھہرانا اس میں حدیث میں حلالہ کرنے والے اور جس کے لئے حلالہ کیا جائے دونوں پر لعنت آئی ہے"۔

"ایک غلطی یہ ہے کہ بعض لوگوں نے یہ مسئلہ سن لیا ہے کہ ایک طلاق دے کر رجوع کر لے تو نکاح بدستور قائم رہتا ہے اور اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ خواہ کتنی ہی بار ایسی حرکت کرے ہمیشہ رجعت جائز ہے۔ سو سمجھ لینا

چاہئے کہ ایسا نہیں ہے۔ مثلاً اگر کسی نے ایک طلاق رجعی دے کر رجعت
کر لی درست ہے پھر اس کے بعد دوسری طلاق دے کر رجعت کر لی یہ بھی
درست ہے۔ لیکن پھر اگر اس نے اس کے بعد تیسری مرتبہ طلاق دی تو
رجعت درست نہ ہو گی"۔

"بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر طلاق کی نیت نہ ہو اور یوں ہی مذاق میں یا غصہ میں طلاق کا لفظ منہ سے نکال دے یا کوئی زبردستی کسی سے طلاق دلوا دے تو ان صورتوں میں طلاق نہیں پڑتی۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ طلاق مذاق کی چیز نہیں، اور غصہ میں تو اکثر دی ہی جاتی ہے۔ اور زبردستی کی صورت تو ایسی ہے کہ اگر کوئی کسی کو زبردستی پڑا دے تو کیا اس کو چوٹ نہ لگے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ زبردستی کرنے والے پر گناہ یا مواخذہ ہو گا۔ تو اسی طرح حقیقت ضرب کی طرح حقیقت طلاق کا اثر تو بہر حال ہو ہی جائے گا،۔ (ص ۹۶)

"بعضے لوگ سمجھتے ہیں کہ نشہ کی حالت میں مثل جنوں کے آدمی غیر مکلف
ہو جاتا ہے اور اس حالت میں طلاق نہیں واقع ہوتی۔ سو یہ غلط ہے اس کا
حکم جنوں کا سا نہیں۔ البتہ اگر کسی حلال چیز کھانے سے ضعف مزاج کے
سبب نشہ ہو گیا، اس نشہ کا حکم البتہ مثل جنوں کے ہے کہ طلاق دینے سے
واقع نہ ہو گی"۔

"بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف طلاق ہی ایک ایسی شے ہے، جس سے
نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ اس بناء پر اگر کسی کی زبان سے کفر کا کوئی کلمہ صادر ہو
تو تجدید ایمان کی ضرورت سمجھی جاتی ہے (گو آج کل اس کی بھی بہت کم) مگر
تجدید نکاح کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ حالانکہ مرتد ہونے سے بھی نکاح ٹوٹ
جاتا ہے، اس لئے تجدید ایمان کے بعد تجدید نکاح بھی واجب ہے"۔

نفقہ کے معاملات اور کوتاہیاں: عورت کا نفقہ مرد پر ہوتا ہے، اتنا تو سب جانتے ہیں مگر بہت سی باتیں اس کی تفصیل میں ناواقفیت و جہالت کی شریک ہو گئی ہیں مثلاً "بعض عورتیں شوہر سے مخالفت کر کے میکے جا بیٹھتی ہیں، اور نفقہ کا مطالبہ کرتی ہیں جو مرد پر واجب نہیں کیونکہ نفقہ کے لئے عورت کی جانب سے تسلیم نفس شرط ہے۔

"ایک کوتاہی بعض عورتوں کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ شوہر کے مال کو بے دریغ اڑاتی ہیں اور تمام تنعمات و فضولیات شوہر کے ذمہ سمجھتی ہیں خصوصاً بعض چائے پان وغیرہ میں اس قدر زیادتی کرتی ہیں کہ خود بھی کھاتی پیتی اور آنے جانے والوں کو بھی تقسیم کرتی ہیں، اور یہ سب شوہر کے ذمہ جرمانہ سمجھتی ہیں۔ حالانکہ فقہا نے یہاں تک تصریح کی ہے کہ مرض میں دوا اور طبیب کی فیس بھی شوہر کے ذمہ نہیں"۔

"واقعی ان عورتوں کی فضول خرچیوں خصوصاً پان تمباکو لباس و آرائش اور رسوم و تقریبات کی بدولت مسلمان پنپنے نہیں پاتے .... رشوت وغیرہ کی زیادہ ذمہ داریہی فضول خرچیاں ہیں، ورنہ اکثر گھروں میں دنیا کی بھی رونق رہے اور مردوں کا تقویٰ بھی محفوظ رہے۔ بلکہ اگر عورت ذرا مضبوطی اختیار کرے تو مرد کو مجبوراً متقی بننا پڑے۔ بہت سے ایسے نظائر ہیں کہ عورتوں نے مردوں پر زور دیا کہ اگر تم رشوت نہ چھوڑو گے۔ تو ہم تمہاری کمائی کھائیں پیئیں گے نہیں اور مردوں کو توبہ کرنی پڑی"۔

بیکار چیزوں کی حرص: "اسی طرح اکثر عورتوں میں اکثر بیکار چیزوں کی حرص ہوتی ہے، خواہ ضرورت بھی نہ ہو بس پسند آنے کی دیر ہے خرید لیتی ہیں اور ذخیرہ کرتی چلی جاتی ہیں۔ پھر لطف یہ کہ اکثر ان کی حفاظت بھی ٹھیک نہیں کرتیں اور یوں ہی ضائع جاتی ہیں تو اس طرح "خاوند کے مال کو اڑانا قیامت میں اس کی باز پرس ہوگی حدیث میں ہے کہ المراۃ راعیۃ فی بیت زوجھا"۔

ان فضول و دنیوی مصارف کا تو ذکر ہی کیا "دینی مصارف میں بھی مثلاً کسی سائل کو دینا، یا کسی مسجد و مدرسہ وغیرہ میں چندہ دینا کسی عالم یا واعظ یا یتیم و مسکین و بیوہ و محتاج کی خدمت کرنا بھی بلا رضائے شوہر اس کے مال سے جائز نہیں نہ ایسا دیا ہوا خدا تعالیٰ کے ہاں مقبول ہو گا"۔

بعض حکیمانہ مشورے۔ لیکن "چونکہ ایسے مصارف دنیویہ و دینیہ کی اکثر حاجت ہوتی ہے اور اکثر عورتوں کے پاس جداگانہ مال ہوتا نہیں" (اس لئے حضرت علیہ الرحمہ کا ساتھ ہی کیسا حکیمانہ و شفیقانہ مشورہ ہے کہ) "مردوں کو مناسب ہے کہ نفقہ واجبہ کے علاوہ حسب وسعت کچھ خرچ ایسے مواقع کے لئے بھی دے دیا کریں، جس کا حساب نہ لیا کریں تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق آزادی سے خرچ کر سکیں۔

"نفقہ ہی کا ایک جز بی بی کو رہنے کے لئے گھر دینا بھی ہے، جس کو اکثر مرد اپنے ذمہ واجب نہیں سمجھتے اور اپنے عزیزوں میں عورت کو لا ڈالتے ہیں سو اگر وہ بخوشی اس پر راضی تو خیر ورنہ مرد پر اس کے لئے جدا رہنے کا انتظام واجب ہے .... اور آج کل کے طبائع و واقعات کا مقتضا تو یہ ہے کہ اگر عورت ساتھ رہنے پر راضی بھی ہو اور جدا رہنے سے اعزہ ناخوش بھی ہوں تب بھی مصلحت یہی ہے کہ جدا رکھیں۔ اس میں ہزاروں مفاسد کا انسداد ہے۔ گو چند روز کے لئے عزیزوں کا ناک منہ چڑھے گا، مگر جب اس کی مصلحتیں دیکھیں گے، تو خوش ہوں گے، خصوص چولہا تو ضرور علیحدہ ہونا چاہئے۔ زیادہ تر آگ اسی چولہے سے بھڑکتی ہے۔ فقہا نے یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر پہلی بی بی سے کچھ اولاد ہو تو اس کے ساتھ رہنے پر بھی مجبور نہیں کر سکتا" (واقعی جیسا حضرت اکثر فرمایا کرتے ہمارے فقہا حکمائے امت ہیں)۔

عام طور سے تو لوگ زن مرید ہی ہوتے ہیں خصوصاً اس زمانہ میں، اور بی بی کے مقابلہ میں والدین کے حقوق کی قطعاً پروا نہیں کرتے لیکن دوسری طرف

> "بعضے آدمی اس کو بڑی سعادت مندی سمجھتے ہیں کہ بی بی کو اپنی ماں کا محکوم و مغلوب بنا کر رکھیں، جس کی بدولت بیبیوں پر بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں سو سمجھ لینا چاہئے کہ بی بی پر فرض نہیں کہ ساس کی خدمت کیا کرے تم سعادت مند ہو تو خدمت کرو یا نوکر رکھو(۱)۔

۱۔ تعدیل حقوق والدین کے نام سے حضرت کا ایک مختصر سا مستقل رسالہ ہے، جس میں اس کی ضروری تفصیل ہے۔

ایک اور غلطی یا کوتاہی: یہ ہے کہ بجز بی بی اور اولاد کے کسی اور کا نفقہ اپنے ذمہ نہیں سمجھتے حالانکہ ایک تو محتاج والدین کا نفقہ مالدار اولاد پر واجب ہے۔ اور دوسرے جتنے اقارب ذی رحم ہوں اور وہ حاجت مند اور کسب سے عاجز بھی ہوں سب کا نفقہ بھی واجب ہے۔ مگر تنہا نہیں بلکہ والدین کا تو تمام اولاد پر ان اقارب کا تمام ایسے رشتہ داروں پر کہ اگر وہ ذی رحم محرم مرجاوے تو ان رشتہ داروں کو ان کی میراث میں حصہ پہنچے۔ بقدر اس حصہ کے ہر شخص پر واجب ہو گا"۔

"ایک فرد نفقہ واجبہ کی مطلق احتیاج کے سبب ہے، جس میں کسی کی تخصیص نہیں جو شخص بھی حاجت مند اور کسب سے عاجز ہو خواہ قریب ہو یا اجنبی خواہ مسلم ہو یا کافر حتیٰ کہ خواہ آدمی ہو یا جانور سب کی خبر گیری سب پر واجب ہے"۔

معاشی مشکل کا کیا آسان حل: نفقات واجبہ کا صرف یہ ایک اختیاری قانون بہت سی معاشی مشکلات کا کیسا آسان اور سیدھا سادھا حل ہے بشرطیکہ عوام میں موثر دینی تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس کو رائج کر دیا جائے۔ اور ایسی تربیت کے رواج کے لئے اس سے عشر عشیر بھی زور و زر کی ضرورت نہ ہو گی، جتنا جمہوریت اشتمالیت اشتراکیت وغیرہ کے پیچ در پیچ اصول و نظامات کے اجباری و حکومتی قوانین کے نفاذ کے لئے ہوتی ہے۔ نہ انفرادی آزادی اور شخصی ملکیت کے قدرتی مصالح و مطالبات میں حکومت کی دست اندازی کی ضرورت رہ جائے گی۔ پھر اشتراکیت وغیرہ کے نظامات معیشت میں ایک مشکل کو حل کرنے کے لئے بیسیوں دیگر مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، جن کی بدولت معاشی مسائل کے ساتھ ساتھ روز نئے نئے ایسے سیاسی مسائل و فسادات سر اٹھاتے رہتے ہیں کہ بالاخر آج دنیا بھر میں کہیں امن و سلامتی کا نام و نشان نہیں رہ گیا ہے۔ حالانکہ امن و امان کا قیام و بقا حکومت کا معاشی انتظام سے بھی زیادہ مقدم فرض تھا۔

رہا مدعیان جمہوریت و اشتراکیت وغیرہ کا غیر قدرتی مساوات کا بلند بانگ دعویٰ تو یہ خبط نہ دنیا میں کبھی کسی بڑے پیمانہ پر قابل عمل رہا ہے اور نہ خود مارکس اور لینن کا نام

جتنے والے حکومت و وزارت کے ایوانوں میں بیٹھ کر زبانی دعووں سے آگے آج تک اس کا کوئی عملی ثبوت دے سکے ہیں۔ ان دعووں کا عملی ثبوت بھی دنیا میں اگر کسی نے کبھی دیا ہے تو وہ دین شریعت ہی کی تعلیم و تربیت کے صدیق و فاروق یا دیگر کاملین نے۔

اور کیوں نہ ہو کہ شریعت نے تو انسان کیا حیوان بلکہ بے جان چیزوں تک کی ضروری حفاظت و صیانت کا حق عائد فرما دیا ہے، خود حضرت ہی کا ایک رسالہ حقوق حیوانات کے متعلق بنام "ارشاد الھائم فی حقوق البہائم" قابل ملاحظہ ہے۔ البتہ بے جان چیزوں کے نفقہ پر "اگر وہ بدوں اس کے ضائع ہو رہی ہوں جیسے کھیتی یا مکان مجبور نہیں کیا ہے، تاہم نفس مال کے ضائع کرنے کی کراہیت اس شخص پر بھی ہو گی لیکن اگر یہ مشترک ہو اور ایک شریک بقدر اپنے حصہ کے خرچ کرنے کو تیار ہو تو دوسرے کو بھی حاکم مجبور کرے گا کہ بقدر اپنے حصہ کے خرچ کرے کیونکہ یہاں دوسرے کا مال بھی ضائع ہو رہا ہے، جس کا اس کو حق نہیں اس لئے جبر کیا جاوے گا"۔

نفقہ کی ایک غامض صورت۔ "ایک فرد نفقہ واجبہ کی ایسی غامض ہے کہ عوام کیا خواص کا ذہن بھی اس کی طرف نہ منتقل ہوا ہو گا۔ لیکن اس کو بتلانے سے پہلے ایک مقدمہ معروض ہے۔ وہ یہ کہ

> "فقہا نے تصریح کی ہے کہ نفقہ احتباس کی بھی جزا ہوتا ہے۔ یعنی جو شخص کسی کی مصلحت یا خدمت کے لئے محبوس و مقید ہو، اور اس کے سبب اپنی معیشت کا انتظام نہ کر سکتا ہو، تو اس شخص کا نفقہ اس پر واجب ہو گا، جس کی مصلحت و منفعت کے لئے وہ محبوس ہے۔ اس کی مشہور مثال قاضی کا رزق یا نفقہ ہے چونکہ وہ عامہ مسلمین کی منفعت کے لئے خدمت قضا میں محبوس و مشغول ہے، اس لئے اس کا گزارہ عامہ مسلمین پر واجب ہے، جس کی شکل یہ ہے کہ بیت المال میں سے دیا جاتا ہے، جو در حقیقت اموال مسلمین ہی کا خزانہ ہے .... اور فقہا نے زوجہ کے نفقہ کو بھی جزائے احتباس ہی کہا ہے۔ جب یہ مقدمہ ہو چکا تو اب اس فرد غامض کو بتلایا جاتا

ہے"۔

"وہ علماء و طلباء و مشائخ کی خدمت ہے، جس کی حقیقت یہی ہے کہ یہ حضرات قوم کی دینی خدمت میں محبوس ہیں۔ علم دین کی تحصیل و تعلیم کا دینی خدمت ہونا تو ظاہر ہے۔ باقی اس کا قوم کی طرف راجع ہونا تو وہ اس طرح ہے کہ علوم دینیہ میں تبحر مجموعہ مسلمین پر فرض کفایہ ہے یعنی قوم میں اتنے جامع علوم دینیہ کے موجود رہنے کا انتظام ضروری ہے، جن سے عامہ مسلمین کی دینی حاجتیں احکام و جواب فتاویٰ وغیرہ پوری ہو سکیں۔ اگر ایسا انتظام نہ کیا جاوے تو تمام قوم عاصی و گنہگار ہو گی۔ اس مسئلہ کی علماء نے تصریح بھی کی ہے اور عقل سے بھی سمجھ میں آتا ہے۔ جس کی عقلی نظیر طبیب کامل ہے کہ ہر شخص کو طبیب کی حاجت پیش آتی ہے۔ لیکن ہر شخص طبیب کامل بنے تو امر معاش بالکل مختل ہو جائے اور اگر کوئی بھی نہ بنے تو طبی حاجت کسی کی بھی پوری نہ ہو، اس لئے صورت مجوزہ عقلی بھی ہے کہ چند آحاد کامل ہوں جو تمام قوم کی حاجتوں کو کافی ہوں۔

"اسی طرح مطب روحانی کے اہتمام کو اس مطب جسمانی پر قیاس کر لیا جائے۔ باقی اگر کوئی اس مطب روحانی ہی کو فضول سمجھے وہ قوم سے خارج اور ہمارا مخاطب ہی نہیں۔ خطاب مسلمانوں سے ہے۔ جس طرح کوئی وحشی جنگلی مطب جسمانی ہی کو فضول بتلا دے تو مطب جسمانی کی مثال اس پر حجت نہیں"۔

"غرض اس طرح دین کے علماء و طلباء کے نفقات مجموعہ قوم کے ذمہ واجب ہوں گے۔ پھر جس وقت تک بیت المال تھا اس سے وصول ہو جانا عامہ مسلمین سے وصول ہو جانے کی صورت تھی۔ چنانچہ فقہا نے قضاۃ علماء و مفتیین وغیرہ کی کفایت کا بیت المال سے ہونا تصریحاً لکھا ہے۔ اور جب بیت المال نہیں رہا ہے تو اس کی صورت صرف یہی ہے کہ سب مسلمان متفق و مجتمع ہو کر تھوڑی تھوڑی سب ان حضرات کی خدمت بقدر کفایت

کریں خواہ مدرسہ کی شکل میں جس میں ضوابط و قواعد مقرر ہوتے ہیں اور یہ سہل و اقرب الی الضبط ہے اور خواہ توکل کی صورت میں جس میں کوئی مقدار متعین نہیں، جو جس کو توفیق ہوتی بلاواسطہ کسی مہتمم وغیرہ خود ان کی نذر کر دے اور یہ اقرب الی الخلوص ہے۔

"اور یہ مسئلہ قرآن میں منصوص ہے قال اللہ تعالیٰ للفقراء الذین احصرو فی سبیل اللہ لایستطیون ضربافی الارض الایہ۔ اس آیت میں اگر ان امور پر نظر کی جائے کہ لام استحقاق کا ہے لفظ فقرا احتیاج کو بتلا رہا ہے احصرو احتباس پر دلالت کر رہا ہے اور فی سبیل اللہ کی تفسیر طلب علم کے ساتھ منقول ہے اور لا یستطیعون ضرباً اسباب معاش کے لئے عدم فراغت کی طرف اشارہ کر رہا ہے تو تقریر مذکور کی صریح دلیل ہے۔

"بس علماء و طلباء سے جو یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آخر انہوں نے معاش کا کیا انتظام کیا ہے تو ظاہر ہو گیا کہ ان کے ذمہ اپنی معاش کا انتظام لازم ہی نہیں۔ یہ قوم کے ذمہ ہے۔ اور ان کو قوم سے سوال کرنے کا حق حاصل ہے کہ ہم تو ایک فرض میں مشغول ہیں اور تمہارے ذمہ ہماری خدمت واجب ہے تم نے اس کا کیا انتظام کیا ہے۔ تو عجیب بات ہے کہ سوال کا حق تو ان کو الٹے انہیں سے سوال کیا جانے لگا۔

"لہٰذا معلوم ہو گیا کہ اس کا انتظام قوم پر واجب ہے تو اگر وہ اس میں کوتاہی کرے گی تو قیامت میں باز پرس ہو گی۔ اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تعلیم دین پر جو تنخواہ لی جاتی ہے اس میں امام شافعی کے قوم پر اخذ اجرت علی الطاعات کے جواز کا فتویٰ دینے کی حاجت نہیں۔ اس کو اجرت ہی کیوں کہا جائے۔ جزائے حبس کیوں نہ کہا جائے تو خود امام ابو حنیفہؒ ہی کے مذہب پر جواز ثابت رہے گا۔

"اور یہ بات تجربہ سے معلوم ہے کہ اگر یہ لوگ معاش میں مشغول ہوں، تو خدمات دینیہ کا ایسا حق نہیں ادا کر سکتے جیسا کہ ان کے لئے بالکل فارغ

ہونے میں کر سکتے ہیں اللہ تعالیٰ جن لوگوں کی نسبت لا یستطیعون فرمایا ہے وہ اپاہج نہ تھے، بلکہ غایت درجہ مشغول فی سبیل اللہ تھے۔ البتہ اس تقریر سے وہی علماء منتفع ہو سکتے ہیں جن کی نیت محض دینی خدمت کی ہے۔ جس کا معیار یہ ہے کہ اگر ایک جگہ تنخواہ میں توسط کے ساتھ گزر ہو رہا ہے اور دوسری جگہ زیادہ تنخواہ کا پیام آوے اور وہاں جانے میں کوئی دینی مصلحت زیادہ نہ ہو تو یہ شخص وہاں جانے سے انکار کر دے۔ پس یہ معیار ہے ورنہ بیشک وہ اجیر ہے۔ اور ایسے شخص کی تنخواہ کا تعین اس کو رزق و کفاء ت ہونے سے نہ نکالے گا، بلکہ اس تعین کو مصلحت قطع نزاع کہا جاوے گا، جس سے وہ اجرت نہ ہوگی۔ (ص ۱۱۵)

وقت کا اہم و اقدم مسئلہ: یہ کوئی معمولی تجدید و اصلاح کی بات نہیں بلکہ وقت کے نہایت ہی اہم و اقدم مسئلہ کی مجتہدانہ تحقیق اور اس سے پیدا شدہ مشکل کا نہایت ہی صحیح عقلی و عملی حل ہے۔ جن لوگوں کے نزدیک دین کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں، اور ساری دوڑ دھوپ کو اس دنیا کی زندگی میں گم کر رکھا ہے، ان سے نہ خطاب ہے، نہ سوال۔ سوال صرف مسلمانوں سے ہے کہ اگر مسلمان ہونے کے معنی اسلامی شریعت کے احکام کو ماننے اور ان پر چلنے کے سوا کچھ نہیں، تو جب تک ان احکام کے جاننے والے اور معمولی جاننے والے ہی نہیں بلکہ ہر روز طرح طرح کے پیدا ہونے والے نئے نئے سوالات کے جوابات کے لئے علوم دینیہ میں تبحر اور محققانہ استنباط کی قوت رکھنے والے علماء و فقہا اور پھر عام مسلمانوں میں عام احکام کی تعلیم و تبلیغ کے لئے عام اہل علم کی ایک ایسی کثیر تعداد موجود ہوگی جو مثلاً ہندوستان ہی کے کروڑوں مسلمانوں کو ان کے دین سے کم از کم بقدر واجب واقف رکھ سکے اس وقت تک ہمارے مسلمان رہنے کی آخر صورت اور مطلب ہی کیا ہے؟

درسگاہوں کا انتظام: صورتیں فقط دو ہی ہیں۔ ایک طرف تو ہر ہر شہر میں چھوٹی اور ہر صوبہ میں کم از کم ایک دو دیوبند کے درجہ کی بڑی درسگاہیں ہوں جس میں تمام علوم دینیہ کی تعلیم کا وسیع پیمانہ پر ہزاروں طلبہ کے لئے انتظام ہو، جہاں سے کچھ تو ایسے ذی استعداد نکل

سکیں گے. جو تبحر و تحقیق اور استنباط و تفقہ کے درجہ تک پہنچ سکیں۔ باقی متوسط اور ادنیٰ استعداد کی اکثریت کا کام یہ ہو کہ صوبہ بھر میں شہر شہر قصبہ قصبہ اور قریہ قریہ میں پھیل کر عام مسلمانوں میں احکام کی تعلیم و تبلیغ اور ان کے اتباع کی ترغیب و تدبیر میں مصروف ہو۔

ان کے مصارف کا انتظام. دوسری طرف ان درسگاہوں اور ان میں مختلف دینی و درسی خدمات انجام دینے والوں کی گزر اوقات یا نفقات کا انتظام ہو۔ جس کی شکل یہی ہے کہ یا تو وہ خود ہی فارغ البال و خوشحال ہوں. جیسا کہ حضرت نے جابجا امراء کو متوجہ فرمایا ہے کہ دین کی تعلیم و تعلم کا سب سے زیادہ فرض انہیں پر عائد ہے اور کم از کم اپنی اولاد میں سے ایک کو جو سب سے زیادہ ذہین ہو علم دین کے لئے وقف کر دیا کریں۔ باقی جو لوگ فارغ البال نہیں۔ ان کے لئے عامہ مسلمین کی طرف سے بقدر کفایت معاش کا انتظام واجب ہے۔ اور کچھ قدرۃً ایسے بھی ہوں گے جو کوئی نہ کوئی مشغلہ معاش خود اختیار کر کے اس کے ساتھ بھی حسب استعداد و حسب فرصت دینی خدمات ادا کرتے رہیں۔ البتہ دینی درسگاہوں کے فارغ التحصیل یا علمائے دین کے لئے یہ کسی طرح سزاوار نہیں کہ عام دنیا داروں کی طرح وہ تمامتر صاف طلب دنیا یا فکر معاش میں اپنی سعی کو کھپا دیں۔ اس سے نہ محض ان کا علم نسیا منسیا ہو جائے گا. جیسا کہ اکثر دیکھا جاتا ہے. بلکہ ایسے علم دین حاصل کرنے کا حاصل ہی کیا نکلا۔ دنیوی مصروفیت کے ساتھ اپنی واجب ضرورت بھر کے احکام کا علم تو معمولی اردو کی کتابوں سے بھی حاصل کر لیا جا سکتا تھا پھر زندگی کے دس بارہ سال خالص عربی و علم دین کی تحصیل میں لگا دینے کا مطلب کیا نکلا!

خدمت دین کا حوصلہ. اس معاملہ کی طرف ہمارے دینی مدارس کے اہل حل و عقد کی بڑی توجہ کی ضرورت ہے اور بڑی ناعاقبت اندیشی ہے کہ وہ بالعموم صرف کتابوں کا ایک مقررہ نصاب پورا کرا کے فراغت کی سند دے کر اپنے نزدیک گویا ساری ذمہ داری سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ان درسگاہوں کے طلبہ کی تعلیم و تربیت کا یہ لازمی جز ہونا چاہئے کہ سند کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی نوع کی خدمت دین کی ہمت و حوصلہ بھی لے کر

نکلیں ورنہ ان کو سند ہی نہ دی جائے۔ اور جن طلبہ سے برسوں اساتذہ و منتظمین کا سابقہ رہتا ہے اگر نظر رکھی جائے تو ان کے رجحانات کا اندازہ کر لینا دشوار نہیں۔

خدام دین کی خدمت کا فریضہ: اب رہا یہ کہ ایسی درسگاہوں اور ان سے نکلنے والے خدام دین یا علماء کی خدمت کا فرض کیونکر ادا ہو تو اس کی تدبیر بھی عام مسلمانوں ہی کے ذمہ ہے، نہ کہ مدرسہ والوں کے، کہ وہ انتظام و تدریس کی ذمہ داریوں کے ساتھ دروازہ دروازہ چندہ بھی تحصیل کرتے کراتے پھریں۔ نہ جو فارغ التحصیل علماء کسی شہر قصبہ یا گاؤں میں تبلیغ و تعلیم دین کی خدمت متعلقہ انجام دے رہے ہیں ان کا کام یہ ہے کہ اپنے گزران و نفقہ کے لئے لوگوں کو مخاطب کریں یا ان کا منہ دیکھیں اس میں نہ وہ آزادی کے ساتھ تعلیم و تبلیغ کر سکتے ہیں اور نہ ان کی تعلیم و تبلیغ کا معتدبہ اثر ہو سکتا ہے۔ ان کی خدمت جماعتی یا انفرادی، جس انتظام کے ساتھ ہو خود اپنی ہی سعادت اور عین اپنا ہی فریضہ سمجھ کر ہو۔

عالی ہمت و قانع طبیعت علماء: البتہ خود ان علماء ہی میں اگر کچھ ایسے عالی ہمت و قانع طبیعت افراد ہوں کہ کسی صنعت و حرفت وغیرہ کے ذریعہ بالکل بقدر ضرورت اپنی معاش کا بھی انتظام کر سکیں (اسی لئے حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمہ نے مدارس دینیہ میں صنعت و حرفت وغیرہ کے انتظام پر زور دیا ہے) یا بعض افراد ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو بالکلیہ توکل کر کے سارا وقت خدمت دین ہی میں صرف کریں، لیکن یہ بہت نادر ہوں گے کیونکہ ایسا توکل واجب نہیں اور اس کے استحباب کے جو شرائط ہیں ان کا پورا کرنا کاملین ہی کا کام ہے (۱)۔

نفقات روحانیہ: نفقات کے سلسلہ میں جن غلطیوں و کوتاہیوں کی اصلاح فرمائی گئی ہے، ان کا آخری باب نفقات روحانیہ پر ہے۔ اہل و عیال اعزہ و اقربا کا معاملہ تو یہ ہے،

۱۔ دینی تعلیم کی تجدید و اصلاح پر مفصل گفتگو تجدید تعلیم و تبلیغ کے عنوان سے مستقل رسالہ میں کی گئی ہے۔

کہ ان سے ہمارا محبت کا طبعی تعلق اور بعض صورتوں میں لحاظ و مروت یا دنیا کی نیک نامی و عزت ہی کا خیال ایسا ہوتا ہے، کہ اگر دینی احکام کا اہتمام نہ بھی ہو تو بھی ان کے نفقات جسمانیہ و حاجات دنیویہ کو سرے سے نظر انداز کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ خصوصاً بال بچوں کے نفقات و مصارف میں جو کوتاہیاں ہوتی ہیں، وہ بالعموم تقصیر و تفریط کے بجائے زیادہ تر افراط اسراف کی ہوتی ہیں۔ بخلاف اس کے نفقات روحانیہ سے اتنی شدید غفلت و اجنبیت ہے کہ یہ عنوان ہی لوگوں کو عجیب معلوم ہو گا سو "نفقات روحانیہ سے مراد دینی تعلیم و تربیت ہے" اوپر اہل و عیال کے جو حقوق و نفقات بیان کئے گئے ان کا تعلق لغوی یا جسمانی رزق سے تھا آگے ان کے معنوی یا روحانی رزق کا بیان ہے اور "جس طرح نفقات حسیہ سے بی بی بچوں اور متعلقین کی جسمانی تربیت ضروری ہے اسی طرح علوم دینیہ اور اصلاح کے طریقوں سے ان کی روحانی تربیت اس سے بھی زیادہ ضروری ہے اور اس میں بھی انواع انواع کی کوتاہیاں کی جاتی ہیں"۔

اعظم کوتاہی: "سب سے اول و اعظم کوتاہی تو یہ ہے کہ بہت لوگ اس کو سرے سے ضروری نہیں سمجھتے۔ یعنی اپنے گھر والوں کو نہ کبھی دین کی بات بتلاتے ہیں نہ کبھی امر منکر پر روک ٹوک کرتے ہیں .... حالانکہ قرآن مجید میں نص صریح ہے قوا انفسکم واہلیکم نارا اور حدیث صحیح میں ہے کہ کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ اس کے وجوب کو صاف بتلا رہے ہیں"۔ اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں۔ بچوں کے لئے حکم ہے کہ سات سال کی عمر میں ان کو نماز کا حکم کرو اور جب دس سال کے ہو جائیں تو مارو۔ غرض جس طرح اہل و عیال کا نان نفقہ واجب ہے، اسی طرح ان کی تعلیم و تربیت دینی بھی۔

"ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ لڑکوں کی تعلیم کو ضروری سمجھتے ہیں، مگر بیبیوں کی اور لڑکیوں کی تعلیم کو ضروری نہیں سمجھتے۔ بلکہ تعلیم نسواں کو مضر سمجھتے ہیں جیسا کہ ان کے مقابل میں دوسری طرف بعض لوگ عورتوں کے لئے جدید تعلیم کو یا قدیم تعلیم کو بطرز جدید ضروری سمجھتے ہیں۔" (۱)

۱۔ اس پر بھی مفصل گفتگو اسی رسالہ بالا میں ملے گی۔

تربیت سے بے پرواہی۔ "ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ تعلیم کو تو سب کے لئے ضروری سمجھتے ہیں مگر تربیت کو ضروری نہیں سمجھتے۔ حالانکہ تربیت کی ضرورت تعلیم درسی سے تو من کل الوجوہ اور من وجہ نفس تعلیم سے بھی اہم ہے درسی سے تو اس لئے کہ وہ فرض عین نہیں۔ بہت سے صحابہ علوم درسیہ سے خالی تھے .... اور نفس تعلیم سے اس لئے کہ مقصود تعلیم سے تربیت ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ تعلیم کے معنی علم دینا ہیں اور تربیت کے معنی عمل کرانا۔ اور علم سے مقصود عمل ہی ہے۔ اور مقصود کا اہم ہونا ظاہر ہے۔

"اس سے اعمال جوارح کا عقائد سے اہم ہونا لازم نہیں آتا۔ کیونکہ عقائد تو ان علوم کا نام ہے، جو خود مقصود بالذات ہیں۔ اور یہاں گفتگو ان علوم میں ہے جو علوم کے لئے مقصود ہیں۔ اور من وجہ اس لئے کہا گیا کہ بعض حیثیات سے یہ علوم اعمال سے افضل ہیں۔ کیونکہ علم اصل بنیاد ہے اور عمل اس کی فرع اور اس پر مبنی ہوتا ہے۔ بہرحال تربیت یا تعلیم سے اہم ہے یا اس کے برابر ہی سہی۔ مگر اس سے قطع نظر کرنے یا اس کو ضروری نہ سمجھنے کی تو کسی حال میں بھی گنجائش نہیں"۔

تربیت کا مطلب۔ "ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ تربیت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں، مگر اس سے عرفی یا رواجی تہذیب کو سمجھتے ہیں چنانچہ اس کا اہتمام بھی کرتے ہیں گو وہ شریعت مقدسہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ حتیٰ کہ ایک معزز تعلیم یافتہ کا جو طبیب بھی تھے میں نے بچشم خود یہ واقعہ دیکھا کہ ان کی گود میں ان کا ایک بچہ تھا ایک صاحب ان سے ملنے آئے تو بچے کو حکم دیا کہ ان کو سلام کرو۔ اس بچے نے کہا السلام علیکم تو حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں کہو آداب عرض۔ وہ ملاقاتی دیندار آدمی تھے بگڑے کہ افسوس بچہ تو سنت پر عمل کرے اور آپ اس کو بدعت کی تعلیم دیتے ہیں"۔

"اس کی وجہ یہی ہے کہ تہذیب شرعی ان کی نظر میں کوئی چیز نہیں۔ حالانکہ مسلمان کو جس تہذیب کا امر ہے وہ تہذیب شرعی ہے .... بلکہ تہذیب عرفی جو تہذیب شرعی کے منافی ہو اس قابل بھی نہیں کہ اس کو تہذیب کہا بھی جائے۔ احقر تو اس کو تعذیب کہا کرتا

ہے۔ کیونکہ اس کی حقیقت تکلف ہے اور تکلف سے جو کلفتیں ہوا کرتی ہیں ظاہر ہیں۔ (ص۲۱۶) پھر مسلمان کے لئے تو کلفت و راحت کی بھی بحث نہ ہونی چاہیئے۔ اس لئے مسلمان ہونے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ ہر امر میں اسلام کی تعلیم کے سامنے سر جھکا دے۔

غضب و عبرت کی بات: یہ ہے کہ اچھے اچھے علماء و مشائخ جو ظاہر ہے کہ تہذیب شرعی کی ضرورت و اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے، مگر اس کی حقیقت سے ایسی غفلت ہے کہ عملاً و ارشاداً طرح طرح کی فروگذاشتوں میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔

"اس کی وجہ یہ نہیں کہ قرآن و حدیث میں تہذیب کی تعلیم نہیں، بلکہ اس کی طرف التفات نہیں۔ اس لئے بعضے خدمت تدریس پر بھی مامور ہیں اور شب و روز قرآن و حدیث زبان پر جاری ہے پھر بھی بے خبری ایسی ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ کو دیکھتے ہیں مگر لا تمنن تستکثر کو نہیں دیکھتے۔ اسی طرح لاتدخلو بیوتا غیر بیوتکم حتیٰ تستانسو وتسلموا علی اھلھا کے عموم پر نظر نہیں کرتے۔

اس سلسلہ میں حضرت نے خود اپنے دو تجربات درج فرمائے ہیں: کہ

"ایک ذی علم شب کے وقت مردانہ مکان کے پھاٹک پر پہنچے سب سو گئے تھے آواز دی ملازم جاگا اور بولا پھاٹک کھولنے کا حکم نہیں۔ نیز ناوقت ہو جانے اور ان کو نہ پہچاننے کی وجہ سے بے اطمینانی بھی ہوئی اس لئے اس نے ادب کے ساتھ عذر بھی کیا۔ مگر جب تاکیدی حکم ملا تو مروت سے پھاٹک کھول دیا اور وہ دیوان خانہ میں ٹھہر گئے۔ صبح جب میں نے یہ آیت پڑھ کر بلا اذن ٹھہرنے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ یہ آیت خاص زنانخانہ کے لئے ہے۔ میں نے اس تخصیص کی دلیل پوچھی جواب ندارد"۔

"ایک اور واقعہ یہ ہے کہ میرے ہاں ایک مولانا مہمان آئے گھر سے ان کے لئے کھانا آیا تو آپ نے ایک دوسرے ہم وطن کو اصرار کر کے کھانے میں شریک کر لیا میرے ملازم نے کہا کہ بلا اجازت مالک کے یہ تصرف جائز نہیں معلوم ہوتا فرمانے لگے کہ ہم تحقیق کر لیں گے۔ مگر ان کے

نزدیک یہ امر اتنا مہتم بالشان ہی نہ تھا کہ تحقیق ضروری سمجھتے آخر میں نے
خود ہی ایک روز ان سے تذکرہ کیا، تو فرماتے ہیں کہ میں سمجھا کہ سب میرے
ہی لئے ہے، اور تھا زیادہ اس لئے دوسرے کو شریک کر لیا۔ میں نے کہا
حیرت ہے اس کی کیا دلیل تھی، کہ آپ کے پاس تملیکا آیا، بلکہ ظاہر تو
یہی ہے کہ اباحتہً آیا ہے، اور وہ اباحت مقید ہے تصرف خاص کے ساتھ کہ
وہ آپ کا نوش فرمانا ہے اور زیادہ اس لئے تھا کہ مہمان کو کمی نہ رہے شاید
وہ دوبارہ مانگتے ہوئے شرمائے، تو آپ نے یہ دوسرا تصرف کس بناء پر کیا۔
غرض ان باتوں کی پرواہی نہیں، سب کی وجہ یہی ہے کہ تربیت اخلاق کی نظر
سے قرآن و حدیث کو دیکھا ہی نہیں"۔

علماء و مشائخ میں ایک عام بلا۔ "اسی طرح بعض اہل علم و مشائخ میں ایک عام بلا
شائع ہے کہ اپنے ساتھ دعوت میں اگر محتاط ہوئے دو ہی چار کو ورنہ اور زیادہ کو لئے
چلے جاتے ہیں۔ اور جی کو سمجھا لیتے ہیں کہ صاحب دعوت کی اجازت ہو گی۔ حالانکہ
بکثرت صاحب دعوت کو یہ گراں گزرتا ہے۔ بعضے اجازت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں، مگر
خود اجازت کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ اجازت وہ ہے جہاں اجازت دینے والا آزادی سے
انکار بھی کر سکے۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقام پر دعوت میں ایک
سے زائد شخص کی اجازت لی۔ مگر حضورؐ نے اپنے جاں نثاروں کو بے تکلف کر رکھا تھا، کہ
جب ان کی رائے نہ ہوتی تھی تو آزادی سے صاف انکار کر دیتے تھے۔ جیسا کہ ایک
فارسی کا شوربا پکانا اور آپ کی دعوت کرنا اور آپ کا حضرت عائشہؓ کے لئے پوچھنا اور
اس کا انکار کر دینا اور آپ کا برا نہ ماننا۔ اسی طرح حضرت بریرہ سے مغیث کی
سفارش فرمانا اور ان کا انکار کر دینا حدیثوں میں مصرح ہے۔ بھلا کیا آج کل کسی مرید کی
ہمت ہے کہ اس طرح پیر سے انکار کر دے یا کسی پیر کی ہمت ہے کہ ایسے انکار کو
بشاشت سے قبول کر لے۔ تو ایسی اجازت کا نہ لینا معتبر نہ دینا۔ سو حقیقت میں ان
صاحبوں کو اجازت کی حقیقت سے آگاہی نہیں"۔

تعلیم و تربیت کی ابتداہی سے ضرورت: "بہرحال تعلیم و تربیت دونوں کی ضرورت عام ہے اور تجربہ سے ثابت ہے کہ جو تعلیم و تربیت ابتداہی سے ہو اس کا جو اثر ہوتا ہے کہ وہ علوم و اعمال مثل امور طبعیہ کے ہو جاتے ہیں، یہ بات بعد میں نہیں پیدا ہوتی۔ اور یہ کام ماں باپ اور سرپرستوں کا ہے، جو عموماً اس میں کوتاہی کرتے ہیں پھر بعد میں جو شخص اس کا اہتمام کرنا چاہتا ہے مثلاً عورت کے لئے شوہر اور مردوں کے لئے استاد یا پیر تو ان کو سخت دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ اور بعض جگہ ناگواری درجہ منافرت تک پہنچ جاتی ہے۔ دوسرے معلمین سے یہ منافرت تو صرف مباعدت کی صورت پیدا کرتی ہے۔ مگر زوجین کا تعلق ایسا ہے کہ ہر وقت سابقہ رہتا ہے، اور مرد اپنی مصلحتوں سے قطع تعلق پسند نہیں کرتا، اور نہ عورت کی جہالتوں کو برداشت کر سکتا ہے تو ہمیشہ کے لئے منازعت و مشاقت قائم ہو جاتی ہے، جس کے نتائج جانبین کے حق میں برے سے برے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور دونوں کی زندگی موت سے بھی زیادہ تلخ ہو جاتی ہے"۔

قدرت اصلاح: "اور ان سب کا سبب اکثر وہی ابتدا میں اصلاح کی طرف توجہ نہ کرنا ہے۔ لیکن جب ایسا ہو گیا تو یہی نہیں کہ ان لوگوں کو مہمل چھوڑ دیا جائے بلکہ جب قدرت ہو تب ہی اس کی سعی ضروری ہے۔ قدرت کی دو قسمیں ہیں ارادی و قہری۔ ارادی تو پیر و استاد کی ہے اور قہری حاکم کی خواہ بحکومت عامہ ہو جیسے سلطان خواہ بحکومت خاصہ جیسے عورت کے لئے شوہر یا غلام کے لئے آقا۔ سو مردوں کی تہذیب شرعی کے لئے حکومت قہریہ کے اسباب بہت کم مجتمع ہیں کیونکہ سلاطین کو اس طرف توجہ ہی نہیں۔ اور غلام اب ہیں نہیں۔ رہ گئی حکومت ارادیہ تو اس کے اثر سے نکل جانا ہر وقت اختیار میں ہے۔ اس لئے مردوں کی اصلاح کے اسباب بہت ضعیف ہیں۔ البتہ عورتوں کے لئے عادۃً شوہر کا ہونا لازم ہے اور ان کی اصلاح بہت سہل ہے"۔

"بی بی میاں دونوں مہذب ہیں": یہ حضرت علیہ الرحمہ نے چوتھائی صدی سے بھی قبل تحریر فرمایا تھا۔ اب عورتوں کے لئے بھی آزادی و برابری کا زمانہ ہے، حتیٰ کہ یہ بلا ان گھروں تک میں گھس رہی ہے، جن کے ہاں بیبیاں شوہروں سے چار آنکھیں کرنا

بھی شرافت کے خلاف جانتی تھیں۔ اس لئے اب ان عورتوں کی اصلاح بھی "بہت سہل" نہیں رہی ہے، اور جو کچھ ہے وہ بھی "اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند"۔ البتہ تہذیب شرعی کے فقدان سے زوجین میں منافرت کا اندیشہ بھی نہیں رہا اس لئے کہ زوج کو خود ہی تہذیب شرعی کی کب پرواہ ہے۔ دونوں تہذیب مغربی کے مہذب ہیں۔

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں
اسے غیرت نہیں آتی انہیں غصہ نہیں آتا

ابھی اوپر ہی تازہ تجربہ اس قسم کی پوری نہیں صرف آدھی بلکہ چوتھائی یا اس سے بھی کم مہذب خاتون کا بیان ہو چکا ہے، کہ نامحرم اعزہ سے پردہ کو قبول نہ کیا، زیادہ اصرار و اظہار ناراضگی کیا گیا، تو فرمایا کہ میں تو قرآنی پردہ کرتی ہوں اور قرآن میں منہ چھپانے کا پردہ نہیں۔ جب اور زیادہ اظہار ناراضگی کیا گیا تو عین ایام عدت میں وہ گھر ہی چھوڑ دیا، جہاں شوہر کا انتقال ہوا تھا اور جہاں اب بھی ایسے "نامہذب جاہل" موجود ہیں جو عورتوں کی آزادی میں قہراً خلل انداز ہوتے ہیں!!

"خلاصہ یہ کہ ماں باپ یا پرورش کنندوں کے ذمہ بچوں کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔ اور شوہر کے ذمہ بی بی کی۔ اصالتاً اسی مضمون کو بیان کرنا مقصود تھا، باقی جس کو جس پر قدرت ہو اور جس قسم کی ہو اس پر قیاس کر لیا جائے۔ ممکن ہے استطراداً اس کے بھی کچھ مضامین بیان ہو جائیں:۔

بی بی کی اصلاح۔ اس کے بعد نمبروار "تعلیم و تربیت" کے مختصر اور ضروری قواعد مخلوط طور پر" بیان فرمائے گئے ہیں۔ جن میں سے ذیل میں صرف چند کا اقتباس مثلاً کیا جاتا ہے۔ نکاح کے بعد سب سے پہلے تو بی بی کے بے تکلف کر کے اس کے ضروری عقائد کا بہشتی زیور حصہ اول کو پیش نظر رکھ کر امتحان لے اور ان میں جہاں جہاں اصلاح کی ضرورت ہو کرے اسی طرح نماز کا امتحان لے کر اگر درست نہ ہو درست کرائے۔

پھر "پردہ کے سب احکام و مسائل بتلا دے کہ کس کس سے پردہ ضروری ہے اور کون کون محرم ہیں اور اس کی بہت تاکید کرے۔ یہ سب مسائل بھی بہشتی زیور میں ہیں ان کو دیکھ کر

بتلادے۔ نیز اہل حقوق کے حقوق خصوصاً جن سے ہر وقت سابقہ پڑتا ہے سمجھاوے۔ یہ حقوق رسالہ حقوق الاسلام میں مذکور ہیں۔ رسوم جہالت کی قباحت اس کے دل میں ایسی بٹھادے کہ ان کے پاس نہ پھٹکے، اس کے لئے اصلاح الرسوم کافی ہے۔

اصلاحی کتابیں. اعمال واخلاق کی عام اصلاح کے لئے علاوہ بہشتی زیور حقوق الاسلام اور اصلاح الرسوم کے حضرت نے اپنی کتابیں اور تجویز فرمائی ہیں کہ یہ تھوڑی تھوڑی پڑھائی یا سنائی جاتی رہیں، یعنی تعلیم الدین، جزاء الاعمال فروع الایمان تبلیغ الدین۔ آداب المعاشرت قصد السبیل۔ اصلاح انقلاب ان چند چھوٹی چھوٹی کتابوں اور رسالوں کو اگر آدمی برابر مطالعہ میں رکھے اور دہراتا رہے تو حقیقت میں معمولی ضروریات دین کا ایسا جامع نصاب ہے کہ مسلمانوں کے ہر طبقہ کی ہر اعتبار سے ضروری دینی اصلاح کے لئے انشاء اللہ بالکل ضامن وکفیل ہو جا سکتا ہے ساتھ ہی حسب فرصت حضرت کے مختلف مواعظ کو بھی پڑھتے یا سنتے رہنا چاہئے جو بہترین واعظ وناصح ہیں اور جن کا خاص اثر یہ ہے کہ اپنی اصلاح کی طرف توجہ اور دین کی طلب ورغبت پیدا ہو جاتی ہے۔

بچوں کی تربیت: بی بی کے بعد بچوں کی تربیت کے لئے کچھ ضروری ہدایات فرمائی گئی ہیں۔ کچھ تو بہشتی زیور پر گفتگو کے سلسلہ میں نقل کی جاچکی ہیں اور کچھ یہاں اصلاح انقلاب سے نقل کی جاتی ہیں۔

> "خدا تعالیٰ جب اولاد دے اور سیانی ہونے لگے تو سب سے پہلے اس کو کلمہ توحید سکھلادے۔ پھر اور ضروری آداب کی تعلیم کرے۔ مثلاً جب سامنے آوے سلام کرے۔ کسی کے پاس کوئی چیز دیکھے حرص نہ کرے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ وسعت کے موافق اس کو مرغوب چیزیں ضرور اس کو کھلاتا پلاتا رہے۔ اور جب ضد کرے تو ہرگز نہ پوری کرے تاکہ ضد کی عادت چھوٹ جائے۔ یہ عادت ڈالے کہ کوئی چیز تنہا نہ کھائے، دوسرے بچوں کو تقسیم کر کے کھائے، جس کے لئے یہ خیال رکھنا ضروری ہے، کہ جو کچھ اس کو دے خواہ نقد خواہ کوئی چیز وہ اس کی ملک نہ کرے۔ کیونکہ ملک ہو

جانے کے بعد نابالغ کو تبرع کرنا جائز نہیں، بلکہ اباحت کے طور پر دے تاکہ دوسروں کو دینا اور ان دوسروں کا لینا جائز ہو"۔ بھلا اس بات کا پڑھے لکھے دیندار گھرانوں میں بھی کوئی خیال کرتا ہو گا!

"جھوٹ بولنے سے بچے کو نفرت دلاتا رہے۔ اسی طرح مکر و فریب کی عادت سے بہت بچائے۔ اس کی عادت ڈالے کہ اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اقرار کر لیا کرے، اور اگر غلطی کا اثر دوسرے تک پہنچا ہو تو اس سے معاف کرایا کرے۔ یہ عادت ڈالنا بہت ضروری ہے۔ اس میں دین کی سلامتی اور دنیا کی عزت و راحت ہے، اور اس میں کچھ پس و پیش کرنا تکبر اور موجب نفرت و ذلت ہے۔ اس کو بھی عادت ڈالے کہ سخن پروری کبھی نہ کرے۔ حق بات معلوم ہو جانے پر خواہ کم درجہ ہی کا آدمی بتلائے، اس کو مان لیا کرے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو ساتھ نہ کھیلنے دے، کیونکہ اگر وہ نامحرم ہیں تو آئندہ کے مفاسد کا احتمال ہے اور اگر محرم ہیں تو لڑکیوں میں قلت حیا اور لڑکوں میں نقصان عقل کا اندیشہ ہے۔ چھپ کر کوئی کام نہ کرنے پائیں کیونکہ چھپ کر بچہ اسی کام کو کرتا ہے، جس کو برا جانتا ہے، تو گویا ابتداء ہی سے برا کام کرنے کا خوگر ہو جائے گا۔ خود بھی بچوں کے سامنے کوئی نامناسب یا بے حیائی کا کام نہ کرے گو بچہ اتنا چھوٹا ہو کہ بول بھی نہ سکتا ہو کیونکہ اس کام کا عکس اس کے دماغ میں مرتسم ہو جاتا ہے، بڑے ہو جانے پر اثر ظاہر ہو گا۔ ہنسی دل لگی کی عادت نہ ہونے دے، اس سے بیباکی پیدا ہو گی، کیونکہ بچہ کو محل بے محل کی تمیز نہیں ہوتی۔ اس کا اہتمام رکھیں کہ سیانے بچوں میں دوستی نہ پیدا ہونے دے۔ ان کے باہم کھیلنے کے وقت خود موجود رہیں اپنی غیر موجودگی میں اختلاط نہ ہونے دیں، اس میں بیشمار مفاسد ہیں"۔

بھلا آج کل سکولوں کالجوں کیا عربی و دینی مدارس میں بھی ان باتوں کا اہتمام کیا ادھر التفات بھی کس کو ہوتا ہے، پھر نتائج ظاہر ہیں۔

"جب بچہ سیانا ہو جائے نماز کی سورتیں اور دعائیں زبانی یاد کراوے اور نماز پڑھوائے۔ لڑکی ہو تو اس کو پرزہ میں بٹھلا دے۔ جب پڑھنے کے قابل ہو تو لڑکے کو ایسے مکتب میں جس کا معلم شفیق اور دیندار ہو بٹھلاوے اور لڑکی کو زنانہ مکتب میں، مگر آج کل جو زنانہ اسکول ایجاد ہوئے ہیں ان کی آب و ہوا سے بچائے۔ سب سے اول قرآن شریف پڑھوائے۔ اگر دماغ متحمل ہو تو حفظ کرانا افضل ہے، ورنہ ناظرہ ہی سہی مگر صحیح خواں سے پڑھوائے" (ص ۱۲۴)

اس کا ہزاروں میں شاید ہی کوئی ایک آدھ خیال کرتا ہو کہ بچوں کو قرآن شریف کسی ایسے معلم سے پڑھوایا جائے جو اگر پوری مجود نہ سہی تو کم از کم معمولی مخارج تو اس کے درست ہوں۔ عام مکاتب و مدارس یا گھروں پر اس کے اہتمام کا ذکر ہی کیا، اچھے اچھے اور بڑے بڑے عربی و دینی مدارس میں بھی پرواہ نہیں کی جاتی ہے۔

بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے متعلق راقم احقر کو ایسے تلخ تجربات ہوئے، کہ ان کی نسبت اصلاح انقلاب کی مذکورہ بالا ہدایات قریب قریب سب ہی نقل کر دینے کو جی چاہا کہ جن کو اپنی اولاد کی دنیا ہی کی نہیں دین کی بھی فکر ہے وہ ضرور ان ہدایات کی طرف توجہ کریں۔ اصلاح انقلاب کا سب سے آخری عنوان "متعلق بہ تعزیر و تعییر و تکفیر ہے"۔

تعزیر تعییر و تکفیر: "تعزیر سے وہ سزا مراد ہے جو تادیب کے لئے دی جائے اور حد کے درجہ سے کم ہو، جس کے مختلف طریقے ہیں ملامت کرنا، ڈانٹنا ہاتھ یا لکڑی وغیرہ سے مارنا کان کھینچنا، سخت الفاظ کہنا، محبوس کر دینا یا مالی سزا دینا۔ تعییر (یا عار دلانا) یہ ہے کہ کسی کا عیب نکالنا جس میں غیبت و بہتان بھی داخل ہو گیا۔ اور تکفیر کسی کو کافر کہنا"۔

"اوپر کے ابواب میں غیر کے مال میں تصرف کی بحث تھی۔ ان تینوں امور میں غیر کی آبرو میں تصرف کا بیان ہے۔ ان تینوں سے دوسرے کی آبرو ریزی ظاہر ہے گو بعض میں جان و مال کا بھی تصرف ہے۔ لیکن چونکہ آبرو ریزی مشترک ہے، اس لئے ان تینوں کے مضامین مخلوط طور پر بیان ہوں گے۔

اشد کوتاہی۔ "ان کے متعلق ایک کوتاہی جو بوجہ علمی ہونے کے سب سے اشد یہ ہے کہ ان کے حق العباد ہونے کا احتمال ہی کسی کو نہیں ہوتا الا ماشاء اللہ۔ سو یہ بڑی سخت غلطی ہے، اس لئے کہ یہ اعتقادی غلطی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صریح ہے کہ الا ان دمائکم و اموالکم واعراضکم حرام علیکم کحرمتہ یومکم ہذا فی بلدکم ہذا فی شہر کم ہذا (۱) جس سے صاف ثابت ہے کہ حقوق عباد کی تین قسمیں ہیں کسی کی جان یا بدن کو ضرر پہنچانا مال کو ضرر پہنچانا اور آبرو کو ضرر پہنچانا۔

تعزیر میں زیادتیاں۔ "تعزیر کے متعلق ایک کوتاہی تو یہ ہے کہ جفا کاروں کے نزدیک اس کی کوئی حد ہی نہیں، جب تک اپنے غصہ کو سکون نہ ہو جائے سزا دیتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اور اس میں اہل حکومت اکثر مبتلا ہیں خواہ دنیاوی حکومت ہو جیسے اہل عدالت و پولیس یا شوہر یا باپ خواہ دینی حکومت ہو جیسے استاد۔ اور استاد اس باب میں سب سے بڑھے ہوتے ہیں۔ عدالت و پولیس کو حکام بالا کا ڈر ہوتا ہے شوہر کو محبت اور باپ کو شفقت ہوتی ہے، جس سے ظلم میں کمی ہوتی ہے لیکن ان حضرت استاد کو نہ کوئی اندیشہ نہ محبت و شفقت .... ان کے ہاں تعزیر کی کوئی حد ہی نہیں۔ حالانکہ ضرب فاحش سے فقہا نے مصرحاً منع فرمایا ہے، اور جس ضرب سے جلد پر نشان پڑ جاوے اس کو ضرب فاحش میں داخل کیا ہے .... بلکہ فاحش کی صورت میں خود استاد کو سزا دینے کا حکم ہے۔

"اسی طرح یہ بھی کوتاہی ہے کہ ایسی سزاؤں کے لئے ثبوت شرعی کی ضرورت نہیں سمجھتے بے سند باتوں پر بلکہ بعض دفعہ محض قرائن پر سزا دینے کو جائز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید میں نص ہے "انما السبیل علی الذین یظلمون الناس و یبغون فی الارض بغیر الحق۔ اور بدون دلیل شرعی کے کسی کو ایذا دینا وہ ناحق کا ظلم ہے، اس لئے

۱۔ یاد رہے کہ تمہارے خون تمہارے مال اور تمہاری آبرو کی ایک دوسرے پر اسی طرح حرمت واجب ہے جس طرح تمہارے آج کے دن کی حرمت تمہارے اس شہر میں اور تمہارے اس مہینہ میں

پہلے مجرم کے جرم کی شرعی تحقیق کر لینا لازم ہے۔ اگر خود اس کا اہل نہ ہو تو کسی عالم محقق سے دریافت کر لے کہ کون سا طریق ثبوت معتبر اور کون سا غیر معتبر ہے۔

جرمانہ کی سزا: "ایک کوتاہی جو بعض برادریوں میں بھی مستقلاً جاری یہ ہے کہ خطاؤں پر جرمانہ کرتے ہیں اور وصول کر کے بعضے تو کسی موقع پر اس کا کھانا پکا کر برادری کو جمع کر کے کھا پی لیتے ہیں اور بعضے اپنے زعم میں اس کو ثواب کے کاموں میں صرف کرتے ہیں، جیسے مدرسہ مسجد یا انجمن، سو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ مالی سزا ہمارے مذہب میں درست نہیں اور بعض روایات میں جو وارد ہے وہ منسوخ ہے، اور بعض لوگ جو اس کے قائل ہیں ان کا مطلب یہ ہے، کہ چند روز اپنے پاس رکھ کر جب وہ شخص توبہ کر لے یہ مال اس کو لوٹا دیا جاوے۔ اور اس کو جائز رکھنے والوں کے نزدیک بھی شرائط ہیں، جن کی لوگوں کو نہ خبر نہ ان کی رعایت لہٰذا اختلافی جواز بھی تحقق نہیں ہوتا

"یہی حال ان رقوم کا ہے، جو دباؤ ڈال کر یا شرما کر چندہ کے نام سے جمع کی جاتی ہیں یا شادیوں میں دولہا والوں سے کمینوں (پرجوں) یا مسجد وغیرہ کے لئے لے لیتے ہیں۔ کیونکہ بلا طیب خاطر ونیا سب میں مشترک ہے۔

"اسی طرح بعض جگہ کوئی کمیٹی یا جماعت معاہدہ سے جو اس پر متفق ہو جاتی ہے کہ جو شخص نماز نہ پڑھے اس پر اس قدر جرمانہ، سو یہ بھی جائز نہیں۔ کیونکہ معاہدہ کے وقت طیب خاطر سے لازم نہیں آتا کہ رقم دیتے وقت بھی طیب خاطر ہو۔ اور جہاں معاہدہ بھی کسی اثر یا دباؤ سے ہو (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) تو بدرجہ اولی ناجائز ہے۔

"اور بعض حدیثوں میں بعض معاصی کا کفارہ تصدق بدینار یا نصف دینار یا مطلق تصدق وارد ہوا ہے اور بعض مشائخ انہیں حدیثوں سے اس طریقہ پر مریدوں کی تربیت بھی فرماتے ہیں، تو ان حدیثوں کا مطلب یہ ہے کہ صاحب معصیت خود اپنے نفس کا اس سے علاج کرے، نہ یہ کہ کوئی دوسرا جبراً وصول کرے۔ یہ تو امر اول کے متعلق ضروری بیان تھا۔

عام تعبیر میں غلطیاں: "اور امر ثانی (تعبیر) کے متعلق ایک کوتاہی جو بہت ہی عام ہے حتیٰ کہ علماء و مشائخ وثقات بھی الا ماشاء اللہ اس سے محفوظ نہیں یہ ہے کہ جس کی نسبت جو کچھ بھی سنا۔ یا اکثر بے سنے محض قرائن (وہ بھی ضعیف) کی بنا پر جو جی میں آیا زبان سے ہانک دیا۔ کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع (۱)۔ وایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث (۲) اس بارے میں صریح و صحیح نصوص ہیں۔ نیز ان احادیث کا شب و روز مشاہدہ بھی ہوتا ہے کہ سنی سنائی باتیں اور اس سے بڑھ کر قرائن پر مبنی روایات اس کثرت سے غلط نکلتی ہیں کہ گویا قریب قریب سب ہی غلط ہوتی ہیں۔ اگر کوئی اتفاقاً صحیح بھی ہو، تو اس میں جھوٹ کی اتنی زیادہ آمیزش ہوتی ہے جیسے کوے کے مقابل میں اس (ذرا سا) پر

"پھر اس بے بنیاد لغو و مہمل روایت کی بنا پر کسی سے عداوت کسی پر بدگمانی کسی کی نسبت بدزبانی بے تکلف جائز رکھی جاتی ہے............اور بالخصوص کسی مرد یا عورت کی عفت کے معاملات میں تو یہ بے احتیاطی حد سے گزری ہوتی ہے۔ جس کی نسبت نصوص سے سب سے زیادہ احتیاط کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ فقہا نے ان ہی نصوص کی بنا پر تصریح فرمائی ہے کہ اگر ایک مشرقی کا ایک مغربیہ سے توکیلا نکاح ہو، اور کسی نے دونوں کو مجتمع نہیں دیکھا اور پھر اولاد ہوئیے تو اس کے باوجود اس عورت کو زانیہ کہنا یا اس کے بچہ کو والد الزنا کہنا جائز نہیں"۔

"علیٰ ہذا بغیر شرعی ثبوت کے ان باتوں میں الہام یا کشف بھی حجت و معتبر نہیں۔ اسی طرح حاضرات کا عمل کرنا لوٹا گھما کر چور کا نام نکالنا مسمریزم وغیرہ یہ سب خرافات اور شرعاً ناقابل اعتبار ہیں"۔

تکفیر میں کوتاہیاں: "امر ثالث کے متعلق عرض ہے کہ اس میں بھی یہ بڑی کوتاہی ہے کہ ذرا تدبر سے کام نہیں لیتے قائل کے قول کا کوئی صحیح محل نہیں سوچتے۔ بس مفتی

۱۔ آدمی کے جھوٹے ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ ہر سنی سنائی بات کو بیان کرتا پھرے۔

۲۔ دیکھو خبردار انکل سے بچتے رہو کیونکہ انکل بدترین جھوٹ ہے۔

صاحب کو جو بات ناگوار ہوئی فوراً کفر کا فتویٰ لگا دیا، بلکہ بعض اوقات صحیح محل بھی سمجھ میں آجاتا ہے، پھر بھی اس کو ذہن سے دفع کر کے اپنا غصہ نکالتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ قائل بیچارہ وجہ کفر کا خود انکار کرتا اور محمل صحیح کی تصریح کرتا ہے، جب بھی اس کو معافی نہیں دی جاتی اور تکفیر کی سزا بحال رہتی ہے"۔

کافر گروں کی جرأت کی حد: "اور ان مکفّرین کی جرأت یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ عوام سے گزر کر خواص یعنی علماء تک کو اپنی تکفیر کا نشانہ بناتے ہیں، اور ان سے گزر کر اخص الخواص یعنی عارفین تک بھی پہنچتے ہیں۔ اور ماشاء اللہ جن اقوال کی بنا پر تکفیر کرتے ہیں وہ ایسے دقیق ہوتے ہیں کہ ان کا طائر ذہن بھی وہاں تک نہیں پہنچتا یا دقیق نہیں ہوتے مگر ناشی ایسے احوال سے ہوتے ہیں، جن کی ہوا تک ان محبوسان الفاظ و رسم کو نہیں لگی، تو ان کی تکفیر کرنا بالکل اس آیت کا مصداق ہے بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ولما یاتھم تاویلہ کیا یہ غضب و ستم نہیں کہ ہر زمانہ میں ایسوں کی تکفیر ہوئی، جن کی برکت سے علوم اسلامیہ کا احیاء ہوا اور جن کے فیض سے برکات دنیبہ کا ابقا ہوا۔ اور اگر کسی بزرگ کے کلام کی تاویل نہ ہو سکے، تو اس کی تکفیر سے یہ اسلم و احوط ہے کہ اس کلام کی ان کی طرف نسبت ہی کا انکار کر دیا جائے"۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں اکابر کے کلام میں اہل باطل کی طرف سے الحاقات بکثرت ثابت ہیں۔

احتیاط میں بے احتیاطی: یہ ہے کہ احتیاط بالا کا "یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی صریح کفر کا کام یا صریح کفر کی بات کرے جس میں تاویل نہ ہو سکے یا ہو سکے مگر خود فاعل یا قائل اس کا انکار کرے، تب بھی اس کی تکفیر نہ کی جائے۔ چنانچہ ایک کوتاہی اس باب میں یہ بھی ہے کہ علماء پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ذرا ذرا سی بات میں تکفیر کر دیتے ہیں"۔ ان کے نزدیک وہ بات ذرا سی ہوتی ہے۔ حالانکہ ان کو یہ آیت پیش نظر رکھنا چاہئے ولئن سالتھم لیقولن انما کنا نخوض و نلعب قل اباللہ وایاتہ ورسولہ کنتم تستھزءون

لا تعتذروا قد کفرتم بعد ایمانکم (۱) (سورۂ توبہ ۷ع)

خلاصہ یہ کہ ہر امر میں حدود شرعیہ کا پاس واجب ہے نہ ان کا تنابز ہو نہ ان سے تجاوز۔ ایک بے احتیاطی اس باب میں یہ ہوتی ہے کہ ثبوت کفر کے بعد اسلام کی تو تجدید کر لی جاتی ہے۔ باقی نہ نکاح کی تجدید ہوتی ہے، نہ حج کا اعادہ ہوتا ہے۔ حالانکہ کفر سے سابق حج باطل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بعد تجدید ایمان اگر وجوب حج کے شرائط پائے جائیں تو حج پھر کرنا چاہئے"۔ (ص ۱۱۳۸)

۱۔ اگر ان سے پوچھو تو کہیں گے ہم تو محض گپ اور دل لگی کرتے تھے کہو کہ کیا اللہ اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول کی ہنسی اڑاتے تھے بہانہ مت بناؤ تم تو اپنے کو مومن کہہ کر پھر کفر کی باتیں کرنے لگے۔

تعلیم الدین

حضرت جامع المجددین کی جامع و مستقل تجدیدی و اصلاحی کتابوں میں بہشتی زیور اور اصلاح انقلاب کے بعد تعلیم الدین ہے۔ جس میں عقائد دیانات معاملات، معاشرات سب کی خلاصہ ضروری دفعات کے ساتھ اصل میں تصوف کے سارے اجزا کی نہایت جامع تلخیص فرمائی گئی ہے، اور کتاب و سنت کی شہادت کے ساتھ تصوف کا نہ صرف تعلیم دین میں داخل ہونا بلکہ اس کی روح رواں ہونا واضح فرمایا گیا ہے۔ کتاب کا نصف سے زائد حصہ تصوف ہی کے مباحث کی عطر کشی ہے۔

معاملات و سیاسات: لیکن پیش نظر ترتیب مباحث کے لحاظ سے تصوف سے پہلے معاملات و معاشرات اور اصلاح رسوم پر ایک نظر ڈال لینا ہے۔ معاملات پر ایک پورا مستقل حصہ بہشتی زیور میں شامل ہے، اس کے علاوہ ایک مستقل رسالہ "صفائی معاملات" کے نام سے تحریر فرمایا گیا ہے۔ معاملات میں ہماری کوتاہیوں اور ان کی اصلاح کی تفصیل کے لئے تو انہیں دونوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ باقی ان کا مختصر بیان معاملات و سیاسیات کے عنوان سے تعلیم الدین میں بھی کچھ ہے، جو ذیل میں اقتباسات درج ہیں۔

اسباب معاش: سب سے بہتر کسب دستکاری ہے۔ اس کو انبیاء علیہم السلام نے اختیار فرمایا۔ زانیہ کی خرچی اور جھوٹے تعویذ گنڈے فال کھلائی وغیرہ کا نذرانہ سب حرام ہے۔ آج کل کے پیرزادے دونوں بلاؤں میں مبتلا ہیں رنڈیوں سے خوب نذرانے لیتے ہیں اور واہی تباہی تعویذ گنڈے کرتے فال کھولتے اور لوگوں کو خوب ٹھگتے ہیں۔ مانگنے کا پیشہ سب سے بدتر ذلیل اور گناہ ہے۔ اس سے گھاس کھودنا لکڑی کاٹ کر بیچنا ہزار درجہ بہتر ہے۔

اگر کسی سخت مصیبت ولاچاری میں مانگناہی پڑے تو دیندار عالی ہمت سے مانگے کہ اس میں پھر بھی ذلت کم ہے۔ اگر بلا حرص و طلب کہیں سے کچھ ملے اس کے لینے میں مضائقہ نہیں۔ جو چیز شرع میں حرام ہے اس میں ایر پھیر حیلہ و تاویل مت کرو اللہ تعالیٰ دل کو دیکھتا ہے۔

"مفت خوری سے بہتر عالی ہمتی سے کمانا اور دوسروں کی خدمت کرنا ہے۔ البتہ جو لوگ ایسی خدمت دین میں مشغول ہیں کہ اگر معیشت میں لگیں تو وہ دینی کام برباد ہو توان کو ترک اسباب جائز بلکہ بعض اوقات اولیٰ ہے اور ان کی خدمت عام مسلمانوں کے ذمہ ہے۔ جس چیز سے دل کھٹکتا ہو وہ چھوڑ دینے کے قابل ہے۔ جس پیشہ میں ہر وقت نجاست سے سابقہ ہو جیسے بھنگی کا کام کرنا پچھنے لگانا ایسے پیشوں سے بچنا بہتر ہے۔ جو گناہ کا آلہ بنائی جائے اس کو مت بیچو۔ ہمارے زمانہ میں روپیہ پیسہ بڑے قدر کی چیز ہے اور حلال کمائی سے عار نہ کرنا چاہئے گو عرف میں معیوب ہی ہو۔ جس طریقہ سے آدمی کی بسر ہو رہی ہو بلاضرورت شدیدہ اس کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ نہ اختیار کرے۔ خرید و فروخت اور اپنے حق کے مطالبہ میں نرمی برتے تنگ گیری اچھی نہیں۔ سودا بیچنے میں زیادہ قسمیں نہ کھاؤ ایک آدھ جھوٹ بھی نکل جاتی ہے پھر برکت مٹ جاتی ہے۔

تجارت: بہت عمدہ چیز ہے، امانت و راستی کا جزو اعظم ہے، اس سے دنیا میں اعتبار ہوتا اور آخرت میں انبیاء و صدیقین و شہداء کی ہمراہی نصیب ہوتی ہے۔ تجارت کے منافع سے کچھ خیرو خیرات کرتے رہا کرو، اس کی بدولت تجارت میں اگر بعض کوتاہیاں ہو جاتی ہیں تو ان کے وبال میں کمی ہو جاتی ہے۔ اگر تمہارے سودے یا داموں میں کچھ عیب ہو اس کو صاف صاف کہہ دو۔ چھپانے سے برکت اڑ جاتی ہے۔

سود اور سودا وغیرہ: سود کے لین دین تحریر و گواہی سب پر لعنت آئی ہے جو چیزیں ناپ تول کر بکتی ہیں اور ایک طرح کی ہیں جیسے گیہوں اس کے مبادلے میں دو باتیں ضروری ہیں ایک یہ کہ برابر برابر ہوں اگرچہ اعلیٰ و ادنیٰ کا تفاوت ہو، دوسرے یہ کہ دست بدست

ہوں. اگر ایک امر میں بھی خلاف ہو تو سود ہو جاوے گا۔ اگر ناپ تول کر بکتی ہیں مگر جنس ایک نہیں، جیسے گیہوں اور جو تو ان میں برابری ضروری نہیں، مگر دست بدست ہونا ضروری ہے اور اگر نہ جنس ایک ہو نہ ناپ تول کر بکتی ہے، جیسے گھوڑا اور اونٹ تو نہ برابر ہونا ضروری ہے نہ دست بدست ہونا۔

"یہ فقہ حنفی کے موافق سود کی تفصیل ہے۔ آج کل جو زیور خریدا یا بنوایا جاتا ہے، اس کو تفادت نرخ کی وجہ سے اکثر برابر بھی نہیں لیا جاتا اور اکثر ادھار بھی رہ جاتا ہے، جو بالکل سود ہے۔ ایسی صورت میں جس طرف چاندی کم ہو اس میں کچھ پیسے بھی ملائے جاویں تو چاندی چاندی برابر ہو جاوے گی اور زائد چاندی کے عوض پیسے ہو جائیں گے۔ اور ادھار ہو تو صاحب معاملہ سے جداگانہ قرض اس معاملہ کو طے کرلیں پھر اس کا قرض بعد میں ادا کردیں اکثر ایسا کرتے ہیں کہ روپیہ دے کر آٹھ آنہ پیسے اب لے لئے اور آٹھ آنہ مثلاً ایک گھنٹہ کے بعد لئے یہ بھی جائز نہیں۔ اگر ایسی ہی ضرورت ہو تو روپیہ امانت اس کے پاس رکھا دیں، جب اس کے پورے پیسے آجاویں مبادلہ کا معاملہ کریں۔

"اگر تم خراب گیہوں کے عوض اچھے گیہوں لینا چاہتے ہیں اور دوسرا شخص برابر برابر نہیں دیتا تو اپنے گیہوں ایک روپیہ کو مثلاً اس کے ہاتھ بیچ ڈالو۔ پھر جتنے گیہوں وہ دے اس روپیہ کے عوض جو تمہارا اس پر قرض ہو گیا ہے اس سے خرید لو۔ اگر چاندی یا سونے کا جڑاؤ زیور یا جس میں اور کوئی چیز ملی ہو چاندی یا سونے کے بدلے یعنی چاندی کا زیور چاندی کے بدلے اور سونے کا سونے کے بدلے خریدنا یا بیچنا ہو تو یہ مبادلہ اس وقت جائز ہے کہ زیور میں چاندی یا سونا یقیناً کم ہو اور داموں کی چاندی یا سونا زائد ہو۔ اگر برابر یا زائد ہونے کا گمان ہو تو جائز نہیں۔ اگر کوئی تمہارا مقروض ہو اور وہ تم کو ہدیہ دے یا دعوت کرے، اگر پہلے سے یہ رسم وراہ باہم جاری نہ ہو تو ہرگز مت قبول کرو۔ اسی سے رہن کی آمدنی کا حال معلوم کرو، کیونکہ راہن تمہارا قرض دار ہے اور قرض کے دباؤ میں انتفاع کی اجازت دیتا ہے تو وہ کس طرح حلال ہو گا۔ بعض لوگ کوئی چیز ادھار خرید کرتے ہیں اور جب قیمت نہیں ادا ہو پاتی تو اس بائع کے ہاتھ کچھ کم قیمت میں اس کو بیچ ڈالتے ہیں، سو چونکہ بائع کو اس بچت کا کوئی حق نہیں، اس لئے یہ سود میں داخل اور ممنوع ہے۔ البتہ اس کی

تدبیر یہ ہے کہ بایع تھوڑی دیر کے لئے مشتری کو سابق کی قرار داد قیمت کی بقدر قرض دیدے، جس کو مشتری اصل قیمت میں ادا کر دے، اس کے بعد وہ چیز کم قیمت میں بایع کے ہاتھ بیچ ڈالے۔

اور جو باقی رہے وہ اس کے ذمہ قرض رہے گا۔ مثلاً دس روپیہ کو تم نے ایک گھڑی خریدی، اور روپیہ کا بندوبست نہ ہوسکنے سے پھر اس بایع کے ہاتھ آٹھ روپیہ کی بیچ ڈالی تو یہ سود اور ناجائز ہے۔ ایسی ہی ضرورت پڑجائے تو یوں کرو کہ دس روپیہ بایع سے قرض لیکر پہلے گھڑی کی پوری قیمت ادا کردو۔ پھر وہ گھڑی اس کے ہاتھ جتنی کمی پر چاہو بیچو۔ جتنے کی بایع نے خریدا اتنا قرض تو ابھی ادا ہوگیا، باقی تمہارے ذمہ رہا۔

"جب تک پھل کام آنے کے لائق نہ ہو جائیں ان کا خریدنا اور بیچنا ممنوع ہے۔ کیونکہ معلوم نہیں پھل رہے یا جاتا رہے۔ صرف بیجک پر مال مت فروخت کرو جب تک تمہارے قبضہ میں نہ آجائے۔ اور جب بایع کے قبضہ میں آجائے تو مشتری کو بیجک دیکھ کر خریدنا درست ہے۔ مگر جب مال کو وہ دیکھے اس وقت اس کو اختیار ہوگا کہ معاملہ کو رکھے یا انکار کردے۔

"بنجارہ یا کوئی اور باہر سے غلہ لایا اس کو شہر میں آجانے دو تب خرید کرو، باہر ہی معاملہ کرلینا اچھا نہیں۔ اس میں کبھی تو اس کو دھوکا دیا جاتا ہے کہ شہر میں اس نرخ کو فروخت نہ ہوگا، اور شہر والوں کو یہ نقصان کہ سب اس کے محتاج ہوگئے جتنے کو چاہئے فروخت کرے۔ نیز ایک آدمی اگر کوئی سودا چکاتا ہو اور بایع نے ابھی منظور نہیں کیا بلکہ منظوری کا احتمال غالب ہے تو تم اس کے سودے کو خراب کرکے مت لینے لگو۔ البتہ جب وہ صاف انکار کرے اس وقت خریدنے میں مضائقہ نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نیلام میں کسی بولی پر بولی بولنا درست ہے کیونکہ خود بایع نے ابھی اس پہلی بولی کو منظور نہیں کیا ہے۔ علی ہذا کسی کو دھوکا دینے کے لئے چیز کے دام اس لئے مت بڑھاؤ کہ دوسرا آدمی اور زیادہ بول دے۔ اگر گائے بکری وغیرہ دودھ دینے والا جانور بیچنا ہو تو اس غرض سے کسی وقت دودھ نہ نکالنا درست نہیں کہ خریدار زیادہ دودھ دیکھ کر دھوکے میں آجائے اور زیادہ دے کر بعد کو پچھتائے نہ کسی اور معاملہ میں کوئی ایسی کارروائی کرو جس سے خریدار کو

دھوکا ہو کوئی مصیبت زدہ ضرورت سے مجبور ہو کر اپنی کوئی چیز بیچتا ہو تو نہ اس کو دباؤ نہ اس چیز کے دام گراؤ۔ بلکہ یا تو اس کی اعانت کر دیا اس کی چیز کو مناسب دام پر خریدو۔ ناپ تول میں دغابازی مت کرو"۔

آج کل ہندوستان اور پاکستان میں رشوت ستانی اور چور بازاری کی جو گرم بازاری ہے اور جس کے بارے میں ابھی کل ہی ہندوستان کے بڑے مدبر و مدعی وزیر اعظم نے اپنی بے بسی کا نہایت حسرت و یاس کے ساتھ اقرار و اعلان کیا ہے اس کا ممکن علاج صرف مذکورہ بالا قسم کی دینی ذہنیت کا عوام اور حکومت میں پیدا کرنا ہے۔ باقی اگر الٹے لادینی (سکولر) حکومت اور لادینی ذہنیت کی عوام میں و حکومت میں پیدا کرنے کی دیوانگی بدستور رہی تو مرض کا مزمن و لاعلاج ہو کر انجام ہلاکت ہے۔

"خود رو گھاس کا بیچنا درست نہیں اگرچہ تمہارے مملوکہ زمین ہو۔ اسی طرح پانی۔ جو چیز تمہاری ملک و قبضہ میں نہ ہو اس کا معاملہ اس امید پر مت ٹھہراؤ کہ بازار سے خرید کر دیدیں گے۔ رہن میں یہ شرط ٹھہرانا کہ اگر اتنی مدت تک زر رہن ادا نہ ہو تو اس کو بیع سمجھا جاوے گا باطل ہے، اور مدت گذر جانے پر بیع نہ ہوگی۔ اگر کوئی چیز بطور بدنی کے خریدی اور فصل پر بایع سے وہ چیز نہ بن پڑی تو جتنا روپیہ اس کو دیا تھا واپس لے لو، نہ زیادہ روپیہ لینا درست ہے نہ اس روپیہ کے بدلے کوئی اور چیز اس سے خریدنا درست ہے، البتہ اپنا روپیہ لے کر پھر اس سے جو چاہو خرید لو۔ غلہ ارزاں خرید کر گراں بیچنا درست ہے مگر جب مخلوق کو تکلیف ہونے لگے، اس وقت زیادہ گرانی کا انتظار کرنا حرام اور موجب لعنت ہے۔ حاکم کو اختیار نہیں کہ زبردستی نرخ مقرر کرے البتہ تاجر کو فہمایش اور صلاح دینا مناسب ہے۔

"اگر تمہارا کوئی دیندار غریب ہو اس کو پریشان مت کرو مہلت دو یا سب کچھ معاف کر دو اللہ تعالیٰ تم کو قیامت کی سختی سے نجات دیں گے تم کسی کے دیندار ہو تو خراب چیز سے اس کا حق مت ادا کرو، بلکہ ہمت کرو کہ اس کے حق سے بہتر اس کو ادا کیا جائے، مگر معاملہ کے وقت یہ معاہدہ جائز نہیں۔ اگر تمہارے پاس ہے تو کسی کے حق کو ٹالنا بڑا ظلم ہے۔ اگر تمہارا مدیوں کسی دوسرے سے دہانید کرادے اور اس سے وصول ہونے کی امید

ہو تو خواہ مخواہ ضد میں آکر اس کو مت دق کرتے رہو۔ دہانید کو قبول کرلو۔ حتی الامکان کسی کے قرض دار مت ہو اگر ضرورۃً ہونا ہی پڑے تو ادا کی فکر رکھو بے پروا مت بن جاؤ۔ اور اگر دائن تم کو کچھ کہے سنے صبر کرو اس کا حق ہے۔ اگر وسعت ہو تو کسی غیر مستطیع قرض دار کی طرف سے اس کا قرض ادا کر دیا کرو۔ جب کسی کا قرض ادا کیا کرو تو ادا کرتے وقت اس کو دعا بھی دیا کرو اور شکر ادا کرو۔

"شرکت میں ساجھیوں کو امانت و دیانت کا خیال رکھنا چاہئے ورنہ برکت سلب ہونے لگتی ہے۔ امانت میں کسی طرح کی خیانت ہرگز مت کیا کرو۔ جو مال ظلم سے دباؤ سے کسی کی وجاہت ولحاظ یا شرما شرمی سے وصول کیا جاوے وہ حلال نہیں، چندہ جمع کرنے والے اس کو اچھی طرح ذہن میں رکھیں۔ حلال وہی مال ہے جو بالکل ہی خوشی خاطر سے دیا جائے۔ پڑوسی کی رعایت کیا کرو چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس سے جھگڑا مت کیا کرو۔ مثلاً تمہاری دیوار میں میخ گاڑنے لگے اور تمہارا کوئی نقصان بھی نہ ہو، تو اجازت دیدو۔ اگر کوئی زمین یا گھر بے میل یا بے موقع ہونے کی وجہ سے فروخت کرو تو مصلحت یہ ہے کہ جلدی اس کا کوئی دوسرا مکان یا زمین خرید لو ورنہ روپیہ رہنا مشکل ہوتا ہے۔

"جس درخت کے سایہ میں آدمیوں کو جانوروں کو آرام ملتا ہو اور تمہاری ملکیت میں بھی نہ ہو اس کو مت کاٹو اس سے عذاب ہوتا ہے۔ مزدور سے کام لیکر اس کی مزدوری دینے میں کسی طرح کوتاہی مت کرو ورنہ اس مقدمہ میں خود اللہ تعالیٰ مدعی ہوتا ہے۔ عہد کر کے خلاف مت کرو۔ خصوصاً اس میں اللہ تعالیٰ کے نام کا واسطہ ہو، اس میں بھی خود اللہ تعالیٰ مدعی ہوں گے۔ اکثر قحط میں بعض لوگ اپنی اولاد کو اور بعض ظالم دوسروں کے بچوں کو بیچ ڈالتے ہیں ان کا بیچنا یا خرید کر ان کو غلام سمجھنا یہ سب حرام ہے، اس مقدمہ میں بھی اللہ تعالیٰ مدعی ہوں گے۔ اگر کسی کو کوئی چیز یہ کہہ کر دو کہ تمہاری زندگی بھر کے لئے دیتے ہیں مرنے کے بعد واپس لے لیں گے، تو وہ چیز بالکل اس کی ہو جاتی ہے اور مرنے کے بعد اس کے وارثوں کو ملے گی تو اس امید باطل پر اپنی چیز مت دو ورنہ پھر حسرت ہوگی۔ اگر ایک بیٹے کو کوئی چیز دو تو دوسرے کو بھی ویسی ہی دو ورنہ ناانصافی بری بات ہے ہدیہ ایسے شخص کا قبول کرو جو کسی بدلے کا طالب نہ ہو ورنہ باہم رنج ہوگا۔ البتہ تم اپنی طرف

سے کچھ نہ کچھ بدلے ہی کی کوشش کرو، اور اگر یہ میسر نہ ہو تو اس کی کچھ تعریف ہی کرو اور لوگوں کے سامنے اس کے احسان کو ظاہر کرو۔ اور تعریف کے لئے اتنا کہہ دینا بھی کافی ہے کہ جزاک اللہ خیرا۔ اور اگر محسن کا شکر ادا نہ کیا گیا تو خدا تعالیٰ کا شکر بھی ادا نہ ہو گا۔ باہم تحفہ تحائف کی راہ و رسم رکھو اس سے محبت بڑھتی اور دلوں کو صفائی ہوتی ہے۔ اور یہ خیال نہ کرو کہ تھوڑی چیز ہے کیا بھیجیں جو کچھ بھی ہو بے تکلف دو۔ اگر تمہارے ذمہ کسی کی امانت یا قرض یا اور کوئی حق ہو اس کی یاد داشت بطور وصیت کے لکھ کر پاس رکھو۔ اگر اللہ تعالیٰ مال دے تو اول خویش بعدہ درویش۔

واجب و مستحب معاملات کا یہ نچوڑ کہیں کہیں لفظی حذف و اضافہ کے ساتھ قریباً پورا کا پورا اس لئے نقل کر دیا گیا ہے، کہ ایک طرف تو یہ ایسے معاملات ہیں، جن سے کم و بیش ہر شخص کو سابقہ پڑتا رہتا ہے دوسری طرف اس دعوے کے باوجود کہ اسلام پوری زندگی کا قانون ہے، ان معاملات سے ہماری غفلت کا یہ عالم ہے کہ کوتاہیوں کا کیا ذکر سرے سے عمل ہی غائب۔ عمل تو عمل علم بھی ان کا کتنوں کو ہو گا۔ پھر جو پیٹ حرام و حلال سے جہل و بے احتیاطی کے ساتھ بھرے جاتے ہوں ان کے نماز روزے اور عبادت میں بھی کیا نورانیت اور خیر و خیرات سے کیا برکت ہو سکتی ہے۔ نیز مستحب معاملات جو بتلائے گئے ہیں وہ آپس کی ہمدردی و محبت اور غیروں کی نظر میں ہماری اور ہمارے دین کی وقعت و حرمت کے کیسے آسان و ارزاں نسخے ہیں۔ مگر محرومی کا کیا علاج! اور ایسی حالت میں خالی پریس و پلیٹ فارم پر اسلام اسلام کا ڈھنڈھورا پیٹنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے!

غیر متعصب غیر مسلم بھی سن لیں کہ آخرت تو آخرت اسلام کی یہ تعلیمات کیا دنیا کو بھی جنت نہیں بنا دے سکتی ہیں۔ لیکن ان تعلیمات پر عمل جب ہی ہو سکتا ہے کہ حکومت و سیاست کی بنیاد ولا دینی (Seculare) نہیں بلکہ تمامتر دین ہو۔ یعنی تعلیم و تربیت کے ذریعہ عوام و خواص راعی و رعایا سب کے دلوں میں خدا و آخرت کا خوف و خیال جاگزیں کیا جائے۔

معاملات نکاح سے متعلق بعض اشارات۔ نکاح کے ضروری معاملات و اصلاحات کا ذکر اوپر اگرچہ اصلاح انقلاب میں آچکا ہے لیکن بعض باتیں جو تعلیم الدین کے باب النکاح میں بیان فرمائی گئی ہیں وہ مختصر ہونے کے وصف کے ساتھ مکرر ذکر و توجہ کے لائق ہیں۔

"مثلاً نکاح میں زیادہ تر منکوحہ کی دینداری کا لحاظ رکھو، مال و جاہ حسب و نسب کے پیچھے زیادہ مت پڑو۔ اگر کوئی شخص تمہاری عزیزہ کے لئے پیام بھیجے زیادہ تر قابل لحاظ اس کی نیک وضع و دینداری ہے، دولت و حشمت و عالی خاندانی کے اہتمام میں رہ جانے سے خرابی ہی خرابی ہے" (ہمارا عمل ان دونوں معاملوں میں بالکل الٹا ہے، کہ جس بات کا "زیادہ تر لحاظ" رکھنا چاہئے اس کا کمتر بھی نہیں رکھتے اسی طرح ارشاد ہے) کہ "اس نکاح میں زیادہ برکت ہوتی ہے، جس میں خرچ کم پڑے اور مہر بھی ہلکا ہو" (ہم برکت کے بجائے دونوں باتوں کو عین ذلت جانتے ہیں) "ولیمہ مستحب ہے مگر اس میں تکلف و تفاخر نہ کرے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بی بی کا ولیمہ دو سیر جو سے کیا حضرت صفیہؓ کے ولیمہ میں خرما پنیر اور گھی کا مالیدہ تھا۔ سب سے بڑا ولیمہ حضرت زینب کا تھا کہ ایک بکری ذبح ہوئی اور گوشت روٹی پیٹ بھر کر کھلائی گئی" ۔ (ہمارا ولیمہ کیا کوئی معمولی دعوت بھی بالعموم تفاخر کے اجزا و اظہار سے خالی نہیں ہوتی ہے) "نکاح کا مسجد میں ہونا بہتر ہے، تاکہ اعلان بھی ہو اور جگہ برکت کی ہے۔

"جس عورت سے نکاح کا ارادہ ہو بن پڑے تو اس کو ایک نگاہ دیکھ لے کہ بعد نکاح اس کی صورت سے نفرت نہ ہو" (اس میں الٹا عمل یہ ہے کہ ایسی صورت میں خود ناکح تو کیا تابہ امکان اس کی طرف کی عورتوں کو بھی نہیں دیکھنے دیا جاتا اور یا پھر اگر خدانخواستہ ترقی و تجدد کا زور ہو تو "کورٹ شپ" کی بھی اجازت!) خواہ مخواہ بلا قرینہ بی بی پر بدگمانی کرنا جہالت و تکبر ہے اور قرائن ہوتے ہوئے چشم پوشی کرنا بے غیرتی و دیوثی ہے" ۔

بعض اسی سلسلہ میں احتیاط اور غیرت و حیا کی باتیں ہیں۔

"تنہائی میں غیر عورت کے پاس بیٹھنا زہر قاتل اور سخت گناہ ہے، اس کے ساتھ سفر کرنا بھی ممنوع ہے۔ آج کل پیروں اور رشتہ داروں سے اس کی بالکل احتیاط نہیں ہوتی۔ غیر عورت اس کو کہتے ہیں جس سے عمر بھر میں کبھی نکاح حلال ہو" تنہائی کا کیا ذکر حکم تو یہ ہے کہ "اگر کسی عورت پر اچانک نگاہ پڑ جائے فوراً پھیر لو۔ پھر بھی دل میں کچھ خیال رہے تو بی بی سے فراغت کر لو وسوسہ رفع ہو جاتا ہے"۔ بلا ضرورت عورتوں کے لئے منع ہے کہ غیر مرد کو دیکھے، اکثر عورتوں کو جھانکنے تاکنے کی عادت ہوتی ہے بڑی واہیات بات ہے"۔

"ایک کپڑے میں دو مردوں یا دو عورتوں کا لیٹنا بالکل نامناسب و بے غیرتی ہے۔ اور جس طرح مرد کو دوسرے مرد کا ستر دیکھنا گناہ ہے اسی طرح عورت کو دوسری عورت کا بدن ناف سے گھٹنے تک دیکھنا گناہ ہے۔ عورتیں اکثر اس کی احتیاط نہیں رکھتیں۔ بلکہ "بغیر ضرورت شدیدہ پیشاب پاخانہ و مجامعت کے خود بھی برہنہ مت ہو فرشتوں اور اللہ تعالیٰ سے شرم کرنا چاہئے۔ میاں بی بی کے معاملات خلوت کا دوست احباب ساتھیوں سہیلیوں سے ذکر کرنا خدا تعالیٰ کو نہایت ناپسند ہے۔ اکثر دولہا و دلہن اس کی پرواہ نہیں کرتے"۔

سیاست و حکومت۔ اب بعض معاملات جو سیاست و حکومت کے عنوان کے تحت درج فرمائے گئے ہیں ملاحظہ ہوں۔ آج کل حکومت و سیاست نام ہو گیا ہے روز روز اور بات بات میں شور شغب فتنہ و فساد چیخ پکار لڑائی جھگڑے، کشت و خون، حرص و آز، بغض و انتقام، جبر و تغلب، نوچ کھسوٹ غرض تمام ایسی باتوں کا جو امن و عافیت اور دل و دماغ کے سکون و راحت کی دشمن ہیں۔ راعی رعایا کے دشمن رعایا راعی سے برسر جنگ۔ خود رعایا میں باہم عداوت و پرخاش۔ اور ان چیزوں کا مہذب نام مطالبہ حقوق و آزادی احتجاج و

قربانی، اسٹرائک اور ایجیٹیشن ووٹ اور الیکشن! لیکن نتیجہ سب کا جماعات و اقوام کے چھوٹے سے چھوٹے دائروں تک کے امن و امان کی غارتگری سے لے کر بین الاقوامیت کے بڑے سے بڑے میدانوں کی عالمگیر جنگ و خوں ریزی جس کی انتہا ایٹم بم کی برکت سے لاکھوں کی بستی کا، ہر ادنیٰ و اعلیٰ جاندار اور بے جان وجود سمیت، دم کی دم میں عدم کے منہ میں چلا جانا ادنیٰ کرشمہ ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ یہ انتہا کس انتہا کی ابتدا ہے! غرض ایسی حکومت و سیاست کے کمال کی معراج یہ ہے کہ انسان و حیوان کسی کے لئے سمندر کی تہ سے لے کر فضا کی بلندی تک خشک و تر میں کہیں امن و امان کا نام نہیں رہ گیا۔ پھر بھی "ظہر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس" سے اندھے پن کا یہ عالم کہ خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر کو گہرا کرتے جانے کا نام عین عقل و دانش رکھا گیا ہے۔ برین عقل و دانش بباید گریست!

اس کے مقابل میں کامل اسلامی تعلیمات کا ذکر نہیں چند سیدھی سادھی باتوں کا بھی انتظام و اہتمام کر لیا جائے تو دنیا کی یہ خود ساختہ جہنم کچھ نہیں تو اعراف تو بن ہی جا سکتی ہے، اور انسان کو اس دن رات کے فتنہ و فساد سے اتنا دم لینے کی مہلت مل جا سکتی ہے کہ کچھ اپنی انسانیت یا روحانیت کے بلند تر مطالبات کا بھی نام لے سکے!

بڑی بیماری: موجودہ سارے نظامات حکومت و سیاست کی بڑی بیماری خود غرضی و جاہ طلبی ہے خواہ وہ انفرادی ہو یا جماعتی و طبقاتی خواہ قومی و وطنی ہو خواہ لونی و نسلی۔ فرد و جماعت طبقہ و قوم جس کو بھی حکومت کی طلب ہے اپنی ذات اپنی جماعت اپنے طبقہ اپنی قوم و وطن یا اپنی نسل و رنگ کے منافع کے لئے۔ حکومت و سیاست کے اس مطلوب کا اس کے سوا اور مطلب ہی کیا نکل سکتا ہے کہ فرد فرد سے جماعت جماعت سے طبقہ طبقہ سے قوم قوم سے وطن وطن سے نسل نسل سے برسرپیکار ہے، اور بلا انتہائی مجبوری کے اپنی جماعت اپنے طبقہ اپنی نسل اپنی قوم اور اپنے وطن کے مفاد کے مقابل میں دوسرے فرد دوسری جماعت دوسرے طبقہ دوسری نسل و قوم اور دوسرے ملک وطن والے کے ساتھ انصاف کا نام نہ لے۔ ذہنیت ایسی بنا دی گئی ہے کہ ہر فرد ہر جماعت اپنے انفرادی اور

جماعتی منافع ہی کے لئے حکومت کی طالب و ساعی ہے۔ اسی لئے شریعت نے اہلیت حکومت کا پہلا معیار یہ قرار دے دیا کہ

طالب حکومت ناقابل حکومت ہے: "جو شخص حکومت کی درخواست کرے وہ حکومت کے قابل نہیں وہ خود غرض ہے اور جو اس سے بھاگتا ہو، وہ زیادہ عدل کرے گا، اور اس کو حکومت دینا سزاوار ہے"۔

بھلا آج کل جس مدعیانہ شان سے حکومت کے منصبوں اور عہدوں کے لئے خود ستائی کے قصیدے (مینی فسٹو) کو لے کر کھڑا ہو جاتا ہے، اور جس طرح جائز و ناجائز راہوں سے اس کو حاصل کیا جاتا ہے، ذرا اس کا مقابلہ اسلامی حکومت و حاکمیت کی اس کسوٹی سے کرو تو جمہوریت و اشتراکیت سب کی حقیقت برہنہ ہو جائے! یہ اصول اپنے اصول کی رو سے جس طرح فرد کی حاکمیت کی کسوٹی ہے اسی طرح جماعت کی بھی۔ یعنی فرد کی طرح جو جماعت حکومت کی طالب ہو وہ بھی من حیث جماعت حکومت کے قابل نہیں اور خود غرض ہے۔ ملک کی حکومت طلب کرنے سے پہلے کاش مسلمان اپنی خانگی و اختیاری اداروں ہی میں اس اصول کو اختیار کرتے تو مشاہدہ ہو جاتا کہ اس ایک اصول ہی کی پابندی کی کیا گوناگوں برکات ہیں! لیکن دوسروں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی اس حقیقت کو بھلا کر "زشتی اعمال ماصورت نادر گرفت" خود اپنی اصلاح سے بالکلیہ بے فکر ہو کر حصول حکومت کا ذریعہ رائج الوقت لادینی طریقوں کو ٹھہرالیا ہے حالانکہ "جب حکام ظلم کرنے لگیں تو ان کو برا کہنے کے بجائے پہلے یہ

"سمجھ جاؤ کہ ہم سے حاکم حقیقی کی نافرمانی ہوئی ہے اور یہ اس کی سزا ہے اپنی حالت درست کر لو اللہ تعالیٰ حکام کو بھی درست کر دیں گے"

مگر جب حاکم حقیقی کا خوف و خیال ہی دل سے نکل گیا ہو نکل جانے کے برابر ہو گیا ہو تو اس سمجھ کا گزر ہی دل میں کیسے ہو سکتا ہے۔

حاکم و محکوم کو ہدایات: اسی طرح حاکم و محکوم کے لئے بعض ہدایات یہ ہیں کہ

"حاکم کو ایسی جگہ بیٹھنا جہاں نہ حاجت مند جا سکے نہ کسی ذریعہ سے اپنی فریاد پہنچ سکے جائز نہیں"

آج کل کے بڑے حکام وزراء کا تو ذکر ہی کیا معمولی منصف و تحصیلدار تک بھی ہر کس و ناکس کی رسائی آسان نہیں۔

"غصہ کی حالت میں حواس درست نہیں رہتے اس وقت کسی معاملہ مقدمہ کا فیصلہ نہ کرنا چاہئے۔ رشوت کی سخت ممانعت ہے گو ہدیہ کے طور پر ہو"۔

اس "سخت ممانعت کا مقابلہ خصوصیت سے رشوت ستانی اور چور بازاری کی اس آزادی سے کرو جو ہندوستان و پاکستان کی تازہ سیاسی آزادی کے جلو میں روز افزوں ہے!

"حق بات کہنے میں حکام سے مت دبو" (اب اس طرح بے دباؤ حق کو کہنے اور اس سے بڑھ کر حق کو ٹھنڈے دل سے سننے والے جمہوریت و اشتراکیت کے حکام میں کتنے ہیں!) "جھوٹا دعویٰ جھوٹی گواہی، جھوٹی قسم، کسی کے حق کا جھوٹا انکار یہ سب گناہ ہیں"۔

لیکن ان گناہوں سے توبہ کے بعد منصفی کے احاطہ سے لے کر ہائیکورٹ کے ایوان تک خاک اڑنے کے سوا کیا رہ جا سکتا ہے! اور خود وکلا و حکام کے گھر شداد کی جنت کیسے بن سکتے ہیں! اور انصاف فروش حکومت کی جیب میں اسٹامپ کی کروڑوں کی آمدنی کیونکر داخل ہو سکتی ہے!

"اپنا حق ثابت کرنے کے لئے کوشش کرنا کوئی بری بات نہیں، بلکہ اس میں کاہلی کی راہ سے بیٹھ رہنا کم ہمتی ہے اور باوجود کوشش کے اکائی ہو تو زیادہ غم کرنا بھی برا ہے۔ سمجھ لے کہ حاکم حقیقی کو یہی منظور تھا"۔

اولاً تو جب دل میں "حاکم حقیقی" کا کوئی تصور ہی نہ رہ گیا ہو تو یہ سمجھ کیسے لے! پھر جب منصفی سے لے کر ہائی کورٹ و پروی کونسل تک مرافعہ در مرافعہ کے دروازے برابر

کھلے ہیں تو "کم ہمتی سے کیوں کام لے۔ اپنی زندگی میں نہ سہی تو بیٹے پوتے کی زندگی میں فیصلہ ہی ہو جائے گا! اور مال وقت اور قوت گو حق کی قیمت سے زیادہ ہی خرچ ہو جائے، لیکن اگر جیت گئے تو کاغذی کامیابی کیا کم کامیابی ہے!

موجودہ نظام عدالت اور قانون مرافعہ سے جو یہ ذہنیت پیدا ہو گئی ہے، کہ ایک ایک مقدمہ سالہا سال اور نسل ہا نسل چلتا رہتا ہے اس کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ قانون شریعت کی یہ کتنی بڑی نعمت ہے کہ مرافعہ کی گنجائش ہی نہ رکھی۔ جس سے ایک بار کوشش کر لینے کے بعد یکسوئی تو نصیب ہو جاتی ہے اور بجائے سالہا سال بغل میں بستہ دبائے عدالتوں کی خاک پھانکنے میں مال وقت و قوت کی جو بے پناہ اضاعت ہوتی ہے اس کو دین و دنیا کے کسی بہتر مشغلہ میں لگایا جا سکتا ہے۔

غیر مسلم رعایا کے حقوق: اگر حاکم مسلمان اور محکوم یا رعایا کافر ہے تو اس کے حقوق کے باب میں کیسی سخت تہدید ہے، کہ

> "جو شخص کافر رعایا پر ظلم کرے یا اس کے حقوق میں کمی کرے یا اس کو بے موقع تکلیف دے یا اس کی ناراضی سے اس کی چیز لے لے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت میں اس پر دعویٰ دائر فرمائیں گے"۔

افسوس آج اپنے بھائیوں ہی پر ایسے ظلم سے کب ہم چوکتے ہیں، جو غیروں کا اتنا خیال ہو ورنہ غیروں سے ہم کو حکومت کے لئے جنگ نہ کرنا پڑتی وہ خوشی خوشی بلکہ خوشامد سے ہم کو اپنا حاکم بناتے۔ مگر یہ جب ہی ہو سکتا ہے، جب کہ ہم حکومت کے طالب ہونے کے بجائے صرف حاکم حقیقی کی رضا کے طالب ہوں۔

طعام و لباس وغیرہ کے متفرق آداب: اس قسم کے معاملات و سیاسیات کے بعد طعام و لباس وغیرہ کے کچھ متفرق آداب معاشرت ہیں۔ مثلاً

> "جس چیز میں سب انگلیاں نہ لگانی پڑیں اس کو تین انگلیوں سے کھاؤ اور انگلیاں چاٹ لیا کرو اور برتن میں اگر سالن ہو چکے تو اس کو بھی صاف کر لیا

کرو، اس سے برکت ہوتی ہے۔ کھانا تواضع کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ متکبروں کی طرح تکیہ لگا کر مت کھاؤ۔ اگر کھانا کم ہے اور آدمی زیادہ تو سب آدمی آدھا پیٹ کھاؤ، یہ نہیں کہ ایک تو پیٹ بھر لے اور دوسرا پیٹ پیٹتا رہ جائے۔ جنس روزانہ ناپ تول کر پکاؤ ہندوستانی عورتوں کی طرح اندھا دھند مت اٹھاؤ کہ آٹھ دن کی جنس چار دن میں تمام ہو جائے۔ لیکن بچے ہوئے کو مت ناپو، اس میں بے برکتی ہوتی ہے۔ مہمانوں کی خاطر و مدارت کرو، ایک روز کسی قدر تکلف کا کھانا کھلاؤ، دو تین دن تک اس کا حق مہمانی ہے۔ مہمان کو زیبا نہیں کہ میزبان کے گھر جم ہی جائے کہ وہ تنگ آ جائے۔ جب کھانا کھا چکو تو پہلے دستر خوان اٹھوا دو خود پہلے اٹھنا خلاف ادب ہے۔ اگر اپنے ساتھی سے پہلے کھا چکو تب بھی اس کا ساتھ دو، تھوڑا تھوڑا کھاتے رہو، کہیں تمہارے اٹھنے سے وہ بھوکا ہی نہ اٹھ کھڑا ہو اور اگر کسی وجہ سے اٹھنا ضرور ہے، تو اس سے عذر کرو۔ مہمان کو گھر کے دروازہ تک پہنچانا سنت ہے۔ پانی ایک سانس میں مت پیو تین سانس میں پیو اور سانس لینے میں برتن منہ سے جدا کر لو۔ کھانا کھانے اور پانی پینے کے بعد اپنے رازق کا شکر ادا کرو۔

"مردوں کے لئے ٹخنے سے نیچے کرتا پانجامہ یا لنگی پہننا ممنوع ہے اس طرح حریر یا زری کا کپڑا پہننا ممنوع ہے۔ البتہ چار انگشت چوڑی گوٹ وغیرہ جائز ہے۔ ایسی وضع سے کپڑا مت پہنو کہ اٹھتے بیٹھتے ستر کھل جائے۔ کپڑا داہنی طرف سے پہننا شروع کرو مثلاً داہنی آستین پہلے پہنو۔ کپڑا پہن کر اپنے مولیٰ کا اس طرح شکر ادا کرنے سے گناہوں کی مغفرت ہوتی ہے الحمد اللہ الذی کسانی ہذا و رزقنیہ من غیر حول منی ولا قوۃ۔ امیروں کے پاس زیادہ بیٹھنے سے دنیا کی ہوس بڑھتی ہے، عمدہ پوشاک کی فکر ہوتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جب تک کپڑے میں پیوند نہ لگ جائے اس کو پرانا نہ سمجھو۔ کپڑے میں نہ اس قدر زینت و اہتمام کرے کہ لوگوں کی نظر پڑے کہ یہ ریا و تکبر ہے

اور نہ بالکل بد حیثیت میلا گندا رہے کہ نعمت کی ناشکری ہے سادگی کے ساتھ توسط رکھے۔ اپنی وضع چھوڑ کر دوسری قوموں کی وضع ولباس سے ایسی نفرت ہونا چاہئے۔ جیسا مرد کو انگیا لہنگا پہننے سے جو عورتوں کی وضع ہے"۔

کیا خوب مثال ہے، لیکن اس ترقی کا کیا جواب کہ مردوں نے تو ابھی چہرے کی صفائی ہی کی حد تک عورتوں کی وضع اختیار کی ہے، لیکن عورتیں تو اب بے حجیبپ مردوں کا لباس پہننے لگی ہیں۔ تعلیم الدین کی تصنیف تک تو شاید ایسی مرد عورتیں نظر نہ آتی ہوں گی تاہم شریعت کا حکم تو حضرت نے لکھ ہی دیا تھا کہ

"مردوں کو عورتوں کا لباس اور عورتوں کو مردوں کا لباس اور شکل و صورت بنانا حرام و موجب لعنت ہے"۔

غنیمت ہے کہ مسلمان عورتوں نے ابھی اپنی مغربی بہنوں کی تقلید میں اس لعنت کو نہیں اوڑھا ہے، مگر آگے کا خدا ہی حافظ ہے! اور مردوں کو اس ترقی کا خدا جانے کیا انتظار ہے کہ وہ اپنی "مرد بیبیوں کا اتارا ہوا لباس زیب تن کر کے "عورت میاں" نہیں بن جاتے! اللهم احفظنا من ہذہ الفتن ماظہر منہا وما بطن۔

داڑھی کی نسبت بھی یہ حکم ہے کہ "جب تک مٹھی سے زائد نہ ہو کٹانا منع ہے" منڈانے والوں سے تو عرض ہی کیا کیا جاسکتا ہے سوا اس کے محمد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے دعویٰ کے ساتھ آپ کی صورت کے مقابلہ میں آپ کے دشمنوں کی صورت کو اختیار کرنا کیا معنی رکھتا ہے اور دلائل کو چھوڑ کر بس ذرا اتنی ہی بات پر گریبان میں سر ڈال کر غور فرمالیں۔ باقی رکھانے والوں پر زیادہ تعجب ہے کہ رکھا کر بھی کیوں ذرا سی کوتاہی کر کے سنت کے اتباع سے محروم ہیں!

"باہم سلام کیا کرو اس سے محبت بڑھتی ہے، اس میں جان پہچان والوں کی تخصیص مت کیا کرو جو مسلمان مل جائے اس کو سلام کرو"۔

افسوس کہ بہت سے مسلمانوں نے ایسی صورت بنائی ہے کہ جان پہچان کے بغیر ان کو راستہ گلی میں مسلمان جان کر سلام کرنے کی کوئی صورت ہی

نہیں۔ بہرحال سلام نفس اسلام کا حق ہے، جس میں جان پہچان وغیرہ کس اور تعلق کو دخل نہیں، بلکہ "جو شخص ابتداء سلام کرتا ہے زیادہ ثواب ملتا ہے"۔ مزید آداب اس کے یہ ہیں کہ "سوار کو چاہئے کہ پیادہ کو سلام کرے، چلنے والا بیٹھے ہوئے کو اور تھوڑے آدمی زیادہ آدمیوں کو اور کم عمر زیادہ عمر والے کو۔ اگر کئی شخصوں میں سے ایک بھی سلام کرے تو سب کی طرف کافی ہے اسی طرح ایک کا جواب بھی سب کی طرف سے بس ہے"۔

"چار زانو بیٹھنا اگر براہ تکبر نہ ہو مضائقہ نہیں۔ بن ٹھن کر اتراتے ہوئے مت چلو۔ عورت اگر باہر نکلے تو سڑک کے کنارہ کنارہ چلے۔ سرراہ مت بیٹھو اگر باضرورت بیٹھنا پڑے تو ان امور کا لحاظ رکھو کہ نامحرم کو مت دیکھو کسی راہ گیر کو تکلیف مت دو نہ اس کا راستہ تنگ کرو، جو سلام کرے اس کا جواب دو نیک بات بتلاتے اور بری سے منع کرتے رہو، اگر کسی پر ظلم ہوتا دیکھو تو اٹھ کر مدد کرو، کوئی راہ بھول گیا ہو اس کو بتلا دو۔ اگر کسی کو سوار ہونے یا اسباب لادنے میں مدد کی ضرورت ہو اس کی مدد کرو۔

اللہ اکبر جس شریعت کی تعلیمات میں صرف کسی ضرورت سے عارضی طور پر کچھ دیر کے لئے کسی راستہ کے کنارے بیٹھ جانے کے ایسے اور اتنے آداب و حقوق ہوں اس کی تہذیب و معاشرت کے سامنے کسی دوسری تہذیب معاشرت کا نام لینا اور خصوصاً مسلمانوں کا اس کے پیچھے دوڑنا بے غیرتی کے علاوہ محرومی بھی کتنی بڑی ہے! کچھ آداب مجلس اور سن لیں۔

آداب مجلس: "کسی شخص کو اس کی جگہ سے اٹھا کر مت بیٹھو۔ جو شخص اپنی جگہ سے اٹھ کر چلا جائے اور جلد واپس آنے کا ارادہ رکھتا ہو وہ جگہ اسی کا حق ہے دوسرے کو نہ بیٹھنا چاہئے۔ بلاضرورت محض ترفع کی نیت سے مجلس میں ممتاز جگہ مت بیٹھو۔ جب مجلس میں جاؤ جہاں جگہ ملے بیٹھ جاؤ یہ نہیں کہ لوگوں کو پھاند کر ممتاز جگہ پہنچو۔ جو شخص تم سے

ملنے آئے ذرا اپنی جگہ سے کھسک جاؤ گو مجلس میں گنجائش ہو، اس میں اس کا اکرام ہے۔ مجلس میں ناک بھوں چڑھا کر مت بیٹھو۔ حاضرین میں ملے جلے ان سے ہنستے بولتے رہو اور ان کی باتوں میں شریک رہو بشرطیکہ خلاف شرع نہ ہوں۔ مصافحہ کرو اس سے دل صاف ہوتا اور گناہ معاف ہوتے ہیں۔ محبت سے معانقہ میں بھی مضائقہ نہیں۔ کسی معزز یا بزرگ آدمی کے آنے کے وقت تعظیماً کھڑے ہو جانا مضائقہ نہیں۔ جس سے ملو کشادہ روئی سے ملو بلکہ تبسم مناسب ہے تاکہ وہ خوش ہو۔

زبان کی حفاظت۔ بہت ضروری ہے، اس کی ذات سے دین و دنیا کے بہت فتنے برپا ہوتے ہیں۔ لہٰذا سب سے مقدم تو اس کا خیال رکھنا ہے کہ

"جب کچھ بولو سوچ کر بولو۔ جس کلام سے کوئی دینی و دنیوی فائدہ نہ ہو زبان سے مت نکالو۔ گالیاں دینا فاسقوں کا کام ہے۔ کسی کو فاسق کافر ملعون خدا کا دشمن بے ایمان مت کہو۔ اگر وہ ایسا نہ ہو گا تو یہ سب چیزیں لوٹ کر کہنے والے پر پڑیں گی۔ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ رحم فرمائے لوگوں میں بڑی غفلت ہے گناہوں پر بڑی جراءت ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر یہ تاسف شفقت کی راہ سے ہے تو مضائقہ نہیں اور اگر خود پسندی و خود بینی سے کہا جائے تو یہ پہلے خود ہی اس الزام کا مورد ہے، جو دوسروں پر عائد کرتا ہے۔ دورویہ پن مت کرو بقول شخصے جمنا پر گئے تو جمنا داس اور گنگا پر گئے تو گنگا داس۔ چغل خوری مت کرو۔ جھوٹ ہرگز مت بولو، البتہ دو شخصوں میں مصالحت کرنے کے لئے کچھ جھوٹ بول دینے کا مضائقہ نہیں۔ کسی کے منہ پر خوشامد سے اس کی تعریف مت کرو اسی طرح غائبانہ تعریف ہو تو اس میں بھی مبالغہ اور یقینی دعویٰ مت کرو۔ کیونکہ حقیقت حال تو اللہ ہی کو معلوم ہے، بلکہ یہ کہو کہ میرے علم میں ایسا ہے۔ اگر اتفاقاً نفس و شیطان کے غلبہ سے کوئی معصیت ہو جائے تو اس کو گاتے مت پھرو۔ محض لوگوں کو ہنسانے کے لئے جھوٹی باتیں مت بناؤ۔ غیبت جیسے زبان سے ہوتی ہے، اسی طرح کسی کی نقل اتارنے سے بھی بلکہ یہ زیادہ بری ہے، جیسے آنکھ دبا کر دیکھنا لنگڑا کر چلنا۔ جس شخص کی غیبت ہو گئی ہو اور کسی وجہ سے معاف کرانا دشوار ہو تو ہارے درجہ علاج یہ ہے کہ اس شخص کے لئے ساتھ ہی اپنے لئے استغفار کرتے رہو۔

اللھم اغفرلناولہ۔ جھوٹا وعدہ مت کرو حتیٰ کہ بچے کے بہلانے کو بھی جھوٹ مت کہو کہ مٹھائی دیں گے بسکٹ دیں گے۔ کسی کا دل خوش کرنے کے لئے خوش طبعی میں مضائقہ نہیں مگر نہ کوئی جھوٹ بولو نہ کوئی ایسی بات ہنسی مذاق کی کہو کہ الٹے اس کو بری لگے۔ حسب نسب یا اور کسی کمال پر شیخی مت بھگارو۔ فساق و فجار کے لئے زیادہ تعظیمی الفاظ استعمال مت کرو۔ جس طرح عورت کو احتیاط ضروری ہے کہ غیر مرد کے کان میں اس کی آواز نہ جائے اسی طرح مرد کو احتیاط واجب ہے کہ خوش آوازی سے غیر عورتوں کی موجودگی میں اشعار وغیرہ پڑھے۔ کیونکہ عورتیں رقیق القلب ہوتی ہیں ان کی خرابی کا اندیشہ ہے۔ گانے بجانے کے شغل سے قلب خراب ہوتا ہے۔ کیونکہ نفوس میں خبث غالب ہے اور گانے بجانے سے اس غالب موجودہ کیفیت کو معمولاً حرکت و قوت ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ حرام کا مقدمہ (پیش خیمہ) حرام ہے"۔

حقوق و خدمت: ایک عنوان حقوق و خدمت کا ہے، جس میں اس طرح کے امور عاشرت درج ہیں کہ

"ماں باپ کی خدمت میں اطاعت کرو گو وہ کافر ہی ہوں، جب تک کہ وہ خدا اور سول کے حکم کے خلاف نہ کہیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے ملنے والوں سے بھی سلوک و احسان کیا جائے۔ ماں باپ ناخوش مر گئے ہوں تو ان کے لئے ہمیشہ دعائے مغفرت کرو۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو رضامند کر دیں گے۔ خالہ کا حق مثل ماں کے ہے اور چچا کا مثل باپ کے، بڑے بھائی کا مثل باپ کے اعزہ و اقارب سے سلوک کرو اگرچہ وہ بدسلوکی کریں۔ یوں تو اولاد کی پرورش کا ثواب ہی ہے، مگر لڑکیوں کی پرورش کی زیادہ فضیلت ہے۔ کما کما کر بیواؤں اور غریبوں کی خبر گیری سے جہاد کے برابر ثواب ملتا ہے پڑوسی کو کسی قسم کی تکلیف نہ دو جہاں تک ہو سکے نفع

پہنچاؤ۔ حاجت مند کی کار بر آری میں سعی کرو خود نہ ہو سکے سفارش ہی کر دو بشرطیکہ سفارش جس سے کرتے ہو اس کو کوئی ضرر یا تکلیف نہ ہو۔

"سب کی خیر خواہی کرو۔ ظالم کی خیر خواہی اس طرح کرو کہ اس کو ظلم سے باز رکھو، اور مظلوم کی مدد تو بہت ضروری ہے۔ جو بات اپنے لئے پسند کرو وہی دوسرے کے لئے پسند کرو۔ چھوٹوں پر مہربانی اور خصوصاً بوڑھوں کی تعظیم کرو۔ ہر شخص کی قدر و منزلت اس کے رتبہ کے موافق کرو، سب کو ایک لاٹھی نہ ہانکو (آج کل مساوات طلبی میں اکثر سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنے ہی کا مطالبہ ہوتا ہے۔ جامع) دوستی و محبت بلا کسی غرض کے محض اللہ کے واسطے کرو۔ جس سے دوستی کرنا ہو اس کا دین وضع و خیالات پہلے معلوم کر لو ورنہ صحبت کے اثر سے کہیں تم نہ بگڑ جاؤ۔ اتفاقاً کسی سے رنجش ہو جائے تو تین دن سے زیادہ بول چال چھوڑ دینا گناہ ہے، اور جو پہلے ملے اس کو زیادہ ثواب ملے گا۔ اگر دو شخصوں میں رنجش ہو جائے اصلاح کر دو۔ جو کام کرو سوچ سمجھ کر۔ جلدی میں اکثر کام بگڑ جاتا ہے۔ البتہ در کار خیر حاجت استخارہ نیست۔ کوئی مشورہ لے تو جو تم بہتر سمجھتے ہو وہی صلاح دو۔

"کفایت و انتظام سے خرچ کرنا گویا آدھی معاش ہے، لوگوں کی نظروں میں محبوب رہنا گویا آدھی عقل ہے، اور اچھی طرح کسی بات کا دریافت کر لینا گویا آدھا علم ہے۔ لوگوں سے ملنا ان کے کام آنا ان کی ایذا پر صبر کرنا اس سے بہتر ہے کہ گوشہ عافیت میں جان بچا کر بیٹھ رہے اور کسی کے کام نہ آوے۔ البتہ اگر بالکل برداشت نہ ہو تو لاچاری ہے۔ لوگوں سے اپنا کہا سنا لیا دیا معاف کرا لو ورنہ قیامت میں بڑی مصیبت ہو گی۔ دوسروں کو نیک کام بتلاتے رہو اور بری باتوں سے منع کرتے رہو۔ البتہ اگر قبول کی بالکل امید نہ ہو یا اندیشہ ہو کہ اذیت پہنچائے گا تو سکوت جائز ہے مگر دل سے بری بات کو برا ہی سمجھتے رہو"۔

آداب معاشرت کی کوتاہیاں: اگرچہ تعلیم الدین میں جس طرح دین کے تمام شعبوں کا تھوڑا تھوڑا بیان ہے، اسی طرح معاشرت کی بھی بعض جزئیات کو بہت اختصار کے ساتھ بیان فرمادیا گیا ہے اور نسبتہً زیادہ تفصیل بہشتی زیور میں ہوچکی ہے۔ لیکن حضرت نے جابجا اور بار بار متوجہ و متنبہ فرمایا ہے کہ عقائد و دیانات، معاملات و اخلاق کو تو مختلف طبقات کسی نہ کسی درجہ میں دین سمجھتے ہیں مگر معاشرت کو معمولاً اجزائے دین کی فہرست سے خارج ہی جانتے ہیں، اس لئے آداب المعاشرت نام کے ایک مستقل رسالہ میں اس کی اصلاح و تجدید کی طرف مستقل توجہ فرمائی گئی ہے۔ تمہید میں ارشاد ہے کہ

"دیگر اجزائے دین کی کم و بیش خاص یا عام طور پر یعنی وعظ میں کچھ تعلیم و تلقین بھی ہوتی ہے، لیکن معاشرت کے جز کا زبان پر نام تک نہیں آتا۔ اس لئے عملاً یہ بالکل نسیا منسیا ہو چلا ہے۔ اور میرے نزدیک باہمی الفت و اتفاق میں (جس کی شریعت نے سخت تاکید کی ہے اور اس وقت عقلاً بھی اس کی چیخ و پکار کر رہے ہیں) جو کمی ہے اس کا بڑا سبب سوء معاشرت ہے کیونکہ اس سے باہم انبساط و انشراح نہیں رہتا، جس پر باہمی الفت کا بڑا دارومدار ہے"۔

قرآن و حدیث میں معاشرت کی تاکید: اور جو احکام ہیں ان کا کچھ نمونہ یہ ہے کہ

"حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں جگہ فراخ کردو تو فراخ کردیا کرو۔ اور جب تم سے کہا جائے کھڑے ہو جاؤ تو کھڑے ہوجایا کرو۔ اور ارشاد ہے کہ "دوسرے کے گھر میں (گو وہ مردانہ ہو مگر ہو خاص خلوت گاہ) بے اجازت مت جایا کرو۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ساتھ کھاتے وقت دو چھُوارے ایک دم ساتھیوں کی اجازت کے بغیر نہ لینا چاہیئے۔ دیکھئے ایک خفیف بے تمیزی سے محض اس لئے ممانعت فرمائی کہ دوسروں کو ناگوار ہو گا۔

حضورؐ ہی کا ارشاد ہے کہ جو شخص لہسن اور پیاز (خام) کھائے تو ہم سے (یعنی مجمع سے) علیحدہ رہے دیکھئے اس خفیف سے سبب اذیت سے بھی منع فرمایا۔ اور فرمایا کہ مہمان کو حلال نہیں کہ میزبان کے پاس اس قدر قیام کرے کہ وہ تنگ ہو جائے، اس میں ایسے امر سے سخت ممانعت ہے، جس سے دوسرے کو تنگی ہو۔ اور ارشاد ہے کہ ساتھ کھاتے وقت گو پیٹ بھر جائے، مگر جب تک ساتھ والے فارغ نہ ہو جائیں ہاتھ نہ کھینچے کیونکہ اس سے دوسرا بھی شرما کر ہاتھ کھینچ لیتا ہے، اور شاید اس کو ابھی کھانے کی حاجت ہو، اس سے ثابت ہوا کہ ایسا کام بھی نہ کرے جس سے دوسرا شرمندہ ہو"۔

"ایک بار حضرت جابرؓ در دولت پر حاضر ہوئے اور دروازہ کھٹکھٹایا آپ نے پوچھا کون؟ انہوں نے عرض کیا میں ہوں، آپ نے ناگواری سے فرمایا میں ہوں میں ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بات صاف کہے جس کو دوسرا سمجھ سکے۔ گول بات کہنا جس کے سمجھنے میں تکلیف ہو دوسرے کو الجھن میں ڈالنا ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی محبوب نہ تھا، مگر آپ کو دیکھ کر اس لئے کھڑے نہ ہوتے کہ آپ کو ناگوار ہوتا۔ اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی خاص ادب تعظیم یا خدمت کسی کے مزاج کے خلاف ہو، تو گو اپنی خواہش ہو، مگر دوسرے کی خواہش کو مقدم رکھے۔ اور فرمایا کہ دو شخصوں کے درمیان (جو قصداً پاس پاس بیٹھے ہوں) جا کر بلا اجازت بیٹھنا حلال نہیں، اس سے بھی ظاہر ہے کہ کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے دوسروں کو کدورت ہو۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تو جو شخص جہاں پہنچ جاتا وہیں بیٹھ جاتا، یعنی لوگوں کو چیر پھاڑ کر آگے نہ بڑھتا، اس سے بھی اہل مجلس کا کتنا ادب ثابت ہے، کہ ان کو اتنی ایذا بھی نہ

پہنچائے۔ مروی ہے کہ عیادت میں مریض کے پاس زیادہ نہ بیٹھے اس میں بھی کس قدر دقیق رعایت ہے کہ کسی کی ادنیٰ گرانی کا بھی سبب نہ بنے، کیونکہ بعض اوقات مریض کو کسی کے سامنے کروٹ بدلنے پاؤں پھیلانے یا بات چیت کرنے میں ایک گونہ تکلف ہوتا ہے۔ البتہ جس کے بیٹھنے سے اس کو راحت ہو وہ مستثنیٰ ہے۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ شب برات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بستر سے آہستہ اٹھے اور اس خیال سے کہ وہ سوتی ہوں گی بے چین نہ ہوں آہستہ نعل مبارک پہنے آہستہ کواڑ کھولے اور آہستہ سے باہر تشریف لے گئے اور آہستہ کواڑ بند کئے۔ اس میں سونے والے کی کتنی رعایت ہے کہ ایسی آواز یا کھڑ کا بھی نہ ہو جس سے وہ دفعتہً جاگ اٹھے اور پریشان ہوں۔ حضرت مقدادؓ سے ایک طویل قصہ میں مروی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان تھے بعد عشا آکر لیٹ رہتے حضورؐ اقدس دیر میں تشریف لاتے تو (چونکہ مہمانوں کے سونے جاگنے دونوں کا احتمال ہوتا اس لئے) سلام تو کرتے کہ شاید جاگتے ہوں مگر ایسا کرتے کہ جاگتے ہوں تو سن لیں اور سوتے ہوں تو آنکھ نہ کھلے"۔

فقہا کی تصریحات۔ سلام کرنے کی اسلام میں کتنی تاکید ہے لیکن پھر بھی "روایات فقہا میں تصریح ہے کہ جو شخص کھانے یا درس یا اوراد میں مشغول ہو اس کو سلام نہ کیا جائے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص کسی ضروری کام میں مشغول ہو بلا ضرورت اس کے قلب کو منتشر کرنا شرعاً ناپسند ہے۔ اسی طرح جماعت و مسجد کی نماز کی کتنی تاکید اور کتنا اجر ہے، مگر کند ذہنی کے مرض میں جو مبتلا ہو اس کو اس مسجد میں نہ آنے دینا بھی فقہا نے نقل کیا ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی اذیت کے اسباب کا انسداد کتنا ضروری ہے"۔

واقعی حقیقی حسن معاشرت اور کامل تہذیب وہی ہے، جس کی تعلیم کتاب و سنت اور نبوت و شریعت نے فرمائی ہے۔

آداب معاشرت پر مجبور کرنا: "اور شارع علیہ السلام نے صرف اپنے قول و فعل ہی سے اس کے اہتمام پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ بے پروائی کے موقع پر ان آداب پر مجبور فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک صحابی کچھ ہدیہ لے کر آپ کی خدمت میں بلا سلام و بلا اجازت داخل ہو گئے، آپ نے فرمایا باہر واپس جاؤ اور السلام علیکم کیا میں حاضر ہوں، کہہ کر پھر آؤ"۔

"غرض شریعت نے اس کا نہایت درجہ خاص طور پر اہتمام کیا ہے کہ کسی شخص کی کوئی حرکت دوسرے کے لئے ادنیٰ درجہ میں بھی کسی قسم کی تکلیف و اذیت یا ثقل و گرانی یا ضیق و تنگی یا تکدر و انقباض یا کراہیت و ناگواری یا تشویش و پریشانی یا توحش و خلجان کا سبب نہ ہو"۔

حسن اخلاق کی جان: "اور در حقیقت حسن اخلاق کا راس واساس یہی ہے کہ کسی کو کسی سے ایذا و کلفت نہ ہو، جس کو حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت جامع الفاظ میں فرمایا ہے کہ "المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ (رواہ البخاری) یعنی پورا مسلمان وہ ہے، جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمانوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اور جس امر سے تکلیف و اذیت ہو گو وہ صورۃً مالی یا جانی خدمت ہو یا ادب تعظیم ہو جس کو عرف عام میں حسن خلق کہا جاتا ہے، مگر دراصل وہ سب سوء خلق ہے۔ کیونکہ راحت جو جان خلق ہے، وہ مقدم ہے خدمت پر جو پوست خلق ہے"۔

معاشرت کا تقدم عقائد و عبادات پر: "اور گو شعائر ہونے کی حیثیت سے باب معاشرت عقائد اور فرض عبادات سے موخر ہے، لیکن اس اعتبار سے کہ عقائد و عبادات کے خلل سے اپنا ہی ضرر ہے اور معاشرت کے خلل سے دوسروں کا اور دوسروں کو ضرر پہنچانا اشد ہے اپنے نفس کو ضرر پہنچانے سے، اس لحاظ سے اس کو ان دونوں پر تقدم حاصل ہے۔ آخر کوئی بات تو ہے کہ اللہ تعالیٰ سورۂ فرقان میں فرماتے ہیں الذین یمشون علی الارض ہونا واذا خاطبہم الجاہلون قالو سلما کہ حسن معاشرت پر وال ہے، مقدم فرمایا صلوٰۃ

و خشیت و اعتدال فی الانفاق اور توحید کے ذکر پر۔ حالانکہ ان چیزوں کا تعلق طاعات مفروضہ و عقائد سے ہے۔ اور یہ تقدم علی الفرائض تو محض بعض وجوہ سے ہے، ورنہ نفل عبادت پر تو حسن معاشرت بہمہ وجوہ مقدم ہے"۔

"چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو دو عورتوں کا ذکر کیا گیا ایک تو نماز روزہ کثرت سے کرتی تھی (یعنی نوافل کیونکہ کثرت اسی میں ہو سکتی ہے) مگر اپنے ہمسایوں کو ایذا پہنچاتی تھی۔ اور دوسری زیادہ نماز روزہ نہ کرتی تھی (یعنی ضروریات پر اکتفا کرتی تھی) مگر ہمسایوں کو ایذا نہ دیتی تھی آپ نے پہلی کو دوزخی اور دوسری کو جنتی فرمایا۔

معاملات سے بھی اہم: "اور معاملات پر گو معاشرت اس حیثیت سے مقدم نہیں کہ معاملات کے خلل سے دوسروں کو ضرر پہنچتا ہے، مگر ایک دوسری حیثیت سے معاملات سے بھی اہم ہے، وہ یہ کہ عوام نہ سہی مگر خواص معاملات کو داخل دین سمجھتے ہیں اور معاشرت کو بجز اخص الخواص کے بہت سے خواص بھی داخل دین نہیں سمجھتے، اور بعض جو سمجھتے بھی ہیں وہ معاملات کے برابر اس کو مہتم بالشان نہیں مانتے، اور اس وجہ سے عملاً اس کی پرواہ کم کرتے ہیں۔ رہی اخلاق باطن کی اصلاح تو وہ عبادات مفروضہ کے حکم میں ہے، اس لئے عبادات پر معاشرت کے تقدم کی جو حیثیت اوپر مذکور ہو چکی وہی باطنی اصلاح پر بھی اس کے تقدم کی ہے۔

"غرض معاشرت کا تمام اجزائے دین سے کسی سے من وجہ اور کسی سے من کل الوجوہ مقدم و مہتم بالشان ہونا ثابت ہے مگر اس کے باوجود عوام کا تو بکثرت اور خواص میں بھی بعض کا تو اس کی طرف خود عملاً بھی کم التفات ہے۔ اور اگر کسی نے خود عمل بھی کر لیا تو دوسروں کو خواہ وہ اجنبی ہوں یا اپنے متعلقین ان کو روک ٹوک یا تعلیم و اصلاح کرنا تو مقصود ہی ہے"۔

احتساب معاشرت سے غفلت: بلکہ اکثر تو ان باتوں میں اپنے پرائے کسی کی بھی روک ٹوک کو بد اخلاقی اور سخت گیری و ناروا داری خیال کرتے ہیں۔ مگر ایک عالم باعمل

اور مجدد کامل، دین کے ایسے "مقدم و مہتم بالشان باب" میں عوام و خواص کی اس درجہ علمی و عملی غفلت و غلط فہمی کا کیسے روادار ہو سکتا تھا نہ ایسی نام نہاد رواداری جو دراصل مداہنت ہے، اصلاح و تجدید کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

"احقر مدتوں سے اپنے متعلقین کو ایسے مواقع پر زبانی احتساب کرتا رہتا ہے۔ گو اس میں اتنی خطا ضرور ہے بعض وقت مزاج میں حدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف کر کے اصلاح فرما دے۔ اور اکثر وعظ میں بھی ایسے امور کی تعلیم و تبلیغ کرتا ہوں"۔

مگر حسن معاشرت کی اوپر جیسی غیر معمولی اہمیت معلوم ہو چکی اور اس کے باوجود عوام و خواص سب کی اس معاملہ میں جیسی غفلت ہے، اس کے پیش نظر صرف خاص مجلس یا عام وعظ میں اس کی روک ٹوک یا اس کی تعلیم و تبلیغ پر اکتفا نا کافی تصور فرما کر آداب المعاشرت کے نام سے مذکورۂ بالا مستقل بالذات کتاب تصنیف فرمائی اور تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر اس باب میں جو اصلاح و تجدید ضروری خیال فرمائی گئی اس کو تمہید بالا کے بعد آداب کے عنوان سے الگ الگ اور ایک ایک کر کے مفصلاً قلم بند فرما دیا ہے۔ جس میں سے بعض ایسی باتوں کو درج ذیل کیا جاتا ہے، جن کا اوپر ذکر نہیں آیا۔

"کسی کا خط مت دیکھو نہ حاضرانہ جیسے بعض آدمی لکھنے میں دیکھتے ہیں اور نہ غائبانہ۔ اسی طرح کسی کے سامنے کاغذات رکھے ہوئے اٹھا کر مت دیکھو، شاید وہ شخص کسی کاغذ کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہو۔

"جو شخص کھانے کے لئے جا رہا ہو یا بلایا گیا ہو اس کے ساتھ مت جاؤ۔ کیونکہ صاحب خانہ شرما کر کھانے کی تواضع کرتا ہے اور دل اندر سے چاہتا نہیں۔ اور بعضے جلدی قبول کر لیتے ہیں تو صاحب خانہ کی بلا رضامندی کھایا اور قبول نہ کیا تو اس کی سبکی ہے۔ پھر صاحب خانہ کا اول وہلہ میں تردد یہ بھی مستقل ایذا ہے۔"

"بعضے آدمی مجلس میں پہنچ کر سب سے مصافحہ کرتے ہیں اگرچہ سب سے تعارف نہ ہو، جس میں بہت وقت صرف ہوتا ہے، اور فراغ تک تمام

مجلس مشغول و پریشان رہتی ہے۔ مناسب ہے کہ جس کے پاس قصد کر کے آئے ہو اس سے مصافحہ پر قناعت کرو۔ البتہ اگر دوسروں سے بھی تعارف ہو تو مضائقہ نہیں۔"

"جب اپنے بڑے کے ساتھ ہو بدوں اس کی اجازت کے مستقل کوئی کام نہ کرنا چاہئے۔"

"استنجا عام گزر گاہ سے ہٹ کر اور حتی الامکان لوگوں کی نظر سے چھپ کر سکھلانا چاہئے جس قدر بھی دوری ممکن ہو۔ آج کل کی سفارش میں جبر و اکراہ ہے کہ اثر سے دوسروں پر دباؤ ڈالتے ہیں، جو شرعاً جائز نہیں۔ اگر سفارش کرو تو اس طرح کہ مخاطب کی آزادی میں ذرہ برابر خلل نہ پڑے وہ جائز بلکہ ثواب ہے۔"

"کام کرنے والے کے پاس بیکار آدمی کا بلا ضرورت بیٹھنا اس کے قلب کو مشغول و مشوش کرنا ہے، خاص کر جب اس کو تکتا بھی رہے۔ اس کا بہت لحاظ رہے۔"

"متکلم گفتگو میں جس دلیل پر رد یا دعویٰ کے خلاف ثابت کر چکا ہو تم کو ان مقدمات پر کلام کرنے میں تو مضائقہ نہیں، مگر بعینہٖ اس دعوے یا دلیل کا اعادہ کرنا مخاطب کو ایذا پہنچانا ہے۔ اس کا بہت خیال رکھو۔"

آج کل کے عام جدید و قدیم مہذب ذرا سب اپنی بحث و گفتگو کا اس ادب سے مقابلہ فرمائیں۔ اور بھی بہت سے چھوٹے بڑے آداب بیان فرمائے گئے ہیں، جن پر عمل کیا نظر بھی شاذ ہی کسی کی پڑتی ہے۔ عوام و خواص، نئے تعلیم یافتہ اور پرانے علماء و مشائخ کسی کو مشکل ہی سے ان کی طرف التفات بھی ہوتا ہو گا!

چھوٹوں کا لحاظ۔ آگے چند ایسے آداب ہیں، جن کا خصوصیت سے اپنے چھوٹوں کے ساتھ لحاظ رکھنا چاہئے۔ خواہ عمر میں چھوٹے ہوں یا رشتہ و رتبہ میں مثلاً:-

"جس شخص کو نسبت تم کو قرائن سے یقین یا گمان ہو کہ تمہارے کہنے کو ہرگز نہ ٹالے گا، اس سے کسی ایسی بات کی فرمائش مت کرو جو شرعاً واجب نہیں۔"

"اگر بلا فرمائش کوئی مالی یا بدنی خدمت کرے تب بھی لحاظ رکھو کہ اس کی راحت یا مصلحت میں خلل نہ پڑے۔ یعنی اس کو زیادہ جاگنے مت دو، اس کی گنجائش سے زیادہ ہدیہ مت لو۔ اگر تمہاری دعوت کرے بہت سے کھانے مت پکانے دو، ہمراہی میں بہت سے آدمیوں کی دعوت مت کرنے دو۔"

"اگر کسی شخص پر قصداً ناخوش ہونا پڑے یا اتفاقاً ایسا ہو جائے تو دوسرے وقت اس کا دل خوش کر دو۔ اگر تم سے واقعی زیادتی ہو گئی ہو، تو بے تکلف اس سے معذرت کر کے معافی مانگ لو عار مت کرو۔ قیامت میں تم وہ برابر ہوں گے کوئی چھوٹا بڑا نہ ہو گا۔ (قیامت کے اس عقیدۂ مساوات کے بغیر دنیا میں خالی جمہوریت و اشتراکیت کے بلند بانگ دعوؤں سے ایسا مساوات قیامت تک ممکن نہیں۔ جامع)۔"

"اپنے کسی خادم یا متعلق کو اتنا مقرب مت بناؤ کہ دوسرے اس سے دبنے لگیں یا وہ دبانے لگے۔ اسی طرح اگر وہ لوگوں کی روایات و حکایات تم سے کہنے لگے تو منع کرو۔ ورنہ لوگ اس سے خائف ہو جائیں گے اور تم لوگوں سے بدگمان ہو جاؤ گے۔ اسی طرح اگر وہ کسی کا پیام یا سفارش تمہارے پاس لائے تو سختی سے منع کر دو تاکہ لوگ اس کو واسطہ سمجھ کر اس کی خوشامد نہ کرنے لگیں، اس کو نذرانے نہ دینے لگیں یا وہ لوگوں سے فرمائش نہ کرنے لگے"۔

کیا حد ہے اس حکیمانہ و مجددانہ نظر کی کہاں کہاں جاتی ہے!

"خلاصہ یہ کہ تمام لوگوں کا تعلق براہ راست اپنے سے رکھو کسی شخص کو واسطہ مت بناؤ۔ ہاں محض اپنی خدمت کے لئے ایک آدھ شخص کو خاص کر

لو مضائقہ نہیں. مگر اس کو لوگوں کے معاملات میں ذرہ برابر دخل نہ دینے دو۔"

"اسی طرح مہمانوں کا قصہ کسی پر مت چھوڑو خود سب کی دیکھ بھال کرو۔ گو اس میں تم کو تعب زیادہ ہو گا، مگر دوسروں کو راحت و سہولت رہے گی اور بڑے تو تعب کے لئے ہوا ہی کرتے ہیں۔"

خود حضرت علیہ الرحمہ نے جن اسباب کی بنا پر عام و مستقل خانقاہی میزبانی کو ترک فرمایا تھا، اس کا ایک بڑا سبب یہی تھا کہ سارے مہمانوں کو دیکھ بھال کا بذات خود اہتمام فرماتے تھے. جس سے ان مہمانوں کی اصل خدمت (اصلاح و تربیت میں). جس کے لئے وہ دور دور سے سفر کر کے آتے تھے خلل پڑتا تھا۔ ورنہ خاص خاص کچھ مہمان تو اکثر ہی رہا کرتے تھے۔

خود حضرت کو آداب معاشرت و انتظام کا غایت اہتمام: یہ تو جو کچھ بھی واقف ہے خوب جانتا ہے، کہ خود حضرت والا کے ہاں ان آداب و قواعد اور ہر امر میں انتظام کا کیسا التزام تھا، اور چونکہ لوگ زیادہ تر انہیں باتوں میں گڑ بڑ کرتے ہیں، اس لئے انہیں باتوں پر زیادہ روک ٹوک احتساب و مواخذہ اور تغیر و ناگواری کی نوبت آتی تھی۔ اور کیوں نہ آتی جب خود ہی فرماتے ہیں کہ "میری نظر ذکر و شغل پر اس قدر نہیں ہے، جس قدر کہ اصلاح اخلاق و معاشرت پر کیونکہ ان کا تعلق دوسروں سے ہے"۔ اسی طرح انتظام کی نسبت "اکثر فرمایا کرتے کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے جو سلطنت گئی وہ بد نظمی کی وجہ سے۔ کیونکہ سلطنت کفر جمع ہو سکتی ہے۔ اور عموماً مسلمانوں کی بد انتظامیاں دیکھ دیکھ کر بہت شکایت و اظہار افسوس فرمایا کرتے کہ "بوجہ شامت اعمال مسلمانوں کے اندر سے سلطنت کا مادہ ہی نکل گیا ہے خود اپنی نسبت ہر امر میں کمال انتظام کی بنا پر مزاحاً فرماتے "کہ مجھ کو تو انتظام کا ہیضہ ہے"۔

حکومت الٰہیہ کے داعیوں اور پاکستان کے معماروں میں کتنے ہوں گے، جن کا ذہن بھی اس طرف جاتا ہو۔ یا حضرت علیہ الرحمہ کی اس تنبیہ کے بعد تنبیہ اور قبول پر تیار

ہوں۔ اور یہ ایک خاص جواب اس عام سوال کا بھی ہے جو بارہا خود مسلمانوں کی زبان سے ضعف ایمان کے لہجہ میں سنا جاتا ہے کہ بھلا ہم خدا و رسول کا نام تو لیتے ہیں تو کیا ہم ان غیروں (کافروں و مشرکوں) سے بھی گئے گزرے ہیں، جو اپنی مشرکانہ و کافرانہ سرکشی و طغیان کے باوجود حکومت و سلطنت سے سرفراز ہیں!

پھر بھی اعتدال۔ انتظام معاشرت وغیرہ میں اس قدر نازک آداب و قواعد کے باوجود قواعد پرستی کسی معاملہ میں بھی، حدود اعتدال کی شان کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتی، ضروری مستثنیات کی گنجائش ہر معاملہ میں ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اس پر متنبہ فرماتے ہیں کہ

> "ان آداب و قواعد کو ایک بے قاعدگی کے قاعدہ پر ختم کرتا ہوں کہ ان میں بعض آداب تو عام ہیں۔ ہر حالت میں اور ہر شخص کے لئے اور بعضے آداب وہ ہیں جن سے بے تکلف مخدوم یا بے تکلف خادم مستثنیٰ بھی ہیں۔ چونکہ اس درجہ کی بے تکلفی تک پہنچ جانے کا ادراک و جدانی و ذوقی ہے، اس لئے ایسے آداب کی تعیین بھی وجدان و ذوق پر چھوڑتا ہوں اور رسالہ کو اس شعر پر جو کہ ادب تکلف اور ادب بے تکلفی دونوں کا جامع ہے تمام کرتا ہوں۔"

طرق العشق کلہا ادب　　　ادبو النفس ایہا الاصحاب

خود راقم ہذا کے بعض تجربات۔ حضرت علیہ الرحمہ کو بعض بدفہموں یا بدمذاقوں نے "قواعد پرستی میں بدنام کیا ہے، لیکن جن کو کچھ قریب سے تعلق کی سعادت نصیب رہی وہ جانتے ہیں کہ خادموں تک کے ساتھ "آداب بے تکلفی" کے مستثینات کتنے اور کیسے کیسے تھے یہ سب سے نکما نام لیوا خود اپنے بعض تجربات عرض کرتا ہے۔

تعویذ گنڈے لکھنا حضرت کے اصل مزاج کے خلاف تھا مگر مرشد محترم (حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ) کا ارشاد تھا کہ کوئی مانگے تو لکھ دیا کرو اس لئے ظہر و عصر کی مابین عام مجلس کا جو وقت تھا وہی اس کے لئے بھی مقرر تھا اور خلاف وقت کوئی درخواست کرتا تو نہیں دیکھا کہ انکار فرما دیتے۔ ایک مرتبہ خادم ہذا کے خادم نے جس مکان میں قیام تھا عشاء

کے بعد کہا کہ اس میں بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ حضرت سے کسی تعویذ کے لئے عرض کروں۔ حاضر ہو کر ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ ناوقت تو ہے مگر کوئی اور تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔ ناگواری کا بالکل نام نہ تھا بلکہ کچھ ایسا فرمایا کہ نہیں ایسا "ناوقت عین وقت ہے" اور خود ہی اندر سے قلمدان لاکر تعویذ تحریر فرما دیا۔ پھر اس خادم کے رفیق کو الحمد اللہ کسی دن ڈرنے کی شکایت نہیں ہوئی۔

عام ہدایت یہ تھی کہ خط لکھنے والے ایک خط میں ایک سے زائد سوال نہ کیا کریں، اور کیسے نہ ہوتی جب کہ پچیّس تیس خطوط کے جواب تک کا روانہ اوسط تھا اور پھر یہ اہتمام کہ روز کے روز سب کے جوابات لکھ جائیں۔ یہ اہتمام اور جوابات کی نوعیت ایک مستقل کرامت تھی۔ بہرحال اس نالائق سے اس کی پابندی بہت کم ہوتی اور ایک کیا کئی کئی سوالات اور بارہا کئی صفحات کے طویل عریضے لکھ جاتا۔ ایک مرتبہ اس کی عذر خواہی کی کیسی نہایت شفقت و کرم سے تحریر فرمایا کہ "کہیں زلف محبوب کا طول بھی ناگوار ہوتا ہے"۔

سفارش میں بہت ہی احتیاط فرماتے اور ملفوظات وغیرہ میں بکثرت اس میں احتیاط کی تعلیم اور بے احتیاطی کی قباحتوں کا ذکر ملتا ہے۔ کبھی کسی کی درخواست پر شفارش فرماتے تو بہت ہی محتاط و مختصر۔ اس لئے راقم احقر کو کبھی کسی معاملہ میں اس قسم کی زحمت دینے کا خیال تک نہیں آتا تھا۔ ایک بہت بڑے مشہور اور بڑے صاحب اقتدار سے، جو حضرت سے بھی خاندانی و ذاتی عقیدت رکھتے تھے راقم کا کچھ کام اٹکا، تو گو اس ناکارہ کی طرف سے حضرت کی خدمت میں اشارۃً بھی کوئی درخواست نہ تھی۔ تاہم خود ہی ایک ایسی مجلس میں کہ میں حاضر بھی نہ تھا، ایک رفیق خاص سے فرمایا کہ "وہ (یعنی یہ نالائق) چاہیں تو میں سفارش لکھ دوں" اس شفقت و توجہ ہی پر بس نہیں فرمایا بلکہ فرمایا "جو چاہوں لکھ لاؤ میں نقل کر دوں گا" اس امر کا امتثال بڑا امتحان تھا لیکن بتکرار عذر خواہی کے باوجود یہی امر فرمایا گیا تو نفس بیان واقعات کی حد تک بجالایا، پھر اپنی طرف سے کافی سفارشی عبارت بڑھا کر دو صفحے کا سفارش نامہ تحریر فرمایا۔

غرض یہ کہ قانوں اور قاعدوں کا انتظام مصالح سے تھا اصل مقصود روح قانون ہوتی تھی چنانچہ اسی آداب المعاشرت میں فرماتے ہیں کہ

خلاصہ۔ ان تمام تر آداب کا یہ ہے کہ اپنے کسی قول یا فعل یا حال سے دوسرے کی طبیعت پر کوئی بار پریشانی یا تنگی نہ ڈالے۔ بس یہی خلاصہ ہے حسن اخلاق کا۔ جو شخص اس قاعدہ کو مستحضر کر لے وہ زیادہ تفصیل سے مستغنی ہو جائے گا۔ اسی سے فہرست کو بڑھایا نہیں گیا۔ البتہ اس قاعدہ کے لحاظ سے اتنا کام اور کرنا پڑے گا کہ ہر قول و فعل کے قبل ذرا سوچنا پڑے گا کہ ہماری یہ حرکت موجب ایذا تو نہ ہوگی پھر غلطی بہت کم ہوگی اور چند روز بعد خود طبیعت میں صحیح مذاق پیدا ہو جائے گا کہ پھر سوچنا بھی نہ پڑے گا۔ یہ سب امور مثل طبعی کے ہو جائیں گے"۔

مطلب وہی کہ اصل شے دفعات قانون کی لفظی پابندی نہیں بلکہ ان کی روح کو اپنے اندر پیدا کرنا ہے۔ اور سارے دین کی روح وہ ہے جس کا اصطلاحی نام تصوف ہے۔

تصوف

لیکن جب شریعت کے ظاہر احکام میں جو اپنے ظہور کی وجہ سے قدرۃً زیادہ صاف و متعین تھے۔ طرح طرح کے انقلابات و فسادات پیدا کر دیئے گئے تو طریقت یا تصوف کے احکام جو اس ظاہر کا باطن یا روح تھے اور اس لئے قدرۃً اس میں بطون و خفا زیادہ تھا، وہ خلل و انقلاب کی دستبرد سے کیسے محفوظ رہتے۔ خفا و بطون ہی کی بدولت اسی دروازے سے نہ صرف طرح طرح کی فسق و فجور اور گوناگون بدعات کے سیلاب اُمڈے بلکہ بہت سی کفرو شرک الحاد بیدینی کی باتوں نے عین دین کا نام پایا۔ اور جس فساد کو عین صلاح یا جس مرض کو عین صحت سمجھ لیا جائے اس کے ازالہ و اصلاح کی طرف التفات ہی کیسے ہو سکتا ہے۔

ایک جماعت نے اس فساد کو سمجھا بھی اور اس کی اصلاح پر کمر بھی چست کی مگر اپنی ظاہر بینی و خشک مزاجی کی بدولت مرض کے ساتھ مریض ہی کو ختم کرنا چاہا اور تصوف کے اسما و اصلاحات سے ایسے بھڑکے کہ دین کی ساری روح اور شادابی کو نکال کر اس کو ایک بے جان لاش اور خشک درخت بنا دیا۔

اصلاح تجدید کا یہ وہ نازک مقام تھا جو جسم و جان ظاہر و باطن و قلب و قالب دونوں کی جامع تجدید حذاقت دست شفا کا طالب تھا۔ حضرت جامع المجدد دین علیہ الرحمہ جس جسم و قالب کے جامع و کامل مصلح و مجدد ہیں (اور اب تک اوپر زیادہ تر اسی اصلاح و تجدید کے کارنامے مذکور ہوئے) اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر قلب و روح کی اہمیت کے پیش نظر، تصوف کی اصلاح و تجدید میں تجدید جامعیت و کمال حذاقت کی خدمات انجام دی ہیں۔ اور حساب لگایا جائے تو کم و کیف ہر اعتبار سے زندگی میں ان خدمات و مشاغل کا پلہ بہت بھاری

نکلے گا۔ ساری تصنیفات و تعلیمات مکتوبات و ملفوظات میں غلبہ اسی رنگ کا ملے گا۔

تصوف سے متعلق ان تجدیدی خدمات و مشاغل اگر محض سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو ایک مجلد در کار ہو گا, لیکن جامعیت کے کمال کے ساتھ حضرت کی صفت ایجاز واختصار بھی ایسی سراپا اعجاز ہے کہ پورے دفتر کو ایک رسالے ایک صفحے ایک سطر اور جملہ وفقرہ تک میں نچوڑ کر واقعی سمندر کو کوزہ میں بند فرمادیتے ہیں۔

تصوف اور تجدید تصوف کا متن متون۔ فنی و تجدیدی جامعیت کے لحاظ سے اسی **تعلیم الدین** کے نصف آخر کے تیس بتیس ورق متن متون (ٹیکسٹ بک) کی حیثیت رکھتے اور پورے تصوف اور اس کی اصلاح و تجدید کا عطر ہیں۔ اس لئے اختصار کے باوجود گنجائش کی حد تک اس کے زیادہ سے زیادہ اقتباسات درج ہیں۔ باقی اس باب میں حضرت کی تجدید کی تفصیلی بحمدللہ ایک مستقل کتاب کی شکل میں تجدید تصوف و سلوک کے نام سے راقم احقر کی پیش و شائع ہوچکی ہے۔ تعلیم الدین کے اس حصے میں سب سے پہلا عنوان "ولایت و سلوک مقامات" کا ہے۔

عام غلط فہمی۔ تصوف کے جاہل دشمنوں اور مذکورہ بالا خشک مصلحین اور بہت سے نام نہاد جدید محققین نے ایک غلط فہمی یہ پھیلا دی ہے کہ اس کی تعلیمات کتاب و سنت کے بجائے زیادہ تر اجنبی و بیرونی اثرات سے ماخوذ ہیں۔ اس لئے تصوف کی تجدید و اصلاح میں اس کی اصلی و صحیح تعلیمات کو کتاب و سنت سے جمع پیش کرنے کا اہتمام بلیغ فرمایا ہے۔ چنانچہ عنوان بالا کے تحت پہلے نفس ولی اور ولایت کی قرآنی حقیقت کو بیان فرمانے کے لئے ذیل کی تفہیم و تفسیر فرمائی ہے۔

۱۔ التکشف فی احادیث التصوف کے جزئی و کلی کئی ہزار مسائل کی احادیث جمع فرمائی ہیں۔ اور بیان القران پر صوفیانہ اعتبارات تفسیری کا پوری احاشیہ ہے اور ایک مستقل کتاب بھی ہے۔

ولایت کا مدار: اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

"اس آیت میں ولایت کا مدار دو چیزوں پر فرمایا ہے ایمان اور تقوی، سو جس درجہ کا ایمان وتقویٰ حاصل ہو گا اس مرتبہ کی ولایت حاصل ہوگی۔ اگر ادنیٰ درجہ کا ایمان و تقویٰ ہے، جو ضروری عقائد کی تصحیح اور ضروری اعمال کی پابندی سے حاصل ہوتا ہے، تو ادنیٰ درجہ کی ولایت حاصل ہوگی جو ہر مومن کو حاصل ہے، اس کو ولایت عامہ کہتے ہیں۔ اور اگر اعلیٰ درجہ کا ایمان و تقویٰ ہے تو اعلیٰ درجہ کی ولایت حاصل ہوگی، جس کو ولایت خاصہ کہتے ہیں۔ اور اصطلاحاً ولی وہی کہلاتا ہے جو ولایت خاصہ کے ساتھ موصوف ہو۔ اور یہاں اسی ولایت کے احکام بیان کرنا مقصود ہے۔"

ولایت خاصہ: تو "ولایت خاصہ کے لئے دو چیزیں ضروری ٹھہریں کامل ایمان اور کامل تقویٰ، اور مثل نماز روزہ کے یہ بھی فرض و واجب ہے جیسا کہ اس امر وجوب سے ظاہر ہے کہ یا ایہا الذین امنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ (۱) اور اس کے اختیاری ہونے کے لئے فرمایا فاتقوا اللہ ما ستنعطتم ۔ اور یہ دونوں باتیں بدون اصلاح باطن کے حاصل نہیں ہوتیں۔ ایمان کا محل تو ظاہر ہے کہ قلب ہے رہا تقویٰ سو گو ظاہری تقویٰ جوارح سے متعلق ہے، مگر حقیقی کامل تقویٰ قلب ہی سے متعلق ہے کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم التقویٰ ہہنا واشار الی الصدر (۲) لہٰذا اصلاح باطن بھی فرض ٹہری کیونکہ واجب کا مقدمہ واجب ہے۔

۱۔ اے مسلمانوں اللہ سے پورا پورا کماحقہ، تقویٰ اختیار کرو

۲۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تقویٰ یہاں ہے اور سینہ کی طرف اشارہ فرمایا۔

اصلاح باطن کی فرضیت و حقیقت۔ "اس بناء پر طالب ولایت کے لئے دو چیزیں فرض ٹھریں ایک ضروری عقائد و اعمال کی تصحیح دوسرے اصلاح باطن۔ عقائد و اعمال بطور نمونہ اس رسالہ کے گذشتہ چار صفحوں میں مذکور ہو چکے۔ اب سمجھئے کہ اصلاح باطن کیا ہے۔ باطن کے محمود و مذموم اوصاف ہوسکتے ہیں لہٰذا اصلاح باطن کی حقیقت یہ ہے کہ اوصاف محمودہ کو پیدا کیا جائے اور مذمومہ کو دور کیا جائے پہلے کو تحلیہ کہتے ہیں اور دوسرے کو تخلیہ و تجلیہ۔ حدیث شریف میں اس کا ذکر بہت مختصر و جامع الفاظ میں اس طرح فرمایا گیا ہے۔ الا وان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الاوھی القلب یعنی خوب سمجھ لو کہ آدمی کے بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ درست ہو جاتا ہے تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو تمام بدن بگڑتا اور سن لو کہ وہ دل ہے۔

حصول ولایت کا نام تصوف ہے۔ ولایت کے حاصل کرنے کے اس طریق کا نام تصوف ہو گیا ہے۔ اور دل کی درستی یعنی اوصاف حمیدۃ کے پیدا اور ذمیمہ کے فنا کرنے کو اصطلاح صوفیہ میں مقامات کہا جاتا ہے۔ اور چونکہ ان اوصاف حمیدہ کے حصول اور ذمیمہ کے ازالہ کا حضرت شارع علیہ السلام نے صاف صاف امر فرمایا ہے۔ لہٰذا یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ شارع نے تصوف کی تعلیم نہیں دی۔

اجمالی مجاہدہ اور وصول نسبت۔ "پس تقریر ہذا سے واضح ہو گیا کہ فن تصوف کے مقاصد یہی مقامات ہیں اور طالب کا کام انہی کو درست کرنا ہے۔ ان کے درست کر لینے کو تفصیلی ریاضت کہتے ہیں۔ لیکن ریاضت و مجاہدہ کا ایک طریق اجمالی بھی ہے، جس کے اصول ائمہ فن کے نزدیک چار ہیں قلت کلام قلت طعام قلت منام اور قلت [illegible] الانام یعنی کم بولنا کم کھانا کم سونا اور کم ملنا۔ اس تفصیلی و اجمالی ریاضت و مجاہدہ سے سالک کے قلب میں وصول الی اللہ کی قریبی استعداد پیدا ہوتی ہے، جس کے بعد [illegible] فضل خداوندی سے قلب میں مطلوب حقیقی کے ساتھ بالفعل ایک خاص جذبی تعلق پیدا [illegible] [illegible] کو نسبت سکینہ اور نور سے تعبیر کرتے ہیں، اور اس نسبت کے پیدا ہو جانے کا نام [illegible]

ہے۔

حقائق و معارف اور احوال و کیفیات: "پچھلے زمانہ میں حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب عہد کی برکت سے اس مقام پر بوجہ نسبت قوی پیدا ہو جانے کے کمال و صول نصیب ہو جاتا تھا۔ لیکن اب اکثر اس مقام پر نسبت ضعیف ہی پیدا ہوتی ہے جس کا حاصل کرنا فرض ہے۔ اور نسبت قویہ اور وصول کرنے کیلئے اذکار و اشغال و مراقبات کی ضرورت پڑتی ہے جس کا حاصل کرنا مستحب ہے۔ خلافت و مشخیت کا ادنیٰ درجہ اس قوی نسبت کے حاصل ہو جانے پر میسر آ جاتا ہے پھر اس نسبت قویہ کے حصول کے بعد چونکہ مبدء فیاض سے قلب کو تعلق ہو جاتا ہے، اس لئے بوجہ صفائی قلب اس پر کچھ علوم و اسرار اور کبھی حالات و آثار کا نزول ہوتا ہے۔ ان علوم کو حقائق و معارف اور آثار کو احوال و کوائف کہتے ہیں۔

طریق جذب و عشق: "اور بعض اوقات محض جذبہ غیبی یا کسی بزرگ کی توجہ و ہمت سے نسبت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد مقامات کی تصحیح ہوتی ہے، جو اقرب طرق ہے اور اس زمانہ میں معمول مشائخ یہی ہے۔ جس کو طریق عشق سے ملقب کیا جاتا ہے۔

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد اوز حرص و عیب کلی پاک شد

پہلے شخص کو سالک مجذوب مرید و محب کہتے ہیں اور دوسرے کو مجذوب سالک اور مراد و محبوب کہتے ہیں۔

ترتیب سلوک: "پس سلوک کی ترتیب یہ ہوئی کہ اول قلب میں ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ جس کے بعد اپنے کو کسی کامل کے سپرد کر دینا چاہئے جس کا عنوان اس زمانہ میں بیعت ہے۔ پھر یہ شیخ اجمالی یا تفصیلی ریاضت کرائے جس سے کچھ نسبت پیدا ہو یا پہلے القاء نسبت کر دے پھر ریاضت کرائے۔ جب قلب تعلقات سے خالی ہو جائے جو لازمہ نسبت ہے تب ذکر پھر شغل و مراقبہ کی تعلیم کرے، جس سے نسبت قوی پیدا ہو جائے۔ پھر چاہے اس کو خلافت دیدے اور چاہے تو نزول احوال و معارف کا منتظر رہے اگر قسمت میں ہے تو ان

کا نزول ہو گا جن کے غلبہ کا نام عروج ہے اور جن کا منتہٰی تجلی بے کیف ہے بعض اسی میں مستغرق رہ جاتے ہیں اور بعض کو افاقہ ہو جاتا ہے اس افاقہ کو نزول کہتے ہیں. خلافت کاملہ و مشیخیت علیا اس مقام پر پہنچ کر حاصل ہوتی ہے۔

ترتیب ابواب بحث۔ "اس طرح امور مذکورہ کی ترتیب سے عنوانات یا ابواب بحث کی ترتیب یہ ہوئی ارادت وبیعت، ریاضت اجمالی و تفصیلی۔ اذکار واشغال و مراقبات اور احوال و معارف۔ پانچ مباحث تو یہ ہوئے اور چونکہ ہر فن میں کچھ اصطلاحات بھی ہوتی ہیں جن کے نہ جاننے سے قوم کا کلام سمجھنے میں غلطیاں ہوتی ہیں، اسی طرح کچھ مسائل جزئیہ ہوتے ہیں، اسی طرح کچھ غلطیاں بھی لاعلمی سے ہوتی ہیں، اسی طرح ہر مطلوب میں کچھ موانع بھی پیش آتے ہیں، اسی طرح مشائخ کا معمول رہا ہے کہ کچھ کلمات جامعہ طالبین کو بطور وصیت کے فرماتے ہیں۔ اس بنا پر پانچ مضمون ضروری اور نکلے اصطلاحات مسائل جزئیہ اغلاط موانع ووصایا۔

مضامین عشرہ۔ آگے ان دسوں مضامین کو نہایت اختصار وایجاز کے ساتھ دس ابواب میں بیان فرمایا گیا ہے۔ لیکن چونکہ اکثر خشک مزاج اس طریق کا انکار کرتے ہیں، اس لئے حضرت امام غزالی کے ارشادات کا اس بارے میں کچھ خلاصہ بیان فرمانے کے بعد اس مشہور حدیث احسان کا نقل فرمایا کہ

> "الاحسان ان تعبداللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان واسلام یا عقائد ضرور یہ اعمال ظاہرہ کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہے، جس کا نام اس حدیث میں احسان آیا ہے، اور اس کی حقیقت جو بیان فرمائی گئی اس سے معلوم ہوا کہ وہ یہی طریق باطن ہے کیونکہ بدوں اس طریق کے وہ حضوری ہرگز میسر نہیں ہوتی جو اس حدیث میں احسان کی حقیقت بتائی گئی ہے۔ (مزید براں لاکھوں بڑے بڑے علماء واکابر کی شہادت اس کی تائید و توثیق میں موجود ہے) "جو نہایت قوی دلیل

ہے کہ طریق باطن بھی کوئی چیز ہے"۔

بیعت: "عادۃ اللہ یوں ہی ہے کہ کوئی کمال بدون استاد کے حاصل نہیں ہوتا، تو اس راہ میں استاد طریق کو ضرور تلاش کرنا چاہئے۔

گر ہوائے ایں سفر داری دلا
دامن رہبر بگیری بس برا
بے رفیقے ہر کہ شد درراہ عشق
عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

شیخ کی شرائط و علامات: "اول علم شریعت سے بقدر ضرورت واقف ہو خواہ تحصیل سے یا علماء کی صحبت سے تاکہ عقائد و اعمال کے فساد سے محفوظ رہے اور طالبین کو محفوظ رکھ سکے ورنہ "اوکہ خویشتن گم است کرا رہبری کند" دوم متقی ہو یعنی کبائر کے ارتکاب اور صغائر پر اصرار سے بچتا ہو سوم تارک دنیا (یعنی حریص و طامع نہ ہو تارک کسب ہونا ضروری نہیں) اور ظاہری و باطنی طاعات پر مداومت رکھتا ہو ورنہ طالب کے قلب پر برا اثر پڑے گا چہارم مریدوں کا خیال رکھے کہ کوئی امر ان سے خلاف شریعت و طریقت ہو جائے تو تنبیہ کرے پنجم بزرگوں کی صحبت اٹھائی ہو ان سے فیوض و برکات حاصل کئے ہوں۔ باقی خوارق و کرامات ہونا ضروری نہیں" (قول جمیل)

اصل میں اسی طریق کی زیادہ بدنامی اور اس میں زیادہ فسادات جاہل وغیرہ متشرع یا دین کے بھیس میں دنیا پرست مشائخ ہی کی بدولت واقع ہوئے ہیں، اس لئے انتخاب شیخ کی جو اوپر اقل قلیل شرائط و علامات بیان فرمائی گئی ہیں مرید کے لئے بیعت سے پہلے ان کا اطمینان کر لینا ضروری ہے۔ باقی نفس بیعت کے مسنون ہونے پر ایک سند بھی بیان فرما دی ہے کہ

بیعت کی مسنونیت کی سند "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام و غزوہ وغیرہ کے علاوہ مقامات سلوک کی بھی بیعت لی ہے مثلاً ہر مسلمان کی خیر خواہی کی اور اس بات کی کہ اللہ کے معاملہ میں کسی کی ملامت سے نہ ڈریں اور اس بات کی کہ لوگوں سے کوئی چیز نہ مانگیں۔ لہذا

اس کے سنت ہونے میں کوئی شک نہیں رہا۔ البتہ بعد کو بوجہ اشتباہ خلافت سلف نے صحبت پر اکتفا فرمایا۔ پھر بجائے بیعت کے خرقہ کی رسم جاری ہوئی۔ جب وہ رسم خلف میں نہ رہی صوفیہ نے اس سنت مردہ کو زندہ کیا"۔

صوفی کا لقب: "یہ لفظ صوفی کے لقب کی ابتداء سو خیر القرون میں تو صحابی تابعی اور تبع تابعی کے القاب اہل حق کے امتیاز کے لئے کافی تھے پھر خواص کو عابد وزاہد کہنے لگے۔ پھر فتن وبدعات کا شیوع ہوا اور اہل زیغ بھی اپنے عابد وزاہد کہنے لگے تو اہل حق نے امتیاز کے لئے صوفی کا لقب اختیار کر لیا اور دوسری صدی کے اندر اس لقب کی شہرت ہوگئی۔

راقم ہذا کے نزدیک صوفی کا لغوی ماخذ صوف کے بجائے **اصحاب صفہ** کا "صفہ" کیوں نہ ہو خصوصاً اس لئے کہ اس زمانہ تک اہل حق کو ہر بات میں کتاب وسنت کی سند کا بڑا اہتمام رہتا تھا۔ صفہ سے صفی یا صوفی بن جانا لغوی ولسانی رجحان کے عین مطابق ہے۔

ریاضت و مجاہدہ: "اس کے دو رکن ہیں (۱) مجاہدہ اجمالی جس کے اصول اربعہ قلت منام قلت طعام قلت کلام قلت اختلاط مع الانام میں شیخ کامل کی تعلیم کے مطابق توسط کو ملحوظ رکھے نہ اس قدر کثرت جس سے غفلت وقساوت و کاہلی پیدا ہو نہ اس قدر قلت جس سے صحت وقوت زائل ہو جائے۔ نفس کے مطالبات دو قسم کے ہیں حقوق و حظوظ۔ حقوق تو وہ ہیں جن سے قوام بدن وبقائے حیات ہے ان کو باقی رکھے اور حظوظ (لذات) جو ان سے زائد ہیں ان کو فانی کرے (یعنی ان کے پیچھے نہ پڑے)

اس دنیا میں حزن وغم سے خالی کون بشر ہے اور بہتوں کو تو اپنی زندگی سراپا حزن وغم ہی نظر آتی ہے، حتیٰ کہ بعضے خودکشی تک کر لیتے ہیں۔ باقی اس کو شر یا ناپسندیدہ بلکہ مبغوض تو سب ہی جانتے ہیں۔ لیکن عارف کی نگاہ میں یہ بھی اتنی بڑی دولت ہے کہ فائدہ عظیم کے عنوان سے ارشاد ہے کہ

اعلیٰ درجہ کا مجاہدہ۔ "سالکان طریق نے حزن و غم کو اعلیٰ درجہ کا مجاہدہ قرار دیا ہے، جس سے نفس کو پستی و شکستگی حاصل ہوتی ہے جو آثار عبودیت سے ہے۔ یہاں سے یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ سالک کو جو قبض پیش آتا ہے وہ اس کے بعد و طرد کی علامت نہیں بلکہ کیا عجب ہے کہ اس سے تصفیۃ و مجاہدہ مقصود ہو۔ لہٰذا اس کی شکایت ہرگز نہ کرے سر تسلیم خم کر دے۔ اور اپنا کام کرتا رہے حضرت ابو علی وقاق فرماتے ہیں کہ حزن و غم میں اللہ تعالیٰ کی راہ جتنی جلد قطع ہوتی ہے وہ اس کے بغیر سالہا سال میں نہیں قطع ہوتی۔

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال
مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

تفصیلی ریاضت۔ تفصیلی ریاضت میں پہلے اخلاق حمیدہ کا بیان ہے جس کے مقامات توبہ صبر شکر خوف رجا زہد توحید توکل محبت شوق اخلاص و صدق مراقبہ و محاسبہ اور تفکر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی ماہیت اور اس کے طریق حصول کی مختصر تفصیل اور کتاب و سنت سے تائید فرمائی گئی ہے۔

نیز ان مقامات مذکورہ ہی کی تصحیح سے تقویٰ، ورع، قناعت، یقین، عبودیت، استقامت، حیاء، حریت، فتوت، خلق، ادب معرفت کے مقامات بھی درست ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی نصوص سے مشید ہیں۔

اس کے بعد اخلاق ذمیمہ کی تفصیل ہے، جن سے مراد شہوت غضب، حسد، حب دنیا بخل حرص، حب جاہ، ریا عجب، وغرور وغیرہ ہیں۔ جن کا دور کرنا سالک پر لازم ہے۔ ان کے بارے میں آیات و احادیث کے ذکر کے ساتھ ہر ایک کی ماہیت اور اس کے معالجہ یا ازالہ کی تدابیر کی تفصیل ہے۔

اگر تصوف جیسا کہ مقدمین نے اس کو سمجھا اور رسالہ قشیریہ وغیرہ سے ظاہر ہے انہیں اخلاق حمیدہ و ذمیمہ کے حصول و ازالہ کا نام رہتا، اور خواہ مخواہ اس کو تفلسف اور اصطلاحات سے زیر بار نہ کیا جاتا، اور اذکار اشغال وغیرہ کا درجہ محض تدبیر و معالجہ کا رہتا تو ان اخلاق کی مدح ذم امر و نہی سے قرآن و حدیث پر ہیں۔ لہٰذا یہ تصوف تو عین کتاب و

سنت تھا جس سے کسی "خشک مزاج" کو بھی انکار کی مجال کیسے ہوتی۔

"تیسرا باب اذکار و اشغال و مراقبات میں ہے۔ ذکر کے معنی تو ظاہر ہیں۔ شغل ذکر کے تصور کو کہتے ہیں اور مراقبہ مذکور کے تصور کو۔ اذکار و اشغال و مراقبات بکثرت کتب قوم میں مذکور ہیں"۔

مگر حضرت نے ان تینوں کے متعلق صرف دو طریقے "اپنے ہادی و مرشد حضرت مولانا الحاج الحافظ امداد اللہ صاحب رحمتہ اللہ کی کتاب ضیاء القلوب اور ارشاد مرشد سے نقل فرمادیئے ہیں، جو بہت سہل و مختصر اور مفید ہیں۔

البتہ آخر باب میں فائدہ کے عنوان سے جس خاص امر کی طرف توجہ دلائی ہے، اس کی نوعیت باعتبار تجدیدہ زیادہ اہم ہے۔ اس لئے وہ ذرا تفصیلا پیش ہے فرماتے ہیں کہ

اہم تجدیدی فائدہ۔ "احقر نے ایک معتبر کتاب میں دیکھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خواب میں دیکھا اور سوال کیا کہ حضرت آپ کے زمانہ اور اس زمانہ کی نسبت میں کیا فرق ہے۔ فرمایا ہمارے زمانہ میں تین چیزوں کی زیادہ کثرت کرتے تھے۔ نماز و تلاوت و ذکر۔ اور اس وقت لوگوں نے صرف ذکر پر اکتفا کر لیا ہے"۔

"غور کیا تو قرآن مجید کی اس آیت میں تینوں چیزوں کو جمع پایا" اتل ما اوحی الیک من الکتاب واقم الصلوٰۃ ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر ولذکر اللہ اکبر واللہ یعلم ما تصنعون۔ بلکہ بقول حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ غالباً صحابہ و تابعین میں حصول نسبت کے لئے اسی نماز و تلاوت و دیگر اوراد کی کثرت بشرط خشوع و تدبر کافی تھی اور ان اشغال متعارفہ کی ان کو حاجت نہ تھی پس سالک کو ضرور ہے کہ ان چیزوں کو نہ چھوڑے اور ان کے آداب و شرائط کی حفاظت و رعایت سے غافل نہ ہو۔

پھر نماز و تلاوت کے آداب مختصر مگر نہایت با اثر یہ بیان فرمائے ہیں کہ

"قرآن مجید جب پڑھنے کا ارادہ کرے تو تھوڑی دیر پہلے یہ سوچ لے کہ میں اللہ تعالیٰ کے روبرو بیٹھا ہوں جس طرح شاگرد استاد کے روبرو ہوتا ہے

اور بطور سبق کے سنا رہا ہوں. اس مراقبہ سے جو کیفیت پیدا ہوگی خود معلوم ہو جائے گی۔ اور نماز میں حضوری حاصل ہونے کے کئی طریقے ہیں۔ ایک یہ خیال کرنا کہ میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو دیکھ رہے ہیں تیسرا یہ کہ معنی کا خیال رکھے چوتھا لفظ کو بقصد منہ سے نکالنا محض یاد سے نہ پڑھنا ہے ہر ہر لفظ پر قصد کرتا جائے کہ اب یہ کہوں گا پھر اب یہ کہوں گا۔ پانچواں طریق یہ سمجھنا کہ میری عمر میں شاید یہ آخری نماز ہو۔ ان میں جو طریقہ آسان اور دلچسپ ہو اختیار کرلے اور صبح شام کسی قدر اوراد پڑھ لیا کرے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب کی کتاب ارشاد مرشد میں ضروری ضروی موجود ہیں ان میں جس قدر بسہولت ممکن ہو معمول کرلے"۔

نماز و قرآن کی بےقدری: تصوف سے بعد اور بدگمانی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نماز و تلاوت اور کتاب و سنت کے اذکار اوراد کی جگہ دیگر طرح طرح کے اذکار واشغال کا غلبہ زیادہ ہوگیا ہے اور بہتوں نے تو جانماز سرے سے تہ کردی اور قرآن کو بالائے طاق کردیا۔ پھر بھی خود اپنے کو اور دوسرے ان کو صوفی اور خدا رسیدہ ہی سمجھے جاتے ہیں۔ بھلا اس جاہلانہ تصوف سے سوا جہلا کے اور کون نہ بھڑکے گا۔ اسی کو آگے حضرت فرماتے ہیں کہ

"افسوس اس زمانہ میں نماز و قرآن کی حد سے زیادہ بےقدری ہے عوام کیا خواص بھی بہت کم ہیں جو ٹھیک طور پر نماز خصوصاً جماعت کے پابند ہوں بلکہ بہت سے فقیروں کو یہ گمان ہے کہ باطنی نماز کافی ہے ظاہری کی ضرورت ہی کیا نعوذ باللہ۔ پھر ان میں جو پڑھے جن میں وہ قرآن مجید میں تحریف کرتے ہیں کہیں ھم فی صلوٰتھم دائمون سے استدلال کرتے ہیں کہ صلوٰۃ ظاہری کو دائم ہو نہیں سکتی پس صلوٰۃ باطنی مراد ہے کہیں ولذکر اللہ اکبر سے تمسک ہے کہ گو نماز اچھی چیز ہے، مگر ذکر اللہ اس سے اکبر ہے سو اکبر کے ہوتے اصغر کی کیا ضرورت۔ یہ سب صریح الحاد ہے موٹی بات ہے کہ

تمہارے پہلے کے پیروں اور سب پیروں کے پیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیوں نہ سمجھا۔ دوسرے تمام قرآن مجید و حدیث عموم فرضیت سے بھرا پڑا ہے، جس میں نہ کسی آدمی کی تخصیص نہ کسی حالت کا استثنا بجز ان لوگوں کے جو قاعدۂ شرعی سے مرفوع القلم ہیں۔

رہی آیات بالا کی جاہلانہ تفسیر اگر مان بھی لی جائے اور "تسلیم کر لیا جائے کہ دائموں سے صلوۃ باطنی مراد ہے تو چلو یہ بھی سہی مگر اس سے ظاہر نماز کا فضول ہونا کس طرح نکلا۔ نماز باطنی اس آیت سے فرض اور ظاہری دوسری آیات سے تو دونوں ادا کرو" (اسی طرح) "ولذکر اللہ اکبر" کی بھی اگر تفسیر مذکور تسلیم ہی کر لی جائے تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ "مثلاً ایک شخص کے دو بیٹے ہیں ایک بڑا ایک چھوٹا تو اکبر کے ہوتے اصغر کی کیا حاجت چھوٹے کا گلا گھونٹ کر تمام کر دینا چاہیئے۔ بس اللہ تعالیٰ فہم سلیم عطا فرمائے۔

چوتھا باب احوال میں ہے، جس میں قبض و بسط ، انس و ہیبت، تمکین و تلوین فنا و بقاء حضور و غیبت سکر صحو تجلی و استتار کشف و کرامت وغیرہ کی کچھ تفصیل فرمائی گئی ہے۔

معارف و حقائق۔ پانچواں باب معارف میں ہے۔ ان کی نسبت ارشاد ہے کہ "اس میں ہر شخص کا مذاق جدا ہے مگر اس میں سب کا اتفاق ہے کہ حقائق و معارف مقبول وہ ہوں گے جن کو شریعت رو نہ کرے، سلیمان درونی کا قول ہے کہ اکثر میرے دل میں کوئی نکتہ اسرار صوفیہ سے آتا ہے مگر اس کو بلا دو عادل گواہوں کتاب و سنت کے بغیر قبول نہیں کرتا۔ اس طرح ابو سعید خراز کا قول ہے کہ جو باطن ظاہر کے خلاف ہو وہ باطل و مردود ہے۔ اور دلیل ان علوم کی چونکہ کشف ہے اس لئے قرآن و حدیث کے اندر انکا داخل کرنا تکلف سے خالی نہیں۔

وحدۃ الوجود۔ صوفیانہ حقائق و معارف میں سب سے زیادہ اہمیت مسئلہ وحدۃ الوجود کو حاصل ہو گئی ہے، اس کی نسبت ارشاد ہے کہ

"ظاہر ہے کہ تمام کمالات حقیقتہً اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں۔ مخلوقات کے کمالات عارضی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عطا و حفاظت کے سبب موجود ہیں۔ ایسے وجود کو اصطلاح میں وجود ظلی کہتے ہیں۔ ظل کے معنی سایہ کے ہیں، مگر سایہ سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ جسم ہے، جس کا یہ عالم سایہ ہے، بلکہ اس کے معنی وہ ہیں جیسے کہا کرتے ہیں کہ ہم آپ کے زیر سایہ رہتے ہیں، یعنی آپ کی حمایت و پناہ میں۔ اسی طرح ہمارا وجود چونکہ محض عنایت خداوندی کی بدولت ہے اس لئے اس کو وجود ظلی کہتے ہیں۔"

"پس یہ بات تو یقینی ہے کہ ممکن کا وجود حقیقی و اصلی نہیں، عارضی و ظلی ہے اب گر وجود ظلی کا اعتبار نہ یا جائے تو صرف وجود حقیقی کا ثبوت ہوگا اور وجود کو واحد کہا جائے گا، جو وحدۃ الوجود ہے اور اگر اس کا اعتبار کیجئے کہ آخر کچھ تو ہے بالکل معدوم تو ہے ہی نہیں گو غلبہ نور حقیقی سے کسی مقام پر سالک کو نظر نہ آوے تو یہ وحدۃ الشہود ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ نور ماہتاب نور آفتاب سے حاصل ہے اگر اس نور ظلی کا اعتبار نہ کیجئے تو صرف آفتاب کو منور اور ماہتاب کو تاریک کہا جاوے گا، یہ مثال وحدۃ الوجود کی ہے۔ اور اگر ماہتاب کے نور کا بھی اعتبار کیجئے کہ آخر کچھ تو آثار خاصہ ہیں گو نور آفتاب کے وقت وہ بالکل مسلوب النور ہوجائے، تو یہ مثال وحدۃ الشہود کی ہے۔"

"یہاں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں یہ اختلاف لفظی ہے مآل کار دونوں کا ایک ہے اور چونکہ اصل و ظل میں نہایت قوی تعلق ہوتا ہے اس کو اصطلاح صوفیہ میں عینیت سے تعبیر کرتے ہیں، اس مقام سے لاموجود الا اللہ اور ہمہ اوست کے معنی معلوم ہوگئے۔ اور عینیت کے یہ معنی نہیں کہ دونوں ایک ہیں۔ یہ تو صریح کفر ہے۔ چنانچہ وہی محققین صوفیہ اس عینیت کے ساتھ غیریت کے بھی قائل ہیں پس یہ عینیت اصطلاحی ہے

نہ کہ لغوی "مسئلہ کی تحقیق تو اسی قدر ہے۔ اس سے زیادہ اگر کسی کے
کلام منثور یا منظوم میں پایا جاوے تو وہ کلام حالت سکر کا ہے، نہ قابل
ملامت نہ لائق نقل و تقلید۔"

سبحان اللہ کیا تحقیق اور کیا صاف تصفیہ ہے! اس وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود یا
عینیت و غیریت کے مسئلہ کو جس قدر لوگوں نے پر پیچ و خطرناک بنا رکھا ہے، اسی قدر ان کا
دس بارہ سطروں ہی سے معلوم ہو گیا کہ کیسا صاف سہل اور بے خطر ہے۔ مسئلہ اپنی جگہ
بالکل حق ہے البتہ اس کی تشریح میں اجمال بالا سے آگے قدم بڑھانا مشکلات کو بڑھانا اور
تاریکی میں گھسنا ہے۔ جہاں پہنچ کر بات عقل و نقل دونوں کے تحمل سے دور جا پڑتی ہے۔
یوں کسی طفل مزاج متفلسف کو اپنے تفلسف یا طفل تسلی ہی سے تسلی ہو تو بیچارہ اپنی
حد تک معذور ہے۔ ورنہ ذات و صفات کے مسائل میں بس ایمان کی روشنی ہی تک روشنی
ہے آگے اندھیرا ہی اندھیرا۔

دور بنیاں بارگاہ الست　　جز ازیں بے نبردہ اند کہ ہست

تنزلات ستہ: اسی سلسلہ میں تنزلات ستہ کی بھی کچھ محتاط و اجمالی تفصیل ملاحظہ ہو کہ
"یہ ظاہر ہے کہ مصنوعات سے صانع کا ظہور ہوتا ہے۔ پھر خود صانع میں
ایک مرتبہ ذات کا ہوتا ہے ایک صفات کا پھر صفات میں ایک مرتبہ اجمال
کا ہوتا ہے ایک تفصیل کا اور ذات کا پتہ ہمیشہ صفات سے لگتا ہے اور اجمال
کا تفصیل سے جب یہ سب باتیں سمجھ میں آگئیں۔"
"تو اب سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا علم ہم کو مخلوقات سے ہوا پھر اسی
قاعدہ مذکورہ کے موافق اللہ تعالیٰ کی صفات تفصیلیۃ سے صفات اجمالیہ
کا اور ان سے ذات کا پتہ لگا۔ اسلئے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اول ظہور اللہ تعالیٰ
کا صفت جامعیت و اجمالیہ سے ہوا پھر صفات تفصیلیۃ سے پھر مخلوقات
سے ہوا۔ اب مخلوقات میں ایک عالم ارواح ہے ایک عالم اجسام۔ اور
چونکہ ان میں باہم بوجہ غایت لطافت و کثافت مناسبت ہے نہیں، لہذا ان

کے تعلق کے لئے ایک ایسی چیز پیدا کی جس کو دونوں سے مناسبت ہے، اس کو عالم مثال کہتے ہیں۔"

"اس طرح مخلوقات کی ترتیب میں پہلے روح ہوئی پھر عالم مثال پھر عالم اجسام۔ عالم اجسام میں سب سے آخر انسان پیدا ہوا جس میں اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی صفتیں رکھیں، اسی وجہ سے اس کو جامع الصفات کہتے ہیں اور جس ترتیب سے مخلوقات یکے بعد دیگرے پیدا ہوتی گئیں اسی قدر صانع کا ظہور بڑھتا گیا۔ غرض صفات تفصیلیۃ کے بعد اللہ تعالیٰ کا عالم ارواح سے ظہور ہوا پھر عالم مثال سے پھر عام اجسام سے اور سب سے آخر انسان سے۔ پس ظہور کے دو مرتبہ توصفات میں (اجمال و تفصیل کے) ہوئے اور چار مخلوقات میں ظہور کے انہیں علی الترتیب چھ مراتب کے اعتبارات کا نام تنزلات ستہ ہے اور تنزل ان کی اصطلاح میں ظہور کو کہتے ہیں نہ کہ آسمان سے زمین میں یا انسان کے اندر اتر آنے کو (یہ تو حلول ہوگا جو کفر ہے)۔"

"بہرحال یہ چھ مراتب تو تنزلات کے ہوئے اور وجود کے سات کیونکہ وجود کا ایک مرتبہ خود ذات حق کا ہے۔ مرتبہ ذات حق کو ہاہوت کہتے ہیں، مرتبہ صفات اجمالیہ کو لاہوت اور حقیقت محمدیہ۔ مرتبہ صفات تفصیلیۃ کو جبروت، اعیان ثابتہ حقیقت آدم اور عالم ارواح۔ مثال کو ملکوت اور عالم اجسام کو ناسوت اور انسان کو مرتبہ جامعہ کہتے ہیں۔"

"یہ سب اصطلاحات ہیں ورنہ یقینی بات ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم و آدمؑ بھی مخلوقات ہی ہیں نہ کہ صفات الٰہیہ ۔ بس مسئلہ کی تحقیق اسی قدر ہے، اس سے آگے اہل سکر کا غلبہ ہے، جس میں ان کی زبان و قلم سے موہم الفاظ نکل گئے ہیں، اور ناواقف لوگ اصطلاح کو لغت سمجھنے لگے۔"

اسلم طریقہ۔ اگر تنزلات سے مراد واقعی صفات و مخلوقات کے ظہور و پیدائش کے محض اعتبارات و مراتب ہی ہوں اور معاملہ اصطلاح کا ہو تو بلاشبہ چنداں مناقشہ کی بات نہیں لیکن اصل یہ ہے کہ یہ اصطلات و تعبیرات چونکہ فلسفہ و اشراقیت وغیرہ بیرونی اثرات کا رنگ لئے ہوئے ہیں جہاں حلول واتحاد سب ہی کچھ تھا اور مسلمان صوفیہ میں کہیں نہ کہیں خواہ سکر کے غلبہ ہی سے یہ رنگ محض عنوان و عبارت یا اصطلاح کی حدود سے نکل گیا ہے۔ اس لئے اسلم طریقہ یہی ہے کہ ایسی موہم اصطلاحات کا سرے سے استعمال ہی کیوں ہو۔ اور کتاب و سنت کی عنوانات و عبارات سے تجاوز کرنے کی ان نازک مسائل میں آخر وہ ضرورت ہی ایسی کونسی ہے، جس سے گریز نہیں کیا جاسکتا۔ خود خلق کے لئے بھی آخر خلق کے بجائے ظہور کی اصطلاح کیوں استعمال ہو، جو طرح طرح کے ایہامات سے خالی نہیں۔

"عالم سوز باتیں"۔ درحقیقت یہ چیزیں فلسفہ پسند اور نظریات ساز و ماغوں کی راہ سے داخل ہوگئی ہیں، جو وحی و نبوت کے فطری مذاق سلیم پر قانع نہیں رہ سکتے اس لئے اگر اس طرح کی فلسفہ سازیوں کو فلسفہ و کلام ہی کے اندر محدود رکھا جاتا تو وضع الشی فی غیر محلہ کے وہ ظالمانہ نتائج نہ برآمد ہوتے، جن کی طرف عارف روم نے اشارہ فرمایا کہ

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند وز سخنہا عالمے را سوختند

لیکن اس کو کیا کیا جائے کو متقدمین کا تصوف جو بالکل سلف اور کتاب و سنت کے مذاق پر تھا اور اس کی جگہ احکام قلب کے لئے وہی تھی جو احکام قالب کے لئے فقہ کی، خود اس میں آگے چل کر چونکہ بہت سے سے فلسفیانہ مذاق کے لوگ داخل ہوگئے جن کی بدولت فلسفہ ہی کے رنگ کا ایک فطری تصوف پیدا ہو گیا جس نے کلام کی طرح دین و فلسفہ کے مابین ایک برزخی صورت اختیار کرلی۔ حتیٰ کہ اخلاق باطنہ یا قلب کی اصلاح کا وہ خالص سلفی رنگ بہت مدہم پڑگیا، جس کی تجدید کا حق اب حضرت جامع المجددین نے کم و بیش پوری نصف صدی کی سعی میں ادا فرمایا اور بارہا فرمایا کہ انشاء اللہ طریق اب صدیوں کے لئے صاف ہوگیا۔

حضرت کی تجدید جامعیت ہی کا یہ بھی کمال تھا کہ جو غلط فہمیاں پیدا کرنے والی موہم

اصطلاحات و تعبیرات پیدا ہو گئی تھیں ان کی بھی تصحیح و تجدید فرما کر کتاب و سنت کے مذاق سے تا بہ امکان قریب تر فرما دیا ہے۔

اصطلاحات۔ آگے ایک باب اصطلاحات کا ہے۔ اس میں بھی بہت سی غلطیوں کا ازالہ فرما کر اصلاح و تجدید فرمائی گئی ہے۔ مثلاً ملامتی اور قلندر کے معنی یہ سمجھ لئے گئے ہیں کو جو اوامر و نواہی سے بے پروا بلکہ فسق و فجور تک میں مبتلا ہو تاکہ

"لوگوں میں اس کی قدر و منزلت نہ رہے باقی اللہ تعالیٰ کو طاعت کی پروا کیا ہے" (استغفر اللہ) حالانکہ قلندر وہ ہے کہ صرف ضروری عبادت کرے اور باقی اوقات ذکر و فکر میں گزارے۔ اسی طرح ملامتی وہ ہے کہ تمام فضائل و نوافل کا بھی پابند ہو مگر لوگوں کی نظر سے مخفی رکھے۔"

وصل: "وصل کے معنی بھی لوگ خدا جانے کیا کیا سمجھتے اور اس کی بدولت طرح طرح کے قبائح میں مبتلا ہوتے ہیں، حالانکہ اس کی سیدھی سادھی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ذاتی حضور و تعلق مستقلاً قائم ہو جائے اور غیر سے غفلت و ذہول۔ علیٰ ہذا اتصال نام ہے۔

"ماسوی اللہ سے انقطاع اور حق کے ساتھ اتصال کا۔ لیکن یہ اتصال جسمانی نوعیت کا ذات کے ساتھ نہیں ہوتا، جیسا کہ جہلا سمجھتے ہیں کہ قطرے کس طرح سمندر میں مل گیا۔ حق تعالیٰ کی شان میں ایسا اعتقاد کفر ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

اتصالے بے تکلیف بے قیاس ۔۔۔ ہست رب الناس وا با جان ناس

اور جو کسی شعر وغیرہ میں ایسے (جسمانی اتصال کے موہم) الفاظ موجود ہوں وہ قابل تاویل ہیں۔

"قشریہ میں مذکور ہے کہ ابن شاہین نے جنید رحمۃ اللہ سے معیت کے معنی پوچھے تو فرمایا کہ دو معنی ہیں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ تو باعتبار نصرت و حفاظت کے معیت ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا انا معکما الخ اور عوام کے ساتھ علم و اطاعت کے اعتبار سے جیسے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مایکون من نجویٰ ثلثۃ الا ہو رابعہم "۔ یہ سن کر ابن شاہین نے کہا کہ آپ ہی جیسا آدمی امت کو اللہ تعالیٰ کی راہ بتلانے کا اہل ہے۔ غرض بعد انقطاع خلق خوف و رجا انس و ہیبت وغیرہ کا جو مقام بھی حاصل ہو سب وصال ہے"۔

قرب: قرب و بعد سے متعلق ارشاد ہے کہ "قرب الٰہی کی تین قسمیں ہیں ایک عام و ضروری وہ قرب علم و قدرت کا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سب کو جانتے اور سب پر قادر ہیں۔ دوسرا قرب ممکن و خاص ہے وہ فضل و لطف کا قرب ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں اپنے لطف و فضل کا مورد بنا دیں تیسرا قرب محال ہے وہ ذات کا ذات سے مل جانا ہے۔ ہر قرب کے مقابلے میں بعد کے جدا معنی ہوں گے۔

لطائف ستہ: یہ ہیں نفس قلب روح سر خفی اخفی ان کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ ان کے جوہر و عرض مادی و مجرد، واحد و متعدد ہونے اور تعیین مقامات میں اہل طریق کا اختلاف ہے۔
"اصل یہ ہے کہ جس کو جس طرح کشف ہوا اسی طرح فرمایا۔ قابل بیان صرف اس قدر ہے کہ نفس کی اصل غذا غفلت ہے، اس مرتبہ میں اس کو امارہ کہتے ہیں، اور جب شہوات کی مدافعت کرنے لگے گو ہنوز پورا سکون نہ ہوا تو لوامہ کہلاتا ہے، اور جب بالکل قرار ہو جائے مطمئنہ کہتے ہیں۔
"غرض آمارگی کے مرتبہ میں اس کی غذا (یعنی شہوات) کی تقلیل میں کوشش کرے۔ اور غذا قلب کے ذکر ہے، روح کی حضوری، سر کی مکاشفہ، خفی کی شہود و فنا اور اخفی کی فناء الفناء بعض نے اس میں بھی کسی قدر اختلاف کیا ہے۔ ہر کسے را اصطلاح وادہ ایم

شطح: "بے اختیاری میں کسی غلبہ وارد کی وجہ سے ظاہری قواعد کے خلاف جو بات کسی (مغلوب) کے منہ سے نکل جائے وہ شطح ہے جو اس شخص پر تو گناہ نہیں"۔ لیکن جاہل و نقال بغیر غلبہ وارد کے اس کی جو نقالی "و تقلید کرنے لگتے ہیں وہ جائز نہیں"۔

تمثل: "ایک بڑی اصطلاح تمثل کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ
"کوئی ذات اپنی اصلی حالت و صفت پر باقی رہ کر کسی دوسری صورت میں ظہور کرے۔
اس دوسری صورت کو صورت مثالی کہیں گے، جیسے جبریل علیہ السلام صورت بشریہ میں متمثل ہوتے تھے۔ یہ نہ تھا کہ فرشتہ سے آدمی بن گئے ورنہ تمثل نہ ہوتا استحالہ و انقلاب ہوتا۔ اسی طرح خواب و مکاشفات میں حق تعالیٰ کو مثالی صورت میں دیکھ سکتے ہیں۔ موسیٰؑ نے اس مثالی تجلی سے نور الٰہی کو دیکھا تھا، ورنہ طالب دیدار کیوں ہوتے۔ پس اللہ تعالیٰ مثل سے تو پاک ہیں، لیکن مثال خود ہی اپنے نور کی بیان فرمائی ہے۔ جن دو چیزوں میں کچھ صفات مشترک ہوں ایک کو دوسری کی مثال کہتے ہیں مثلاً حسین آدمی کو چاند سے تشبیہ دیں تو وہ آدمی چاند نہیں ہو گیا، البتہ صفت حسن میں اشتراک کی وجہ سے چاند کو آدمی کی مثال کہیں گے، اور اس کی شناخت سے حسن انسانی کی کسی قدر شناخت ہو جائے گی گو کامل شناخت نہ ہو۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لو، اس میں غور نہ کرنے سے کفر و الحاد لازم آ جاتا ہے"۔

اس کے بعد صوفیہ کے مختلف چودا خانوادوں چشتیہ و نقشبندیہ وغیرہ کا پھر اولیاء کے مختلف اقسام اقطاب و ابدال وغیرہ کا ذکر ہے نیز جواہر غیبی سے کچھ وہ اصطلاحات بھی نقل فرمادی گئی ہیں جو فارسی کلام میں کثرت سے مستعمل ہیں" اور جن کے نہ جاننے سے دیکھنے والا کچھ سے کچھ سمجھ جاتا ہے۔ مثلاً

فارسی اصطلاحات: "پیر مغاں" پیر خرابات، خمار و بادہ فروش مرشد کو کہتے ہیں۔ ترسا اس مرد روحانی کو کہتے ہیں جو صفات ذمیمہ و نفس امارہ سے خلاص پا کر صفات حمیدہ سے موصوف ہو چکا ہو۔ زنار علامت یک رنگی کو کہتے ہیں۔ دلبر و محبوب و صنم و دوست سے مراد تجلی صفات ہوتی ہے۔ غزوہ بوسہ جذبہ باطن کا نام ہے۔ چشم و ابرو کلام و الہام غیبی کا۔ ساقی و مطرب فیض رساں ہے۔ قلندر و قلاش کے معنی اہل صفا و اہل ترک یا اہل فنا کے ہیں۔ بت و شاہد معانی و مقصود کو کہتے ہیں۔ چلیپا عالم طبائع کو۔ دیر عالم انسان کو۔ اور کلیسا عالم حیوانی کو کہتے ہیں۔ طامات معارف کا نام ہے۔ جور سے مراد سالک کو سلوک عروج سے روک دینا۔ خشم سے مراد صفات قہر کا ظہور ہوتا ہے۔ غمگساری سے صفت

رحمانی کا۔ زلف غیب ہویت کو کہتے ہیں۔ وصل اس نسیان خودی سے عبارت ہے جو وجود حق کے نور کے مشاہدہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اتحاد ہستی حق میں استغراق کا نام ہے"۔
وقس علیٰ ہذا

مسائل فرعیہ: ساتواں باب مسائل فرعیہ کا ہے، ان میں سے چند تجدیدی رنگ کی چیزیں نقل کی جاتی ہیں مثلاً

"کشف والہام سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ ظنی ہوتا ہے۔ اگر قواعد شرعیہ کے موافق ہو تو قابل عمل ورنہ قابل رد ہوگا۔ خوارق ولایت کے لئے ضروری نہیں، بعض صحابہ سے عمر بھر میں ایک خرق بھی واقع نہیں ہوا، حالانکہ وہ سب اولیاء سے افضل ہیں۔ فضیلت کا مدار قرب الٰہی و اخلاص عبادت پر ہے۔ خوارق دراصل ریاضت کا ثمرہ ہیں، اور جوگیوں سے بھی سرزد ہوتے ہیں۔ صاحب عوارف نے تو غیر اہل خوارق کو اہل خوارق سے افضل کہا ہے۔ عارف کی بڑی کرامت یہ ہے کہ شریعت پر مستقیم ہو اور بڑا کشف یہ ہے کہ طالبان حق کی استعداد معلوم کر کے ان کی تربیت کرے۔ شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ بعضے اہل کرامت نے مرنے کے وقت تمنا کی کہ کاش ہم سے کوئی کرامت ظاہر نہ ہوتی"۔

ان لوگوں نے یہ بھی سن لیا جن کے نزدیک بزرگی و ولایت نام ہی ہے کشف و کرامات کا! حیدر آباد میں ایک اچھے پڑھے لکھے خوش عقیدہ بڑے عہدے دار ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ اب تو کوئی بزرگ نہیں رہ گیا۔ میں نے پوچھا کیسے معلوم ہوا کہا کہ فلاں جگہ سے میرا کوئی تبادلہ نہیں کرا پاتا! بزرگوں کی طلب بھی جب دنیا ہی کے لئے ہو، تو بزرگ مل چکے!
"رہا یہ شبہ کہ پھر اولیاء کا ہونا کیسے معلوم ہو"؟ اس کا جواب یہ ہے کہ

ولی کی پہچان: "اول تو ولایت ایک امر مخفی ہے، اس کے معلوم کرنے کی ضرورت ہی کیا۔ اور اگر معلوم کرنے سے یہ مقصود ہے کہ ہم ان سے مستفید ہوں تو ان کی صحبت و

تعلیم سے شرف حاصل کرو، جب اپنی حالت روز بروز متغیر پاؤ گے خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ یہ شخص صاحب تاثیر ہے"۔

اور اصل ضرورت ایسے ہی صاحب تاثیر شیخ و معلم یا پیر کی تلاش کی ہے۔ کیونکہ کمال باطنی کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور عادۃ اللہ ہر کمال کی طرح اس میں یہی ہے، کہ استاد یا پیر کے توسل کے بغیر حاصل نہیں ہوتا"۔ اس لئے پیر کا تلاش کرنا ضروری ٹھہرا۔

پیر کی تلاش۔ "طریقہ اس کا یہ ہے کہ اکثر درویشوں سے جن پر کمال کا احتمال ہو ملتا رہے، اور کسی کی عیب جوئی نہ کرے نہ انکار میں عجلت کرے مگر جلدی سے مرید بھی نہ ہو جائے۔ اول یہ دیکھے کہ شریعت پر مستقیم ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے اس سے علیحدہ ہو جائے گو خوارق وغیرہ بھی اس سے صادر ہوتے ہوں۔ حق تعالیٰ کا حکم کہ لا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا واتبع ہواہ وکان امرہ فرطا۔ اسی طرح ولا تطع منھم اثما او کفورا۔ اگر شرع کا پابند ہے تو خود اس کا نیک و ولی ہونا تو ثابت ہو گیا۔ مگر اس شخص کو تو ضرورت تربیت و تکمیل کی ہے۔ اس لئے ابھی بیعت نہ کرے بلکہ یہ بھی دیکھے کہ اس کی صحبت سے قلب میں کچھ اثر (یعنی اللہ تعالیٰ سے محبت اور دنیا و معاصی سے نفرت) پیدا ہوتی ہے، کیونکہ حدیث شریف میں اولیاء اللہ کی یہی علامت ہے کہ ان کے دیکھنے سے اللہ یاد آتا ہے (اذا راؤا ذکر و اللہ) لیکن اکثر عوام کے لئے تھوڑی صحبت میں اس کا اثر محسوس کرنا دشوار ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے مریدوں میں سے جن کو عاقل و راست گو دیکھے اس سے شیخ کی تاثیر کا حال دریافت کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فاسئلو اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون اور حدیث میں ہے انما شفاء العی السوال یعنی جہل کی دوا سوال و دریافت کرنا ہے۔ اگر کوئی معتبر آدمی شہادت دے اس کا اعتبار کرے اور بہت سے آدمی شہادت دیں تو زیادہ اطمینان کی بات۔ البتہ گواہی دینے والے قرائن سے سچ معلوم ہوتے ہوں۔ مریدان می پرانند نہ ہوں۔ بس اس اطمینان کے بعد بیعت ہو جائے اور پیر کے ارشاد کے موافق عمل در آمد کرے"۔

ایک ضروری بات۔ اس سلسلہ میں ایک اور بہت ضروری بات یہ ہے کہ اول تو لوگ

تعلیم و تربیت کی غرض سے مرید ہی شاذ و نادر ہوتے ہیں اور اگر بیعت کی اس صحیح غرض کو سمجھ کر بھی مرید ہو، لیکن کسی وجہ سے اس کو پیر سے اصلاح باطن کا نفع نہ حاصل ہو رہا ہو تو بھی اس کے دامن کو چھوڑنا وہ اس راہ کے ادب کے خلاف جانتا بلکہ اس میں ضرر سے ڈرتا ہے۔ حالانکہ یہ معاملہ بھی علاج ہی کا سا ہے۔ اگر معتدبہ مدت تک کسی طبیب کے علاج سے نفع نہ ہو، تو جس طرح معالج جسمانی کے بدل لینے میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ اگر مقصود ازالہ مرض ہے تو ضرور بدل لینا چاہئے۔ اس طرح معالج روحانی کو بھی ایسی صورت میں ضرور بدل لینا چاہئے کیونکہ مقصود خدا تعالیٰ ہے نہ کہ شیخ یا پیر البتہ "شیخ اول سے بے اعتقاد نہ ہو، ممکن ہے کہ خود کامل و مکمل ہو، مگر اس کا حصہ وہاں نہ تھا"۔

"اسی طرح اگر شیخ کا انتقال قبل حصول مقصود کے ہو جائے یا ملاقات کی امید نہ رہے جب بھی دوسری جگہ تلاش کرے اور یہ خیال نہ کرے کہ قبر سے فیض لینا کافی ہے۔ کیونکہ قبر سے تعلیم کا فیض نہیں ہوتا۔ البتہ صاحب نسبت کو احوال کی ترقی ہو سکتی ہے۔ سو یہ شخص تو ابھی محتاج تعلیم ہی ہے۔ ورنہ کسی کو بھی بیعت کی ضرورت نہ ہوتی لاکھوں قبریں کاملین بلکہ انبیاء کی موجود ہیں"۔

"اور اگر شیخ کی صحبت سے قلب میں کچھ تاثیر معلوم ہو تو اس کی صحبت کو غنیمت سمجھے، اس کی پوری پوری اطاعت کرے اس کو خوش رکھے۔ کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اس کے تکدر کا باعث ہو کہ اس سے فیوض بند ہو جاتے ہیں۔ سورۂ حجرات کی ابتدائی آیتوں میں آداب نبویہ بتلائے گئے ہیں شیخ چونکہ نبی کا خلیفہ ہے، اس لئے اس کی صحبت و آداب کا بھی وہی حکم ہے"۔

حل اشکال: ایک اشکال اور اس کا حل ملاحظہ ہو۔

"مشہور ہے کہ اپنے پیر کو سب سے افضل سمجھے۔ ظاہراً اس میں اشکال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وفوق کل ذی علم علیم۔ لہٰذا اگر سُکرِ محبت میں ایسا سمجھا تو معذور ہے اور اگر غلبہ سکر نہیں تو اتنا سمجھے کہ میری تلاش

سے زندہ لوگوں میں اس سے زیادہ نفع پہنچانے والا مجھ کو نہیں مل سکتا ہٰکذا قال سیدی و سندی و مرشدی و شیخی الحاج الحافظ محمد امداد اللہ دامت برکاتہم"۔

شیخ پر اعتراض: نیز "شیخ سے احیاناً کوئی فعل قابل اعتراض سرزد ہو جائے تو اعتراض نہ کرے۔ حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کا قصہ یاد کر کے تاویل کرے یا سمجھ لے کہ اولیاء معصوم نہیں ہوتے اور توبہ سے سب معاف ہو جاتا ہے۔ مگر یہ جب کہ اتفاقاً کوئی ایسا فعل ہو جائے۔ اور اگر فسق و فجور کو عادت بنا رکھا ہو تو اس سے علیحدگی اختیار کر لے"۔

افراط و غلو: "جس طرح اولیاء کے آداب میں تقصیر ممنوع ہے، اسی طرح افراط و غلو اور بھی بدتر ہے، کہ اس سے اللہ و رسول کی شان میں تفریط ہوتی ہے۔ مثلاً ان کو عالم الغیب سمجھنا کہ اس سے کفر لازم آتا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ لایعلم من فی السمٰوات والارض الغیب الا اللہ ا۔ یا ان کو کسی چیز کے موجود معدوم کرنے پر یا اولاد و رزق وغیرہ دینے پر یا زبردستی خدا سے دلا دینے پر قادر سمجھنا یہ بھی کفر ہے۔ قال اللہ تعالیٰ قل لااملک لنفسی نفعاً ولا ضراً الا ماشاء اللہ ا۔ یا ان کے ساتھ عبادت کے طریقوں میں سے کوئی طریق برتنا مثلاً ان کی منت ماننا، ان کی قبر کا طواف کرنا، یا ان سے دعا مانگنا، یا ان کے نام کو عبادت کے طور پر جپنا یہ سب باتیں بعض معصیت بعض بدعت اور بعض کفر و شرک ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ ایاک نعبد و ایاک نستعین ۔ وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طواف البیت صلوٰۃ وقال الدعاء ہو العبادۃ ونحوا لک ۲۔"

ا۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ اللہ کے سوا زمین و آسمان میں غیب کو کوئی بھی نہیں جانتا۔

ا۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ کہہ دو (اے پیغمبر) کہ میں نہیں مالک ہوں خود اپنے نفس کے لئے کسی نفع و ضرر کا۔ مگر جو اللہ چاہے

۲۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہم صرف تجھی کو پوجتے اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ خانہ کعبہ کا طواف عبادت ہے اور فرمایا کہ دعا عبادت ہے وغیرہ۔ وغیرہ۔

یادرکھنے کی باتیں: یہ باتیں بھی یاد رکھنے کی ہیں کہ

"ولی کبھی نبی کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ نہ اس کو عبادت کبھی معاف ہو سکتی ہے۔ بلکہ خواص کو زیادہ عبادت کا حکم ہے۔ البتہ مجذوب مسلوب الحواس ہوتا ہے، اس لئے معذور ہے۔ نہ ولی معصوم ہوتا ہے نہ صحابہ کے مرتبے کو پہنچ سکتا ہے"۔

نیز "ان کی اونچی اونچی قبریں بنانا ان پر گنبد بنانا عرس میں دھوم دھام کرنا روشنی کرنا، جیسا آج کل رائج ہے۔ زندہ یا مردہ کو سجدہ کرنا یہ سب باتیں منع ہیں۔ البتہ زیارت کرنا اور ایصال ثواب کرنا اور صاحب نسبت ہو تو ان سے فیوض حاصل کرنا یہ سب اچھی باتیں ہیں"۔

پیر کو ہدایات: "فارغ نہ بیٹھ جائے کمالات میں ترقی کرتا رہے۔ قل رب زدنی علما۔ کمال کا دعویٰ نہ کرے لاتزکوا انفسکم البتہ اظہار نعمت میں مضائقہ نہیں۔ واما بنعمۃ ربک فحدث افشائے طریق پر حریص ہو حریص علیکم۔ مریدوں کے ساتھ شفقت و رحمت سے رہے دنیاداروں کی خاطر سے ان کو علیحدہ نہ کرے ولاتطرد الذین یدعون ربھم الی قولہ فتکون من الظالمین۔ مرید سے دنیا کا طالب نہ ہو لا اسئلکم علیہ اجرا۔ متانت و وقار سے رہے ورنہ مریدوں کی نظر میں بے وقعتی ہونے سے ان کو فیض نہ ہو گا کما وروی قولہ علیہ السلام من یراہ من بعید ھابہ و من یراہ من قریب احبہ۔ ایک مرید کو دوسرے پر ترجیح نہ دے لقولہ تعالیٰ عبس وتولی۔ البتہ اگر ایک کو خدا کی طلب زیادہ ہو ترجیح دینے میں مضائقہ نہیں۔ اور ایسی حرکت نہ کرے جس سے خلقت کو بداعتقادی ہو کہ اس سے طریق ارشاد مسدود ہو جاتا ہے (باب اول سے یہاں تک کے مضامین قاضی ثناء اللہ صاحب کی ارشاد الطالبین سے ماخوذ ہیں)

تصور شیخ: ایک اور غایت احتیاط کا مسئلہ تصور شیخ کا ہے۔ اس کی نسبت ارشاد ہے کہ

"اس کے یہ معنی تو آج تک کسی محقق نے نہیں فرمائے کہ خدا تعالیٰ کو

پیر کی شکل میں سمجھے، یہ محض باطل ہے اور اگر ان اللہ خلق آدم علی صورتہ
سے دھوکا ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ صورت ناک منہ ہی کو نہیں کہتے۔
مثلاً بولتے ہیں کہ اس مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ حالانکہ "مسئلہ کی ناک منہ
نہیں۔ بلکہ صورت کے معنی صفت کے بھی آتے ہیں، تو انسان کو آخر سمع
بصر وغیرہ کی صفات عنایت ہوئی ہیں، اس لئے اس کو صورت حق کہا گیا۔
فن کی کتابوں میں اس قدر مذکور ہے کہ شیخ کی صورت اور اس کے کمالات
کے زیادہ تصور کرنے سے اس سے محبت پیدا ہو جاتی اور نسبت قوی ہوتی
ہے۔ اور بعض محققین نے تصور شیخ میں صرف یہ فائدہ فرمایا ہے کہ اس سے
یکسوئی میسر ہوتی اور خطرات رفع ہوتے ہیں۔

"بہرحال اس میں جو حکمت و فائدہ بھی ہو راقم کا تجربہ ہے کہ یہ شغل
خواص کو تو مفید ہے اور عوام کو سخت مضر کہ صورت پرستی تک نوبت آجاتی
ہے۔ اسی واسطے امام غزالی" وغیرہ محققین نے عوام و اغبیاء کو ایسے اشغال
کی تعلیم سے منع فرمایا ہے، جس سے کشف وغیرہ ہوتا ہو۔ لہٰذا عوام کو تو اس
سے بچانا چاہئے۔ خواص بھی کریں تو احتیاط کو ملحوظ رکھیں کہ اس کو حاضر و
ناظر یا ہر وقت اپنا معین و دستگیر نہ سمجھ لیں کیونکہ کثرت تصور سے کبھی
صورت مثالیہ حاضر ہو جاتی ہے۔ جو کبھی تو محض خیال ہوتا ہے اور کبھی کوئی
لطیفہ غیبی اس شکل میں متمثل ہو جاتا ہے، اور شیخ کو اکثر خبر تک نہیں
ہوتی۔ اس مقام پر اکثر ناواقفوں کو لغزش ہو جاتی ہے"۔

ایک اور شدید فتنہ: کی صورت اکثر مشائخ نے یہ اختیار کر رکھی ہے کہ مرید عورتوں
سے پردہ نہیں کراتے اپنے سامنے لاتے ہیں۔ حالانکہ بیعت تک کی بے پردگی کے ساتھ یا
ہاتھ میں ہاتھ تک لے کر اجازت نہیں۔ خود اکابر مشائخ نے لکھا ہے کہ اجنبی عورتوں کو
پردہ سے یا محارم کی وکالت کے ذریعہ بیعت کرانا چاہئے۔ اس کی نسبت بھی ارشاد ہے کہ

"عورتوں کو دست بدست بیعت نہ کرنا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے کبھی کسی عورت کو بیعت میں ہاتھ نہیں لگایا۔ اجنبی عورت کو ہاتھ لگانا

حرام ہے۔ محبوب السالکین میں ہے کہ عورت اگر موجود نہ ہو تو محارم نسبی یا رضاعی میں سے کسی کو وکیل بنا کر بیعت کرے اور موجود ہو تو پردہ سے بیعت کرے"۔

سماع کا فتنہ: اسی طرح ایک دوسرا فتنہ سماع کا ہے، جو رائج الوقت تصوف کا گویا لازمہ بن گیا ہے اولاً تو اس کے جواز ہی میں کلام ہے۔ اور مفاسد شناس محققین نے جائز نہیں رکھا لیکن اکابر میں جن بزرگوں نے جائز بھی رکھا ہے، تو جواز کی شرائط ایسی کڑی رکھی ہیں کہ ہزاروں میں ایک کا بھی ان پر عمل نہیں چنانچہ زماں و مکاں و خوان کی مشہور شرائط کے علاوہ حضرت سلطان المشائخ جن کی سماع میں اکثر لوگ سند پکڑتے ہیں، فوائد الفوائد میں فرماتے ہیں کہ

> "سماع وہ حلال ہے، کہ مسمع (سنانے والا) عورت یا کم عمر (امرد) نہ ہو بلکہ پورا مرد ہو۔ مسموع (یعنی جو چیز سنی جارہی ہو وہ) ہزل و فحش نہ ہو اور مستمع (سننے والا) حق تعالیٰ کی یاد سے لبریز ہو۔ اور چنگ ورباب وغیرہ مزامیر قطعاً نہ ہوں"۔

حضرت سلطان جی کے اس قول کو نقل فرما کر حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ

> "ان شرائط سے بھی قطع نظر کر لی جائے تب بھی سمجھنا چاہئے کہ سماع میں ایک خاص اثر یہ ہے کہ جو کیفیت کسی پر غالب ہوتی ہے، اس کو اور قوت دیتا ہے اس زمانہ میں چونکہ اکثر نفوس میں خبث اور غیر اللہ کی محبت غالب ہے اس لئے سماع سے لازماً اسی کو اور قوت ہوگی۔ پھر جب غیر اللہ کی محبت حرام ہے تو اس کے سبب کو کیا فرمائے گا"۔

استغراق کمال نہیں: ایک اور کیسی عجیب غلط فہمی اچھے اچھوں کو یہ ہے کہ بعضے بزرگوں میں استغراق یا غلبہ حال کا جو رنگ ہوتا ہے اس کو زیادہ کمال خیال کیا جاتا ہے کہ ایسے باکمال ہیں کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر ہی نہیں رکھتے حالانکہ یہ رنگ نہ صرف سنت کے

خلاف، بلکہ خود حضرات صوفیہ کے نزدیک کمال سے فروتر ہے۔ جیسا کہ حضرت نے خواجہ عبید اللہ احرار کا قول نقل فرمایا ہے کہ

"استغراق میں ترقی رک جاتی ہے کیونکہ ترقی دوام عمل سے ہوتی ہے، اور استغراق میں عمل کا انقطاع ہو جاتا ہے" ۔ یہی نہیں بلکہ غلبہ حال میں بعض دفعہ خلاف شرع کلمات تک منہ سے نکل جاتے ہیں، گو مغلوب معذور ہوتا ہے، لیکن دوسروں کو بہت احتیاط لازم ہے۔ شارح گلشن راز فرماتے ہیں کہ محض اہل کمال کی تقلید سے بدون غلبہ کے خلاف شریعت کلمات منہ سے نکال کر کافر مت بنو۔

ترا اگر نیست احوال و مواجید   مشو کافر بنادانی بہ تقلید

"اور مرج البحرین میں ہے کہ اگر سکر و غلبہ حال میں صوفی کے منہ سے کچھ نکل جائے تو اس پر اعتراض نہ کرو نہ اس کی تقلید کرو" ۔ (حضرت اپنی شان اصلاح و تجدید کے مناسب مزید تنبیہ یہ فرماتے ہیں کہ) "مطلب یہ ہے کہ ایسے شخص پر اعتراض نہ کرو۔ باقی ایسی بات تو ضرور قابل اعتراض ہے۔ خصوصاً جب کہ عوام کو مضر ہو اس وقت تو اس کی غلطی کا ظاہر کر دینا واجب ہے"۔

باطن قرآن کا اشد فتنہ: جاہلانہ تصوف کے ان سب فتنوں اور گمراہیوں سے اشد ظاہر قرآن و حدیث کو چھوڑ کر ایسے "باطنی" معنی نکالنا ہے، جو اکثر تحریف بلکہ کفر و الحاد تک پہنچا دیتے ہیں۔ حدود کا لحاظ رکھ کر اس کی اصلاح یوں فرمائی گئی ہے کہ

"قرآن و حدیث کے ظاہر معنی کا انکار تو کفر ہے۔ البتہ ظاہر کو تسلیم کر کے باطن کی طرف عبور کرنا محققین کا مسلک ہے۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ جس گھر میں کتا ہو فرشتے نہیں آتے۔ اہل ظاہر نے تو کتا پالنے کو برا سمجھا مگر دل میں صفات کلبیہ کو ہمیشہ جمع رکھا۔ ان میں ایمان موجود ہے مر کر جنت مل جائے گی۔ ان کے برخلاف منکرین ظاہر نے کتا پالنے کی اجازت

دے دی اور کہا مولوی حدیث کا مطلب ہی نہیں سمجھے گھر سے مراد قلب ہے
اور فرشتوں سے انوار غیبیہ اور کتے سے مراد درندگی وغیرہ کے صفات۔
یہ لوگ شرع کا انکار کر کے سرے سے کافر و مستحق جہنم بن گئے"۔
"محققین نے کہا کہ مطلب تو حدیث کا وہی ہے، جو اہل ظاہر سمجھے۔ مگر
غور کرنا چاہئے کہ ملائکہ کو کتے سے کیوں نفرت ہے صرف اس کے صفات
ذمیمہ سبعیت و نجاست حرص و غضب وغیرہ کی وجہ سے تو پھر جب ان
مذموم صفات کی بناء پر ظاہری گھر میں کتا رکھنا جائز نہیں تو باطنی گھر
(قلب) میں خود ان صفات کا رکھنا کیسے جائز ہو گا"۔
اس طرح "محقق نے ظاہری کتا پالنے کو بھی حرام کہا کیونکہ وہ مدلول
مطابقی ہے اور باطن کے اس کے صفات مذمومہ کے ساتھ متصف ہونے کو
بھی حرام کہا کیونکہ وہ مدلول التزامی ہے"۔

اصلاح اغلاط۔ ان کے علاوہ تصوف کے نام سے اور جو طرح طرح غلطیاں اور گمراہیاں مسلمانوں اور خصوصاً نام نہاد صوفیوں اور درویشوں میں گھس گئی ہیں، یوں تو وہ بے شمار ہیں لیکن جن میں آج کل لوگ زیادہ مبتلا ہیں "اصلاح اغلاط" کے عنوان سے آٹھویں باب میں ان پر بھی متنبہ فرمایا گیا ہے۔ ایک ام الاغلاط یہ ہے کہ طریقت کو شریعت سے کوئی جداگانہ بلکہ معاذ اللہ مافوق حقیقت قرار دے کر "فقیری میں اتباع شریعت کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی"۔ اس گمراہی کی تردید میں خود بہت سے اساطین صوفیہ کے اقوال نقل فرمائے گئے ہیں مثلاً

اتباع شریعت۔ حضرت شیخ اکبر کی فتوحات میں ہے کہ "جو حقیقت
شریعت کے خلاف ہو وہ زندقہ اور مردود ہے۔ اور اللہ کی طرف ہمارے
لئے اس کی شریعت کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ پس جو شخص شریعت کے
خلاف کسی راہ کا قائل ہو وہ جھوٹا ہے۔ حضرت بایزید" فرماتے ہیں کہ اگر تم
کسی کو کرامات والا دیکھو حتیٰ کہ ہوا میں اڑتا ہو تو دھوکے میں نہ آ جانا جب

تک یہ نہ دیکھو کہ امر و نہی حفظ حدود اور پابندی شریعت میں کیسا ہے۔
حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ مخلوق پر سب راہیں بند ہیں سوا اس کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بقدم چلے"۔

اسی طرح حضرت خواجہ اجمیریؒ اور حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ وغیرہ بڑے بڑے مسلم بزرگوں سے ایسے صاف و صریح بے شمار اقوال منقول ہیں "جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فقر میں اول علم شریعت اور پھر عمل شریعت کے بدوں آگے راستہ نہیں کھلتا۔ اور کبھی کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر کے اور طریق بدعت کو اختیار کر کے ولی نہیں ہو سکتا۔ جب بدعت قاطع طریق ہے تو کفر و شرک کا پوچھنا ہی کیا"۔

ایک اور عام و عامیانہ شبہہ: کا ازالہ اس طرح فرمایا گیا ہے کہ

"علم حقیقت اگر شریعت کے خلاف نہیں تو بزرگوں نے اسرار کو کیوں پوشیدہ رکھا تو اس کو اچھی طرح سمجھ لو کہ ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ علم شریعت ہی کو علم حقیقت کہتے ہیں بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ علم حقیقت علم شریعت کے خلاف نہیں۔ یعنی ایسا نہیں کہ شریعت نے ایک چیز کو حرام یا کفر کہا ہو اور حقیقت کی رو سے وہ حلال یا ایمان ہو۔ مثلاً دیوانی کا قانون اور ہے فوجداری کا اور مگر یہ نہیں کہ جو چیز ایک میں ناجائز ہو وہ دوسری میں جائز ہو جائے البتہ ہر ایک کے مضامین جداگانہ ہیں سو یوں تو شریعت میں بھی مختلف مضامین ہیں اور خود حقیقت میں بھی"۔

اخفائے اسرار کی وجہ: "اب یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ پوشیدہ رکھنے کی کیا وجہ ہے۔ قابل اخفا تین امر ہوتے ہیں ایک اسرار سو امام غزالی نے اس کی کئی وجوہ بیان فرمائی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ وہ مضامین خلاف شرع تو نہیں ہوتے مگر دقیق ہوتے ہیں، جو عوام کی فہم میں نہیں آسکتے اور ان کو مضر ہوتے ہیں۔ دوسرے تعلیم سلوک کے طریقے، ان میں اخفا کی وجہ یہ ہے کہ اعلان سے ان کی بے قدری اور طالب کے ہوسناکی کا احتمال ہے۔ تیسرے

ثمرات مجاہدہ و مکاشفات وغیرہ ہیں۔ ان کا اخفار یا و دعویٰ کے احتمال سے کیا جاتا ہے۔ غرض کسی امر کا اخفا اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ خلاف شرع ہے۔ اور اگر وہ ایسا ہو تو وہ قابل رد و انکار ہے۔

باقی "اگر کسی بزرگ کا کوئی قول و فعل خلاف سنت منقول ہے، تو وہ یا تو سکر و غلبہ حال کا ہے یا وہ حکایت ہی غلط ہے یا کسی باریک مسئلہ میں جہاں دلیل شرعی خفی و دقیق تھی ان سے خطائے اجتہادی ہو گئی جس کی وجہ سے وہ شرعاً مجبور ہیں اور خدا تعالیٰ سے ان کو بعد نہیں ہوا"۔

"یہاں سے معلوم ہوا کہ خلاف شرع کوئی کام مثل طواف قبر و سجدہ مشائخ وغیرہ جن کا ذکر ابھی باب مسائل میں آ چکا درست نہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ شیخ کی اطاعت جب ہی تک ہے کہ وہ اللہ و رسول کے خلاف نہ کہے ورنہ اس شیخ ہی کو سلام۔ حضرت نوریؒ فرماتے ہیں کہ جس کو دیکھو کہ اللہ کے ساتھ کسی ایسی حالت کا دعویٰ کرتا ہے، جو اس کو حد شرعی سے باہر کر دیتا ہے، تو اس کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ اور شیخ سعد الدینؒ فرماتے ہیں کہ اگر نادانی سے کسی جاہل یا بدعتی کا مرید ہو جائے تو پھر کسی شیخ حق سے تجدید بیعت کرے تاکہ گمراہ نہ ہو"۔

ایک بہت بڑا نفسانی مفسدہ: بےاحتیاط بلکہ نفس پرست پیروں میں عورتوں اور بے ریش لڑکوں سے مخالطت یا میل جول کا مرض پھیل گیا ہے، اس کی آفات ظاہر ہیں اور یہ مرض نیا نہیں پرانا ہے۔ چنانچہ حضرت یوسف بن حسین فرماتے ہیں کہ

"میں نے دیکھا کہ نوعمروں اور ناجنسوں سے میل و جول اور عورتوں کے ساتھ رفق و ملاطفت یہ صوفیوں کے آفات ہیں۔ حضرت شیخ نصیر آبادی سے کسی نے کہا کہ لوگ عورتوں کے پاس بیٹھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے دیکھنے میں ہماری نیت پاک ہے"۔

عجیب بات ہے کہ ابھی حال ہی میں بعینہٖ یہی فقرہ ایک عزیز نے دہرایا، جب میں نے

ان کو ایسے موقع پر ٹوکا، خیر وہ تو دنیادار تھے، اور بعض صوفیہ تو

"غضب یہ ہے کہ اس کو قرب الٰہی سمجھتے ہیں۔ خدا کی پناہ اگر معصیت ذریعہ قرب ہو تو سارے رنڈی بھڑوے کامل ولی ہوا کریں اور یہ جو مشہور ہے کہ بدون عشق مجازی کے عشق حقیقی نہیں ہوتا تو اول تو یہ کوئی کلیہ نہیں، دوسرے یہ عشق حلال و جائز موقع پر بھی ہو سکتا ہے۔ نکتہ صرف یہ ہے کہ عشق مجازی سے قلب کے متفرق تعلقات منقطع ہو کر یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے، جس کے بعد صرف اس ایک بلا کو دفع کرنا رہ جاتا ہے، جس کے دفع ہوتے ہی کام بن جاتا ہے۔ سو یہ غرض تو اولاد بی بی گائے بھینس ہر چیز کے ساتھ زیادہ محبت کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ غیر عورت یا امرد کی کیا تخصیص۔

"اور اگر اتفاقاً بلا اختیار کہیں دل پھنس ہی گیا، تو اس وقت مجازی سے حقیقی حاصل ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ محبّ و محبوب میں دوری ہو ورنہ وصل و قرب میں تمام عمر اس میں مبتلا رہے گا۔ اسی کو مولانا جامی فرماتے ہیں۔

ولے باید کہ در صوت نمائی   وزیں پل زود خود را بگذرائی

بلکہ اگر اس پل سے جلد گزر نہ گیا اور وصل کے ساتھ ہوس نکل گئی تو حقیقی کیا حاصل ہو گا مجازی کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بس دوکانداروں اور ہوسناکوں نے حظوظ نفسانیہ اور لذات شہوانیہ حاصل کرنے کے لئے بزرگوں کے اقوال کو آڑ بنا رکھا ہے۔

ایک اور آفت زبان اور پیٹ کی ہے یعنی۔

"زبان سے جو کلمہ چاہتے ہیں بیباکی سے نکال دیتے ہیں خواہ اس سے کفر ہو جائے یا حق تعالیٰ کی جناب میں بےادبی و گستاخی۔ خصوصاً وحدۃ الوجود کے دعوے میں تو زبان کو لگام ہی نہیں کہیں خدا کو بندہ بنا دیا کہیں بندہ کو خدا ٹھہرا دیا۔ حالانکہ اس مسئلہ کی جو غرض تھی کہ غیر اللہ کو دل سے نکال دیا جائے اس کی ہوا بھی نہیں لگتی تو زبانی جمع خرچ سے کیا ہوتا ہے۔"

از ساحت دل غبار کثرت رفتن   خوشتر کہ بہرزہ درد حدت سفتن
مغرور مشو کہ توحید خدا   واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

"اور پیٹ کی بے احتیاطی یہ کہ حلال حرام کی کچھ پرواہ نہیں کرتے سود خوار زن بازاری وغیرہ جو بھی ہو سب کی دعوت و نذرانہ قبول۔ حالانکہ بزرگوں نے صاف فرما دیا ہے کہ بدوں اکل حلال انوار الٰہی نصیب نہیں ہوتے"۔

ایک کافرانہ غلطی: "ایک غلطی یہ ہے کہ بعض کا اعتقاد ہے کہ فقیری میں کوئی ایسا درجہ ہے کہ وہاں پہنچ کر شرعی احکام معاف ہو جاتے ہیں۔ یہ صریح کفر ہے جب تک ہوش و حواس قائم ہیں ہرگز احکام معاف نہیں ہو سکتے۔ کسی نے حضرت جنید سے ذکر کیا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو واصل ہو گئے ہم کو ان ظاہری احکام کی اب کیا حاجت۔ فرمایا بیشک واصل تو ہو گئے مگر جہنم واصل، اور فرمایا اگر میں ہزاروں سال زندہ رہوں بلا عذر شرعی وظیفہ بھی ناغہ نہ کروں۔"

ایک اور غلطی: یہ ہے کہ اپنے کمالات کا صراحتہً یا اشارۃً فخریہ دعویٰ ہوتا ہے اور دوسروں کی تحقیر و توہین۔ حالانکہ صاف حکم ہے کہ فلا تزکوا انفسکم ۔ البتہ اظہار نعمت کی غرض سے اگر کوئی موقع کی بات کہہ دیجئے اور اس کو اپنا کمال نہیں محض خدا کا فضل سمجھیں تو مضائقہ نہیں کہ اما بنعمۃ ربک فحدث۔

ایک جاہلانہ دعویٰ: "بعض جہلا ایک عجیب دعویٰ کرتے ہیں کہ ہماری نسبت اتنی قوی ہے کہ گناہ کرنے سے بھی اس میں فتور نہیں آتا۔ یاد رکھنا چاہئے ایسی نسبت جس کو معصیت سے بقا یا ترقی ہو شیطانی نسبت ہے اور ایسی ترقی کو مکر و استدراج کہتے ہیں۔ حضرت خواجہ عبیداللہ احرار نے فرمایا کہ مکر الٰہی دو ہیں ایک عوام کے حق میں اور ایک خواص کے۔ عوام کے حق میں تو یہ کہ خدمت و اطاعت میں تقصیر کے باوجود نعمت میں توفیر ہو اور خواص کے حق میں ترک ادب کے باوجود ان کے حال کا باقی رہنا"۔

نقل حدیث کی ایک عام غلطی: صوفیاء و فقراء کی ایک اور عام غلطی یہ ہے کہ "احادیث کے بیان کرنے میں نہایت بے احتیاطی ہوتی ہے حدیث کی تحقیق ہمیشہ علمائے حدیث سے کرنا چاہئے یہ کسی طرح درست نہیں کہ اردو فارسی کی یا عربی کی کسی غیر معتبر کتاب میں حدیث کا نام دیکھ لیا اور اس سے استدلال شروع کر دیا، جیسے انا عرب بلا عین وغیرہ کہ ایسی عجیب و غریب حدیثوں کے نہ کہیں الفاظ کا پتہ نہ معانی کا نشان۔ خود حدیث میں اس معاملہ کی بڑی وعید آئی ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا اس کا ٹھکانا جہنم ہے"۔

جاہلانہ دلیری: اسی قسم کی جاہلانہ دلیری کا یہ دعویٰ ہے، کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو آپ نے تصوف کے کچھ اسرار کی خفیہ تعلیم فرمائی تھی جو سینہ بسینہ چلے آتے ہیں اور ایک دو نہیں بلکہ

> "کئی ہزار کلمات تصوف کے جو شب معراج سے آپ لائے تھے سب سے علیحدہ حضرت علیؓ کو تلقین فرمائے! اس دعوے میں کتنے جھوٹ جمع ہیں اول یہ کہ آپ کو معراج میں کئی ہزار کلمات تصوف عطا ہوئے۔ حالانکہ وہاں تو اس قدر ابہام تھا کہ فرشتہ تک کو اطلاع نہیں ہوئی، یہ مدعی کہاں کھڑے سنتے تھے ایسے مقام کا راز کسی کو معلوم ہو سکتا ہے۔ دوسرا جھوٹ یہ کہ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا تھا۔ کہ آپ کو حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ خاص باتیں بتلائی ہیں آپ نے نہایت سختی سے انکار فرمایا کہ ہمارے پاس کوئی خاص چیز نہیں۔
>
> سوائے فہم قرآن جو آدمی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت ہوتی ہے۔"

سو یہی فہم ثمرہ تھا اس نور نسبت کا جو صحبت نبویؐ کی بدولت آپ کے سینہ میں پہنچی تھی اور وہی اب تک سینہ بسینہ منتقل ہوتی آئی ہے۔ یہی معنی ہیں اس قول کے کہ تصوف سینہ بسینہ آتا ہے۔ نہ یہ کہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ پوشیدہ باتیں کانا پھوسی کے ذریعہ اب تک چلی آ رہی ہیں۔

"اگر ایسے بے اصل دعویٰ کا اعتبار کیا جائے تو تمام کارخانہ ہی درہم برہم ہو جائے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ میاں کتابوں میں جو لکھا ہے کہ حاتم بڑا سخی تھا یہ علم سفینہ ہے اور مجھ اپنے بزرگوں سے سینہ بسینہ یہ راز پہنچا ہے کہ وہ بڑا بخیل تھا، مگر یہ بات کس سے کہنا نہیں ورنہ خشک ملانے (یا مورخ) جھٹلا دیں گے۔ اس طرح جس چیز کا چاہو سینہ بسینہ دعویٰ کر دو پھر کسی بات کا اعتبار رہے گا۔

"تیسرا جھوٹ یہ ہے کہ سب صحابہ کو نعوذ باللہ اس (راز سینہ بسینہ) کے ناقابل ٹھہرایا حالانکہ قرآن و حدیث میں صحابہ خصوصاً خلیفہ اول کے فضائل دیکھو تو یہ سارا اشتباہ جاتا رہے۔ سیر الاولیاء میں ہے (جو خود اولیاء ہی کے حالات میں اور ولی ہی کی لکھی ہے) کہ فاضل ترین ہمہ امت حضرت امیر المومنین ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اند و سید اہل تجرید بادشاہ اہل تفرید۔ مشائخ حضرت ایشاں را مقدم ارباب مشاہدہ سید ارند (جواہر غیبی)

دنیا میں دید حق کا دعویٰ: "ایک غلطی یہ ہے کہ جس طرح حق تعالیٰ کے دیدار جنت میں ہو گا اسی طرح دنیا میں دیدار کے قائل ہیں۔ حالانکہ خود قرآن میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے دنیا میں دیدار کی تمنا کی تو لن ترانی جواب ملا۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ انکم لن تروا ربکم حتی تموتوا یعنی مرنے سے پہلے کبھی خدا تعالیٰ کو نہ دیکھو گے۔ خود عارفین کا کلام سنئے مصباح الہدایۃ میں ہے کہ رویت عیاں دریں جہاں متعذر است اما در آخرت مومناں را موعود است و کافراں را ممنوع"۔

باقی "سلوک کی کتابوں میں مقام فنا کا جو مشاہدہ لکھا ہے وہ رویت قلبی ہے۔ نیز مقام فنا مشابہ خواب کے ہوتا ہے اور خواب میں اللہ تعالیٰ کا دیکھنا ممکن ہے"۔ بعض اوقات سالک روحانی تجلی کو ربانی تجلی سمجھ کر گمراہ ہوتا ہے، اس مقام پر شیخ کامل و محقق کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت یحییٰ منیری مکتوب چہار دہم میں فرماتے ہیں کہ

"روح را نیز تجلی باشد و بیسار روندگان دریں مقام مغرور شدہ اند و پنداشتند کی تجلی حق یافتند اگر شیخ صاحب تصرف بناشد ازیں ورطہ خلاصی دشوار بود .... گاہ بود کہ ذات روح کہ خلیفہ حق ست در تجلی آید و بخلافت خود دعویٰ انا الحق کردن میگیر دو گاہ بود کہ جملہ

موجودات راپیش تخت خلافت روح در سجود و بنید در غلط افتد داند کہ مگر حضرت حق ست"۔

"اور بعض بزرگوں کے جو اس قسم کے اقوال ہیں کہ دیگراں راوعدۂ فردا بود لیک مار نقد ہم اینجا بود۔ اس کے معنی شیخ عبدالقدوس" فرماتے ہیں کہ معنی او آنست انچہ وعدہ بردیت بود اینجا بچشم یقین مشاہدہ ایں منقود رامحققاں مشاہدہ خوانند نہ محض رویت دانند"۔

اللہ اکبر! اس راہ میں کیسے کیسے مزلات ہیں کہ اگر کامل شریعت اور جامع شیخ کا دامن ہاتھ میں نہ ہو تو سالک کہاں سے کہاں جا گرتا ہے، خدارسی تو الگ رہی ایمان ہی کی خیر نہیں رہتی۔ اس لئے اصلاح اغلاط کا یہ آٹھویں باب قریب قریب سارا کا سارا نقل کر دیا گیا ہے، جس کی اصلاحی و تجدیدی اہمیت اغلاط بالا اور ان کی اصلاح کے بیان کے بعد محتاج بیان نہیں رہتی۔

موانع طریق: نواں باب موانع طریق کا ہے۔ "یوں تو جتنے معاصی اور تعلقات ماسوی اللہ ہیں سب ہی اس راہ کے رہ زن ہیں مگر (ذیل میں صرف خاص) چند چیزوں کا بیان کیا جاتا ہے"۔

سب سے بڑا مانع "سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ہے، جس کا بیان اوپر گزر چکا۔ افسوس اس زمانہ میں رسوم و بدعات کی اتنی کثرت ہے کہ تصوف ان ہی رسوم کا نام رہ گیا ہے............ تصوف کی جو حقیقت تھی کہ فنا و بقا کی نسبت حاصل کریں اس کے معنی بھی نہیں جانتے رسوم کے مقید ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے زمانہ کا کیا ٹھکانا جب ابوالعباس دنیوری اپنے زمانہ کا حال بیان فرماتے ہیں کہ لوگوں نے ارکان تصوف کو توڑ دیا، اس کے طریقوں کو تباہ کر دیا اور اس کے معنوں کو ایسے ناموں سے بدل دیا جو خود گڑھتے ہیں۔ (مثلاً) دین حق سے نکل جانے کا نام سطح اتباع ہوئی کا نام امتحان رکھ دیا" وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ بعض دیگر موانع مثلاً عورتوں اور لڑکوں سے میل جول یا کمالات اور

توحید کا دعویٰ جس میں شریعت اور حق تعالیٰ کے ساتھ گستاخی تک کی پرواہ نہیں ہوتی ان کا ذکر اوپر "اصلاح اغلاط" کے باب میں آچکا ہے۔

آخر میں دو ایسے موانع کا ذکر ہے، جن کی طرف لوگوں کو بہت کم التفات ہوتا ہے ایک یہ کہ شیخ کی تعلیم سے زائد اتنا مجاہدہ کرنا کہ چند روز میں گھبرا کر جو کچھ شیخ نے تعلیم کیا تھا وہ بھی چھوٹ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اعمال میں سے اتنا خیال کرو کہ اکتا نہ جاؤ کیونکہ اللہ نہیں اکتاتا یہاں تک کہ تم اکتا جاؤ۔

دوسرے ثمرات مجاہدہ کے حصول میں تقاضا و عجلت کرنا کہ اتنے دن ہو گئے اب تک کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔ اس جلد بازی کا انجام یہ ہوتا ہے کہ یا تو شیخ سے بد اعتقاد ہو جاتا ہے یا مجاہدہ ترک کر دیتا ہے۔

ایک اور "مانع شیخ سے محبت و عقیدت میں فتور آ جاتا ہے یا اس سے بھی بڑھ کر شیخ کو آزردہ کرتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ جو میرے ولی سے عداوت کرے میں اس کو اعلان جنگ دیتا ہوں۔

وصایا: سب سے آخر کا دسواں باب وصایا کا ہے، جس میں متقدمین میں امام قشیری اور متاخرین میں حضرت شاہ ولی اللہ" کے وصایا کا خلاصہ تحریر فرما کر اس باب اور کتاب کو اپنے مرشد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصایا پر اس طرح ختم فرمایا گیا کہ

> "حضرت سیدنا و مرشدنا الشیخ الحافظ الحاج محمد امداد اللہ صاحب" کی وصایا کا خلاصہ لکھ کر رسالہ ہذا کو ختم کرتا ہوں۔ اس کو آخر میں اس لئے لکھا کہ خاتمہ میں برکت ہو ورنہ میرا حق یہ تھا کہ اس کو سب سے مقدم کرتا" ۔ وہ وصایہ یہ ہیں:۔
>
> "طالب حق پر لازم ہے کہ اول مسائل ضروری و عقائد اہل سنت و جماعت حاصل کرے پھر ان رذائل سے تزکیہ کرے۔ حرص، اہل غضب، جھوٹ، غیبت، بخل، حسد، ریا، کبر و کینہ اور یہ اخلاق پیدا کرے

صبر، شکر، قناعت، علم، یقین، تفویض، توکل، رضا، تسلیم، اور شرع کا پابند رہے۔ اگر گناہ ہو جائے نیک عمل سے جلد تدارک کرے۔ نماز با جماعت وقت پر پڑھے۔ کسی وقت یاد الٰہی سے غافل نہ ہو۔ لذت ذکر پر شکر بجا لائے۔ کشف و کرامات کا طالب نہ ہو۔ اپنا حال یا سخن تصوف غیر محرم سے نہ کہے۔ دنیا و مافیہا کو دل سے ترک کرے۔ خلاف شرع فقرا کی صحبت سے بچے۔

"لوگوں سے بقدر ضرورت اخلاق کے ساتھ ملے۔ اپنے کو سب سے کمتر جانے۔ کسی پر اعتراض نہ کرے۔ بات نرمی سے کرے سکوت و خلوت کو محبوب رکھے۔ اوقات منضبط رکھے۔ تشویش کو دل میں نہ آنے دے۔ جو کچھ پیش آئے حق کی طرف سے سمجھے۔ غیر اللہ کا خطرہ نہ آنے دے۔ دینی کاموں میں نفع پہنچاتا رہے۔ نیت خالص رکھے۔ خورد و نوش میں اعتدال رکھے نہ اتنا زیادہ کھائے کہ کسل ہو نہ اتنا کم کہ عبادت سے ضعف ہو۔ کسب حلال افضل ہے، اگر توکل کرے تو بھی مضائقہ نہیں بشرطیکہ طمع نہ رکھے نہ کسی سے امید و خوف کرے حق تعالیٰ کی طلب میں بے چین رہے۔

"نعمت پر شکر کرے، فقر و فاقہ سے تنگ دل نہ ہو۔ اپنے متعلقین سے نرمی برتے ان کے خطا و قصور سے در گزر کرے۔ ان کا عذر قبول کرے۔ کسی کی غیبت و عیب نہ کرے۔ اپنے عیوب کو پیش نظر رکھے کسی سے تکرار نہ کرے۔ مہمان نواز اور مسافر پرور رہے۔ غربا و مساکین علماء و صلحا کی صحبت اختیار کرے۔ قناعت و ایثار کی عادت رکھے۔ بھوک پیاس کو محبوب رکھے۔ ہنسے کم روئے زیادہ عذاب الٰہی سے لرزاں رہے۔

"موت کا ہر وقت خیال رکھے روزانہ اپنے اعمال کا محاسبہ کر لیا کرے نیکی پر شکر بدی پر توبہ کرے۔ صدق مقال و اکل حلال اپنا شعار رکھے۔ غیر مشروع مجلس میں نہ جائے۔ رسوم جہل سے بچے۔ شرگیں کم گو کم رنج

صلاح جو نیکو کار نیکو رفتار باوقار بردبار رہے۔ ان صفات پر مغرور نہ ہوں۔ "

"اولیاء کے مزارات سے مستفید ہوتا رہے۔ گاہ گاہ عوام مسلمین کی قبور پر جا کر ایصال ثواب کرے۔ مرشد کا ادب اور فرمانبرداری کامل طور پر بجالائے اور ہمیشہ استقامت کی دعا کرتا رہے"۔

"الحمد اللہ کہ ۲۷/ صفر روز پنج شنبہ ۱۳۱۵ھ کو مقام مدرسہ جامع العلوم (کانپور) یہ رسالہ تعلیم الدین اختتام کو پہنچا"۔

اور الحمد للہ کہ ۶/ شعبان ۱۳۶۸ھ بروز سہ شنبہ یہ کتاب تجدید دین کامل بعد نظر ثانی اختتام کو پہنچی۔ اللھم تقبلہ منی واجعلہ وسیلۃ لمغفرتی۔